دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ

جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

جنوری 2012

نگران اعلیٰ

معراج رسول

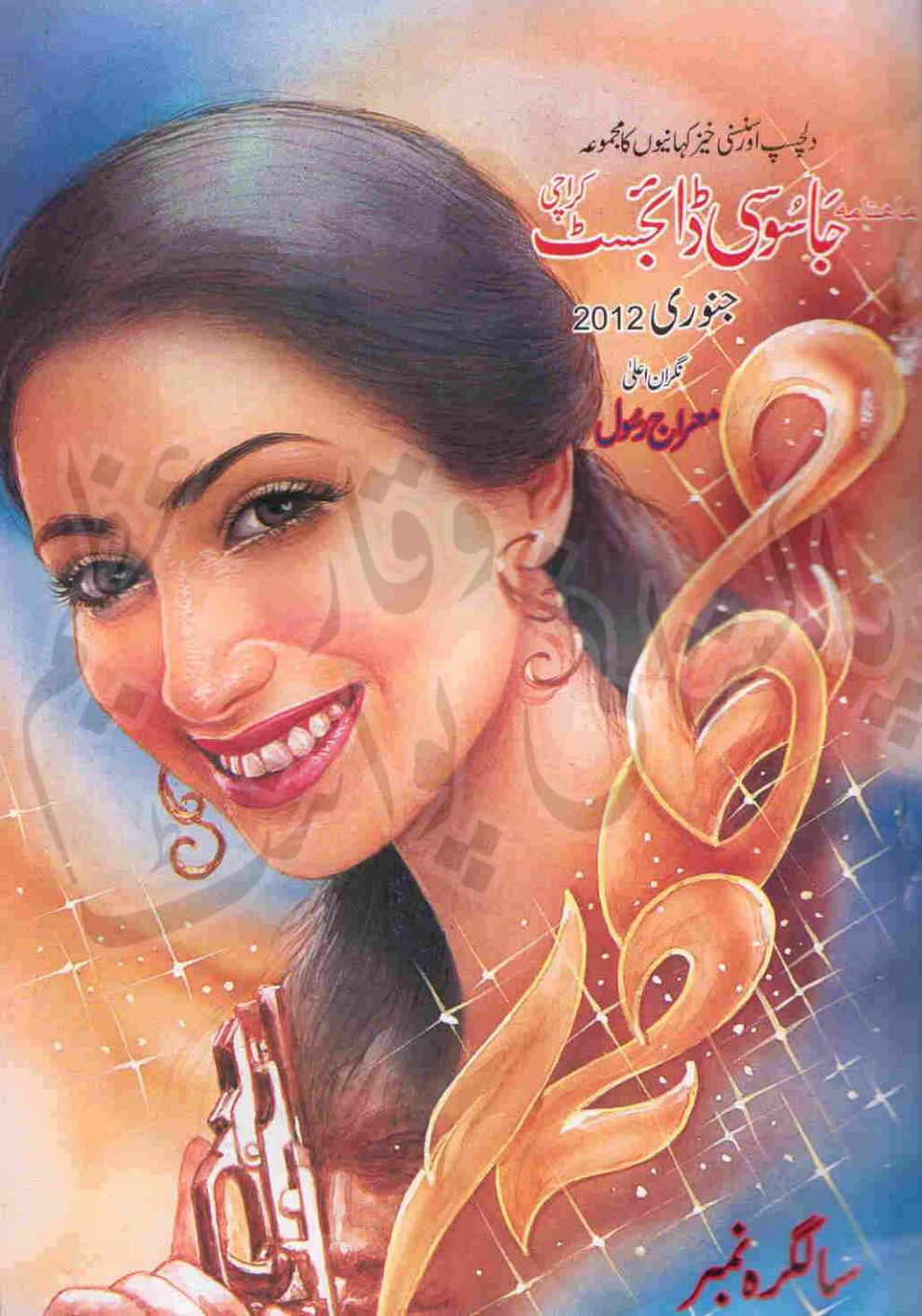

سالگرہ نمبر

جاسوسی ڈائجسٹ

چینی نکتہ چینی — مدیر اعلیٰ — 11
قارئین کی گرماگرمیاں، کج ادائیاں
نامۂ پیام، محبتیں، عنایتیں اور شکایتیں

حاصل لاحاصل — سلیم فاروقی — 18
انسان اور اس کے وجود کی رنگ بدلتی
صورتوں کا ادراک نہ رکھنے والوں کا ماجرا

غلطی کا پھل — محمد عفان آزاد — 55
فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والے کرداروں
کے گرد پھیلی دنیا کی ایک جھلک

جیسے کو تیسا — بابر نعیم — 71
دو شکاریوں کی مہم جوئی
جن کا ہدف مشترک تھا

انوکھی پروفیسر — مختار آزاد — 73
جذبات و احساسات کو جکڑ لینے والے
حالات و واقعات کی کڑی در کڑی

للکار — طاہر جاوید مغل — 88
محبت کے محاذ پر للکارنے والے شخص کی جدوجہد
اسے اپنے تحفظ کی جنگ کا سبیل تھا

تین نسل بعد — مریم کے خان — 131
نسل پرستی میں مبتلا قانون کے رکھوالے
جو نفرت میں بہت دور نکل گئے تھے

برف کی چوری — نجمہ موری — 147
نک ویلوٹ کا جنوری
کی سردی میں سرمائی کارنامہ

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

گرداب — اسما قادری — 156
تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر
کا کھیل... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

جائے پناہ — تنویر ریاض — 183
ایک مجرم کی آخری خواہش سے
شروع ہونے والی سنسنی خیز کہانی

فائنل لیول — سلیم انور — 195
مختصر پیرائے میں یاد
رکھنے والی عبرت اثر کتھا

فیصلہ — جمال دستی — 201
دوستی اور فرض کے درمیان
حائل امتحان کی کٹھن گھڑیاں

بازگشت — کاشف زبیر — 207
اس شخص کا ماجرا جو لوگوں سے کم آشنائی
اور گریزپائی کے اصول پر عمل پیرا تھا

ایک اور لوسٹوری — احمد اقبال — 241
آغاز سے انجام تک کا سفر طے کرنے
والے مسافر کا دگرگوں احوال

طرفہ تماشا — عبدالرب بھٹی — 272
اس جوڑے کا قصہ جس کی زندگی اور
محبت کے گرد دشمنوں کا گھیرا تنگ ہورہا تھا

تراش خراش — ادارہ / قارئین — 000
اقتباسات، گدگدیاں، مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ
آپ کی تفریح طبع اور تواضع کے لیے

جلد 41 • شمارہ 01 • جنوری 2012 • زرسالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 50 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون (021) 35895313 فیکس 350255...
E-mail:jdpgroup@hotmail.com(021)
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

چینی، نکتہ چینی

مدیرِ اعلیٰ

عزیزانِ من... السلام علیکم!

نئے سال کا آغاز ہوا اور اس کے ساتھ ہی 2012ء کا پہلا اور خاص شمارہ 'جاسوسی ڈائجسٹ' کا سالگرہ نمبر بہت سی تبدیلیوں کے ساتھ قارئین کے لیے سال نو کا تحفہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی آپ سب کو جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی طرف سے دل کی گہرائیوں سے نئے سال کی مبارک باد اور مسیحی قارئین کو کرسمس مبارک... ہر سال وقت ایک خاص لمحے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اُس لمحے کے آتے ہی ہم سب گردشِ ایام میں نئے ہندسوں کے ساتھ، سال کے مزید تین سو پینسٹھ شب و روز بِتانے کے لیے کتابِ حیات کی نئی بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں۔ اگرچہ جنوری سردی کا مہینا ہے، لیکن یہ پُرجوش جذبوں کا دوسرا نام بھی ہے۔ جنوری جہاں نئے سال کا آغاز ہے وہیں یہ من کے موسموں کی فصلِ بہار بھی ہے۔ اس مہینے شاخِ اُمید پر نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں... جذبوں کے مہکتے گل کھِلتے ہیں... تشنۂ تکمیل آرزوؤں کے آسودہ ہو جانے کا امکان نظر آتا ہے... جو نہ مل سکا، اُس کے مل جانے کی دعا لبوں پر آجاتی ہے... کچھ کر گزرنے کا نیا حوصلہ جنم لیتا ہے اور جو پچھلے برس نہ کر سکے، اس برس کر گزرنے کا جذبہ انگڑائی لے کر تازہ دم ہو جاتا ہے... ماہ و سال کے نئے سفر کا آغاز ہو چکا۔ پچھلے برس بھی وطنِ عزیز ماضی کی طرح وسوسوں، خدشات، امکانات اور امیدوں کے جھولے پر جھولتا رہا اور اس نئے برس کے اولین ایام بھی کتابِ زیست کے نئے باب میں پچھلے اوراق کی میراث سمیٹے چلے آئے ہیں۔ نئے سال کے پہلے دن سے وطنِ عزیز کے اُفق پر امیدوں اور حوصلوں کے بادل بدستور چھائے ہوئے نظر آرہے ہیں... جن کے سائے میں رہنے کا یارا تو نہیں مگر امیدوں کی بِنا پر دل کو نیا دلاسا دیتے ہیں کہ خدا کرے کہ اس باب کی تحریر پچھلے اوراق سے کچھ مختلف ہو۔ اے خشک و تر کے مالک! نئے سال کے اس نئے باب میں ہماری تشنہ آرزوؤں کو جامِ تکمیل میسر کردے... امید کو یقین کا سہارا عنایت کردے... جذبوں کو صداقت کے چمکتے سورج کی بھرپور روشنی نہ سہی، کم از کم کوئی کرن تو عطا کردے... لبوں پر لرزتی استحکامِ پاکستان کی دعا کو شرفِ قبولیت بخش دے!

اس کے ساتھ ہی چلتے ہیں نئے سال کی پہلی بزم میں جہاں گزرے برس کے آخری شمارے پر آپ کی چینی اور نکتہ چینی اظہار کے لیے بے قرار ہے!

ناصر محمود کوہستان ہزارہ سے تصحیح فرماتے ہیں ”ہم بھی اس دفعہ بہت سے لوگوں کی طرح پہلی بار شاملِ بزم ہو رہے ہیں۔ (خوش آمدید) ڈاکر انکل! آپ سے ایک ٹھوس نوعیت کا شکوہ یہ ہے کہ آپ صنفِ نازک کو خوب سے خوب تر بنانے میں اتنے مگن رہتے ہیں کہ ہماری نمائندہ صنف لنگور... اسٹال پر دور سے جاسوسی پر نظر پڑی تو اوپر کا دایاں حصہ آنکھوں سے سیدھا دل میں اتر گیا۔ شاعرانہ انداز میں کہہ اٹھے کہ گھٹاؤں میں چاند ٹھہرا ہوا ہے اور سرورق کی حسینہ، زلف سہ رخ پر پریشاں کیے ہوئے اور چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے دکھائی دیا۔ حسینہ کے مخالف سمت میں ایک بے آب و گیاہ بنجر و ویران سی پہاڑی دکھائی دی۔ گھر پہنچ کر اطمینان سے سرورق کا خوردبینی جائزہ لیا۔ (یعنی ابھی کچھ باقی تھا؟) سرورق سے براہِ راست چینی، نکتہ چینی میں پہنچے۔ تختِ شاہی پر راولپنڈی سے عامر رسول براجمان تھے۔ تبصرہ اچھا تھا۔ ایک پورا مبارک بادوں کا، درمیانی سائز کا میری طرف سے قبول کریں۔ باقی تبصرے بھی بس ٹھیک ہی تھے۔ تحریم تلوکر کی باتیں پڑھ کر ہمیں یوں ہی خیال سا آگیا کہ ان کے نام کے دوسرے حصے میں ک کے بجائے الف ہونا چاہیے تھا۔ جی میں ٹھان رکھی تھی کہ للکار سے جاسوسی کو للکاریں گے مگر خود کردہ کے کافرستان اور چترال نے روک دیا کہ یہ تو ہمیں پڑوس کی طرح لگتے ہیں۔ لیکن جوں جوں بڑھتے گئے، بوریت غلبہ پانے لگی۔ حقیقت سے کوسوں دور حالات و واقعات کی بھرمار۔ غاروں کا بیان ایسا کہ سانسیں رکتی محسوس ہوں لیکن آغا لیفہ صاحب چاغی کی موجودگی میں اس بھیانک غار میں کنگھی چوٹی میں مصروف ہیں۔ یہ کہانی پڑھتے ہوئے سیانوں کے اس قول پر دل و جان سے عمل کرنے کا خیال آتا رہا کہ ایسے افسانے کو ایک خوب صورت موڑ دے کر چھوڑ دینا چاہیے جسے انجام تک لانا ممکن نہ ہو مگر ہم نے غالباً، مجبوراً، عادتاً، مروتاً نیز طوعاً و کرہاً تفصیلاً اس کہانی کا خاتمہ بالایمان کیا۔ (ضروری نہیں تھا... ان صفحات کو بنا پڑھے چھوڑا بھی جا سکتا تھا) اور ڈرون کی رفتار سے سوئے للکار چل دیے۔ نہایت ہنگامہ خیز سماں تھا۔ سلطانہ کا وادیٔ عدم آباد کو کوچ کر جانا، سوگوار کر گیا۔ عمران اور تابی بھی موت سے کچھ ہی دور سانسیں لیتے نظر آئے مگر عین کٹھن وقت میں کعبے کو صنم خانے سے پاسبان مل گئے۔ عمران کو چاہیے کہ قیمت ادا کر کے گیتا مکھی سے خاص جانکاری لے اور اللہ مغل صاحب کے قلم کا زور اور زیادہ کرے۔ للکار کے بعد گرداب نے داب لیا۔ چودھرائن کے پرلوک سدھارنے کے بعد راوی کم از کم چند لوگوں کے لیے چین ہی چین بیان کرے گا۔ ماہ بانو ایک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں۔ ہم دعا گو ہیں کہ مشابرم خان فی الحال آنجہانی کی مسند پر براجمان نہ ہو۔ مختصر کہانیوں میں دوسری عورت چونکا دینے والا انجام لیے ہوئے تھی۔ واردات، انتقام کا روایتی رنگ لیے ہوئے تھی۔ انصاف قدرے جاندار تحریر تھی۔ نسب نما، قاتل مسیحا، قدر شناس، شیطان کی موت ڈھیلی ڈھالی کہانیاں تھیں۔ کاشف زبیر کی نشانہ میں سوئی کو پتا نہیں بانسری کے ذریعے پھینکنا کیسے ممکن ہوا۔ (ہر چیز ممکن ہے... بشرطیکہ کرنا چاہو...) مبح بخیر دلچسپ کاوش تھی۔ برائے فروخت میں شون بروقت آن پہنچی ورنہ مزہ بالکل بھی نہ آتا۔ رنگوں میں پہلا رنگ زبردست رہا۔ جلیبی کی طرح سلجھے ہوئے اس فسانے نے آخر تک تجسس میں رکھا۔ دوسرا رنگ قدرے پھیکا سا تھا۔ تاریخی اعتبار سے شرمندگی سی محسوس ہوئی اپنے تاثیر نیازی... یارانِ نکتہ چیں کو اطلاع بہم پہنچاتا چلوں کہ آئندہ ن م اخوند کے نام سے شریکِ محفل ہوا کریں گے۔ (کرم نوازی ہے... سرکار کی) انشاءاللہ یا زندہ، صحبت باقی۔“

زیب حسن کی تشریف آوری خان بوائز ہاسٹل لاہور سے ”یکم دسمبر کی ٹھٹھرتی شام کو جاسوسی کے درشن ہوئے۔ خوشی کی اک لہر پورے وجود میں سرایت کر گئی۔ جاسوسی کی تعریف کے لیے کیا کہوں؟ قارئین! اور بزمِ یاراں کو میرا نام نیا ضرور لگے گا لیکن میں پہلے بھی دو تین بار عزیز محفل میں شرکت کا شرف حاصل کر چکا ہوں۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ یہ عرصہ تین سال پہلے کی بات ہے۔ جاسوسی سے ناتا نہ کبھی ٹوٹا اور نہ ہی ٹوٹے گا۔ تنہائی کے عالم میں گھر سے

دور بلطفرتی اور ویران ہی راتوں میں جاسوسی کا ساتھ ایک مخلص دوست جیسا محسوس ہوتا ہے۔(کہاں کی ویران بستیوں میں ڈیرے ڈال لیے؟) سرورق کی حسینہ بڑی شوخ مسکراہٹ چہرے پر سجائے کسی نامعلوم شخص کو دیکھ رہی تھی حالانکہ اس کے عین سامنے، ایک مافوق الفطرت گریبان چاک شخص لاچار حالت میں پتا نہیں کیا کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ عقب میں کوئی جاسوس ٹائپ پرسن دونوں کی جانب دیدے پھاڑے منہ کھولے بس دیکھے ہی جا رہا تھا۔ اس ابھی گتھی کو سلجھائے بغیر محفل یاراں کے در پر دستک دی۔ م۔الف نے دروازہ کھولا اور پُرتبسم چہرے کے ساتھ استقبال کیا۔ ایک اونچے سے چبوترے پر عامر رسول کو براجمان پایا۔ باقی لوگ بشمول چھ صنفِ نازک حسب مراتب کارپٹ پر آلتی پالتی مارے زم گرم گفتگو میں منہمک نظر آئے۔ بہرکیف عامر صاحب کو مبارک باد۔ آپ کا تبصرہ پڑھ کے بے اختیار ہونٹوں پر مسکان پھیل گئی۔ حسنین بلوچ وعلیکم السلام! ہم آپ کے لیے بھی دعا گو ہیں۔ سیدمحی الدین اشفاق کہانی ضرور لکھیں ویسے مجھے بھی جوش چڑھا ہوا ہے کہ کہانی لکھ ڈالوں لیکن اس کے لیے ٹائم بہت درکار ہے۔ میں ہاسٹل میں رہتا ہوں اور یہاں ہر لڑکے کی مختلف کہانی ہے۔ محترمہ تحریم ناراضی آمیز غصے میں نظر آئیں لیکن یہ تسلیم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ہمارے سنڑلیے ترتیب وار چھپتے ہیں لہٰذا کوشش جاری رکھنی چاہیے۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے طاہر صاحب کی سوغات، جاسوسی کی جان اور ہمارے دلوں کی دھڑکن للکار پڑھی۔ کمال کردیا... اتنی عمدہ کہانی، زبردست منظر کشی، محبت، جنگ، وصال و ہجر، جذبات اور تابش اور عمران کی دوستی... واہ بھئی واہ۔ طاہر انکل نے اپنے قلم کا حق ادا کردیا۔ میں ہمیشہ للکار رات کے گہرے سناٹے اور تنہائی کے عالم میں پڑھتا ہوں تو مزہ دوبالا ہوجاتا ہے۔ دوسری عورت میں ماریا نے بہت پراسرار طریقے سے اپنی راہ کے کانٹے کو صاف کیا۔ منظر امام کی نسب نما سبق آموز تحریر تھی۔ واردات کے شروع سے ہی میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ نیولے کی شکل والا سلیم خان ہی قاتل ہے۔(آپ تو بڑے ہوشیار ہیں) بہرحال کہانی دلچسپ تھی۔"

عاطف گجر چک بھاری کھاریاں سے لکھتے ہیں "اس دفعہ شمارہ سات تاریخ کو ہمارے ہاتھوں کی زینت بنا۔ سرورق بہت پسند آیا۔ اس کے بعد چل پڑے میٹھی میٹھی محفل میں۔ اس دفعہ وکٹری اسٹینڈ پر عامر رسول نظر آئے، مبارک ہو۔ آمنہ پٹھانی جی محفل سے صنفِ نازک اس طرح بھاگ رہی ہیں جس طرح گنجے کے سر سے بال۔ آپ کا تبصرہ اچھا لگتا ہے۔ حسنین عباس بلوچ کی آمد اچھی لگی۔ سیدمحی الدین اشفاق مبارک ہو جی ایم اے میں داخلہ لے لیا یقیناً چالیس کے پیٹے میں پہنچ گئے ہوں گے۔ تصویر العین صاحبہ! آپ پر کوئی تبصرہ نہیں کیونکہ آپ پھر یہ کہیں گی کہ آپ مرد، عورتوں پر تبصرہ زیادہ کرتے ہیں لیکن ہم اس محفل میں سب کو ایک گھر کی طرح محسوس کرتے ہیں۔ تفسیر عباس صاحب! آپ یقیناً لفظوں کے کھلاڑی ہیں۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ للکار سے آغاز کیا۔ سلطانہ کی موت پر اتنا ہی دکھ ہم کو ہوا جتنا تابش بھائی کو ہوا۔ سرجن اسٹیل کی موت نے یہ ثابت کیا کہ کہانی آہستہ آہستہ اختتام کی طرف گامزن ہے، یہ میرا اندازہ ہے آگے آپ جانیں۔ گرداب میں اس دفعہ تیزی آئی، ویری گڈ۔ اسما جی آپ نے خوب کڑیاں ملائیں اس دفعہ۔ اب آتے ہیں ریگِ رواں یعنی دوسرے رنگ کی طرف۔ سلیم فاروقی صاحب آج سے آپ میرے بیسٹ رائٹر ہیں۔ مجھ ناچیز کی رائے کے مطابق یہ کہانی سال بھر کی تمام کہانیوں سے زیادہ پسند آئی ہوگی۔ پہلا رنگ بھی پسند آیا۔ منظر امام کی نسب نما کچھ خاص پسند نہ آئی۔ عبدالرب بھٹی، ثمر عباس، کاشف زبیر کی کہانیاں پسند آئیں۔"

احسان سحر کی حاضری میانوالی سے "دسمبر کا شمارہ ہمیشہ کی طرح کلیم کوہی کانپتے ہاتھوں سے ملا۔ ٹائٹل دیکھ کر غصے سے براحال ہوگیا، ہائی اسپیڈ تک غصہ پہنچ گیا (اتنا غصہ صحت کے لیے اچھا نہیں!) یہ کیا بھائی یہ ٹائٹل جاسوسی کا تو نہیں ہے۔ اتنا بور ٹائٹل ہے۔ مزید مایوسی سے بچنے کے لیے محفل یاراں میں آگئے۔ چینی، نکتہ چینی میں آپ کی باتوں نے متاثر کیا، خاص کر کربلا کے حوالے سے۔ اس دفعہ عامر رسول کرسیِ صدارت پر تھے۔ مبارک ہو بھائی جان آپ کا شعر بھی اچھا تھا تبصرہ تھوڑا اچھا تھا۔ ہمایوں سعید راج صاحب شکر ہے آپ نے بتادیا ورنہ ہم تو آپ کو رومیو ہی سمجھ رہے تھے اور خوب صورت وجہ ہمیں بھی بتائیے نا۔ آمنہ پٹھانی آپ کا تبصرہ کم سے کم ہوتا جارہا ہے۔ صبا گل خفا سی ہیں۔ تصویر العین! اپنی برتھ ڈے کے ساتھ حاضر ہوئیں، برتھ ڈے مبارک۔ اب بات ہوجائے کہانیوں کی۔ سب سے پہلے للکار سے آغاز ہوا۔ واہ مزہ آگیا، کافی ایکشن اور تیز رفتار قسط رہی، پل میں سب کچھ ختم ہوگیا۔ اب یہ کہانی انڈیا جیسے غدار ملک سے نکل کر لاہور آجائے گی۔۔ بہت خوشی کی بات ہے اور یہاں طاہر صاحب عمران کی جیب سے ملنے والی ڈائری کا راز کھولیں گے ویلڈن۔ مختصر کہانیوں میں دوسری عورت مجھے تو کچھ خاص نہ لگی الٹا غصہ آگیا عورت پر۔ قدرشناس کافی سسپنس فل تحریر رہی۔ واردات، عبدالرب بھٹی صاحب کی بھی اچھی تحریر رہی۔ انصاف بھی خوب صورت پیرائے میں ڈھلی تحریر تھی۔ قاتل مسیحا روسکی کی اپنی بیوی سے محبت لاجواب تھی، ایڈورڈ کو مار کر ڈوسکی نے اسے دردناک موت کے انتظار سے بچایا اور خود اس کا اپنا کام بھی حل ہوگیا۔ شیطان کی موت بھی خوب صورت شاہکار رہا۔ شیطان تو شیطان ہے پر ازل سے ابد تک انسان کے ساتھ جونک کی طرح چمٹا رہے گا۔(یہ تو سچ ہے) صبح بخیر مریم کے خان کی اچھی کاوش تھی۔ منظر امام کی کہانی متاثر نہ کرسکی۔ بات ہوجائے سرورق کے رنگوں کی تو سب سے پہلے گماں بے گماں سے شروع کیا۔ آخر سے لے کر اینڈ تک سسپنس انتقام اور دولت کی ہوس تمام تر جذبے شامل رہے۔ دوسرا رنگ سلیم فاروقی صاحب لے کر آئے اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ رنگ بور ہو واقعی جداگانہ اسلوب کی تحریر تھی۔"

کراچی سے سفیان ہاشم کا بھرپور تبصرہ "30 نومبر کی نیم کہر آلود صبح کو جاسوسی کا دیدار ہوا۔ سرورق کی حسینہ تھی جو بار بار اپنی دل لبھانے والی مسکراہٹ سے اپنی طرف کھینچے جارہی تھی بمشکل گھر پہنچ کر اس کے خطرناک ارادوں کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔(سمجھے یا پھسل گئے) چینی، نکتہ چینی کے رنگ میں آگئے جہاں مسندِ شاہی پر عامر رسول حضرت ابراہیم ذوق کے شاگرد بنے بے بحر بے وزن شعر جھاڑتے داد و تحسین کے ڈونگروں کے منتظر نظر آئے۔ جناب والا ایک ہماری طرف سے بھی قبول ہو۔ شاہد عالم صاحب! حسینہ کو آپ کے حسن نے نہیں بلکہ آپ کی جرابوں کی مہک نے مدہوش کیا ہوگا، درستگی قبول فرمائیں۔ سیدمحی الدین صاحب (سرکش) کے بعد اب اردو ایم اے کی بکس بھی لائبریری سے چرا کے ایم اے کرنے کا ارادہ ہے؟(آپ نے بھی ایسا ہی کیا تھا؟) صبا گل صاحبہ! سرورق کی حسینہ نشہ آور دوا کے زیر اثر نہیں تھی بلکہ آپ کے کسی ہم زباں نے اسے نسوار سنگھادی تھی۔ مانسہرہ کے ایم اے انجم صاحب کون سی تعلیمی مصروفیات ہوتی ہیں آپ کی کہ ٹائم ہی نہیں نکال پاتے آپ؟ کہیں محلے کے اسکول کے بچوں کی تختیاں تو نہیں لکھتے رہتے آپ؟ کہانیوں میں سب سے پہلے ابتدائی صفحات پر بکھری کہانی خود کردہ پر بات کرتے ہیں۔ کافرستان چترال پر لکھی گئی کہانی دلچسپ رہی۔ برفانی انسان پر لکھی گئی کہانی اچھی لگی کہ حقیقت کے قریب کرکے یہ واضح کیا گیا کہ برفانی انسان حقیقت نہیں، کہانیاں ہی ہیں۔ باقی کہانی کے آخر تک ہم دعا گو رہے کہ خدا کرے کہ نشور

ہادی صاحب ارسلان اور عالیہ کی شادی نہ کردیں اور انہیں منگنی شدہ حالت میں برقرار رکھیں مگر بسا آرزو کہ خاک شدہ ہمیں آخری صفحے نے سر پیٹنے پر مجبور کر ہی دیا۔(آپ کو کس لیے اعتراض تھا۔ کیا آپ صرف منگنیاں کرنے تک محدود رہتے ہیں؟) واردات عبدالرب بھٹی کی کہانی کا پلاٹ اچھا رہا البتہ بعض اوقات کچھ کرداروں کے مکالمے بے موضوع اور طویل محسوس ہوئے۔ تنویر ریاض کی کہانی انصاف نے انصاف کے حصول کے لیے کی جانے والی کوشش کو احسن پیرائے میں بیان کیا جو ہمیں اچھی بھی لگی۔ مختار آزاد صاحب کی کہانیاں ہمیشہ اپنی طرف کھینچتی ہیں اور اس دفعہ بھی وہ دلچسپی کی رسی ڈھیلی نہیں پڑی۔ حالات کے ہاتھوں مجبور ہونے والے معصوم صفت کلیٹ ڈوسکی کے احوال نے غمزدہ کیا۔ ثمر عباس کی کہانی شیطان کی موت نے انسانی اعضا کا گھناؤنا... کاروبار کرنے والوں کو عیاں کیا۔ صبح بخیر، مریم کے خان کی کہانی نے بیوی سے ڈرنے والا پہلو طریقے سے بیان کیا جو ہر شریف شوہر کی فطرت کا لازمی جزو ہوتا ہے۔ ویسے یہ بات اگر کسی مرد رائٹر کی طرف سے آتی تو کیا بات ہوتی۔ کاشف زبیر کی کہانی نشانہ سیدھی سادی تھی۔ اس میں جاسوسی ڈائجسٹ کے مزاج کی طرح گھماؤ پھراؤ نہیں تھا۔ آصف ملک کی کہانی برائے فروخت نے ذہن پر خوشگوار اثر ڈالا۔ شون اگر ہمارے ملک میں ہوتی تو رات گئے باہر نکلنے پر اس کا باپ اور کچھ نہ بھی کرتا تو اگلے دن اس کی شادی ضرور کروادیتا۔ سلیم فاروقی کی ریگِ رواں تلخ حقائق کا اظہار تھا، ویسے میری نظر میں مکتی باہنی والے ہماری نظر میں تو غنڈے ٹھہرے مگر اپنی قوم کے لیے ہیرو ہیں، یہ عجیب معاملہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ گمان بے گماں نے اتنے پینترے بدلے کہ ہمارے دماغ کی دہی بن گئی۔ آخر میں جب روشی نے منصور شاہد کی امید بھری نظروں کو قبولیت بخشی تو ہمیں بھی راحت کا احساس ہوا۔"(شکریہ)

محمد نعمان پیارے کی باتیں خوشبو لگا کے ایس اے گگ تلمبہ سے "اس مرتبہ کا ڈائجسٹ محرم کی چھٹیوں کی وجہ سے کافی لیٹ، 8 دسمبر کو ملا۔ سرورق پر حسینہ خوشگوار موڈ میں دکھائی دی۔ محفل میں عامر رسول اپنے خوب صورت تبصرے کے ساتھ پہلے نمبر پر موجود تھے۔ مبارکاں۔ صبا گل! آپ کو کیسے معلوم پڑا کہ سرورق کی لڑکی کسی نشہ آور دوا کے زیر اثر تھی۔(یہ بات آپ کے کہنے کی... تھی) کیا پتا بے چاری کو ویسے ہی اونگھ آگئی ہو اور ڈاکر انکل نے ایسے ہی اس کی تصویر بنا ڈالی ہو، خوشبو لگا کے۔ تحریم تلوکر! اب تو آپ کا تبصرہ شائع ہوگیا ہے اس لیے غصہ تھوک دیں۔ اطہر حسین! کیا عجیب خوشگوار بات ہے کہ آپ کو ٹائٹل فضول لگتا ہے۔ حالانکہ ایسا ہونا نہیں چاہیے۔(ہونا تو بہت کچھ نہیں چاہیے مگر ہوتا ہے...) ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی واردات ایک موزوں داستان تھی، دل مراد قاتل سلیم خان کا تعین پہلے ہی کرچکا تھا جو سچ ثابت بھی ہوا۔ سلیم انور کی دوسری عورت مختصر مگر ناقابلِ فراموش کاوش تھی۔ میں تو دوسری عورت کو رہا کی بیوی سمجھ رہا تھا مگر وہ اس کی ماں تھی۔ انصاف کے ساتھ تنویر ریاض نے اچھا انصاف کیا۔ بابر نعیم کی قدرشناس نے دماغ کی چولیں ہلا دیں۔ کہانی درمیان میں کافی پیچیدہ ہوگئی تھی مگر پھر واضح ہوتی چلی گئی۔ للکار کی قسط اس مرتبہ سسپنس اور تھرل سے بھرپور تھی۔ عمران نے گارڈ کو اپنے ساتھ ملا کر دوراندیشی کا ثبوت دیا جو وہ اس کہانی کے شروع سے ہی کرتا آیا ہے اور اب تو عمران کا گیتا کھمی کو قیمت دینے کا وقت بھی آن پہنچا ہے۔ کاشف زبیر کی نشانہ کل کی ایک دلچسپ و عجیب کتھا تھی۔ ثمر عباس کی شیطان کی موت، ایک سبق آموز اسٹوری تھی۔ خوشبو لگا کے۔ خدا حافظ"

بھوانہ سے جعفر حسین کا تجزیہ "سرورق کی اپسرا کے انداز ہائے دلبرانہ پلس قاتلانہ نے دلِ ناتواں پر ایسا کاری وار کیا جس کے آفٹر شاکس ہمیں گاہے بگاہے محسوس ہوتے رہیں گے۔(خدا نہ کرے) گندم سے ہٹ کر ڈاکر انکل نے تجریدی آرٹ کا بھی فائل پیچ دیا۔ عامر رسول آپ کا تبصرہ شان دار تھا۔ مس تصویر العین صاحبہ! 19 تاریخ کو 91 برس کا ہونے پر دلی مبارک باد۔ واؤ۔ اس دفعہ تو ٹیکسلا کی ممی بھی موجود تھیں۔ ممی جی کیسی ہیں آپ؟ ابن قرن کا تبصرہ سب سے جان دار رہا۔ پیارے نعمان دوسروں کی نقل نہیں کرتے، خود فرہاد بنو اور دودھ کی ایک آدھ نہر نکال کر مجھے بھی یاد رکھنا۔(واہ کیا کہنے) تفسیر عباس صاحب اولڈ از گولڈ کی عملی تفسیر بن کر محفل پر چھائے رہے۔ مختصر کہانیوں میں واردات کچھ خاص نہیں رہی۔ عین آخری لحات میں دوسری عورت کا عقدہ کھولنے والی سلیم انور کی تحریر جاسوسی کے معیار کے عین مطابق تھی۔ عدم تحفظ کے احساس سے دوچار اسٹیفنی کی کتھا انصاف قانون کی حد میں رہ کر قانونی مجبوریوں کو سمجھتے ہوئے اپنی عزتِ نفس اور عصمت کو تاراج کرنے والے سے انتقام کی بہترین روداد تھی۔ قدرشناس کچھ حد تک گنجلک اور بور کہانی تھی۔ محبت کے بے پایاں اور گداز جذبے کو عملی طور پر بیان کرتی قاتل مسیحا مغربی معاشرے کی مادیت پرستی کے باوجود یہ حقیقت بتا رہی تھی کہ محبت جہاں بھی ہے، جیسی بھی ہے ہمیشہ امر رہے گی۔ نیکی اور بدی کی متحارب قوتوں کا تجزیہ کرتی شیطان کی موت نے مایوس کیا۔ ایڈورڈ کا ماجرائے عبرت۔ قدیم افریقی قبائل کا طرز انداز اختیار کرکے قتل کی تقریباً بے داغ واردات کا ماجرا لیے نشانہ جاسوسی کی اسٹوری آف دی منتھ تھی۔ منظر امام کی نسب نما اگر کہانی تھی تو پھر آج سے کہانی کی از سرِ نو ڈیفی نیشن کرنی پڑے گی۔ برائے فروخت آصف ملک کی اچھی کاوش تھی۔ نشور ہادی کی خود کردہ نے حقیقی معنوں میں اولین صفحات کی نمائندگی کا حق ادا کیا۔ پلاٹ تنوع کا حامل، موضوع جان دار اور سیاق و سباق کے لحاظ سے ان کا ہوم ورک مکمل تھا۔ رنگوں میں گمان بے گماں پڑھ کر پہلا گمان یہی تھا کہ یہ کہانی کسی انگلش فلم کا فاسٹ فارورڈ ری پلے ہے۔ اتنی تیزی سے سارے حالات و واقعات رونما ہوئے کہ یوں محسوس ہوا جیسے مصنف نے شارٹ نوٹس پر کہانی لکھی ہے۔ ابھی پہلے رنگ کے جھٹکے سے سنبھل نہ پائے تھے کہ سلیم فاروقی نے حیران کردیا۔ 1971ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد انڈیا کی حراست سے فرار ہونے والے چند جنگی قیدیوں کی حقیقی روداد کو مصنف نے افسانوی رنگ دے کر ساری کہانی کا مزہ کرکرا کردیا۔(حقیقت کے ساتھ رنگ آمیزی نہ ہو تو پھر اسے کہانی نہیں، مضمون کہا جاتا ہے) سلسلے وار تحریروں میں اس دفعہ للکار ایکشن اور تھرل کا مرقع رہی۔ تحریر کے رخ سے لگ رہا ہے کہ زرگاں اور شاید اس کے بعد ٹل پانی سے بھی تابی اور عمران کا چل چلاؤ ہے۔ مغل انکل نے اپنی روایات کے برعکس کہانی کے کینوس سے پردہ ایک دم کھینچ لیا ہے۔ مغل صاحب للکار کی 5، 6 اقساط ایڈوانس میں لکھنے کے باوجود سسپنس کے لیے کیوں نہیں لکھ رہے ہیں؟"(ہاں بھئی جواب دیں کیوں نہیں لکھ رہے؟)

ضلع لیہ سے سیدمحی الدین اشفاق کی فرمائش "ٹائٹل حسینہ کچھ خاص نہیں تھی شاید اسی لیے صنفِ وجاہت نے منہ نیچے کر رکھا تھا۔ عامر رسول صاحب! ونگ سیٹ مبارک ہو۔ تصویر العین جی! تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ تفسیر عباس بابر! خیر مبارکاں۔ میرا ابھی شناختی کارڈ نہیں بنا عمر کا اندازہ خود لگالیں۔ محمد نعمان پیارے سے بھائی آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں بیس کا ہوگیا ہوں۔ دلنشین بلوچ! اسی سے اندازہ کرلیں کہ ہم آپ کو کتنا مس کرتے ہیں۔ راج میاں! کافی اچھا تبصرہ تھا۔ چھاگئے ویل ڈن راج میاں۔ آمنہ پٹھانی صاحبہ! شکایت نامہ پسند کرنے کا شکریہ۔ ایم اے انجم کا تبصرہ پسند آیا۔ اب

آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے فیورٹ للکار پڑھی، توقع کے عین مطابق سلطانہ کو مروا دیا گیا۔ اس قسط میں خوب مار دھاڑ اور ایکشن تھا۔ لگتا ہے کر گیتا نکھی عمران کو نئے نئے انکشافات سے آگاہ کرے گی۔ امید ہے ثروت بھی آجائے گی۔ گرداب میں ماہ بانو اور اسلم نے اپنے میزبانوں کی جان بچائی۔ مشابرم خان بے ہوش ہو گیا ہے۔ دوسرا رنگ ریگِ رواں سلیم فاروقی کی تحریر بہت پسند آئی۔ 1971ء کی جنگ کے پس منظر میں لکھی کہانی پڑھ کر زخم تازہ ہو گئے۔ پوری کہانی زبردست تھی مگر خرم کی بیوی کا اس سے نہ ملنا اچھا نہیں لگا۔ باقی جاسوسی بہت اچھا تھا۔ انکل جی ایک فرمائش جو پہلے بھی کی جا چکی ہے کہ تمام رائٹرز کے انٹرویوز شائع کیے جائیں۔''

منڈی بہاؤالدین سے عثمان اینڈ فوزان کا تبصرہ ''جاسوسی اس دفعہ بھی ہمیشہ کی طرح لیٹ ملا۔ خیر، سرورق والے بھائی اپنا سب کچھ گنوا کر دیوار سے لگے نظر آرہے تھے اور پیچھے موجود دلہن کی خستہ حالی دیکھ کر گماں ہوا گویا کوئی ان کے ہاتھ میں بجلی کا بل تھما گیا ہو۔ جبکہ صنفِ نازک اس سارے منظر سے بے نیاز اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ کسی اور سے ہی آنکھیں چار کیے نظر آرہی تھی۔ (کسی اور سے... آپ کا اشارہ راج کی طرف تو نہیں...؟) محفلِ یاراں میں پہنچے تو مدیرِ اعلیٰ کی تلخ مگر سچی باتیں پڑھ کر دل متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔ وطنِ عزیز کی زبوں حالی پہ کفِ افسوس ملنے کے بعد عامر رسول کو کرسیِ صدارت پر براجمان پایا۔ ہماری طرف سے مبارک قبول کیجیے۔ سید محی الدین اشفاق صاحب! آپ نے بڑھاپے میں ایم اے کرنے کی ٹھان لی۔ خیر تعلیم کے لیے عمر کی قید نہیں ہوتی۔ (اور کیا... آپ بھی غور کریں) تفسیر عباس کا تبصرہ جان دار تھا۔ محمد اسحاق انجم کا تبصرہ پڑھتے ہوئے کہانیوں کی فہرست کا گماں ہوا۔ بنوں سے ہمایوں سعید اور راج کا تبصرہ پسند آیا۔ صبا گل صاحبہ! اسلم اور ماہ بانو مل تو گئے اب آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ ٹینشن مت لیں جلد یا بہ دیر یہ دونوں ایک دوسرے سے بہت دور جانے والے ہیں۔ تصویر العین آنٹی! سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔ دلنشین بلوچ صاحب! یہ جل ککڑ کیا ہوتا ہے؟ ابتدائی صفحات پر نشور ہادی کی کہانی خود کردہ برفانی مخلوق کے موضوع پر تھی جس پر پہلے بھی کافی کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ شروع میں کہانی کافی دلچسپ رہی لیکن پھر بالکل انہونی سی سچویشن سامنے آئی۔ ایک 18، 19 سال کی لڑکی جو عام انسان کی اولاد تھی وہ اچانک اتنی طاقتور کیسے ہو گئی کہ ریچھ کو ہاتھوں پر اٹھائے اور اچھال دے۔ کہانی زیادہ متاثر نہ کر سکی۔ للکار ہر لحاظ سے ایک خوب صورت تحریر ہے۔ کہانی کسی بھی موقع پر بور نہیں ہونے دیتی۔ گرداب میں شہریار کو ماہ بانو کا سراغ تو ملا لیکن ملاقات بہت مشکل دکھائی دیتی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ ماہ بانو واقعی اسلم سے شادی کرے گی۔ (تو کیا وہ بے چاری اسی طرح خوار ہوتی پھرے سب کے سب اس کی شادی کے پیچھے پڑ گئے ہیں خود تو کر لی اور اب...) آصف ملک کی برائے فروخت اچھی تحریر تھی۔ سرور اکرام کی گمان بے گماں میں ہمیں یقین تھا کہ شاہد ہی منصور ہے۔ سلیم فاروقی کی ریگِ رواں نے 71ء کے سانحے کو تازہ کر دیا۔ باقی کترنیں اچھی تھیں۔''

اے بی فرام حلہ گنگ کی تیز رفتاری ''جاسوسی کافی لیٹ ملا... لیکن جب ملا تو دل ٹائٹل دیکھ کر خوش ہو گیا مگر آدھا... کیونکہ آدھا ٹائٹل تو کیوٹ سی گرل نے کور کیا ہوا تھا۔ ویسے لڑکی انکل نے پہلی بار ہی پینٹ کی ہے ورنہ تو آنٹی ٹائپ کی شکل دیکھ دیکھ کر خوب بور ہوتے ہیں اور آدھا ٹائٹل ایک مالنا کلر کے انسان پتا نہیں انسان بھی ہے کہ نہیں اور نیچے نیلے رنگ کا کارٹون پتا نہیں کیا تلاش کر رہا تھا۔ (بھول گئے... آپ کو) خیر پہنچے سیدھے چینی، نکتہ چینی، جہاں عامر رسول کرسیِ صدارت پر تشریف فرما تھے۔ تصویر العین! آپ کہانی پڑھتے وقت ساتھ ٹھنڈے پانی کا گلاس رکھنا مت بھولا کریں تاکہ بی پی ہائی نہ ہوا کرے ویسے آپ کی عمر کتنی ہے جو آپ کا بی پی ہائی ہو جاتا ہے؟ تفسیر عباس بابر کا تبصرہ اتنا لمبا لگ رہا تھا کہ پڑھا ہی نہیں... سب سے مزے کا تبصرہ ہمایوں سعید راج کا تھا۔ اب آتے ہی کہانیوں کی طرف تو سب سے پہلے نشور ہادی کی ٹھنڈی ٹھنڈی برفانی خود کردہ پڑھی۔ میرے خیال میں جاغنی، عالیہ کے ساتھ آجاتی تو اچھا تھا۔ پھر اپنی فیورٹ گرداب میں ڈبکی لگائی اور کنارے تک پہنچ کر ہی دم لیا۔ اس بار کی قسط کافی اچھی تھی۔ ماہ بانو اور شہریار شاید ایک بار ملاقات کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ للکار میں آخر کار سلطانہ ماری گئی لیکن تابش کا ردِعمل کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہا تھا۔ سرجن اسٹیل کی موت کا پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ اور کتے کا کردار بھی اچھا لگا جو عمران کو بچا گیا۔ پہلا رنگ بہت اچھا تھا جب کے سلیم فاروقی کی کہانی اگرچہ کافی فلمی تھی آخر میں مگر پھر بھی بہت انجوائے کیا۔ کنزیٰ یونس کا لسی والا لطیفہ پڑھ کر بہت دیر تک ہنسی آتی رہی۔ انکل اس بار بھی میری رائٹنگ اتنی ہی بری ہے یا بہتر ہوئی ہے؟'' (یاد نہیں، پچھلا خط نکال کے دیکھنا پڑے گا)

اوکاڑہ سٹی سے تصویر العین کی شکایت ''جاسوسی کے تمام اسٹاف اور تمام قارئین کو نیا سال بہت مبارک ہو۔ ٹائٹل پر موجود دوشیزہ کے چہرے پر چیلنج کرتی اکسا دینے والی مسکراہٹ تھی۔ کھلے بالوں میں اس کا چہرہ بھلا دکھائی دے رہا تھا۔ پتا نہیں جاسوسی میں کیا بات ہے کہ جب نکتہ چینی کی محفل کے لیے لکھنے بیٹھتی ہوں تو لگتا ہے کہ صفحات کم پڑ گئے ہیں۔ (خدارا ایسامت سوچا کریں... گن کے لکھا کریں... ہمیں مشکل ہو جاتی ہے) صدارت کی کرسی پر عامر رسول شریف فرما تھے بہت مبارک ہو۔ حسنین بلوچ! کیا بات ہے ہمایوں سعید راج کے بعد آپ کو بھی ماہا کی کمی محسوس ہونے لگی۔ اور یہ کیا جملہ لکھا سلطانہ کی مردانگی۔ آپ تو سلطانہ کو درمیانی مخلوق بنانے لگے۔ جناب ذرا سوچ سمجھ کر لکھا کریں۔ آمنہ پٹھانی! آپ کاشف عباس کو اپنا ننھیالی رشتے دار ہی سمجھ لیں۔ لگتا ہے صنفِ نازک کے بارے میں آپ کے تبصرے نے ادارے کو متاثر کیا جب ہی تو انہوں نے نکتہ چینی کی محفل میں اس دفعہ صنفِ نازک کو زیادہ جگہ دے ڈالی۔ اپنا تبصرہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور ہمیشہ کی طرح جاسوسی کے ساتھ پیار میں اضافہ ہو گیا لیکن یہ کیا آپ نے 19 دسمبر کو 19 نومبر لکھ دیا میری تاریخ پیدائش ہی بدل ڈالی یہ ظلم ہے اور میں اس کے خلاف احتجاج بلند کرتی ہوں۔ اور آپ کی دعاؤں پر شکریہ ادا کرتی ہوں۔ (سوری بھئی، چلیں آپ کو دوبارہ وش کر دیتے ہیں، بہت بہت مبارک ہو) سید محی الدین اشفاق! ایم اے میں ایڈمیشن مبارک ہو لیکن سبجیکٹ تو بتا دیں نا۔ تفسیر عباس! آپ کا نام ویسے اچھا رکھا گیا ہے لفظوں کے کھلاڑی! میں تو اس سے پوری طرح متفق ہوں۔ آپ کو محفل میں پا کر بہت خوشی ہوئی۔ محمد اسحاق آپ نے تو لفظوں کا جال ہی پھینک دیا۔ اتنا مختصر اور زبردست تبصرہ مزہ آگیا۔ واہ جعفر صادق، آتے ہی ذاکر انکل کی ذاتیات پر حملہ دس از ناٹ فیئر۔ اور یہ مزے دار مبارک باد کون سی ہوتی ہے کیا قلاقند کے ساتھ مبارک باد دے رہے ہیں۔ (ہاں بھئی بتائیں) سید شکیل کاظمی کے نرم دل ہونے پر تمھیں کیا تکلیف ہے؟ ابنِ قرن مجھے آپ کا نام بہت پسند آیا۔ اور تبصرہ بھی۔ محمد نعمان آپ پلیز کم خوشبو لگایا کریں مجھے خوشبو سے الرجی ہے۔ تحریم تلو کر اتنا غصہ... اب تو ٹھنڈی ہو گئی ایسا کرو تھوڑا سا ٹھنڈا پانی پی کر ٹھنڈی ہو جاؤ۔ اور ہاں تم نے پتّر لکھا ہے اور میں اسے پنجابی زبان کا پُتر پڑھ رہی تھی ہاہاہا۔ خود کردہ نشور ہادی کی کافرستان کے حوالے سے

(یہ واحد) کہانی تھی۔ واردات میں ڈاکٹر عبدالرب بھٹی نے اتنی جلدی کیس نمٹا دیا۔ سلیم انور کی دوسری عورت بمشکل ایک صفحے کی کہانی تھی جس میں ماریا نے رجو ( ) کی ماں کو ہلاک کر دیا۔ سلیم آپ اس سے مختصر کہانی نہیں لکھ سکتے۔ (مختصر کہانی لکھنا کمال ہوتا ہے) منظر امام کی نسب نما کہانی میں فیروز کے ساتھ بہت ہی اچھا ہوا، دولت کے بل بوتے پر اکڑنے والے کے ساتھ یہی ہونا چاہیے۔ کاشف زبیر کی نشانہ زبردست تھی۔ آخر تک قاتل کا پتا نہیں چلا۔ پہلا رنگ گمان بے گماں میں سرور اکرام نے ہیروئن روشی کی دوڑیں لگوا دیں۔ اور ہیرو ہیرو ہی نکلا ولن نہیں جیسا کہ امید تھی۔ سلیم فاروقی کی ریگِ رواں اس میں بھی ہیرو صاحب کی دو بیویاں تھیں مگر دونوں سوکنیں بہنوں کی طرح رہنے کے بجائے ثمینہ کو مریم سے تکلیف تھی۔ یہ کیا دو بیویوں کا قصہ شروع کر دیا۔ پلیز اب کوئی ایسی کہانی شائع مت کیجیے گا۔ (آپ کو ہر بات پر اعتراض کیوں؟ یہ تو اچھی بات ہے... بلکہ چار ہونی چاہئیں) اس کے علاوہ مری سے ثمینہ حبیب کا انداز بیان اور کاوش بھی اچھی لگی۔ آخر میں آپ سے پھر گزارش ہے کہ پلیز میرا خط کاٹ مت دیجیے گا اور ضرور شائع کیجیے گا۔ آپ سسپنس میں تیسری قسط وار کہ چوتھی قسط وار کہانی کیوں شائع کر رہے ہیں اس میں تو پہلے ہی اتنی قسط وار کہانیاں آرہی ہیں اب آپ مسافر بھی شروع کریں گے۔ ایسا کریں کہ سسپنس کا نام بدل کر قسط وار کہانیوں کا ڈائجسٹ رکھ دیں۔ (پھر اعتراض!) آئندہ ماہ کے لیے اجازت زندگی رہی تو پھر حاضر ہوں گی اور ہاں پلیز میری سالگرہ والا معاملہ درست کر دیں۔'' (ایک بات آپ سب قارئین کے لیے... ہر قاری لکھتا ہے کہ اس کا خط بنا کسی کانٹ چھانٹ کے جوں کا توں شائع کر دیں... اب ایک قاری 10 صفحات کا خط لکھتا ہے تو صرف ایک ہی خط شائع کر دیں... ایمانداری سے جواب دیں۔ تصویر صاحبہ آپ تو شاید قلم اٹھا کر رکھنا بھول جاتی ہیں)

انفال مرزا اینڈ صبا مرزا چکوال سے لکھتی ہیں ''7 دسمبر کو ڈائجسٹ ہماری دہلیز پر نمودار ہوا۔ سب سے پہلے نظر ٹائٹل گرل کی چھوٹی اور پھیلی ہوئی ناک پر پڑی۔ پہلی نظر میں ہی فیل ہو گئی۔ نیچے والا آدمی کچھ پریشانیوں میں گھرا ہوا نظر آیا۔ اس بار پہلا قدم ہم نے کہانیوں کے نگر میں رکھا۔ خود کردہ بہت ہی دلچسپ اسٹوری تھی۔ عالیہ پر ایک دفعہ بہت ہی غصہ آیا۔ جاغنی کو آزاد کروا کے لیکن اینڈ پڑھ کے کچھ کچھ خوشگوار محسوس ہوا۔ زندہ باد سلیم فاروقی صاحب اس دفعہ تو آپ نے غضب کی کہانی لکھی۔ ثمینہ نے وہی کمزور عورتوں والا روپ دکھایا۔ مریم کے لیے اس کے دل میں کچھ تو جگہ ہوتی۔ سرور اکرام کی گمان بے گماں اسٹوری سے زیادہ اسٹوری کا نام اچھا تھا۔ اسما قادری جی آپ کی کہانی روز بروز دبلی پتلی ہوتی جا رہی ہے۔ ادھر شروع ہوئی ادھر ختم ہوئی۔ چلیے ہیں جی اب محفل پر کچھ بات چیت کرتے ہیں۔ عامر رسول مبارکاں۔ تفسیر عباس بابر، اشفاق صاحب سے کیا ہوا سوال کھٹا میٹھا تھا۔ آپ کا حملہ ہمیں بڑا زبردست لگا۔ عبدالسلام! آپ بھی عرصے سے غیر حاضر رہے اس کا یہ مطلب ہوا کہ آپ بھی آمنہ پٹھانی کے ہم عمر ہیں۔ تراش خراش میں اس دفعہ خوب چہکار رہی۔ خصوصاً ثمینہ حبیب کی سوغاتیں... چلتے چلتے نیا سال مبارک۔ ہمارے ملک کے لیے اچھا ثابت ہو۔ اچھا جی اللہ حافظ۔'' (سالگرہ کا گڈا آپ کی مصوری کی صورت میں ملا۔ ہمیں بہت پسند آیا۔ آپ کا بنایا ہوا گڈا ہمیں کہیں موجود ہے اسے تلاش کریں)

اُم ثمامہ جھڈو سے لکھتی ہیں ''اس دفعہ جاسوسی تیس تاریخ کو ہی مل گیا تھا۔ جلدی سے سرورق پر اک اچٹتی سی نظر ڈالی کچھ خاص نہیں تھا ہمیشہ کی طرح عجیب و غریب مرد حضرات اور ایک عدد حسینہ جس کے دوست مست تینوں ایک دوسرے سے کچھ خفا خفا تھے۔ اشتہارات کی دیواریں پھلانگتے ہوئے میٹھی میٹھی چینی، نکتہ چینی پر پہنچے کیونکہ پوری امید تھی خط شائع ہوگا کیونکہ ہم خط لکھیں اور وہ شائع نہ ہو ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا مگر یہ کیا! ام ثمامہ جھڈو کے خط کے ساتھ ایسا سلوک... (قینچی چلائے بغیر کپڑے بھی نہیں سلتے... یہ تو خط ہے...) سب سے پہلے عامر رسول کو کرسیِ صدارت کی مبارک باد۔ تبصرہ کافی جان دار تھا۔ حسنین بھائی سے پوچھنا تھا کہ کیا جیل میں اتنی آسانی سے رسالہ مل جاتا ہے اور پڑھنے اور لکھنے کا وقت بھی کیونکہ ایک عام تاثر تو یہی ہے کہ ہماری جیلوں کا نظام نہایت خراب اور سفاکانہ ہے۔ تصویر العین کو ہماری طرف سے ہیپی برتھ ڈے ٹو یو اور ڈھیروں دعائیں۔ تفسیر عباس صاحب کا تبصرہ بھی کرسیِ صدارت کی ٹکر کا تھا۔ ایم اے انجم! آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھ جیسی کم فہم کی باتوں سے کچھ سیکھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ دلنشین کا خط ان کے نام کی طرح دلنشین تھا دلنشین! آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ آپ ایک عدد چار سالہ کیوٹ اور جینئس بھانجے کی خالہ جان ہیں۔ ماہا ایمان، عائشہ اور مرزا سسٹرز کی کمی شدت سے محسوس ہوئی بھئی اگلی بار لازمی خط لکھو تاکہ مقابلہ ٹکر کا ہو۔ محمد نعمان صاحب جتنی محنت آپ نے دل لگانے اور خوشبو لگانے میں صرف کی اگر خط لکھنے میں کرتے تو زیادہ اچھا ہوتا اور ہمایوں پھر ہم امید کریں کہ ہماری ہونے والی بھابی گونگی ہوں گی ایک بار ہی جی بھر کر ٹائٹل کو دیکھ لیتے پھر اطمینان سے پڑھ لیتے تو بہتر ہوتا۔ ہم نے بھی خط چین سے ہی لکھا تھا دل کے تاروں والی بات تو اک استعارہ تھی۔ حیرت ہے آپ جیسے عقل بند میرا مطلب ہے... عقل مند بندے کی سمجھ میں نہیں آئی۔ کہانیوں میں اس دفعہ خلافِ معمول سب سے پہلے سلیم فاروقی کا دوسرا رنگ ریگِ رواں بہت زبردست تھا۔ تینوں فوجیوں کے درمیان کی باتیں ان کی جدائی پھر ان کے ملنے کے مناظر سب کچھ پر تاثر مگر اینڈ میں تھوڑی سی گڑبڑ اور کمی محسوس ہوئی بہت سارے واقعات اور اتفاقات آپس میں گڈمڈ ہو گئے مگر شاید اس لیے کہتے ہیں کہ دنیا گول ہے۔ اب آتے ہیں ہیرو بھائی کی طرف۔ سلطانہ آخر اپنے منطقی انجام پر پہنچی۔ قاسمیہ کے علاقے کی لڑائی اور سین بھی کافی زوردار لگے۔ گوری چمڑی والوں کی شکست پر دل میں ہمیشہ کی طرح اک سکون اور خوشی محسوس ہوئی۔ منظر امام صاحب بہت اچھے رائٹر ہیں مگر ان کی کہانی نسب نما اونچی دکان پھیکا پکوان کے مترادف تھی۔''

ایم اے ہاشمی ڈسٹرکٹ ضلع بونیر سے حاضر ہیں ''جاسوسی 3 تاریخ کو ملا، اس دفعہ ٹائٹل منفرد سا تھا۔ اب معلوم نہیں، یہ انفرادیت لڑکی کی آنکھوں کی وجہ سے تھی یا پھر قریب چھپے مرد کی نسبتاً بہتر صورت کا۔ جبکہ نیچے کسی نے بے چارے ہمایوں کو سیاہی کے ڈرم میں غوطہ دے کر نکالا تھا۔ اس دفعہ جاسوسی کی محفل میں کافی اچھا چناؤ تھا۔ عامر رسول کی تیکھی باتیں واقعی بہت بھلی لگیں۔ ڈھیروں مبارک باد۔ آمنہ بی بی! مجھے لگتا ہے آپ پر کسی بھوت وغیرہ کا سایہ ہے یا پھر فتح پور والوں کے قلم نے لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ تصویر العین! خدا کی پناہ، اتنی بھی نفرت مت کیجیے گا۔ تفسیر صاحب! یقین کیجیے آپ کا خط پڑھ کر محی الدین نواب صاحب کا گمان ہوا۔ جعفر حسین صاحب! بلاشبہ تنقید تبصرے کی ایک شاخ ہے۔ آپ نے گرداب پر جو تنقید کی ہے، وہ بالکل بجا ہے لیکن انسان کی شخصیت کا بھی کچھ خیال رکھنا چاہیے۔ ایک رائٹر پر اتنی گہری تنقید بھی نہیں کرنی چاہیے کہ دلبرداشتہ ہو کر وہ لکھنا ہی چھوڑ دیں۔ ہمایوں صاحب! کیا معیار پایا ہے آپ نے اس عمر میں کہ پلٹ پلٹ کر ٹائٹل دیکھتے رہتے ہو۔ دعا ہے کہ اللہ ذوقِ نظر اور زیادہ۔ م الف! آئندہ خط میں اپنی تانیث کا اظہار بھی کر دیجیے۔ کم از کم آپ کی ذات کے بارے میں یہ لوگ کوئی اور اندازہ قائم نہ کریں۔ صبا گل صاحبہ! ایک بار پھر اپنے کڑوے کسیلے تبصرے کے ساتھ ٹامک ٹوئیاں مار

رہی تھیں۔ شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ میٹھا بولنے کے لیے میٹھا کھانا بھی ضروری ہے اور مجھے لگتا ہے کہ کریلے فیورٹ ڈش ہے۔ کوئٹہ سے ابنِ قرن کا خط زبردست لگا۔ سارہ راجپوت صاحبہ! آپ کیوں ٹھنڈی ٹھار کھڑی ہیں۔ پلیز کچھ بولیے گا بھی۔ للکار کے بارے میں لکھنے کے لیے الفاظ نہیں۔ سلطانہ کی موت نے بے حد رنجیدہ کر دیا۔ تابش کی دیوانگی اور سلطانہ کے ایثار میں پنہاں محبت کی حقیقی معنویت نے دل پر بہت اثر کیا۔ نشور ہادی کی خود کردہ پڑھی۔ اس کہانی میں مستقبل شناس کی ہلکی سی جھلک تھی۔ کہانی اچھی تھی۔ سب سے بڑھ کر برفانی عورت کا قہقہہ لاجواب تھا، ایم اے انجم کی طرح۔ پہلا رنگ گمان بے گماں بس ایویں ہی تھا۔ صبح بخیر اچھی کاوش تھی۔ دوسری عورت لکھ کر سلیم انور نے مرد حضرات کو باخبر کر دیا ہے کہ اپنا گھر بچانے کے لیے دوسری عورت کو کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے سب کو محتاط ہو جانا چاہیے۔" (آپ سمیت)

چشمہ بیراج سے ساگر تلوکر کی عنایت "جاسوسی سے تعلق توڑ کر پھر سے استوار کر رہا ہوں۔ (شکریہ) ٹائٹل پر ایک نظر ڈالی۔ چینی، نکتہ چینی میں حاضری دی۔ عامر رسول کو دل سے مبارک باد، تصویر العین، تفسیر عباس، دلنشین اور نعمان پیارے کے خطوط زبردست رہے۔ باقی سب کے بھی اچھے تھے۔ تحریم اپنا رونا رو رہی تھیں۔ بلال کو بلیک لسٹ میں اول آنے پر مبارک باد۔ اب پھر کہانیوں کی طرف آتے ہیں۔ للکار میں سلطانہ کے مرنے پر بہت خوشی ہوئی۔ ابتدائی صفحات پر خود کردہ بہت جان دار تحریر تھی۔ نشور ہادی کم کم آتے ہیں مگر جب آتے ہیں تو چھا جاتے ہیں۔ پہلا سرورق کا رنگ نہ پڑھ سکا۔ کیونکہ 227 سے 257 تک صفحات آدھے آدھے کٹے ہوئے تھے۔ (ہم معذرت خواہ ہیں آپ کی اس تکلیف پر۔ آپ ہاکر سے پرچہ تبدیل کروالیں اور اگر کوئی پریشانی ہو تو فون پر ہمیں مطلع کریں) دوسرا رنگ ریگِ رواں سلیم فاروقی نے ہمیشہ کی طرح کہانی کا آغاز اچھا کیا مگر اینڈ تک گرفت بہت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ اس پورے سال... پرل گروپ غائب رہا، پرل گروپ کو بہت مس کیا۔"

بنوں سے ہمایوں سعید راج کی وضاحت "جاسوسی اس دفعہ بے تحاشا لیٹ ملا۔ (کیوں بھئی؟) لہٰذا سرورق کے دیدار پر ایک دو دن ضائع کرنے کی حماقت نہیں کی۔ (اچھا کیا) بھائی حسنین! ہمیں تو صنفِ نازک کی نسوانیت لے ڈوبی اور آپ سلطانہ کی مردانگی پر مر مٹے۔ آمنہ جی! آپ نے تسلیم تو کیا کہ ہم مبارک باد کے مستحق ہیں مگر ازلی کنجوسی نے پھر بھی مبارک باد دینے سے باز رکھا۔ تصویر العین صاحب! میں تو غیر جانبداری سے لکھتا ہوں۔ مگر تبصرے کا مردانہ پورشن لاڈلی کی زد میں آ جاتا ہے۔ تفسیر صاحب! آپ تو وصالِ صنم کے ساتھ ساتھ دو دو نعمتوں سے بھی فیض یاب ہو رہے ہیں پھر بھی مجال ہے کہ سنبھلے قدم۔ انجم برادر! کوئی بیچ منجدھار میں چھوڑ کے جائے تو خیریت کہاں ہوگی دل کی ویران بستیوں میں۔ نعمان پیارے! ہاتھ اس لیے کم بڑھایا ہے کہ مجھے تمہارے جیسے پیارے لوگ کم ہی ملے ہیں۔ سب سے پہلے گرداب کو تلاشا۔ تمام معزز تنقید نگاروں سے درخواست ہے کہ اس سے پہلے کوئی سلسلے وار کہانی پڑھی ہوتی تو سمجھ میں آتا کہ طویل کہانی ایسی ہی ہوتی ہے۔ مرکزی کرداروں کے علاوہ تمام ثانوی کردار بدلتے رہتے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ گرداب بڑی خوب صورت اور بے پناہ رنگ لیے ایک ناقابلِ فراموش کہانی ہے۔ (آپ نے اچھا کیا سب کو سمجھا دیا) ابتدائی صفحات پر بھی خود کردہ اپنے ایڈونچر بیچر کی وجہ سے بے تحاشا پسند آئی۔ خان... داراب کا کردار بے حد اچھا لگا۔ ڈاکٹر اکانڈر کے نفسیاتی مسئلے نے ہمیں بھی ڈسٹرب کیا۔ (کیوں؟) گردیزی کی تلاش ہالا خر رنگ لے آئی۔ پہلا رنگ تو کچھ خاص رنگ نہ جما سکا البتہ سلیم فاروقی کی آدی پر مبنی شان دار کہانی نے ساری کوفت دور کر دی۔ منظر امام کی سبق آموز کہانی نسب نما بھی شان دار رہی۔ بے شک مقام وہی ہوتا ہے جو اپنے بل بوتے پر حاصل کیا جائے۔ دوسری عورت بے حد چونکا دینے والی تحریر ثابت ہوئی۔ ہم تو کسی سوکن کے تصور میں بیٹھے تھے یہ تو اماں نکلیں۔ واردات اور نشانہ میں بے حد ہوشیاری سے دو فنکاروں کو رخصت کیا گیا۔ واردات میں سلیم کا کم عمری کے باوجود اتنا شان دار پلان اور اس پر عمل درآمد تعجب خیز لگا۔ مریم کے خان کی صبح بخیر غیر متاثر کن رہی۔"

بالاکوٹ سے محسن علی موم کا استفسار "گھر اور بک اسٹال کے مدار میں کئی چکر لگانے کے بعد آخر ہماری جان جاسوسی نے دیدار دیا۔ (کچھ تنگ وددو کے بعد ہونے والا دیدار شان دار اور دیرپا ہوتا ہے) ٹائٹل گرل چاند سا چہرہ، ستواں ناک، گلاب کی ادھ کھلی پنکھڑیوں جیسے خوب صورت ہونٹ، جھیل جیسی آنکھیں اور زلف گرہ گیر... ان میں سے کچھ بھی تو نہیں تھا اس میں اس لیے معذرت۔ نیچے موجود آدمی شاید وجد میں تھا اور پتا نہیں اس کی یہ حالت کس نے کی۔ (بھول گئے؟ یہ اچھی بات نہیں) ساتھ موجود بھائی صاحب ہمایوں کی طرح لگے۔ اشتہارات پر سے ڈرون کی طرح گزرے اور سید ھا لینڈ کیا چیتی ائربیس پر۔ جہاں کرسیِ صدارت پر عامر رسول براجمان تھے۔ بھائی کیا بات ہے؟ آ گئے تے چھا گئے ٹھا کر کے۔ مبارک ہو جی.... صبا گل! شیطان کو یاد کرو تو وہ حاضر ہو جاتا ہے جس طرح آپ نے آمنہ پٹھانی کو یاد کیا اور وہ حاضر۔ دلنشین صاحبہ کی آمد سے محفل کو چار بلکہ آٹھ چاند لگ گئے لیکن آپ گم کہاں ہو جاتی ہیں جی؟ کہانیوں میں ہمیشہ کی طرح للکار کو للکارا۔ جہاں عمران اور تابی فل ایکشن میں نظر آئے۔ سلطانہ کی موت نے دکھی کر دیا۔ آخر میں گیتا کھی کی رنگین اور سنگین آمد نے ہمیں چونکا دیا۔ گرداب میں ایک بار پھر ماہ بانو کو فرار ہونا پڑا۔ اسلم کی بے پناہ محبت ماہ بانو کو شہریار سے دور کر رہی ہے اس ماہ کہانی کچھ بہتر تھی۔ رنگوں میں پہلا رنگ خوب صورت اور جان دار تحریر تھا۔ روشی یقین اور بے یقینی کے درمیان رہی اور ساری کہانی میں شاہد کا کردار بھی خوب رہا۔ دوسرا رنگ، ریگِ رواں میرے پسندیدہ موضوع یعنی پاک فوج پر ایک اچھی تحریر تھی۔ لہو کو گرما دینے والی اس تحریر کا اینڈ ہمیں افسردہ کر گیا مریم جس نے خرم کی جان بھی بچائی اسے چھوڑ کے چلی گئی۔ ثمینہ ہی کم ظرف نکلی جو مریم کی قدر نہ کر سکی۔ ابتدائی صفحات پر موجود نشور ہادی کی تحریر خود کردہ ایک دلچسپ تحریر تھی۔ ارسلان اور عالیہ کی نوک جھوک سے کہانی مزید خوب صورت ہو گئی۔ خان داراب کا کردار انوکھا اور دلچسپ تھا۔ واردات میں اصغر سے زیادہ خرم ذہین نکلا جس نے اتنی ذہانت سے کی گئی واردات کو بے نقاب کر دیا۔ آخر میں ایک سوال کہ پاکیزہ میں جو عمیرہ احمد لکھتی ہیں، کیا یہ وہی ہیں جن کے ناول پیرِ کامل اور لاحاصل ہیں؟" (جی ہاں، وہی ہیں۔ باقاعدگی سے مطالعہ کرتے رہیں اور ہمیں اپنی رائے سے بھی آگاہ کریں کہ عکس کو ان تینوں میں کہاں پاتے ہیں۔ عکس کا مزاج آپ سسپنس کی کہانیوں سے بہت قریب پائیں گے)

خانیوال سے ماسٹر ضیاالرحمن خان نیازی کی افسردگی "آخاہ! ماہ دسمبر کا شمارہ ہاتھ آیا تو انتظار کرتی آنکھوں کو قرار ملا۔ سرورق پہ طرح دار حسینہ کی قاتل نگاہوں نے سحر زدہ کر دیا۔ محفلِ احباب میں پہنچا تو عامر رسول صاحب کو کرسیِ صدارت پر جا گزیں دیکھا۔ ان کا تبصرہ کافی جان دار تھا۔ علاوہ ازیں آمنہ پٹھانی، تصویر العین، محی الدین اشفاق، تفسیر عباس، محمد اسحاق انجم، جعفر حسین اور محمد نعمان پیارے کے خطوط متاثر کن تھے۔ دیگر تمام شرکا کی کاوشیں بھی لائقِ تحسین تھیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار کی طرف متوجہ ہوئے۔ انگریزوں کی عیاری اور اپنوں کی سادگی پر دل خون کے آنسو رونے لگا۔ سلطانہ جیسی

بہادر، باوفا اور باکردار خاتون کی موت سے دلی دکھ ہوا۔ گرداب میں ٹھہراؤ محسوس ہوا لیکن ٹالی والا کا جعلی پیر سادہ لوح لوگوں کو اتنا گرویدہ کر چکا ہے کہ اس صورت میں وہ حامد راؤ کے مکان پر دھاوا بول دیا۔ خیر، آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ دوسرا رنگ جو 1971ء کے پس منظر میں تھا، پڑھ کر خون کھول اٹھا۔ دشمنوں کی سازش نے وطنِ عزیز کو دولخت کر دیا۔ مجھے اس تحریر نے اس لیے بھی حد سے زیادہ متاثر کیا کیونکہ ہمارا خاندان جنگ 1971ء کی جنگ سے نبرد آزما رہا ہے۔ میرے دو سگے چچا جو پاکستان آرمی ای ایم ای کور اور پنجاب رجمنٹ میں تھے، دشمن کی قید میں چلے گئے۔ ایک چچا جو پاکستان نیوی کی آبدوز غازی میں تھے، آبدوز دورانِ جنگ لاپتا ہو گئی اور آج تک ان کی شہادت کی تصدیق نہیں ہو سکی۔ میں مزید لکھنا چاہتا تھا مگر افسوس کہ اب میرے جذبات قلم کا ساتھ نہیں دے رہے۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کی حفاظت کرے۔" (آپ تو بہادروں کے خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں... اللہ تعالیٰ آپ کو سکون و اطمینان بخشے... اور آپ کے چچا جہاں ہوں، اچھے حالوں میں ہوں... آمین)

گجرات سے طارق محمود راہی کی مبارک باد "اس دفعہ شمارہ 3 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل پر نگاہ پڑی تو ایک صاحب حیران پریشان نظروں سے اپنے کسی دوست کو دیکھ رہے تھے۔ جو شدید پریشانی کی وجہ سے دونوں کہنیاں دیوار پر رکھے سر جھکائے پتا نہیں کیا سوچ رہا تھا۔ (... آپ کو معلوم ہی نہیں کہ آپ کیا سوچ رہے تھے؟) الجھے ہوئے بالوں اور ابتر لباس سے لگتا تھا کہ کوئی ذہنی ٹینشن ہے۔ محفلِ یاراں میں گئے تو عامر رسول کرسیِ صدارت پر نظر آئے۔ مبارک ہو عامر صاحب۔ تبصرہ واقعی جان دار اور کرسیِ صدارت کا حقدار تھا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے خود کردہ پڑھی۔ میں نے نشور ہادی کو پہلی بار پڑھا، ویلڈن۔ کہانی زبردست تھی۔ خان داراب کا کردار بہت پسند آیا۔ ارسلان اور عالیہ کی نوک جھوک نے کہانی کا مزہ دوبالا کر دیا۔ اب بات ہو جائے جاسوسی کی شان کہانیوں کی سردار للکار کی، واہ کیا بات ہے۔ اس دفعہ کی قسط تو جارج گورا کی موت والی قسط سے بھی شان دار تھی۔ سلطانہ ماری گئی، میرا دل تو یہی تھا کہ سلطانہ کو طاہر صاحب کہیں غائب کریں اور تابی کو ثروت سے ملوا دیا جائے اور ایسا ہی ہوا کہ سلطانہ کو ہٹا دیا گیا مگر پھر بھی نہ جانے کیوں سلطانہ کی موت اُداس کر گئی۔ گرداب میں اسلم حامد راؤ اور اس کے اہلِ خانہ کو جواں مردی سے پیر کے بپھرے ہوئے مریدوں کے نرغے سے نکال لایا۔ اساجی ماسٹر آفتاب اور کشور کافی دیر سے غائب ہیں، پلیز ان کو کہانی میں اِن کریں۔ چھوٹی کہانیوں میں سب سے بہتر تنویر ریاض کی انصاف لگی۔ اسٹیفنی نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ٹومی جیسے شخص کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا۔ سلیم انور کی دوسری عورت بس ایویں ہی لگی۔ قدر شناس، قاتل مسیحا اور نسب نما بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ سرورق کا پہلا رنگ گمان بے گماں اسٹوری سے زیادہ اسٹوری سے پہلے لکھا ہوا قطعہ پسند آیا۔ دوسرا رنگ ہمارے فوجی بھائیوں کے ساتھ ہونے والے المناک حادثے کی یاد تازہ کر گیا مگر آخر میں خرم کی دوسری بیوی کا منافقانہ رویہ دکھی کر گیا۔ تصویر العین صاحبہ آپ کی بات ٹھیک ہے، مجھے آپ سے زیادہ پتا ہے لڑکیوں کے فیشن کا۔ جہانگیر اسلم سے مل کے آیا، بہت خوشی ہوئی ان کو دیکھ کے۔ جہانگیر بھائی آپ کو ایک بار پھر رہائی مبارک ہو میری طرف سے۔"

دیتڑہ سے سحرش افضل کا جھونکا "جاسوسی کی محفل میں پہلی مرتبہ قدم رکھ رہی ہوں۔ امید ہے کہ محفل کے کسی کونے میں جگہ دے کر حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ (خوش آمدید) اس ماہ کا شمارہ ہمیشہ کی طرح بہت جلد مل گیا۔ سرورق پر نظر پڑی، بہت اچھا لگا۔ سرورق سے لطف اندوز ہونے کے بعد فہرست پر سرسری سی نظر ڈالی۔ (بھرپور نظر ڈالنے کی بھی اجازت ہے) سب سے پہلے گرداب پڑھی پھر للکار۔ دونوں کہانیاں طول پکڑتی جا رہی ہیں۔ للکار نے تو بور کر کے رکھ دیا ہے۔ انکل طاہر سے گزارش ہے کہ اب اس کا اینڈ ہی کر دیں کب تک تابش اور عمران کو وطن سے دور رکھیں گے۔ (واہ کیا فرمائش ہے) اب بے چاروں کو اپنے وطن کا دیدار کرا ہی دیں۔ باقی تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ آخر میں ڈائجسٹ کی پوری ٹیم کو سالِ نو مبارک۔ (آئندہ ہم آپ کے تفصیلی تبصرے کا انتظار کریں گے)

راولپنڈی سے سارہ راجپوت کی مصروفیت "جاسوسی اس بار خاصی تاخیر سے 7 تاریخ کو ملا۔ 14 نومبر کو اماں کا آپریشن ہوا۔ (اللہ آپ کی والدہ کو جلد صحت یاب کرے، آمین) 4 دن ان کے ساتھ اسپتال میں اور پھر گھر آ کے بھی جو لوگوں کا تانتا بندھا تو سر اٹھانے کی فرصت نہ تھی۔ سرورق کچھ دیکھا دیکھا لگ رہا تھا۔ کرسیِ صدارت پر اس دفعہ ہمارے ہی شہر کے ایک نوجوان بڑی شان سے براجمان ہیں۔ بہت بہت مبارک ہو آپ کو۔ باقی سب کے تبصرے بھی اچھے لگے۔ آغا فرید خان، قدرت اللہ نیازی، ماہا ایمان اور دیگر کئی پرانے ساتھیوں کی کمی بھی محسوس ہوئی۔ کہانیوں میں ہمیشہ کی طرح اپنی فیورٹ کہانی للکار پڑھی جو اس بار فل ایکشن میں تھی۔ طاہر صاحب کی منظر نگاری اس قدر بھرپور ہوتی ہے کہ سب مناظر کسی فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے چلنے لگتے ہیں۔ سرورق رنگوں میں دوسرا رنگ سلیم فاروقی کا ریگِ رواں کسی قدر بہتر تھا لیکن پہلے رنگ نے تو بہت بے مزہ کیا۔ مختصر کہانیوں میں کاشف زبیر کا نشانہ دیکھا جو کمال کا تھا۔ باقی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔ آخر میں سب قارئین، رائٹرز اور جاسوسی کی پوری ٹیم کو میری طرف سے نیا سال مبارک ہو۔"

فتح پور لیہ سے آمنہ پٹھانی کی شمولیت "دسمبر کا شمارہ 3 تاریخ کو ملا۔ ایک خوب صورت اور دو الول جلول آسیب زدہ چہروں سے سجا ٹائٹل کچھ متاثر کن نہیں تھا۔ چینی، نکتہ چینی میں آپ کا وطن کی محبت سے لبریز پُردرد اداریہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر گیا۔ عامر رسول کا خوب صورت، تیکھا تبصرہ شان دار تھا۔ سو مبارک باد۔ صبا گل ڈیئر! آپ کے دل کی پکار بھلا ہماری سماعتوں تک کیسے نہ پہنچ پاتی، لو جی ہم حاضر ہیں۔ تصویر العین! سالگرہ مبارک۔ محی الدین اشفاق! انتہا پسندی کسی بھی فرقے اور مذہب میں ہو، قابلِ مذمت ہے۔ اور اسلامی تعلیمات کے تو سراسر ہی منافی، پھر حیرت کیسی جناب۔ تفسیر عباس! آپ کی لفاظی کا جادو ہم پر نہیں چلے گا بھئی۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ شروعات ہمیشہ کی طرح للکار سے کی۔ سلطانہ کا کردار تابی کے سوٹ کرتا جا رہا تھا لیکن اس کی موت دکھی کر گئی۔ اب دیکھیں ثروت کی انٹری کب ہوتی ہے۔ ابتدائی صفحات پر نشور ہادی کی خود کردہ شمالی برف زار پہاڑوں پر خوب صورت کہانی ثابت ہوئی۔ طویل عرصے بعد برفانی انسان پر لکھی لاجواب کہانی پڑھنے کو ملی۔ پہلا رنگ گمان بے گماں گو مصنف نئے نئے سے لگ رہے ہیں، پھر بھی کہانی موضوع، تنوع، پلاٹ اور کردار نگاری کے باعث بہت اچھی رہی۔ ماضی کی کچھ تلخ یادوں سے وابستہ سلیم فاروقی کی ریگِ رواں نے بہت کچھ یاد دلانے کے ساتھ ساتھ بہت سارلا بھی دیا۔ ویلڈن سلیم فاروقی۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

محمد قدرت اللہ نیازی، خانیوال۔ تحریم تلوکر، خوشاب۔ راؤ ابرار حسین، نامعلوم مقام۔ (آپ کی کہانی ناقابلِ اشاعت ہے) انجم فاروق ساحلی، لاہور۔ صبا گل، مالاکنڈ۔ فضل عظیم حنفی، مانسہرہ۔ مصباح، لیہ۔ عمیر شہزاد، تحصیل ٹل۔ ضلع ہنگو۔ سید شکیل کاظمی، اسلام آباد۔

حاصل لاحاصل

سلیم فاروقی

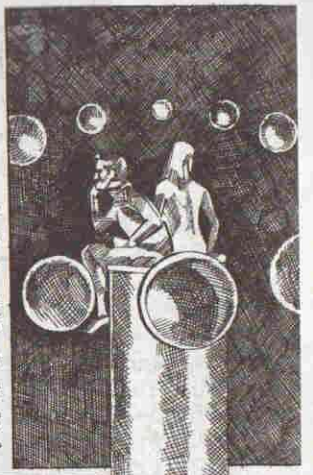

رشتے ناتوں کی دنیا بھی بہت عجیب ہوتی ہے۔ کہیں محبت کے نام پر تو کہیں خون کے رشتوں کا حوالہ انسان کو جیتے جی مار ڈالتا ہے۔ کبھی یہ حوالہ سُست رو زہر ثابت ہوتا ہے تو کہیں سانپ بن کر ڈس لیتا ہے... زَر پرست دنیا داروں میں جینے کی جُستجو کبھی دوسروں کو موت بخش کر سب کچھ حاصل کر لینے پر راغب کرتی ہے تو کبھی کبھار کسی کو بیٹھے بٹھائے سب کچھ مل جاتا ہے... کوئی کھو کر پاتا ہے تو کوئی پا کر کھو دیتا ہے.... کبھی تہی داماں پر عرش سے پُن برس جاتا ہے تو کبھی سب کچھ پالینے والا بھی تہی داماں رہتا ہے۔ کھونے، پانے اور پا کر کھو دینے کے کھیل میں زندگی کا حاصل بھی کبھی کبھی لاحاصل ہی ٹھہرتا ہے...

انسان اور اس کے وجود کی رنگ بدلتی صورتوں کا ادراک نہ رکھنے والوں کا ماجرا

شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ ہوا میں اب اچھی خاصی خنکی تھی اور مجھے سردی محسوس ہو رہی تھی۔ ڈوبتے ہوئے سورج کا منظر، گاؤں کے مکانوں کی چمنیوں سے اٹھتا ہوا دھواں، مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو اور دن بھر محنت کرنے کے بعد گھروں کو لوٹتے ہوئے کسانوں کے سنولائے ہوئے چہرے... اور بیلوں کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کا جلترنگ! یہ منظر ایسا تھا کہ بچپن ہی سے مجھے مسحور کر دیتا تھا اس لیے سردی کے باوجود میں کھیتوں کے قریب ایک منڈیر پر بیٹھا تھا۔

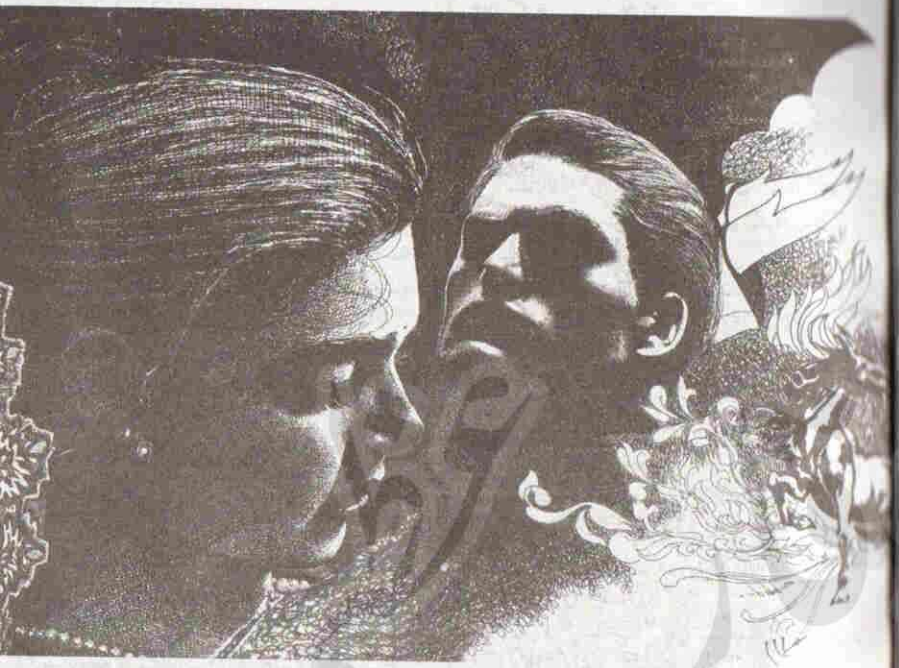

گاؤں کے لوگ میرے نزدیک سے گزرتے تو مجھے ادب سے سلام کرتے اور آگے بڑھ جاتے۔ میری عمر اس وقت صرف چودہ سال تھی لیکن میں جاگیردار ایاز ملک کا اکلوتا بیٹا ہونے کے ناتے ان لوگوں کے لیے قابلِ احترام تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے سخت شرمندگی ہوتی تھی جب گاؤں کا کوئی بزرگ مجھے ادب سے سلام کرتا تھا۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو کو محسوس کیا اور اپنی جگہ سے اٹھنے ہی والا تھا کہ مجھے حویلی کی طرف سے بابا کی لینڈ کروزر رکتی دکھائی دی۔

ڈرائیونگ سیٹ پر نہ جانے کون تھا۔ اس نے بہت خطرناک انداز میں موڑ کاٹا اور انتہائی برق رفتاری سے دھول کے بادل اڑاتا ہوا شہر جانے والے راستے پر روانہ ہو گیا۔

میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور تیزی سے حویلی کی طرف بڑھا۔ حویلی میں داخل ہوا تو نواز چاچو تیزی سے میری طرف بڑھے۔ ''خرم بیٹا! تو کہاں چلا گیا تھا؟''

''میں تو یہیں تھا چاچو!'' میں نے کہا۔ ''خیریت تو ہے؟''

''خیریت نہیں ہے پتر!'' چاچو نے کہا۔ ''بھائی جی کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ ان کی حالت بہت خراب ہے اور وہ کئی دفعہ تجھے پوچھ چکے ہیں۔''

میں گھبرا کر بابا کے کمرے کی طرف بھاگا۔ ان کی حالت واقعی خراب تھی۔ گاؤں کے حکیم صاحب ان کی نبض دیکھ رہے تھے۔ ان کے نزدیک ہی اماں بیٹھی تھیں۔ ان کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''آپ لوگ وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں؟'' میں نے کہا۔ ''بابا کو ابھی اور اسی وقت گجرات لے چلیں۔''

''نہیں بیٹا!'' حکیم صاحب نے کہا۔ ''بڑے ملک صاحب اس وقت طویل سفر کی صعوبت برداشت نہیں کر سکیں گے۔''

''او پتر! پریشان مت ہو۔ میں نے سرور کو شہر بھیج دیا ہے۔ وہ ڈاکٹر احسان کو یہیں لے آئے گا۔ وہ گجرات کے بہت بڑے ڈاکٹر ہیں۔''

''لیکن چاچو! اس میں تو بہت دیر لگ جائے گی۔'' میں نے کہا۔

''بیٹا!'' حکیم صاحب نے کہا۔ ''مجبوری ہے ورنہ میرا بھی خیال یہی تھا کہ بڑے ملک صاحب کو شہر لے جایا

جائے۔"

بابا نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔

میں نے چیخ کر کہا۔ "بابا! آپ ٹھیک تو ہیں؟" میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں لمحے بھر کو چمک سی آئی۔ انہوں نے کچھ کہنا چاہا لیکن ان کے صرف ہونٹ لرز کر رہ گئے۔

"میں بڑے ملک صاحب کو ایک خوراک اور دے دیتا ہوں۔" حکیم صاحب نے کہا۔ "اس وقت یہ قدرے ہوش میں ہیں اس لیے دوا لے لیں گے۔"

حکیم صاحب نے یکے بعد دیگرے دوا کے دو چمچے بابا کو پلا دیے، پھر انہوں نے اپنی صندوقچی میں سے کوئی خمیرہ نکالا اور تھوڑا تھوڑا کر کے بابا کو کھلا دیا۔

بابا اس وقت شاید بہت اذیت میں تھے۔ وہ بار بار اپنا سینہ پکڑ رہے تھے۔

"حکیم صاحب!" میں نے کہا۔ "بابا..."

"میں نے انہیں دوا دے دی ہے۔ آپ لوگ دعا کریں۔" حکیم صاحب نے جواب دیا۔

چند لمحے بعد بابا نے حیرت انگیز طور پر آنکھیں کھول دیں۔ ان کے چہرے پر اب اتنی اذیت کے آثار نہیں تھے۔ وہ گہری سانس لے کر آہستہ سے بولے۔ "خرم!"

"جی بابا!" میں نے جلدی سے کہا اور ان پر جھک گیا۔

"خرم بیٹا!" بابا نے نحیف لہجے میں کہا۔ "میرے بعد اپنی ماں اور بہن کا خیال رکھنا... تم... ابھی..."

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟" امی نے روتے ہوئے کہا۔ "اب تو ماشاء اللہ آپ بالکل ٹھیک ہیں۔"

"میرے پاس وقت بہت کم ہے بجمہ!" بابا نے گہری سانس لے کر کہا۔ "خرم بیٹا! تم ابھی بہت چھوٹے ہو اور ذمے داری بہت بڑی ہے۔ لیکن بیٹا جی! موت تو کسی کو بھی مہلت نہیں دیتی۔ اپنے مزارعوں کا اسی طرح خیال رکھنا جیسے میں نے رکھا ہے۔ شاہانہ ابھی بہت چھوٹی ہے۔ وہ تو... کچھ... بھی..." اچانک بابا کا سانس اکھڑ گیا۔

"چاچو!" میں نے چیخ کر کہا۔ "بابا..."

"سب ٹھیک ہو جائے گا پتر! میں دیکھتا ہوں سرور اب تک واپس کیوں نہیں آیا؟" چاچو گھبرا کر باہر نکل گئے۔

"خرم... میرا... وصیت نامہ... وکیل... صاحب... کے..." وہ بولتے بولتے رکے اور ان کے چہرے پر شدید کرب کے تاثرات ظاہر ہوئے، پسینا پانی کی طرح ان کے چہرے سے بہنے لگا۔

اسی وقت چاچو ایک شخص کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ اسے دیکھ کر اماں جلدی سے دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ اس شخص کے پیچھے سرور بھی تھا جس نے ایک بیگ اٹھا رکھا تھا۔

آنے والا ڈاکٹر تھا۔ اس نے بابا کی نبض دیکھی، اسٹیتھو اسکوپ کے ذریعے ان کے دل کی دھڑکن سنی، پھر بلڈ پریشر چیک کرنے لگا۔

میں بہت غور سے ڈاکٹر کا جائزہ لے رہا تھا۔ بی پی چیک کرتے ہوئے اس کے چہرے پر مایوسی کے تاثرات تھے۔

اس نے چاچو سے کہا۔ "انہیں دل کا شدید دورہ پڑا ہے۔ فوری طور پر اسپتال لے جانا ہوگا۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحب..."

"اور کوئی صورت نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے ایک انجکشن تیار کرتے ہوئے کہا۔ "آپ لوگوں نے بہت دیر کر دی ہے۔" اس نے وہ انجکشن بابا کی نس میں لگا دیا اور بولا۔ "کیا انہیں پہلے سے دل کی تکلیف تھی؟"

"نہیں ڈاکٹر صاحب!" چاچو نے کہا پھر سرور سے بولے۔ "تو گاڑی کو اندر لے آ... جلدی کر۔"

سرور تیزی سے باہر نکل گیا۔

بابا نے بہت دقت سے آنکھیں کھولیں، ایک نظر مجھے دیکھا، پھر ایک ہچکی لی اور ان کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

ڈاکٹر نے بڑھ کر ان کی نبض دیکھی، دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی پھر مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے اس نے بابا کا چہرہ چادر سے ڈھانپ دیا۔

بے ساختہ میری چیخ نکل گئی۔ چاچو بھی بُری طرح بلک بلک کر رو رہے تھے۔ انہوں نے سرور سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب کو چھوڑ آئے۔

میری چیخ سن کر اماں بھی روتی بلکتی وہاں آ گئیں۔ ان کی گود میں شانو تھی جو ابھی صرف ڈیڑھ سال کی تھی۔ اماں کو روتے دیکھ کر وہ بھی چیخ چیخ کر رونے لگی۔ چاچی اور دوسری ملازماؤں نے اماں کو سنبھالا۔

میری نظروں کے سامنے دنیا اندھیر ہو گئی۔ میں چاچو سے لپٹا بلک بلک کر رو رہا تھا۔

"حوصلہ کر خرم بیٹا! تو تو مرد ہے، مردوں کی طرح اس صدمے کا مقابلہ کر۔"

اچانک میرے کانوں میں بابا کی آواز گونجی۔ "خرم بیٹا! میرے بعد اپنی ماں اور بہن کا خیال رکھنا۔"

مجھے ایسا لگا جیسے اچانک میں اپنی عمر سے بہت زیادہ بڑا ہو گیا ہوں۔ میں نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔ واقعی اب شانو اور اماں کی ذمے داری مجھ پر تھی۔

☆☆☆

بابا کے سوئم کے بعد دور و نزدیک کے تمام رشتے دار چلے گئے تو حویلی میں ویرانی اور وحشت پھیل گئی۔ اماں ہر وقت آنسو بہاتی رہتیں۔ میں ان کی دل جوئی کرتا رہتا۔ اب شانو زیادہ تر میرے پاس ہی رہتی تھی۔ اس معصوم کو تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ یتیم ہو چکی ہے لیکن نہیں... وہ یتیم کب ہوئی تھی؟ میں تو موجود تھا۔ میں نے دل ہی دل میں نہ جانے کتنی بار یہ عہد کیا کہ شانو کو بابا کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گا۔

مزید کچھ وقت گزرا تو اماں کے دل کو بھی قرار آ گیا۔

ایک دن وہ خود ہی مجھ سے بولیں۔ "خرم! کیا تیرا اسکول ابھی تک نہیں کھلا؟"

"اسکول تو کھل چکا ہے اماں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اب میں آپ کو چھوڑ کر اتنی دور نہیں جاؤں گا۔"

"تو کیسی باتیں کر رہا ہے بیٹا؟" اماں افسردگی سے بولیں۔ "بھول گیا، تیرے بابا کی خواہش کیا تھی؟"

"مجھے یاد ہے اماں۔" میں نے کہا۔ "لیکن..."

"کوئی لیکن ویکن کچھ نہیں۔" اماں نے میری بات کاٹ دی۔ "تو جانے کی تیاری کر۔ میری فکر چھوڑ۔"

اماں اور چاچو کے اصرار پر میں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں ان دنوں مری کے ایک اسکول میں پڑھتا تھا۔

دوسرے دن میں نادر خان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

بابا کی اچانک موت سے نادر خان بھی بہت افسردہ تھا۔

"نادر چاچا!" میں نے کہا۔ "کیا اس سے پہلے بھی کبھی بابا کو دل کی کوئی تکلیف ہوئی تھی؟"

"نہیں ملک صاحب!" نادر چاچا نے کہا۔ "بڑے ملک صاحب کی صحت تو قابلِ رشک تھی۔ ان میں اب بھی جوانوں سے زیادہ پھرتی اور قوت تھی۔"

"پھر... پھر... یہ کیسے ہو گیا؟" میں نے کہا۔

"ملک صاحب! یہ بیماری..."

"نادر چاچا! آپ مجھے ملک صاحب کیوں کہنے لگے؟" میں نے منہ بنا کر کہا۔ "میں نے ہمیشہ آپ کو اپنا بزرگ سمجھا ہے اور آپ تو میرے استاد بھی ہیں۔ بس آئندہ آپ مجھے ملک صاحب نہیں کہیں گے۔"

"بڑے ملک صاحب کے بعد اب آپ ہی تو میرے مالک ہیں پھر..."

"نادر چاچا پلیز!" میں نے کہا۔

"اچھا بیٹا! جیسے تمہاری مرضی۔" نادر چاچا نے ونڈ اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے کہا پھر وہ چونک کر بولے۔ "جب بڑے ملک صاحب کو دل کا دورہ پڑا، اس وقت میں ہی ان کے پاس تھا۔ وہ اسی وقت باہر سے اٹھ کر آئے تھے۔ وہ بیٹھے بیٹھے اچانک صوفے پر لیٹ گئے اور بولے... نادر خان! میرا دل بہت گھبرا رہا ہے، دم گھٹ رہا ہے۔ مجھے ذرا باہر باغ میں لے چلو۔"

"انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اپنے قدموں پر کھڑے نہ ہو سکے۔ میں نے سہارا دے کر انہیں کمرے تک پہنچایا اسی وقت مالکن بھی آ گئیں۔ وہ بھی پریشان ہو گئیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ "نادر خان! تم فوراً حکیم صاحب کو بلا کر لاؤ۔"

"ارے بھئی میں ٹھیک ہوں۔" ملک صاحب نے کہا۔ "مجھے نادر خان سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

"وہ بات آپ بعد میں کر لیجیے گا۔" مالکن نے کہا اور مجھے جانے کا اشارہ کیا۔

"وہ ضروری بات کیا تھی چاچا؟" میں نے پوچھا۔

"پھر ملک صاحب کو بات کرنے کی مہلت ہی نہ ملی۔" نادر چاچا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ہم اس وقت تک اسکول پہنچ چکے تھے۔

نادر چاچا نے میرا سامان کمرے تک پہنچایا اور مجھ سے کہا۔ "خرم بیٹا! گھبرانا مت۔ میں ہفتے، دس دن میں چکر لگاتا رہوں گا۔"

ہوسٹل میں رہنے والے سب لڑکے میرے کمرے میں جمع ہو گئے۔ ان میں سے بہت سے بابا کے انتقال کے موقع پر گاؤں بھی آئے تھے۔

میرا روم میٹ حسن تو مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا اور بولا۔ "اچھا ہوا خرم تو واپس آ گیا ورنہ میں بھی یہاں سے جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تیرے بغیر میرا دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔"

"یار! میں تو شاید نہ آتا لیکن اماں اور چاچو نے مجھے یہاں آنے پر مجبور کر دیا۔" پھر میں اس سے دیر تک اسکول کے بارے میں پوچھتا رہا۔

☆☆☆

مجھے ہوسٹل آئے دو مہینے ہو چکے تھے۔ پڑھائی زور و شور سے جاری تھی۔ ہمارے سالانہ امتحانات میں تو ابھی دیر تھی لیکن ماہانہ امتحانات جاری تھے۔

دوسرے دن ہمارا ریاضی کا ٹیسٹ تھا۔ میں اس کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو میں چونک اٹھا۔ حسن کمرے میں موجود نہیں تھا لیکن دستک دینے والے کا انداز مختلف تھا۔ میں نے سوچا کہ ہوسٹل کا کوئی لڑکا ہو گا۔ مجھے پڑھائی کے وقت ایسے لوگوں کی آمد بہت ناگوار گزرتی تھی۔ خود بھی نہیں پڑھتے اور دوسروں کا وقت بھی برباد کرتے ہیں۔

میں جھنجلا کر اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔

دروازے پر چاچو کو دیکھ کر مجھے دھچکا سا لگا۔

''چاچو... آپ... سب خیریت تو ہے؟''

''ہاں بیٹا۔'' چاچو نے کہا۔ ''سب خیریت ہے۔ بس تُو فوراً میرے ساتھ گاؤں چل۔''

''بات کیا ہے چاچو؟'' میں گھبرا گیا۔ ''مجھے بتایئے نا... آپ اتنی ایمرجنسی میں مجھے کیوں لینے آئے ہیں؟''

''کوئی خاص بات نہیں ہے بیٹا!'' چاچو نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''بس تو جلدی سے تیار ہو جا۔''

''لیکن چاچو...''

''میں نے تیرے پرنسپل سے بات کر لی ہے۔'' چاچو نے کہا پھر انہوں نے بلند آواز میں کہا۔ ''سرور!''

سرور فوراً ہی اندر آ گیا۔

''خرم کا سامان اٹھا کر گاڑی میں رکھو۔'' انہوں نے سرور کو حکم دیا اور مجھ سے بولے۔ ''چل بیٹا! سرور تیرا سامان لے آئے گا۔''

سرور ان کا خاص آدمی تھا۔ وہ آدمی مجھے کبھی اچھا نہیں لگا۔ وہ خاصا دراز قد تھا، بھاری جسم اور چہرے پر گھنی مونچھیں۔ نہ جانے کیوں مجھے اس شخص سے شروع ہی سے چڑ تھی۔

چاچو نے مجھے حسن سے ملنے کا موقع بھی نہ دیا۔

وہ اپنی ایکسچینج میں آئے تھے۔ سرور نے میرا سامان گاڑی میں رکھا اور خود اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ پھر وہ بہت خوف ناک انداز میں گاڑی دوڑانے لگا۔

''چاچو! آپ مجھے بتایئے، آخر بات کیا ہے؟''

''بیٹا! میری بات ذرا حوصلے سے سننا۔'' چاچو نے کہا اور سگریٹ سلگانے لگے۔

میرا دل انجانے وسوسوں سے بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دل کی دھڑکن میرے کانوں میں دھمک پیدا کر رہی ہو۔

''آج دوپہر بھابی کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔'' چاچو نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

''اماں کو سانپ نے ڈس لیا؟'' میں چیخ کر بولا۔

''کیسے چاچو! اماں کو سانپ نے کیسے ڈس لیا؟ ہماری حویلی میں تو سانپ نہیں ہوتے اور اب ان کی طبیعت کیسی ہے؟''

''ان کی حالت خراب ہے بیٹا!'' چاچو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''سانپ حویلی میں نہیں تھا بلکہ حویلی کے پیچھے والے باغ میں تھا۔'' چاچو کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''چاچو!'' میں نے وحشت زدہ ہو کر کہا۔ ''اماں کی طبیعت اب...''

''بھابی... ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئیں بیٹا!'' چاچو نے گویا میری سماعت پر بجلی گرا دی۔ مجھے ایسا لگا جیسے کوئی میرا دل مٹھی میں لے کر بھینچ رہا ہو۔ میرے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ پھر اردگرد کے تمام منظر دھندلا گئے۔ میں بلک بلک کر رونے لگا۔

''حوصلہ کر بیٹا!'' چاچو نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔

''کیسے حوصلہ کروں چاچو!'' میں نے بلکتے ہوئے کہا۔ ''پہلے بابا مجھے چھوڑ گئے، اب اماں بھی۔ چاچو...''

''خرم بیٹا!'' چاچو نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''تو نے سنا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیارے بندوں کو اپنے پاس جلدی بلا لیتا ہے۔ زندگی تو اللہ کی امانت ہوتی ہے بیٹا! وہ جب چاہے اپنی امانت واپس لے لے۔''

ہم گاؤں میں داخل ہوئے تو ہر طرف اندھیرا پھیل چکا تھا لیکن حویلی کے اندر اور باہر روشنی ہو رہی تھی اور گاؤں والے وہاں جمع تھے۔

میں بلکتا ہوا اماں کے کمرے کی طرف بڑھا اور ان سے لپٹ کر بُری طرح رونے لگا۔

اس وقت میرے کانوں میں شانو کے رونے کی آواز آئی۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا۔ شانو حویلی کی ایک ملازمہ کی گود میں تھی اور بُری طرح رو رہی تھی۔ اس بدنصیب کو تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ باپ کے بعد اب وہ ماں کے سائے سے بھی محروم ہو گئی ہے۔

میں نے اپنے آنسو پونچھ لیے اور شانو کو ملازمہ کی گود سے لے لیا۔

میری گود میں آتے ہی وہ چپ ہو گئی۔ مجھے اب جینا

تھا۔ اپنی معصوم بہن کے لیے۔ اسے ماں اور باپ دونوں کا پیار دینا تھا۔

پھر سب کچھ جیسے خواب کے عالم میں ہو گیا اور میں نے اپنی پیاری محبت کرنے والی ماں کو منوں مٹی کے نیچے اتار دیا۔

حویلی کی ویرانی اور وحشت میں اب پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔

بس ایک شانو کا دم تھا جس سے مجھے زندگی کا احساس ہوتا تھا ورنہ تو مجھے ہر طرف موت کی پرچھائیاں نظر آتی تھیں۔

چاچو ہر وقت میری دل جوئی کرتے رہتے۔ شانو زیادہ تر مجھ سے چپکی رہتی یا پھر وہ اپنی آیا زینت سے مانوس ہو گئی تھی۔

مجھے اس بات کا بھی افسوس تھا کہ میرا تعلیمی سال ضائع ہو گیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اب میں مری نہیں جاؤں گا بلکہ گجرات ہی سے میٹرک کا امتحان دوں گا۔ میں اب شانو کو چھوڑ کر جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ بھی میرے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتی تھی۔

☆☆☆

اماں کے چالیسویں کے بعد چاچو نے مجھ سے کہا۔ ''خرم بیٹا! اب تو اپنی پڑھائی کی طرف بھی توجہ دے۔ تو کل سے اسکول چلا جا۔''

''اب وہاں جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میرا ایک سال تو ضائع ہو ہی گیا ہے۔ میں اب مری نہیں جاؤں گا بلکہ اگلے سال گجرات ہی سے میٹرک کا امتحان دوں گا۔''

''بیٹا! بھائی جان کی خواہش تھی کہ تجھے بیرسٹر بنائیں... اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت بھیجیں...''

''میں نے تعلیم چھوڑی تو نہیں ہے چاچو۔'' میں نے کہا۔ ''میں وکالت بھی پڑھوں گا اور اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن بھی جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''میں بابا کی خواہش ضرور پوری کروں گا۔''

''خوش رہ بیٹا!'' چاچو نے کہا۔ ''پھر تُو ایسا کر، ابھی سے میٹرک کے امتحان کی تیاری شروع کر دے۔''

اس دن صبح ہی سے موسم ابر آلود تھا پھر ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ میں بچپن ہی سے اس موسم کا دیوانہ تھا۔ مٹی سے اٹھنے والی مہک مجھے سرشار کر دیتی تھی۔

میں بارش میں بھیگتا رہا... اچانک مجھے شانو کا خیال آیا۔ اس کی آیا دو دن کی چھٹی لے کر قریبی گاؤں اپنے کسی عزیز کی شادی میں گئی ہوئی تھی۔ شانو چاچی کے پاس تھی اس لیے مجھے اطمینان تھا۔ بس مجھے بھی اس کی کچھ عادت ہو گئی تھی۔

میں یہی سوچ کر حویلی میں داخل ہوا اور سوچا پہلے کپڑے بدل لوں۔ یہ سوچ کر میں اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

اچانک مجھے شانو کے رونے کی آواز سنائی دی۔

میں لپک کر چاچی کے کمرے کی طرف بڑھا۔ ابھی میں دروازے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ چاچی کی چیختی ہوئی آواز آئی۔ ''اب چپ ہو جا منحوس! میرا دماغ خراب کر دیا ہے۔''

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اچانک چٹاخ کی آواز آئی اور شانو بہت بُری طرح بلک کر روئی۔

میں اچانک کمرے میں داخل ہو گیا۔ چاچی اسے دوسرا تھپڑ مارنے ہی والی تھیں۔

میرا دماغ ایک دم گھوم گیا، میں چیخ کر بولا۔ ''چاچی!''

وہ بُری طرح اچھل پڑیں اور مڑ کر مجھے دیکھنے لگیں۔

''آپ اس معصوم کو مار رہی ہیں؟'' میں نے اپنے غصے پر بمشکل قابو پاتے ہوئے کہا۔ میں چاچی کا بہت احترام کرتا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ ان سے کوئی گستاخی کروں۔

''نہ ماروں تو کیا کروں؟'' چاچی نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''یہ منحوس تو ہر وقت ریں ریں کرتی رہتی ہے۔ پہلے ماں باپ کو کھا گئی، اب لگتا ہے یہ ڈائن میری بھی جان لے گی۔''

''چاچی!'' میں نے بہت مشکل سے اپنے لہجے کی تلخی پر قابو پایا۔ ''یہ معصوم تو ابھی کچھ سمجھتی ہی نہیں ہے اور آپ اسے مار رہی ہیں۔ آپ کو اس بدنصیب پر ترس بھی نہیں آتا؟''

''مجھ سے زیادہ بکواس مت کر۔'' چاچی نے کہا۔ ''لے جا اس حرام زادی کو یہاں سے ورنہ پھر ماروں گی۔''

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ جو عورت میرے سامنے کھڑی تھی، وہ تو مجھے بالکل اجنبی لگ رہی تھی۔ یہ وہ عورت تو نہیں تھی جو چاچو کے سامنے میری اور شانو کی محبت کا دم بھرتی تھی۔

چاچی کی چیخ پکار میں شانو نے پھر رونا شروع کر دیا۔ چاچی نے آگے بڑھ کر شانو کے پھول سے رخسار پر ایک اور زوردار طمانچہ رسید کر دیا۔

میں نے جھپٹ کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور تلخ لہجے میں بولا۔ ''اب آپ نے شانو کو ہاتھ بھی لگایا تو...''

''تو؟'' چاچی نے جاہل عورتوں کی طرح کہا۔ ''کیا

کرے گا تُو... مارے گا مجھے؟ آوارہ ماں کی... بدبخت اولاد!''

''چاچی!'' میں اتنی زور سے چیخا کہ میری آواز پھٹ گئی۔ ''اگر میری ماں کے بارے میں ایک لفظ بھی کہا تو زبان کھینچ لوں گا۔''

''دفع ہو یہاں سے... حرام کی اولاد! تیری ماں...''

ان کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ میں نے ان کے منہ پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ وہ لڑکھڑا کر سامنے والی دیوار سے ٹکرائیں اور سہمے ہوئے انداز میں مجھے دیکھنے لگیں۔ شاید انہیں میری آنکھوں میں اترا ہوا خون نظر آ گیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر ان کی گردن دبوچ لی۔

اچانک پیچھے سے کسی نے میری گدی پر زوردار ہاتھ مارا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ میرے پیچھے چاچو کھڑے تھے۔ ان کی نگاہیں گویا شعلے برسا رہی تھیں۔ انہوں نے میرے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کیا اور بولے۔ ''ذلیل، کمینے! تیری یہ مجال کہ تُو اب بزرگوں پر ہاتھ اٹھائے گا۔''

''انہوں نے شانو کو بہت بُری طرح مارا ہے چاچو اور...''

''تو تُو اپنی چاچی پر ہاتھ اٹھائے گا؟ بے غیرت! تجھے شرم نہیں آئی ایسا کرتے ہوئے؟''

''میں ایسا کبھی نہ کرتا چاچو لیکن انہوں نے تو میری مری ہوئی ماں کو بھی آوارہ اور بدچلن کہا۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی...''

''خرم! اپنی بکواس بند کر۔ اب تُو مجھ سے بھی زبان درازی کرے گا... مارے گا مجھے؟ دفع ہو جا یہاں سے۔ اب حویلی میں مجھے تیری شکل نظر نہ آئے۔''

''یہ حویلی صرف آپ ہی کی نہیں ہے، میرے باپ کی بھی ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے شانو کو گود میں اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

شانو کے چہرے پر انگلیوں کے نشان ثبت ہو گئے تھے۔ اس کا چہرہ دیکھ کر مجھے رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب میں اس حویلی میں نہیں رہوں گا بلکہ نہر والی کوٹھی میں منتقل ہو جاؤں گا۔ نہر کے نزدیک وہ کوٹھی بابا نے بنوائی تھی۔

میں نے نادر چاچا سے اس سلسلے میں مشورہ کیا تو وہ بولے۔ ''وہاں چلنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن حویلی کا کوئی ملازم ہمارے ساتھ وہاں جانے کی جرأت نہیں کرے گا۔''

''ہمیں ضرورت پڑی تو گاؤں سے نئے ملازم رکھ لیں گے۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' نادر چاچا نے کہا۔ ''میں تیار ہوں اور شانو بیٹی کے لیے کسی آیا کا بندوبست کرتا ہوں۔''

دوسرے دن میں صبح صبح چاچو کے پاس پہنچ گیا۔ وہ کہیں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ ناگواری سے بولے۔ ''کیا بات ہے؟''

''مجھے نہر والی کوٹھی کی چابیاں چاہئیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے وہاں منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''تو کیا بالکل ہی پاگل ہو گیا ہے۔ کیوں میری جگ ہنسائی کرائے گا۔ لوگ کہیں گے کہ نواز نے بھائی کے مرتے ہی اس کے یتیم بچوں کو گھر سے نکال دیا۔''

''تو پھر میں اس حویلی کے درمیان دیوار کھنچواؤں گا۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''اس حویلی پر میرا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا آپ کا ہے۔''

''اس ہوا میں رہنا بھی مت۔'' چاچو نے کہا۔ ''کہ حویلی پر یا جاگیر پر تیرا حق ہے۔ اپنے حصے کی جائداد تو بھائی جان نے اپنی زندگی میں عیاشیوں میں اڑا دی تھی۔''

''اس کا فیصلہ بھی ہو جائے گا۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''میں کل ہی وکیل صاحب کے پاس جاؤں گا۔ بابا کا وصیت نامہ تو انہی کے پاس ہے نا۔''

''ارے، اسے چابیاں دے کے جان چھڑا۔ میں خود بھی اب اس بدتمیز لڑکے کے ساتھ رہنے پر تیار نہیں ہوں۔'' چاچی نے کہا۔

چاچو کچھ دیر مجھے گھورتے رہے، پھر اٹھ کر الماری سے چابیوں کے کئی گچھے نکالے۔ ان میں سے ایک گچھا انہوں نے میری طرف اچھال دیا اور بولے۔ ''دفع ہو جا میری آنکھوں کے سامنے سے۔''

میں نے چابیاں اٹھائیں اور واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

نادر چاچا برآمدے میں بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں نہر والی کوٹھی کی چابیاں لے آیا ہوں۔

''چلو، پھر اپنا ضروری سامان اٹھا لو۔ باقی سب کچھ تو وہاں موجود ہے۔'' پھر انہوں نے ایک ملازم کو بلایا اور اس سے کہا۔ ''چھوٹے ملک خرم صاحب نہر والی کوٹھی میں جا رہے ہیں۔ تم بھی چلنے کی تیاری کرو اور ملک صاحب کے دوسرے ملازموں سے بھی کہہ دو۔''

''نادر بھائی!'' ملازم نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔

''چھوٹی مالکن نے سب نوکروں سے کہہ دیا ہے کہ جو بھی خرم کے ساتھ جائے گا، اس کے پورے خاندان کو تباہ کرا دوں گی۔ میں نے بڑے ملک صاحب کا نمک کھایا ہے نادر بھائی... لیکن میں اس عمر میں دربدر نہیں ہونا چاہتا۔''

دوسرے ملازمین کا بھی یہی جواب تھا۔ ان کی طرف سے مایوس ہو کر نادر چاچا نے کہا۔ ''آپ فکر مت کریں خرم بیٹا! میں جاگیر سے دوسرے ملازموں کا بندوبست کرلوں گا۔''

جب میں اپنا تمام ضروری سامان بابا کی لینڈ کروزر میں رکھ کر جانے لگا تو شانو کی آیا نے کہا۔ ''چھوٹے ملک صاحب! میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔ شانو بی بی مجھ سے بہت مانوس ہوگئی ہیں۔ مجھے آپ کی خدمت کر کے خوشی ہو گی۔ میں چھوٹی مالکن کی دھمکیوں سے ڈرنے والی نہیں ہوں۔''

میں نے حیرت سے اس کمزور عورت کو دیکھا جس کا حوصلہ مردوں سے بھی بڑھ کر تھا۔ نادر چاچا نے اسے بھی گاڑی میں بٹھالیا۔

نہر والی حویلی پہنچ کر نادر چاچا اور آیا تو صفائی میں جت گئے۔ میں شانو کو لے کر نہر کی طرف نکل آیا جو کوٹھی کی عقبی سمت میں تھی۔ وہ خاصی چوڑی نہر تھی اور اس میں پانی کی روانی برسات کے دنوں میں بہت تیز ہوتی تھی۔

میں نے شانو کا دودھ... بسکٹ اور اپنے کھانے کے لیے کچھ سامان لے لیا تھا۔

میں تین، چار گھنٹے وہاں گزار کر واپس آیا تو نادر چاچا اور آیا نے کوٹھی کو آئینے کی طرح چمکا دیا تھا۔ اب آیا رات کے کھانے کا انتظام کر رہی تھی۔ نادر چاچا بھی اس کی مدد کر رہے تھے اور بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ بس دو ایک دن کی تکلیف ہے، میں جاگیر سے دو تین ملازموں کا بندوبست کرلوں گا۔

مجھے نہر والی کوٹھی میں آئے ہوئے پانچواں دن تھا۔

میں شانو کے ساتھ بالائی منزل پر تھا۔ نچلی منزل کے ایک کمرے میں نادر چاچا سوتے تھے۔

رات کے کسی پہر میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے گھٹن کا احساس ہوا۔ میں نے اٹھ کر کمرے کی کھڑکی کھول دی۔

اچانک مجھے کوٹھی کے نچلے حصے میں کوئی.... آواز سنائی دی۔ ایسا لگا جیسے کوئی اندر کودا ہو۔

میں زینے کی طرف لپکا۔ اسی وقت مجھے کوٹھی کا آہنی پھاٹک کھلنے کی آواز سنائی دی پھر ایک فائر ہوا اور کسی کی چیخ سنائی دی۔

پھر تو وہاں دونوں طرف سے فائرنگ ہونے لگی۔ فائرنگ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ حملہ آور کئی ہیں اور نادر چاچا اکیلے ان کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا ورنہ میں بھی نادر چاچا کی مدد کر سکتا تھا۔

ایک دم مجھے شانو کا خیال آیا۔ وہ فائرنگ کی آواز سے خوف زدہ ہو جائے گی۔ ممکن ہے اندھیرے میں ڈر جائے کیونکہ حملہ آوروں نے مین سوئچ بھی آف کر دیا تھا۔

میں دو دو سیڑھیاں چڑھتا ہوا... اوپر پہنچا۔ شانو کے کمرے میں اندھیرا تھا لیکن اتنی دیر تک اندھیرے میں رہنے کی وجہ سے میری آنکھیں تاریکی سے مانوس ہوگئی تھیں۔ شانو مجھے بیڈ کے ایک کونے پر سکڑی سمٹی نظر آئی۔ میں نے لپک کر اسے گود میں اٹھالیا۔ وہ بُری طرح لرز رہی تھی۔

اس نے اپنی توتلی زبان میں کہا۔ ''بھیا!''

میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ ابھی صرف دو تین الفاظ ہی بولنا سیکھی تھی۔ بھیا، چاچا، آیا وغیرہ۔

شانو کی آیا موجود نہیں تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس وقت وہ کہاں چلی گئی؟

میں شانو کو گود میں لے کر محتاط انداز میں نیچے اترا۔ وہاں فائرنگ نہیں ہو رہی تھی لیکن حملہ آور اب بھی موجود تھے۔

میں نے زینے سے قدم نیچے رکھا ہی تھا کہ کوئی کرخت آواز میں بولا۔ ''وہ دونوں اوپر ہیں، اوپر جاؤ۔'' میں نے بولنے والے کی آواز پہچان لی۔ وہ مکروہ آواز سرور کی تھی۔

میں پھرتی سے زینے کے ساتھ میں واقع ایک کمرے میں گھس گیا اور اس کا دروازہ اندر سے بولٹ کرلیا۔

پھر کئی لوگوں کے اوپر جانے کی آہٹ سنائی دی۔

چند منٹ بعد وہ لوگ دوبارہ نیچے آگئے۔ ان میں سے ایک بولا۔ ''اوپر تو کوئی نہیں ہے۔''

''وہ کہاں جاسکتا ہے؟'' سرور چیخ کر بولا۔ ''آیا تو یہی بتا رہی تھی کہ خرم اور شانو اوپر کے کمروں میں ہوتے ہیں۔'' پھر وہ چیخ کر بولا۔ ''جاؤ اوپر جا کر تلاش کرو اچھی طرح۔ وہ جا کہاں سکتا ہے۔ دھواں بن کر اڑنے سے تو رہا۔ ڈرو مت، اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے ورنہ وہ یوں خاموش نہ بیٹھا رہتا۔ اس کا ہمدرد نادر خان بھی میرے ہاتھوں مارا گیا ہے۔''

''ان لوگوں نے نادر چاچا کو مار دیا؟'' میرے دل سے ایک ہوک سی اٹھی۔ نادر چاچا نے حقِ نمک ادا کر دیا تھا اور وہ ہم پر قربان ہوگیا تھا۔ دوسری طرف وہ نمک حرام آیا تھی جو میرے دشمنوں کے ساتھ مل گئی تھی۔

''وہ آخر گیا کہاں؟'' کمرے کے دروازے کے

پاس سے آواز آئی۔ ''کہیں بھاگ تو نہیں گیا؟''

''بھاگ کر کہاں جائے گا اور کیسے بھاگ سکتا ہے؟'' سرور دہاڑ کر بولا۔

اچانک شانو کھانسنے لگی۔ میں نے لاکھ اس کے منہ پر ہاتھ رکھا لیکن اس کے کھانسنے کی آواز ان لوگوں نے سن لی۔

''وہ اس کمرے میں ہے۔'' سرور نے چیخ کر کہا پھر کسی نے دروازے پر بہت زور سے دستک دی۔ دستک کیا، کسی نے ڈنڈے سے دروازہ بجایا تھا۔

''دروازہ کھول دے خرم!'' سرور چیخ کر بولا۔ ''ورنہ میں دروازہ توڑ دوں گا۔''

میں دیوانہ وار کمرے میں چکر لگا رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اس صورتِ حال سے کیسے نمٹوں؟

کمرے میں ایک کھڑکی بھی تھی جو کوٹھی کی عقبی سمت میں نہر کی طرف کھلتی تھی۔ میں اگر اکیلا ہوتا تو اس کھڑکی کے ذریعے کود کر فرار ہو جاتا لیکن شانو کو لے کر وہاں سے کودنا مشکل تھا۔ کھڑکی اونچائی کمرے میں تو کم تھی لیکن باہر کی سمت بہت زیادہ تھی۔

میں نے دروازے پر لگا ہوا پردہ نکال لیا۔ اس کے ذریعے میں نے شانو کو اپنی پشت پر باندھا اور کھڑکی پر چڑھ گیا۔

دروازے پر اب دھماکے ہو رہے تھے۔ وہ خاصا مضبوط شیشم کا دروازہ تھا لیکن زیادہ دیر تک ان لوگوں کا راستہ نہیں روک سکتا تھا۔

میں نے شانو کو پیٹھ پر اچھی طرح باندھنے کے بعد باہر کا جائزہ لیا۔ باہر صرف مین گیٹ پر ایک آدمی موجود تھا۔ باقی لوگ دروازہ توڑنے میں مصروف تھے۔

میں نے اللہ کا نام لے کر باہر چھلانگ لگا دی۔ میری کوشش تھی کہ اس اچھل کود میں شانو کو چوٹ نہ لگے۔ میری اسی احتیاط کی وجہ سے شانو کو تو ہلکا سا جھٹکا لگا لیکن میرے گھٹنے اور کہنیاں بُری طرح چھل گئیں۔

میرے کودنے سے ہلکی سی آواز پیدا ہوئی تھی لیکن دروازے پر ہونے والے دھماکوں میں دب کر رہ گئی۔

دوسرا حملہ کوٹھی کی چار دیواری عبور کرنے کا تھا۔

یہاں بھی شانو کی وجہ سے مشکل پیش آرہی تھی ورنہ میں اکیلا تو پلک جھپکتے میں چار دیواری پھلانگ سکتا تھا۔

میں ایک دفعہ اس کوٹھی سے باہر نکل جاتا تو حملہ آوروں سے بچ سکتا تھا۔ کھڑکی سے کودنے میں کمر پر بندھے ہوئے پردے کی بندش کچھ ڈھیلی ہوگئی تھی۔ میں نے شانو کو لپیٹ کر ایک مرتبہ پھر اچھی طرح کمر پر باندھا اور باؤنڈری وال پر چڑھ گیا۔ پھر میں نے ہاتھوں سے چار دیواری کی کنگر پکڑی اور باہر کی طرف لٹک گیا اور احتیاط سے باہر کی طرف کود گیا۔

جھٹکا لگنے اور بندھے رہنے کی وجہ سے شانو ایک مرتبہ پھر رونے لگی۔ میں نے اسے چمکار کر خاموش کرایا اور نہر کے ساتھ ساتھ گاؤں کی مخالف سمت میں بھاگنے لگا۔

اچانک کوئی چیخا۔ ''وہ بھاگ رہا ہے۔'' شاید مین گیٹ پر کھڑے ہوئے آدمی نے مجھے دیکھ لیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے مجھے اپنے پیچھے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ شانو کی وجہ سے ان کے مقابلے میں میری رفتار کم تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ ہر قیمت پر مجھے پکڑنے یا ہلاک کرنے کی کوشش کریں گے ورنہ چاچوان سب کی کھال ادھیڑ دیں گے۔

بھاگتے بھاگتے میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ جس سمت میں بھاگ رہا تھا، وہاں سے کچھ فاصلے پر زمین کے ایک ٹکڑے میں خاصی بڑی۔ دلدل تھی۔ وہ لوگ اب مجھے نظر نہیں آرہے تھے لیکن بھاگتے ہوئے قدموں اور گالیوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

میں اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا۔ میں جانتا تھا کہ دلدل کہاں سے شروع ہوتی ہے اور اس کا دائرہ کہاں تک ہے۔ ممکن ہے یہ بات حملہ آور بھی جانتے ہوں لیکن ایک کوشش کرنے میں کیا حرج تھا۔

میں نے دلدلی زمین کے گرد ایک لمبا چکر لگایا اور پھر گھوم کر سامنے کی طرف آگیا۔

اس کوشش میں حملہ آور مزید نزدیک پہنچ چکے تھے۔

''وہ جا رہا ہے حرام زادہ۔'' سرور نے چیخ کر کہا۔ اس نے چاندنی میں مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ لوگ مجھ پر فائر نہیں کر رہے تھے۔ شاید وہ مجھے زندہ پکڑنا چاہتے تھے۔

''رک جاؤ خرم!'' سرور چیخ کر بولا۔ ''ورنہ گولی مار دوں گا۔''

میں جان توڑ کر بھاگتا رہا۔ میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ اگر مجھے جاگنگ کی پریکٹس نہ ہوتی تو اب تک میں ان لوگوں کے ہاتھ آگیا ہوتا۔

پھر وہی ہوا جو میں چاہتا تھا، میرے پیچھے آنے والے جوش میں آکر یہ بھلا بیٹھے کہ آگے دلدل ہے۔ مجھے اپنے پیچھے کچھ چیخیں سنائی دیں۔ میں نے بھاگتے بھاگتے مڑ کر دیکھا۔ صرف دو آدمی دلدل کے کنارے کھڑے تھے، باقی دلدل میں دھنس رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ اب وہ بچ جانے

والے دونوں آدمی بھی میرے پیچھے آنے کے بجائے اپنے ساتھیوں کو بچانے کی کوشش کریں گے۔

میں نے اپنی رفتار کم کردی۔ پھر ایک جگہ رک کر میں نے شانو کو اپنی پشت سے کھولا۔ وہ بُری طرح سہمی ہوئی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ''بھیا!'' پھر وہ میرے سینے سے لگ گئی۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ یہاں کچھ دیر بیٹھ کر آرام کرلوں اور اپنا سانس درست کرلوں لیکن ابھی خطرہ دور نہیں ہوا تھا اس لیے میں تیزی سے چلتا رہا۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں ایک گھنٹے تک چلا یا دو گھنٹے تک، بس میں چل رہا تھا۔ شانو میرے کندھے سے لگ کر سو گئی تھی۔

مجھے رہ رہ کر گزری ہوئی تمام باتیں یاد آرہی تھیں۔ میں نے کبھی اتنا پیدل چلنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ بھی اس بے سروسامانی کے عالم میں۔ مجھے نادر چاچا یاد آئے جو ہم پر قربان ہوگئے تھے۔ مجھے چاچو یاد آئے جو بظاہر میری محبت کا دم بھرتے تھے لیکن درحقیقت وہ میری جان لینا چاہتے تھے۔ مجھے اس وقت بڑی حیرت ہوئی کہ کوئی شخص اتنا بڑا اداکار بھی ہو سکتا ہے۔ بابا کی زندگی میں تو وہ یوں ظاہر کرتے تھے جیسے وہ مجھ پر جان چھڑکتے ہوں۔

میں انہی خیالات میں گم چلا جارہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم میں کب جی ٹی روڈ تک پہنچا اور کس راستے سے پہنچا؟

پیدل چلتے چلتے میرے پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ اچانک میرے کانوں میں گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ وہ کوئی گھوڑا گاڑی تھی۔ گھوڑا گاڑی نزدیک آئی تو میں نے دیکھا، وہ دودھ لے جانے والی گاڑی تھی۔

مجھے دیکھ کر گاڑی بان نے گاڑی روک لی اور مجھ سے بولا۔ ''بیٹا! اس وقت تُو اکیلا کہاں جارہا ہے؟''

میں نے فوری طور پر ایک کہانی گھڑی اور بولا۔ ''بابا! میرے باپ نے دوسری شادی کرلی ہے اور میری سوتیلی ماں نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔''

''گھر سے نکال دیا؟'' بوڑھے گاڑی بان نے حیرت سے پوچھا۔ ''ماں سوتیلی ہے لیکن باپ تو سگا ہے۔ اس نے تجھے نہیں روکا؟''

''ابّا ہی نے تو گھر سے نکالا ہے۔ ماں نے ان کے ایسے کان بھرے کہ انہوں نے مجھے اور میری بہن کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔''

''توبہ توبہ، کیا زمانہ آگیا ہے۔'' گاڑی بان نے کہا۔

''اب تُو کہاں جارہا ہے بیٹا؟''

''میں گجرات جاؤں گا بابا۔'' میں نے کہا۔ ''وہاں میرے ایک ماموں رہتے ہیں۔''

''گجرات!'' بوڑھے نے حیرت سے کہا۔ ''گجرات تو بہت دور ہے بیٹا! تو وہاں تک پیدل جائے گا؟''

''اور میں کر بھی کیا سکتا ہوں بابا۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میری جیب میں تو ایک پیسا بھی نہیں ہے۔''

''ایسا کر، تُو میری گاڑی میں بیٹھ جا۔'' گاڑی بان نے کہا۔ ''میں خوش حال پور تک جارہا ہوں۔ وہاں کے لاری اڈے سے تجھے گجرات کی بس مل جائے گی۔''

''لیکن بابا! میرے پاس تو بس کا کرایہ بھی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''بس کا کرایہ تجھے میں دے دوں گا۔'' بوڑھے نے کہا۔ ''آجا، گاڑی میں بیٹھ جا۔''

میں شانو کو لے کر گاڑی میں چڑھ گیا۔ بابا نے دودھ کے ڈبّوں کے درمیان جگہ بنائی۔ میں نے وہی پردہ بچھا دیا جو میں گھر سے لے کر چلا تھا۔ میں نے شانو کو لٹایا اور خود بھی آرام سے بیٹھ گیا۔ میرا جوڑ جوڑ درد کررہا تھا۔ گاڑی میں بیٹھ کر مجھے بہت سکون ملا۔

اچانک پیچھے سے مجھے ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں۔ گاڑی نزدیک آئی تو میں اسے دیکھ کر لرز کر رہ گیا۔ وہ چاچو کی بیجیرو تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر سرور تھا۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے۔ میں جلدی سے ڈبوں کی آڑ میں چھپ گیا۔

بیجیرو کی رفتار گاڑی کے نزدیک آکر کچھ کم ہوئی تو میں کانپ اٹھا۔ میں نے دیکھا، سرور نے ایک نظر گاڑی پر ڈالی پھر کچھ سوچ کر آگے بڑھ گیا۔ میں نے سکون کا سانس لیا کیونکہ اسی وقت شانو کسمسائی تھی۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ کہیں رونا شروع نہ کردے۔

میں چلتے چلتے اتنا تھک گیا تھا کہ گاڑی میں کچھ دور چلنے کے بعد ہی مجھے نیند آگئی۔

میری آنکھ گاڑی بان کے جگانے پر کھلی۔ اس وقت صبح کاذب کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ وہ کوئی لاری اڈا تھا۔ وہاں کئی بسیں کھڑی تھیں اور اردگرد کچھ دکانیں اور خوانچے والے بھی نظر آرہے تھے۔

گاڑی بان نے ہمدردی سے کہا۔ ''تیری سوتیلی ماں تو بہت ظالم ہے بیٹا! اس نے تجھے بہت بے رحمی سے مارا ہے۔

تیری تو ہتھیلیاں بھی زخمی ہیں اور پیر بھی۔''

اس نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکالا اور مجھے دے کر بولا۔ ''لے، یہ رکھ لے۔ گجرات تو پہنچ جائے گا۔ میرے پاس اور پیسے نہیں ہیں بیٹا ورنہ میں تجھے اور پیسے دے دیتا۔''

''یہ بھی کافی ہیں بابا۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ سو روپے کی میرے نزدیک حقیقت ہی کیا تھی لیکن اس وقت وہی سو روپے مجھے بہت بڑی رقم لگ رہے تھے۔

گاڑی بان نے ایلومینیم کے ایک جگ میں دودھ نکالا اور بولا۔ ''تیری بہن بھی بھوکی ہوگی۔ تو گاڑی میں بیٹھ، میں یہ دودھ گرم کرکے لاتا ہوں۔'' وہ گاڑی سے اتر کر ایک چھپر ہوٹل کی طرف بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دودھ کا جگ اور ایک سلور کا گلاس لے کر آگیا اور بولا۔ ''لے بیٹا! دودھ کو ٹھنڈا کرکے اسے پلا دے، میں نے اس میں چینی بھی ملا دی ہے۔''

میں نے تشکر سے اس بوڑھے کی طرف دیکھا جس کے پاس دنیا کی دولت تو نہیں تھی لیکن وہ خلوص اور ہمدردی کی دولت سے مالا مال تھا۔

میں نے دودھ ٹھنڈا کرکے شانو کو اٹھایا اور اسے دودھ پلانے لگا۔ وہ بے چاری بھی بہت بھوکی تھی اس لیے فوراً ہی دودھ پی گئی۔

پھر گاڑی بان نے مجھے ایک بس میں بٹھایا اور کنڈیکٹر سے کہا۔ ''ان بچوں کو دھیان سے گجرات پر اتار دینا۔''

میں شانو کو لے کر بس میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد بس روانہ ہوگئی۔

وہ گاڑی بان مجھے زندگی میں پھر کبھی نہیں ملا لیکن اس نے میرے ذہن پر ایسے اَن مٹ نقوش چھوڑے ہیں کہ میں اسے آج بھی یاد کرتا ہوں تو میرے دل سے اس کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔

بس میں بیٹھ کر میں ایک مرتبہ پھر سو گیا لیکن جلد ہی شانو کے رونے سے میری آنکھ کھل گئی۔ بس میں اس وقت بہت رش ہوگیا تھا۔ شانو کو اتنی بھیڑ بھاڑ کی عادت نہیں تھی اس لیے وہ گھبرا کر رونے لگی۔ میں نے اسے اپنے کندھے سے لگالیا۔ باہر اب اچھی خاصی دھوپ نکل آئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد کنڈیکٹر میرے پاس آیا اور بولا۔ ''چل بیٹا! اترنے کی تیاری کر، اگلا اسٹاپ گجرات کا ہے۔''

گجرات کے لاری اڈے پر اتر کر میں نے پانی کا ایک نل دیکھ کر شانو کا ہاتھ منہ دھلایا، پھر اسے ایک طرف بٹھا کر اور بھی منہ ہاتھ دھویا، انگلیوں سے بال سنوارے اور وکیل صاحب کے گھر روانہ ہوگیا۔ اب تو اللہ کے بعد انہی کا آسرا تھا۔ وہ بابا کے بہت بے تکلف دوست بھی تھے۔ میں اس سے قبل بھی بابا کے ساتھ دو تین دفعہ وکیل صاحب کے گھر جاچکا تھا اس لیے مجھے ان کے گھر پہنچنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔

ان کی گلی کی طرف مڑتے ہی میں ٹھٹک کر رہ گیا۔

وکیل صاحب کے بنگلے کے سامنے چاچو کی بیجیرو کھڑی تھی۔ گویا ان لوگوں کو بھی اندازہ تھا کہ میں گاؤں سے فرار ہو کر کہاں جاسکتا ہوں۔

میں الٹے قدموں واپس ہولیا اور وقت گزاری کے لیے بازار کی طرف نکل گیا۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ میرے پاس ابھی پیسے باقی تھے۔ میں نے سوچا کہ پہلے میں کچھ کھا لوں اور شانو کو بھی کھلا دوں۔

میں نے ایک ٹھیلے سے چھولے خریدے، اس کے پاس نان بھی تھے اور بہت سے مزدور پیشہ لوگ وہاں کھڑے کھڑے کھا رہے تھے۔

میں شانو کو لے کر ایک طرف بیٹھ گیا اور جلدی جلدی کھانے لگا۔ کھانا کھا کر کچھ جان میں جان آئی۔ میں نے شانو کے لیے بھی بسکٹ کا ایک ڈبّا خریدا اور بازار سے نکل کر ایک گھنے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ گیا۔ وہاں بیٹھ کر میں نے شانو کو بسکٹ کھلائے۔

دو گھنٹے بعد میں پھر وکیل صاحب کے بنگلے پر پہنچا۔ اس وقت وہاں چاچو کی بیجیرو نہیں تھی۔ گویا وہ لوگ واپس جا چکے تھے۔

ڈور بیل کے جواب میں وکیل صاحب کا ایک ملازم باہر نکلا۔ اس نے مجھ پر ایک نظر ڈالی پھر درشت لہجے میں بولا۔ ''کی بات ہے؟'' وہ مجھے پہچانا نہیں تھا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں کسی بڑے جاگیردار کا بیٹا ہوسکتا ہوں۔

''مجھے وکیل صاحب سے ملنا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کون وکیل صاحب؟'' ملازم نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''بیرسٹر احسان علی کا بنگلا یہی ہے نا؟'' میں نے بھی تلخ لہجے میں پوچھا۔

''ہاں تو پھر؟'' ملازم نے کہا۔

''ان سے کہو کہ ملک ایاز کا بیٹا خرم آیا ہے۔'' میں نے بارعب لہجے میں کہا۔

''خرم!'' اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ''آپ... وہ لوگ بھی آپ کو پوچھ رہے تھے۔''

''کون لوگ؟'' میں نے پوچھا۔

”آج صبح ملک نواز کے آدمی بھی آپ کو پوچھتے ہوئے آئے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ خرم ان کے ایک آدمی کو قتل کر کے اور خاصی نقدی اور زیور لے کر وہاں سے بھاگا ہے۔“

”بکواس کرتے ہیں وہ لوگ۔“ میں نے کہا۔ ”تم انکل کو بتاؤ کہ خرم آیا ہے۔“

”لیکن خرم صاحب! وکیل صاحب تو کل ہی لندن گئے ہیں۔ وہاں انہیں کچھ ضروری کام ہے، وہاں سے وہ امریکا جائیں گے۔“

میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔ میں نے مایوسی سے پوچھا۔ ”وکیل صاحب واپس کب تک آئیں گے؟“

”خرم صاحب! وہ ڈیڑھ دو مہینے سے پہلے واپس نہیں آئیں گے۔ وہ تو ہر سال گرمیوں میں لندن جاتے ہیں۔ وہاں ان کی بہن رہتی ہیں۔ گرمی کی چھٹیاں وہ وہیں گزارتے ہیں۔“

”اچھا۔“ میں نے مایوسی سے کہا۔ ”پھر میں دو مہینے بعد آؤں گا۔“

”آپ اندر تو چلیں۔ کچھ دیر آرام کر لیں۔ آپ مجھے بہت تھکے تھکے لگ رہے ہیں۔“ ملازم نے ہمدردی سے کہا۔

”نہیں چاچا!“ میں نے کہا۔ ”آپ کا بہت شکریہ۔ میں اب واپس جاؤں گا۔“ میں شانو کو کندھے سے لگا کر وہاں سے واپس آ گیا کیونکہ شانو پھر سو گئی تھی۔

اب سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ میں کہاں جاؤں؟ چاچو کے علاوہ میرا کوئی ایسا رشتے دار بھی نہیں تھا جہاں میں جا سکتا۔ دور کے کچھ رشتے دار تھے تو وہ بھی ہمارے گاؤں کے نزدیک ہی رہتے تھے۔ میں وہاں چلا بھی جاتا تو چاچو کو فوراً اطلاع مل جاتی۔

سوچ سوچ کر میرا سر پھوڑے کی طرح دکھنے لگا۔ میں اگر اکیلا ہوتا تو کسی فٹ پاتھ یا پارک میں بھی رہ لیتا لیکن میرے ساتھ شانو تھی۔

پھر میں نے سوچا کہ بھٹکنے کے بجائے کراچی یا لاہور چلا جاؤں۔ وہاں کم سے کم مجھے مزدوری تو مل جائے گی۔ ممکن ہے کہیں کوئی چھوٹی موٹی ملازمت بھی مل جائے۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ میں یہاں سے کہیں اور جاؤں کیسے؟ گاڑی بان نے مجھے جو پیسے دیے تھے، وہ ختم ہو چکے تھے۔

شانو بھی اب جاگ رہی تھی اور حیرت سے اپنے اردگرد کے لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔

اچانک اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ”بھیا!“

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”کیا بات ہے گڑیا؟“

اس نے دودھ کی بوتل کی طرف اشارہ کر دیا۔

میں اسے لے کر پھر ایک بند دکان پر بیٹھ گیا اور دودھ کی بوتل اس کے منہ سے لگا دی۔ اس نے کچھ دودھ پیا، پھر بوتل بے دلی سے ایک طرف ہٹا دی۔ کچھ دودھ اس کی گردن اور کپڑوں پر بھی گر گیا۔ میں نے اپنی قمیص کے دامن سے اس کا منہ اور گردن صاف کی تو میری نظر سونے کی چین پر پڑی۔ وہ چین اماں نے شانو کو پہنائی تھی۔ میں نے وہ چین اتار لی۔ اماں نے تو اپنی محبت میں اسے یہ چین پہنائی تھی لیکن آج وہی سونے کی چین میرے لیے امید کی کرن بن گئی تھی۔

میرا اندازہ تھا کہ اس چین کا وزن کم سے کم بارہ، پندرہ گرام تو ہوگا۔ اسے فروخت کرنے کے بعد مجھے اتنی رقم مل سکتی تھی کہ میں کراچی یا لاہور کہیں بھی جا سکتا تھا اور اگر کفایت شعاری سے خرچ کرتا تو کافی ...... دن آرام سے گزار سکتا تھا۔

اب سب سے بڑا مسئلہ اسے فروخت کرنے کا تھا۔ میرا حلیہ ایسا نہیں تھا کہ کوئی بھی سنار مجھ پر اعتبار کرتا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی سمجھتے کہ میں یہ چین کہیں سے چرا کر لایا ہوں۔

آخر ایک ترکیب میرے ذہن میں آ گئی۔ میں بہت اعتماد سے بڑی سی ایک دکان میں داخل ہوا اور کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔ کاؤنٹر پر پہلے ہی دو تین خواتین اور مرد موجود تھے۔ دو سیلز مین انہیں زیورات دکھا رہے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی ادھیڑ عمر کا ایک سیلز مین میری طرف آیا اور درشت لہجے میں بولا۔ ”کیا بات ہے؟“

”مجھے اس چین کا وزن کرانا ہے۔“ میں نے کہا۔

سیلز مین نے مشکوک انداز میں میری طرف دیکھا، پھر چین پر ایک نظر ڈالی اور بولا۔ ”کہاں سے لایا ہے یہ چین؟“

”لوگ کہاں سے لاتے ہیں زیورات؟“ میں نے جان بوجھ کر اپنا لہجہ تلخ بنا لیا۔ ”میں کوئی مفت میں وزن نہیں کرا رہا ہوں، اس کے پیسے دوں گا۔“ میں نے اپنا لہجہ برقرار رکھا۔

”میں پوچھ رہا ہوں تُو لایا کہاں سے یہ چین؟“ سیلز مین تحقیر آمیز انداز میں بولا۔

”اس سوال کا مقصد کیا ہے؟“ میں نے رواں انگریزی میں کہا۔

ہماری تکرار سن کر باوقار سا ایک آدمی ہماری طرف بڑھا اور سیلز مین سے بولا۔ ”کیا مسئلہ ہے، کیوں شور مچا رکھا ہے؟“

”یہ لڑکا اس چین کا وزن کرانا چاہتا ہے سیٹھ صاحب۔“ سیلز مین نے یوں کہا جیسے میں وزن کرا کے کوئی بہت بڑا گناہ کرنے والا ہوں۔

”تو پھر؟“ باوقار شخص نے منہ بنا کر پوچھا۔ وہ یقیناً دکان کا مالک تھا۔ ”میں پوچھ رہا ہوں، مسئلہ کیا ہے؟“

”سیٹھ صاحب!“ سیلز مین نے کہا۔ ”مجھے تو لگتا ہے کہ یہ چین کہیں سے چرا کر لایا ہے۔“

”تو اس میں اتنے ہنگامے کی کیا ضرورت ہے؟“ سیٹھ صاحب نے کہا اور مجھ سے بولے۔ ”ہاں بھائی، یہ چین تم کہاں سے لائے ہو؟“

”یہ چین میری والدہ کی ہے۔“ میں نے کہا۔

”اس کی رسید ہے تمہارے پاس؟“ سیٹھ صاحب نے پوچھا۔

”نہیں، رسید تو نہیں ہے۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا۔

”یہاں ہم چوری کی چیزیں نہیں خریدتے۔“ سیٹھ صاحب نے سرد لہجے میں کہا۔

”سیٹھ صاحب! پولیس کو اطلاع کر دیں۔ وہ لوگ خود ہی معلوم کر لیں گے کہ یہ چین کہاں سے لایا ہے۔ گزشتہ دنوں آپ نے غفار صاحب کا حشر نہیں دیکھا، انہوں نے چوری کی دو چوڑیاں خریدی تھیں۔“

”آپ لوگ شوق سے پولیس کو بلائیں۔“ میں نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ ”میں بیرسٹر احسان علی صاحب کے گھر ٹھہرا ہوا ہوں۔ کسی ضرورت کے تحت ہی یہ چین بیچ رہا ہوں۔ اگر آپ بیرسٹر صاحب کو نہیں جانتے تو پولیس والے ضرور جانتے ہوں گے۔“

”تم... بیرسٹر صاحب کے گھر...“

”ہاں، میں وہیں سے آ رہا ہوں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اگر آپ کو یقین نہ ہو تو ابھی بیرسٹر صاحب کو فون کر لیں۔“

سیٹھ...... نے ایک نظر مجھے دیکھا۔ بیرسٹر صاحب کے نام سے زیادہ وہ میرے اعتماد اور رواں انگریزی سے متاثر نظر آ رہا تھا۔

”فیروز!“ اس نے سیلز مین سے کہا۔ ”اس چین کا وزن کر دو۔“

فیروز اسی ادھیڑ عمر سیلز مین کا نام تھا جو اب تک مجھ سے بحث کرتا رہا تھا۔ اس نے منہ بنا کر مجھے دیکھا پھر چین میرے ہاتھ سے لے لی اور اسے ایک ڈیجیٹل ترازو میں رکھ دیا اور بولا۔ ”تقریباً پندرہ گرام ہے سیٹھ صاحب۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے چین واپس لیتے ہوئے کہا۔ ”اب ذرا مجھے اس کی رسید بنا دیں اور وزن کرانے کے جتنے پیسے ہوں، وہ بھی بتا دیں۔“

سیٹھ نے مجھے حیرت سے دیکھا اور بولا۔ ”تم یہ چین بیچو گے نہیں؟“

”بیچنا تو ہے لیکن آپ تو شاید نہ خریدیں کیونکہ میرے پاس اس کی رسید نہیں ہے۔“

”اب تم نے بیرسٹر صاحب کا حوالہ دیا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ انہوں نے چین میرے ہاتھ سے لے کر کسوٹی پر پرکھی پھر بولے۔ ”میں تمہیں اس کے پینتیس ہزار دے سکتا ہوں۔“

”سوری سر!“ میں نے کہا۔ ”چین اگر چوری کی ہوتی تو میں اسے تیس ہزار میں بھی بیچ دیتا لیکن آپ تو بہت کم قیمت لگا رہے ہیں۔“

”ذرا مجھے دکھانا بیٹا۔“ میرے نزدیک کھڑی ہوئی ایک خاتون نے کہا۔ اپنے حلیے اور لباس سے وہ کسی بڑے گھرانے کی لگ رہی تھیں۔

میں نے چین ان کی طرف بڑھا دی۔ انہوں نے چین کا جائزہ لیا پھر سیٹھ صاحب سے بولیں۔ ”اگر یہ چین میں لے لوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟“

”شوق سے لیں بیگم صاحبہ۔“ سیٹھ نے جلدی سے کہا۔

”بیٹا! آپ اس کے پچاس ہزار مانگ رہے ہیں نا؟“ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔

”میں آپ کو چیک دے دیتی ہوں، آپ...“

”سوری بیگم صاحبہ! مجھے کیش چاہیے۔“ میں نے کہا۔

بیگم صاحبہ چند لمحے تک کچھ سوچتی رہیں، پھر سیٹھ صاحب سے بولیں۔ ”ایسا کریں، آپ مجھ سے یہ چیک لے لیں اور اس لڑکے کو پچاس ہزار روپے دے دیں۔ آپ کو تو ہمارے چیک پر بھروسا ہے نا؟“

”جی ضرور۔“ سیٹھ صاحب نے بے دلی سے کہا اور ان سے چیک لے کر مجھے پچاس ہزار روپے دے دیے۔

”تھینک یو سر!“ میں نے کہا۔ ”تھینکس میڈم!“ میں نے خاتون کا شکریہ ادا کیا اور دکان سے باہر نکل آیا۔

میں نے سب سے پہلے ایک سوٹ کیس خریدا پھر اپنے اور شانو کے لیے کپڑے اور جوتے خریدے اور وہاں سے

سیدھا ریلوے اسٹیشن چلا گیا۔ پھر میں نے کراچی کا ٹکٹ لیا اور پلیٹ فارم پر آ گیا۔

☆☆☆

میرا خیال تھا کہ کراچی پہنچ کر مجھے کہیں چھوٹی موٹی ملازمت بھی مل جائے گی اور رہنے کا معقول ٹھکانا بھی۔ میں یہ بھلا بیٹھا تھا کہ میرے ساتھ شانو بھی ہے اور اس کے ہوتے ہوئے میں ملازمت کیسے کر سکتا ہوں۔ میں ملازمت کرتا تو اسے کہاں چھوڑتا؟

میرے پاس جو رقم تھی، وہ تیزی سے کم ہو رہی تھی۔ یہ سوچ سوچ کر میرا دماغ شل ہو گیا کہ جب یہ رقم بھی ختم ہو جائے گی تو میں کیا کروں گا؟

میرا سارا دن شانو کو گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتے گزرتا۔ ایک دن میں یونہی بھٹکتا ہوا جوڑیا بازار پہنچ گیا۔ وہاں عجیب عالم تھا۔ ٹریفک کا حد درجے ازدحام تھا۔

اچانک میری نظر کچھ لڑکوں پر پڑی۔ ان میں سے کچھ تو میرے ہم عمر تھے، کچھ مجھ سے بڑے اور کچھ چھوٹے تھے۔ وہ بھاگ بھاگ کر خریداروں کا سامان اٹھا رہے تھے اور اسے ان کی سواریوں تک پہنچا کر مزدوری وصول کر رہے تھے۔

میں نے سوچا کہ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ یہی سوچ کر میں آگے بڑھا۔ ایک صاحب چھوٹے بڑے بہت سے ڈبے اور شاپرز کا ڈھیر لگائے کھڑے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ ”صاحب! مزدور چاہیے؟“

انہوں نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر بولے۔ ”میاں مزدور تو چاہیے لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”میں آپ کا سامان گاڑی تک پہنچا دوں گا۔“ میں نے کہا۔

”گویا تم بھی مزدور ہو؟“ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

”جی ہاں، میں بھی مزدور ہوں۔“ میں نے کہا۔

”چلو تو پھر اٹھاؤ سامان۔“ انہوں نے کہا۔

میں نے اردگرد دیکھا تاکہ کسی مناسب سی جگہ شانو کو بٹھا دوں۔

”میاں مزدوری کرنے نکلے ہو تو اس بچی کو کیوں اٹھائے پھر رہے ہو؟“

”یہ بچی میری بہن ہے اور اس کا دنیا میں میرے سوا کوئی نہیں ہے۔ میں اسے اکیلا بھی تو نہیں چھوڑ سکتا۔“

”لگتا ہے، آج پہلی دفعہ مزدوری کرنے نکلے ہو؟“ انہوں نے کہا۔ ”تم اپنے حلیے اور شکل وصورت سے مزدور تو نہیں لگتے۔“

”آپ نے درست فرمایا۔“ میں نے کہا۔ ”میں واقعی آج پہلی دفعہ مزدوری کرنے نکلا ہوں۔ تھوڑی بہت جمع پونجی تھی، وہ ختم ہو رہی ہے۔ اگر اب بھی مجھے کوئی کام نہ ملا تو فاقوں کی نوبت آ جائے گی۔“

”ارے بھائی! رازق تو اللہ تعالیٰ ہے۔ تم کیوں فکر کرتے ہو؟“ پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔ ”تم کچھ پڑھے لکھے بھی ہو؟“

”میں لارنس کالج گھوڑا گلی میں پڑھتا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”بس حالات کی وجہ سے میٹرک کا امتحان نہیں دے سکا۔“

”تم مری کے اس مہنگے کالج میں پڑھتے تھے۔ پھر تو تم میرے لحاظ سے بہت پڑھے لکھے ہو۔ مجھے اپنی دکان کے لیے ایک محنتی اور ایماندار لڑکے کی ضرورت ہے۔“

”آپ کیا کاروبار کرتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ارے یار! دیکھ نہیں رہے ہو۔ میں نے کس چیز کی خریداری کی ہے؟ نارتھ کراچی میں میرا جنرل اسٹور ہے۔“

”چلیے، میں آپ کا سامان اٹھا لوں۔“

”رہنے دو۔“ وہ مسکرا کر بولے۔ ”اب تو تم دکان دار ہو۔ یہ کام تو مزدوروں کا ہے۔“ انہوں نے ایک لڑکے کو آواز دی اور اپنا سامان اٹھانے کو کہا۔

ان کے پاس نئے ماڈل کی سوزوکی کیری تھی۔ انہوں نے تمام سامان اس میں بھرا اور مجھے ساتھ بٹھا کر روانہ ہو گئے۔

مجھے مایوسی کے اندھیرے میں اچانک ہی امید کی کرن دکھائی دی تھی۔ مارے خوشی کے میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے لیکن شانو کا خیال آتے ہی میرا سارا جوش و ولولہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

ان کی گاڑی میں سی ڈی پلیئر بھی لگا ہوا تھا۔ انہوں نے اسے آن کر دیا اور گاڑی میں غزل گونجنے لگی۔ ”ہوش والوں کو خبر کیا بے خودی کیا چیز ہے۔“ اس کے ساتھ ساتھ وہ بھی گنگنا رہے تھے۔

اچانک وہ مجھ سے بولے۔ ”بھئی! اب تک تم نے اپنا نام بھی نہیں بتایا۔“

”میرا نام خرم ہے۔ ملک خرم ایاز... اور یہ میری بہن ہے شابانہ۔“

”میں ظفر الملک ہوں۔“ وہ مسکرا کر بولے۔ ”یار! یہ

والدین بھی عجیب ہوتے ہیں۔ نام رکھ دیتے ہیں شاہ جہاں اور بے چارہ شاہ جہاں مزدوری کر کے بمشکل ایک وقت کی روٹی کھا پاتا ہے۔ اب مجھے ہی لو، نام ہے ظفر الملک اور ظفر الملک صاحب صبح سے شام تک گاہکوں سے مغز ماری کرتے ہیں۔ ان کی اچھی بری باتیں سنتے ہیں، تب کہیں جا کر زندگی کی گاڑی گھسیٹ سکتے ہیں۔ لیکن بھائی احسان ہے اس مالک کا! اس نے لاکھوں کروڑوں سے اچھے حال میں رکھا ہوا ہے۔“ ظفر صاحب ضرورت سے کچھ زیادہ ہی بولتے تھے۔

”میرا نام بھی تو خرم ہے۔“ میں نے تلخ انداز میں ہنس کر کہا۔ ”میں کہیں سے آپ کو خوش وخرم نظر آتا ہوں؟“

”یار! تم تو شکل ہی سے کسی اعلیٰ خاندان کے لگتے ہو، اب اگر مناسب سمجھو تو بتا دو کہ تم پر ایسی کیا افتاد پڑی کہ تم لارنس کالج جیسا مہنگا تعلیمی ادارہ چھوڑ کر در در کی خاک چھان رہے ہو؟ اس کالج میں وزیروں، سفیروں، صنعت کاروں اور بڑے بڑے جاگیرداروں کے بچے پڑھتے ہیں۔ کوئی عام آدمی تو وہاں پڑھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

ان کی باتوں میں ایسی اپنائیت اور خلوص تھا کہ میں نے ان سے کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی اور سب کچھ انہیں تفصیل سے بتا دیا۔

میری باتیں سن کر ظفر صاحب بھی افسردہ ہو گئے۔

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولے۔ ”زن، زر، زمین یہ تین چیزیں ہی جھگڑے اور فساد کی جڑ ہیں۔ جب سے دنیا بنی ہے، یہ جھگڑا ابھی اس وقت سے چل رہا ہے۔“

”میں اسی لیے اپنی بہن کو لے کر اپنی جاگیر سے اتنی دور آ گیا ہوں۔ خدا کی قسم! اگر چاچو مجھ سے جاگیر کا مطالبہ کرتے تو میں بلا حیل وحجت تمام جاگیر ان کے حوالے کر دیتا لیکن وہ چاچا بن کر مانگتے تو...“

”لیکن اب نہیں خرم!“ ظفر صاحب نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اپنا تو یہ اصول ہے کہ جنگ میں پہل مت کرو اور اگر کوئی جنگ میں پہل کر دے تو پھر اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرو۔ میں تمہیں تمہارا حق دلاؤں گا۔ میں اگرچہ بہت چھوٹا آدمی ہوں لیکن دشمنوں کو معاف کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں، تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں۔“ پھر وہ چونک کر بولے۔ ”لیکن خرم! لگتا ہے، تم اس ملازمت سے خوش نہیں ہو۔ خوش ہو بھی کیسے سکتے ہو۔ تم ٹھہرے جاگیردار۔ تم تو مجھ جیسے دسیوں ملازم رکھ سکتے ہو۔“

”یہ بات نہیں ظفر بھائی!“ میں نے انہیں پہلی دفعہ بھائی کہا۔ ”مجھے صرف یہ پریشانی ہے کہ میں شانو...“

”میں شانو کے بارے میں پہلے ہی سوچ چکا ہوں۔“ وہ مسکرا کر بولے۔ ”میاں بزنس مین ہوں۔ کوئی بھی ڈیل کرنے سے پہلے ہر بات پر غور کر لیتا ہوں۔ شانو امی کے پاس رہے گی۔ یہ تو اتنی پیاری بچی ہے کہ امی اسے دیکھ کر خوش ہو جائیں گی۔ میری امی بہت اچھی ہیں، تمہیں بھی ان سے مل کر خوشی ہو گی۔“

”ہاں ظفر بھائی۔“ میں نے افسردگی سے کہا۔ ”مائیں تو ہوتی ہی اچھی ہیں۔“

”لو بھئی، باتوں ہی باتوں میں ہم گھر پہنچ گئے۔“ انہوں نے خوب صورت سے ایک دو منزلہ مکان کے ساتھ گاڑی روکتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہے میرا غریب خانہ۔“

انہوں نے دروازے پر لگی گھنٹی بجائی تو ایک بنگالی ملازم باہر نکلا اور بولا۔ ”ارے جعفر صاحب! آپ ہائے، ہم بولا مجلے کا لور کا لوگ تو نگ کرتا ہے۔“ (محل کا لڑکا لوگ تنگ کرتا ہے)

”سامان نکال کر اندر لاؤ۔“ ظفر بھائی نے کہا اور مجھ سے بولے۔ ”آؤ خرم!“

میں آہنی پھاٹک سے اندر داخل ہوا۔ مکان کے آگے چھوٹا سا ایک خوب صورت لان تھا۔ اس کی عمارت بھی بہت خوب صورت تھی۔

”نیچے کی منزل میں ڈرائنگ روم اور تین بیڈ رومز ہیں۔ ان میں اکثر میرے مہمان ٹھہرتے ہیں۔ اوپر بھی تین بیڈ رومز اور ٹی وی لاؤنج ہے۔ میں امی کے ساتھ اوپر رہتا ہوں۔“ ظفر بھائی نے کہا۔

”اور بھابی؟“ میں نے پوچھا۔

”یار! یہاں بھابی کی نسل کا کوئی جانور نہیں ہے۔“ ظفر بھائی مسکرا کر بولے۔

”کیا آپ نے ابھی تک شادی نہیں کی؟“ میں نے پوچھا۔

”یار! ابھی تک سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“ ظفر بھائی برا مان کر بولے۔ ”کیا میں تمہیں بوڑھا نظر آ رہا ہوں؟“

”نہیں، میرا مطلب ہے کہ اب آپ کو شادی کر لینی چاہیے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”او بھائی! امی سے ملے بغیر ہی تم ان کی زبان بولنے لگے۔“

میں نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن اس وقت تک ہم

اوپر پہنچ چکے تھے۔ اوپر خاصا کشادہ، صاف ستھرا اور سادگی سے آراستہ لاؤنج تھا۔ لاؤنج میں ایک تخت بچھا ہوا تھا۔ اس پر سفید براق چادر اور مخملی گاؤ تکیے رکھے تھے۔ تخت پر باوقار سی ایک خاتون بیٹھی تھیں۔ ان کے چہرے پر نازک سے فریم کا ایک چشمہ تھا اور بالوں کی ایک لٹ سفید ہوگئی تھی جو ان کے وقار میں مزید اضافہ کررہی تھی۔

انہوں نے حیرت سے مجھے اور شانو کو دیکھا۔ میں نے انہیں سلام کیا تو وہ سلام کا جواب دے کر ظفر بھائی سے بولیں۔ ''ظفر! کون ہے یہ لڑکا؟''

''امی! یہ خرم ہے اور یہ اس کی بہن شاہانہ۔ یہ میرے ایک دوست کا بھائی ہے اور کراچی گھومنے آیا ہے۔''

''اچھا اچھا۔'' انہوں نے مطمئن انداز میں سر ہلایا پھر چونک کر بولیں۔ ''خرم بیٹا! کیا تمہیں اپنی بہن سے بہت پیار ہے؟''

''جی آنٹی۔'' میں نے کہا۔ ''یہ تو مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ پیاری ہے۔''

''لیکن بیٹا! تم اتنی چھوٹی بچی کو لاہور سے کراچی لے آئے۔ کیا تم اس کی دیکھ بھال کرلو گے؟''

''آنٹی! اصل میں شاہانہ میرے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' میں نے کہا۔

''خرم! تم نہا دھو کر تازہ دم ہو جاؤ، پھر کھانا کھائیں گے۔''

''میں پہلے شانو کو نہلا دوں۔'' میں نے کہا۔

''بیٹا! اب تم شاہانہ کی فکر مت کرو۔ اسے میں نہلا دوں گی۔ تم جا کر نہاؤ۔ ہاں، تمہارا سامان کہاں ہے؟''

''امی! یہ موصوف تو ایک ہوٹل میں ٹھہر گئے تھے۔ میں نے کہا کہ کیوں غیروں والی بات کرتے ہو۔ جب گھر موجود ہے تو ہوٹل میں کیوں ٹھہرے ہو۔ میں شام کو جا کر ان کا سامان بھی لے آؤں گا۔''

☆☆☆

مجھے ظفر بھائی کے ساتھ رہتے ہوئے دو دن گزر چکے تھے۔ انہوں نے امی کو بھی سب کچھ بتا دیا تھا۔

اس دن میں دکان سے واپس آیا تو آنٹی نے مجھے اپنے پاس بلایا اور بہت شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر بولیں۔ ''خرم بیٹا! تم نے اتنی چھوٹی سی عمر میں بہت دکھ اٹھائے ہیں لیکن تم بہت بہادر بچے ہو۔ اتنے خراب حالات میں بھی تم نے اپنی بہن کا خیال رکھا۔ اتنی چھوٹی بچی کا خیال تو مائیں بھی اچھی طرح نہیں رکھ پاتی ہیں۔''

''آنٹی! شانو تو میری جان ہے۔ میں اس کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتا...''

''لیکن بیٹا! اب سمجھ لو کہ تمہاری تکالیف اور آزمائش کے دن ختم ہوگئے ہیں۔ شانو اب میری بیٹی ہے۔ تم اس کی طرف سے بالکل بے فکر ہو جاؤ اور اپنی تعلیم مکمل کرو۔''

ان کا ہمدردانہ لہجہ اور پیار بھری باتیں سن کر میرا دل بھر آیا اور میں بُری طرح رونے لگا۔ نہ جانے کب کے رکے ہوئے آنسو تھے جو میرے ضبط کا بندھن توڑ کر آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔

مجھے روتا دیکھ کر شانو بھی رونے لگی اور اپنی توتلی زبان میں بولی۔ ''بھیا! آکوکس نے مالا؟'' (آپ کو کس نے مارا ہے؟)

میں نے بے اختیار اسے سینے سے لگا لیا اور اپنے آنسو پونچھ لیے۔

ایک دن میں دکان پر پہنچا تو ظفر بھائی کے ساتھ ایک اجنبی بھی بیٹھا تھا۔

مجھے دیکھ کر ظفر بھائی نے کہا۔ ''آؤ خرم!'' پھر وہ اجنبی سے بولے۔ ''دانش! یہی خرم ہے۔ میں نے اس کے بارے میں تمہیں بتایا تھا نا!''

''اچھا، یہ ہے خرم؟'' دانش نے توصیفی انداز میں مجھے دیکھا۔

ظفر بھائی مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ''یہ میرے بچپن کا دوست دانش ہے۔ کلاس ون سے لے کر بی اے تک ہم لوگ ایک ہی اسکول اور کالج میں پڑھے ہیں۔ اس دنیا میں یہی میرا واحد دوست ہے۔''

''ظفر بھائی! آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ کا کوئی دوست بھی ہے۔ مجھے دیکھیں، میں تو شروع سے اکیلا ہوں۔'' میرے لہجے میں افسردگی تھی۔

''او بھائی! اس میں پریشانی کی کیا بات ہے، تم مجھ سے دوستی کرلو۔ دوستی کے لیے بہت طویل عرصے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دوستی تو محبت کی طرح خود بہ خود جڑ پکڑ لیتی ہے۔''

''بی اے کے بعد میں نے تعلیم کو خیرباد کہہ دیا لیکن دانش پڑھتا رہا۔ یونیورسٹی سے ماسٹر کرنے کے بعد یہ ایک بڑے روزنامے میں کرائم رپورٹر ہوگیا۔ اب قلم سے زیادہ ہاتھ چلاتا ہے بلکہ قلم چلانے سے پہلے بھی یہ ہاتھ ہی زیادہ چلاتا تھا۔ اس نے یونیورسٹی کے دور میں ایک بہت طوفانی قسم کا عشق کیا اور عشق میں ناکامی کے بعد اپنے ہونے والے سالوں کے ہاتھ پیر توڑ دیے۔ نتیجے کے طور پر اس کی ہونے

والی منکوحہ نے اس سے تمام بندھن توڑ دیے اور اب یہ اس کے انتظام کی خاطر لوگوں کے سر توڑتا ہے۔''

''یار! تو تو بولتے ہوئے سانس بھی نہیں لیتا۔'' دانش نے کہا۔

''بس، وہ دن ہے اور آج کا دن ہے۔ یہ عشق میں ناکام ہونے کے بعد پوری دنیا سے بیزار ہوگیا ہے۔ لوگ تو ڈنکے کی چوٹ پر عشق کرتے ہیں، یہ عشق بھی گن پوائنٹ پر کرتا تھا۔''

''کر چکا بکواس؟'' دانش نے ظفر بھائی کو گھورتے ہوئے کہا۔

''میں تیری تعریفیں کررہا ہوں اور تُو اسے بکواس کہہ رہا ہے؟'' ظفر بھائی نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

میں نے دلچسپی سے دانش کی طرف دیکھا۔ ظفر بھائی کی طرح وہ بھی خاصا وجیہہ آدمی تھا، کپڑے پہننے کا سلیقہ بھی جانتا تھا۔ اس کا جسم ورزشی تھا اور میرا اندازہ تھا کہ قد بھی دراز ہوگا۔ اندازہ اس لیے کہ اس وقت دانش بیٹھا ہوا تھا۔

''یار خرم! ویسے دانش ہے بہت دبنگ آدمی۔ جب یہ اسٹوڈنٹس لیڈر تھا تو اپنی شعلہ بیانی سے اک آگ سی لگا دیتا تھا۔ اب یہ صحافی ہے تو بڑے بڑے جغادری بیوروکریٹس اور سیاست داں اس سے گھبراتے ہیں۔''

''یار خرم! یہ تو بکواس کیے جائے گا۔ میرا صرف ایک اصول ہے... جیو اور جینے دو۔ میں خود سے کسی کو چھیڑتا نہیں اور اگر کوئی مجھے چھیڑتا ہے تو میں اسے چھوڑتا نہیں۔ ہاں، مجھ میں یہ خرابی بھی ہے کہ میں اپنے دشمنوں کو خود ہی سزا سناتا ہوں اور خود ہی اس پر عمل درآمد بھی کرتا ہوں۔''

''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی دانش بھائی۔'' میں نے کہا۔

''لیکن مجھے تو خوشی اس دن ہوگی جب تم اپنا حق حاصل کرلو گے۔''

''دانش! میں سوچ رہا ہوں کہ خرم کے ساتھ گجرات کا ایک چکر لگا لوں۔ بیرسٹر صاحب سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور خرم کے چچا اور جاگیر کے حالات بھی معلوم ہو جائیں گے۔''

''پہلے ٹیلی فون کر کے معلوم تو کرلے کہ بیرسٹر صاحب گجرات ہی میں ہیں یا پاکستان سے باہر ہیں؟''

''دانش بھائی! میرے پاس بیرسٹر صاحب کا ٹیلی فون نمبر نہیں ہے۔''

''تم بھی کس زمانے کی بات کر رہے ہو۔ بیرسٹر صاحب کا نمبر تو میں یہیں بیٹھے بیٹھے حاصل کرسکتا ہوں۔'' اس نے اپنی جیب سے سیل فون نکالا اور مجھ سے بولا۔ ''بیرسٹر صاحب کا پورا نام کیا ہے؟''

''بیرسٹر احسان علی۔'' میں نے کہا۔

دانش نے اپنے سیل فون پر کسی کا نمبر ڈھونڈا پھر وہ نمبر ڈائل کردیا۔ دوسری طرف سے رابطہ ملنے پر وہ بولا۔ ''وعلیکم السلام! کیسے ہیں ظہیر صاحب؟ اللہ کا احسان ہے... نہیں، میں کراچی ہی میں ہوں... ہوسکتا ہے میں ایک آدھ ہفتے میں گجرات کا چکر لگاؤں... آپ سے ایک چھوٹا سا کام تھا... گجرات کے کوئی بیرسٹر ہیں احسان علی... احسان صدیقی نہیں، احسان علی... جی ہاں بیرسٹر ہیں... اچھا آپ جانتے ہیں؟ مجھے ان کا ٹیلی فون نمبر چاہیے... اچھا کتنی دیر میں... او کے، میں انتظار کررہا ہوں۔'' اس نے سلسلہ منقطع کر کے ظفر بھائی سے کہا۔ ''اب پانچ منٹ بعد بیرسٹر صاحب کا نمبر مل جائے گا۔''

''تو نے بات کس سے کی ہے؟'' ظفر بھائی نے پوچھا۔

''گجرات کے ایس ایس پی ظہیر عالم خان سے... وہ کہہ رہا تھا کہ وہ بیرسٹر احسان علی کو بہت اچھی طرح جانتا ہے۔ ابھی وہ ٹیلی فون کرکے...''

اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی تو اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ ''وہی ہے۔'' دانش نے سیل فون کی اسکرین پر نظر ڈالتے ہوئے کہا، پھر سیل فون کا بٹن دبا کر اسے کان سے لگا لیا۔ ''جی ظہیر صاحب! جی بولیے...'' اس نے ظفر بھائی کو کاغذ لانے کا اشارہ کیا۔ ظفر بھائی نے ایک رائٹنگ پیڈ اس کی طرف بڑھا دیا... ''جی ہاں بولیں... میں سن رہا ہوں۔'' پھر وہ پیڈ پر ٹیلی فون نمبر لکھنے لگا... ''تھینکس ظہیر صاحب۔'' دانش نے کہا۔ ''ہاں، بیرسٹر صاحب کا سیل نمبر بھی ہوگا آپ کے پاس؟... اچھا... اچھا... نہیں، ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے... ضرورت ہوگی تو پھر آپ کو زحمت دوں گا... جی جی... آپ حکم کریں... اچھا... اس وقت فائل کہاں ہے؟ ٹھیک ہے... میں پوری کوشش کروں گا... نہیں... میں آج ہی بات کرتا ہوں... کل اسی وقت ٹیلی فون کر کے آپ کو بتا دوں گا... او کے، اللہ حافظ۔''

مجھے دانش اچھا لگا تھا۔ اس نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی پھر اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ ''ظفر! میں چلتا ہوں۔ مجھے فوری طور پر پریس کلب پہنچنا ہے۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''تم سے بھی جلد ہی دوبارہ ملاقات ہوگی دوست!''

اس کے جانے کے بعد ظفر بھائی نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ بیرسٹر صاحب کو کل ٹیلی فون کریں۔“

”صبح تو وہ کورٹ کے لیے نکل جاتے ہیں۔ اس وقت وہ اپنے دفتر میں ہوں گے۔ آپ ابھی انہیں ٹیلی فون کر لیں۔“

”اچھا یار! تم کہتے ہو تو ابھی بات کیے لیتے ہیں۔“ انہوں نے ٹیلی فون سیٹ کا اسپیکر آن کیا اور بیرسٹر صاحب کے آفس کا ٹیلی فون نمبر پنچ کرنے لگے۔

دوسری طرف بیل بجتی رہی لیکن کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ میں ظفر بھائی سے کہنے والا تھا کہ بیرسٹر صاحب گھر چلے گئے ہوں گے، آپ ان کے گھر کے ٹیلی فون نمبر پر کال کریں۔ اچانک کسی نے ریسیور اٹھا لیا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے بیرسٹر صاحب کی بھاری آواز سنائی دی۔ ”ہیلو۔“

ظفر بھائی نے مجھے بولنے کا اشارہ کیا۔ میں نے کہا۔ ”السلام علیکم انکل!“

”وعلیکم السلام!“ بیرسٹر احسان نے جواب دیا پھر بولے۔ ”کون؟“

”انکل! میں خرم بول رہا ہوں، ملک ایاز کا بیٹا خرم!“

”تم کہاں ہو بیٹا؟“ انہوں نے پوچھا۔

”میں کراچی میں ہوں انکل! آپ کے پاس بابا کا وصیت نامہ تو محفوظ ہے نا؟“

”ہاں بیٹا!“ بیرسٹر صاحب نے کہا۔ ”لندن سے لوٹنے پر مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم میرے گھر آئے تھے۔ پھر میں نے تمہیں بہت تلاش کیا لیکن تمہارا کوئی سراغ نہ ملا۔ تم اس وقت کہاں ہو؟“

”میں کراچی میں ہوں انکل۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اب جلد ہی آپ سے گجرات آ کر ملاقات کروں گا۔“

”نہیں بیٹا!“ انکل جلدی سے بولے۔ ”تم یہاں مت آنا۔ میں مہینے میں ایک دو دفعہ کراچی کا چکر لگاتا ہوں۔ میں خود تمہارے پاس آ جاؤں گا۔“

”آپ کو زحمت ہوگی انکل۔“ میں نے کہا۔

”زحمت کیسی بیٹا!“ انہوں نے کہا۔ ”اپنے کام سے کراچی تو میں آتا ہی ہوں۔ تم مجھے اپنا ایڈریس اور ٹیلی فون نمبر لکھوا دو۔“

میں نے انہیں ظفر بھائی کے گھر کا ایڈریس اور ان کے گھر اور جنرل اسٹور کے ٹیلی فون نمبر لکھوا دیے۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ میں ایک ہفتے بعد کراچی آؤں گا، پھر تم سے تفصیلی بات ہوگی۔

ظفر بھائی نے کراچی کے ایک اچھے اسکول میں میرا داخلہ کرا دیا تھا اور میں اب میٹرک کی تیاری کر رہا تھا۔ شانو بھی اب پٹر پٹر بولنے لگی تھی۔ وہ آنٹی سے بہت مانوس ہو گئی تھی اور انہیں آنٹی کے بجائے امی کہتی تھی۔

اسکول کے بعد میں دکان پر چلا جاتا تھا۔ ظفر بھائی مجھ سے کہتے تھے کہ اب تم صرف اور صرف پڑھائی کرو۔

”لیکن ظفر بھائی! مجھے اچھا نہیں لگتا کہ...“

”فکر مت کرو جاگیردار صاحب۔“ ظفر بھائی نے مسکرا کر کہا۔ ”میں تم سے اپنی ایک ایک پائی وصول کروں گا۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں تم پر احسان کر رہا ہوں۔ میں بزنس مین ہوں اور بزنس مین کسی بھی گھاٹے کے سودے میں سرمایہ کاری نہیں کرتا۔“

میں جانتا تھا کہ وہ یہ باتیں میرا دل رکھنے کو کہتے ہیں۔ اس کے باوجود میں شام کو دکان پر چلا جاتا تھا۔

ظفر بھائی اتوار کو دکان بند رکھتے تھے۔ اس دن بھی اتوار ہی تھا۔ ہم لوگ ناشتا کر کے بیٹھے تھے۔ اچانک شانو بولی۔ ”ڈفر بھائی... آج... ہم لوگ... دھومنے دائیں گے۔“ (ظفر بھائی! آج ہم لوگ گھومنے جائیں گے)

”بھئی بہت خوب!“ ظفر بھائی ہنس کر بولے۔ ”وہ کم بخت قمرل تو جعفر کہتا ہے لیکن تم نے بالکل صحیح نام دیا ہے بیٹا... ڈفر بھائی!“ یہ کہہ کر وہ بے ساختہ ہنسنے لگے۔

ہم بھی ہنس رہے تھے اور تو اور وہ قمرل بھی دانت نکال رہا تھا۔

شانو ہمارے ہنسنے سے ایک دم پریشان ہو گئی اور رونے لگی۔

”ارے نہیں گڑیا!“ ظفر بھائی نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ ”ہم تم پر نہیں ہنس رہے تھے بیٹا!“

”ڈفر بھائی... تو پھر... تلیں؟“ (چلیں)

”ہاں بیٹا! ڈفر ہیں تو تلیں گے بھی، سموسے، پکوڑے سب کچھ تلیں گے۔“

ان کی اس بات پر آنٹی بھی ہنسنے لگیں اور کچھ نہ سمجھنے کے باوجود شانو بھی ہنسنے لگی۔

ڈور بیل بجی تو قمرل دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے تھوڑی دیر بعد آ کر بتایا کہ کوئی بیرسٹر احسان علی صاحب آئے ہیں، وہ خرم صاحب کو پوچھ رہے ہیں۔

”ارے تو انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔“ امی نے کہا۔

”میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔“

قمرل نے کہا۔

میں تیزی سے ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ میرے پیچھے پیچھے قمرل بھائی تھے۔ شانو ابھی تک ان کی گود میں چڑھی ہوئی تھی۔

مجھے دیکھ کر بیرسٹر احسان کھڑے ہو گئے۔ میں ان سے لپٹ گیا۔ بے اختیار مجھے بابا یاد آ گئے اور میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

بیرسٹر احسان نے میری پشت سہلاتے ہوئے کہا۔ ”ارے بیٹا! تم نے تو بہت بہادری سے حالات کا مقابلہ کیا ہے۔ تم ملک ہو، روتے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔“

”بس، آپ کو دیکھ کر بابا یاد آ گئے۔“ میں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”تمہیں دیکھ کر مجھے بھی ایاز یاد آیا تھا۔ تم ہو بہو اس کی تصویر ہو۔“

میں نے ظفر بھائی سے ان کا تعارف کرایا اور مختصراً انہیں بتایا کہ ظفر بھائی سے میری ملاقات کہاں اور کیسے ہوئی۔ بیرسٹر احسان نے بہت تپاک سے ظفر بھائی سے ہاتھ ملایا، پھر بولے۔ ”یہ بچی شاہانہ ہے؟“ انہوں نے شاہانہ کی طرف اشارہ کیا۔

”جی انکل!“ میں نے کہا۔

”ادھر آؤ بیٹا!“ انہوں نے پیار سے کہا۔

شاہانہ ان کے پاس چلی گئی۔

بیرسٹر صاحب نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”بالکل بھابی کی تصویر ہے۔“

”میں... تصویر نہیں ہوں، میں تانا (شاہانہ) ہوں۔“ اس نے بُرا مان کر کہا۔

انکل اس کی بات پر ہنسنے لگے پھر سنجیدہ ہو کر مجھ سے بولے۔ ”خرم بیٹا! میں ایاز کا وصیت نامہ لے آیا ہوں۔“ انہوں نے اپنا بریف کیس کھولا اور اس میں سے لیدر کا ایک فولڈر نکال کر میرے حوالے کر دیا۔ ”اس کی ایک کاپی میرے پاس بھی ہے۔ ایاز نے اپنی ساری زمین، جائداد اور بینک بیلنس تمہارے نام کر دیا ہے۔ دس مربع زمین شاہانہ کے لیے اور دس مربع زمین بھابی کے لیے تھی۔ انہوں نے اپنی حویلی بھی بھابی کے نام لکھی ہے۔“ پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولے۔ ”لیکن جائداد کے حصول کے لیے تمہیں اس وقت تک انتظار کرنا پڑے گا جب تک تمہاری عمر اکیس سال نہیں ہو جاتی۔ اس وقت تک تمہارے چچا ملک نواز جائداد کی نگرانی کریں گے اور تمہیں اخراجات کے لیے ہر ماہ ایک معقول رقم دیں گے۔ میں نے رقم کی وصولی کا بندوبست کر لیا ہے۔ وہ ہر ماہ میرے اکاؤنٹ میں رقم جمع کرائیں گے۔ میں وہ رقم تمہیں بھیج دوں گا۔ بہت بحث مباحثے کے بعد وہ بیس ہزار روپے ماہانہ پر راضی ہوئے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ رقم کافی نہیں ہے لیکن بیٹا! تمہیں پانچ چھ سال تک تو اس محدود رقم میں گزارہ کرنا پڑے گا۔“

”انکل! ان حالات میں تو میرے لیے یہ بھی کافی سے زیادہ ہیں۔“ میں نے ممنونیت سے کہا۔

انہوں نے بریف کیس سے ایک لفافہ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ اس میں میرے نام بیس بیس ہزار کے دو چیک تھے۔ پھر انہوں نے بریف کیس سے ایک ڈبا نکال کر مجھے دیا اور بولے۔ ”اس میں تمہارے لیے سیل فون ہے تاکہ کسی بھی وقت تم مجھ سے رابطہ کر سکو۔ میں نے اپنا نمبر بھی اس میں محفوظ کر دیا ہے اور تمہارا نمبر بھی میرے پاس ہے۔ ہاں، تم بینک میں اپنا اکاؤنٹ کھلوا لو تو اس کا نمبر مجھے بھیج دینا۔ آئندہ ماہ تمہاری رقم براہِ راست تمہارے اکاؤنٹ میں منتقل ہو جائے گی۔“

اسی وقت قمرل چائے اور دوسرے لوازمات لے آیا۔

”بھئی اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟“

”یہ تکلف ہے انکل؟“ ظفر بھائی نے کہا۔ ”اور آپ کا قیام کہاں ہے؟ آپ ہمارے ہی ساتھ قیام کریں۔“

”شکریہ بیٹے!“ انکل نے کہا۔ ”مجھے کل دو تین بہت ضروری کام ہیں اور میں کل شام ہی لوٹ جاؤں گا۔“

”انکل! آپ کچھ دن تو ہمارے ساتھ رہیں۔“

”خرم بیٹا! میں ابھی تو اپنے کام سے آیا تھا۔ آئندہ خاص طور پر وقت نکال کر آؤں گا، پھر ہم دو چار دن ساتھ رہیں گے۔“ پھر وہ چونک کر بولے۔ ”خرم بیٹا! تم ابھی گجرات، لاہور یا اپنے گاؤں جانے کی کوشش مت کرنا۔“

”کیوں انکل؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”نواز تمہارے خون کا پیاسا ہو رہا ہے بیٹا! میں چاہتا ہوں کہ جب تک تم اکیس سال کے نہ ہو جاؤ اور تمہیں جائداد نہ مل جائے، تم اس کے سامنے نہ آؤ۔ جائداد کے لالچ میں وہ تمہیں اور شاہانہ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔“

”انکل ٹھیک کہہ رہے ہیں خرم۔“ ظفر بھائی نے کہا۔ ”تمہارے چچا تو پہلے بھی تمہاری جان لینے کی کوشش کر چکے ہیں، وہ اب بھی ایسا کر سکتے ہیں۔“

چائے پینے کے بعد انکل کچھ دیر مزید بیٹھے پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”اب میں چلوں گا۔ کوشش کروں گا کہ

آئندہ ماہ تم سے پھر ملاقات ہو۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ انکل! آپ نے مجھ پر..."

"بس بیٹا!" وہ مسکرا کر بولے۔ "مزید بات نہیں۔ ایاز میرا بہت اچھا دوست تھا۔ میں تمہارے لیے تو کچھ بھی نہیں کر رہا ہوں بیٹا! اپنی دوستی کا قرض چکا رہا ہوں۔ مجھ پر ایاز کے بے شمار احسانات ہیں۔"

"میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں انکل۔" ظفر بھائی نے کہا۔ "یہاں کہاں آپ ٹیکسی ڈھونڈتے پھریں گے۔"

"میں نے ہوٹل کے رینٹ اے کار سے گاڑی لے لی ہے، شکریہ!"

بہت سی دعائیں دینے اور نصیحتیں کرنے کے بعد انکل روانہ ہو گئے۔

بیرسٹر احسان صرف بابا کی دوستی میں میرے لیے اتنا کر رہے تھے اور وہ جو میرا اپنا خون تھے، میرا ہی خون بہانے کے درپے تھے۔ اس دن چاچو سے میری نفرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

مجھے سوچ میں گم دیکھ کر ظفر بھائی مسکرا کر بولے۔ "یار! اب تو تم بھی صاحبِ ثروت ہو گئے۔ سیل فون، ہر ماہ بیس ہزار روپے اور مستقبل میں کروڑوں بلکہ اربوں کی جائداد کی وراثت۔ یار! کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بعد میں ہمیں پہچاننے سے انکار کر دو۔ تم جیسے جاگیردار ہم جیسے چھوٹے لوگوں کو منہ ہی کب لگاتے ہیں۔"

"ظفر بھائی!" میں نے برا مان کر کہا۔ "آپ بھی مجھ پر طنز کرنے لگے۔" میں منہ پھلا کر بیٹھ گیا۔

"اوہو جاگیردار صاحب کا مزاج برہم ہو گیا۔ میں مذاق کر رہا تھا۔"

"نہیں ظفر بھائی! آئندہ کبھی مذاق میں بھی ایسی بات مت کیجیے گا۔ آپ کے منہ سے ایسی باتیں سن کر مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔"

"اچھا نہیں کروں گا۔ اب تو ہنس کر دکھا۔ تیری رونی صورت مجھے بالکل اچھی نہیں لگتی۔"

ان کی بات سن کر میں بے ساختہ مسکرا دیا۔

☆☆☆

میں نے میٹرک کا امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کر لیا تھا اور اب کراچی کے ایک اچھے کالج میں پڑھ رہا تھا۔ بیرسٹر احسان ہر مہینے، دو مہینے کے بعد کراچی کا ایک چکر لگاتے تھے۔ ظفر بھائی کے اصرار پر اب وہ ہمارے ہی گھر میں قیام کرنے لگے تھے۔ سیل فون پر بھی ان سے میرا رابطہ تھا۔ اس دوران میں دانش بھائی سے بھی میری اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ ایکسر سائز اور جاگنگ کے شوقین تھے اور مجھے بھی ہمیشہ یہی تاکید کرتے تھے کہ انسان کو ہمیشہ چاق و چوبند رہنا چاہیے۔ میں جاگنگ تو کرتا ہی تھا، ان کی ہدایت پر میں نے ایک جم بھی جوائن کر لیا... اور شام کو ایک گھنٹا جم میں لگاتا تھا۔

میں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا تو بیرسٹر احسان نے مجھے ایک لیپ ٹاپ تحفے میں دیا۔ وہ بہت خوش تھے اور کہتے تھے کہ تم اپنے باپ کی خواہش ضرور پوری کرو گے اور انشاء اللہ ایک دن بہت کامیاب بیرسٹر بنو گے۔

شانو بھی اب اسکول جانے لگی تھی۔ میں ظفر بھائی کے گھر میں یوں رہتا تھا جیسے ہمیشہ سے یہاں رہتا آیا ہوں۔ شانو تو آنٹی کے بغیر کہیں ہلتی نہیں تھی۔ اب تو بعض اوقات مجھے بھی نظر انداز کر دیتی تھی۔

میں اس وقت کے انتظار میں تھا جب میری عمر اکیس سال ہو جاتی اور مجھے میرا حق ملتا۔

زندگی اسی ڈگر پر رواں دواں رہی۔ میں نے لاء کالج میں داخلہ لے لیا تھا اور یہاں میرا دوسرا سال تھا۔ تاریخ پیدائش کے مطابق اس وقت میری عمر بیس سال اور چار ماہ تھی۔ گویا ابھی مجھے آٹھ مہینے مزید انتظار کرنا تھا۔

شانو بھی اب خاصی بڑی ہو گئی تھی اور کراچی کے ایک بہترین اسکول میں پڑھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر بے اختیار مجھے اماں یاد آتی تھیں۔ وہ اماں ہی کی طرح حسین بھی اور اس چھوٹی سی عمر میں بھی اس نے خوب رنگ روپ نکالا تھا۔

میں روزانہ شام کو سات اور آٹھ بجے کے دوران میں انکل احسان کو فون کیا کرتا تھا۔

اس دن بھی میں نے انہیں فون کیا تو دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن انہوں نے کال ریسیو نہیں کی۔ میں نے دو تین مرتبہ کوشش کی لیکن ہر بار یہی ریکارڈنگ سنائی دی کہ آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب نہیں آ رہا ہے۔

میں نے سوچا کہ انکل اپنا سیل فون کہیں رکھ کر بھول گئے ہیں۔ میں نے انہیں لینڈ لائن پر کال کی تو دوسری طرف سے شاید ان کے بیٹے نے ریسیور اٹھایا اور بولا۔ "ہیلو۔"

"پلیز! ذرا انکل احسان سے بات کرا دیں۔" میں نے کہا۔

"کون صاحب بول رہے ہیں؟" بولنے والے کا لہجہ عجیب تھا۔

"میں خرم بول رہا ہوں، ملک خرم ایاز!" میں نے کہا۔

"خرم بھائی! ڈیڈی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔"

"کیا؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ اگر میں فوراً ہی دیوار کا سہارا نہ لے لیتا تو شاید چکرا کر زمین پر گر پڑتا۔

"خرم بھائی! ڈیڈی ایک گھنٹا پہلے بالکل ٹھیک تھے۔ آفس سے آنے کے بعد وہ چائے پی رہے تھے کہ اچانک ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ وہ صوفے پر گر پڑے اور اسپتال لے جانے سے پہلے ہی... وہ..."

ان کا بیٹا اپنی بات پوری نہ کر سکا اور بری طرح رونے لگا۔

"حوصلہ رکھو فرحان!" میں نے کہا۔ "میں پہلی میسر فلائٹ سے گجرات پہنچتا ہوں۔ تم میرا انتظار کرنا۔" میں نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور بلک بلک کر رونے لگا۔

"کیا ہوا خرم؟" اچانک ظفر بھائی کی آواز سنائی دی۔ "کس کا فون تھا اور تم رو کیوں رہے ہو؟"

"ظفر بھائی! ایک مرتبہ پھر میرے سر سے سائبان کھینچ لیا گیا ہے، مجھے ایک مرتبہ پھر اس جھلستی دھوپ میں آبلہ پائی کرنا ہو گی... انکل... احسان... ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئے۔"

"کب... کیسے؟" ظفر بھائی بوکھلا کر بولے۔

"میں نے ان کے گھر فون کیا تھا۔" میں نے روتے ہوئے کہا۔ "ایک گھنٹا پہلے انہیں دل کا دورہ پڑا تھا جو جان لیوا ثابت ہوا۔" پھر میں آنسو پونچھ کر بولا۔ "میں ابھی اور اسی وقت گجرات جا رہا ہوں۔"

"چلو، میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" ظفر بھائی نے کہا۔

"نہیں ظفر بھائی۔" میں نے کہا۔ "آپ امی کے پاس رکیں۔ ان کی طبیعت بھی گزشتہ دو روز سے بہت خراب ہے۔" آنٹی کی طبیعت واقعی بہت خراب تھی۔

"تم ایسا کرو، دانش کے ساتھ چلے جاؤ۔ میں تمہیں اکیلا وہاں نہیں جانے دوں گا۔ تمہیں یاد نہیں، انکل احسان نے کیا کہا تھا؟"

"ظفر بھائی! اب میں بچہ نہیں ہوں۔ میں..."

"خرم! پھر بھی احتیاط لازمی ہے۔" انہوں نے کہا۔ "میں دانش کو فون کرتا ہوں۔" انہوں نے جیب سے اپنا سیل فون نکالتے ہوئے کہا۔

میں اپنے کمرے میں جا کر بیگ میں کپڑے رکھنے لگا۔ مجھے وہاں تین دن تو لگ ہی جاتے۔

میں پیکنگ کر کے باہر نکلا تو ظفر بھائی نے بتایا کہ میں نے دانش سے کہہ دیا ہے۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں پہنچ رہا ہے۔

"ظفر بھائی! وہ مصروف آدمی ہیں۔ آپ ناحق انہیں تکلیف دے رہے ہیں۔"

"وہ میرے لیے اتنا وقت تو نکال ہی سکتا ہے، تم اس کی فکر مت کرو۔"

اسی رات گیارہ بجے ہم لوگ روانہ ہو گئے۔

انکل احسان کی کوٹھی پر ان کے دوستوں اور رشتے داروں کا ایک جم غفیر تھا۔ آنے والوں میں زیادہ تعداد وکیلوں، ججوں اور پولیس کے اعلیٰ افسران کی تھی۔

میں لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا کوٹھی کے اندر پہنچا۔ انکل کا بیٹا فرحان مجھ سے لپٹ کر بری طرح رونے لگا۔ میں نے بمشکل تمام اسے چپ کرایا۔ دل تو میرا بھی چاہ رہا تھا کہ میں دھاڑیں مار مار کر روؤں۔

اس وقت آنٹی بلکتی ہوئی میرے پاس آئیں اور بولیں۔ "خرم بیٹا! تمہارے انکل تم سے بہت محبت کرتے تھے۔ مرنے سے پہلے بھی وہ تمہیں ہی یاد کر رہے تھے۔" پھر وہ چونک کر بولیں۔ "انہوں نے ایک لفافہ میرے پاس رکھوایا تھا اور تاکید کی تھی کہ یہ لفافہ خرم کو دے دینا لیکن میری موت کے بعد۔ ممکن ہے اس کی ضرورت ہی نہ پڑے اور میں لفافہ تم سے واپس لے لوں۔"

وہ بیڈ روم میں گئیں اور خاکی رنگ کا ایک لفافہ نکال لائیں۔ میں نے وہ لفافہ اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

پھر آنٹی کو بہت سی خواتین نے گھیر لیا۔ مجھے بھی اس ماحول سے وحشت سی ہو رہی تھی۔ میں وہاں سے باہر نکل آیا اور دانش بھائی کو تلاش کرنے لگا جو لوگوں کی بھیڑ میں کہیں گم ہو گئے تھے۔

اچانک میری نظر ایک ایسے شخص پر پڑی جسے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ سرور تھا۔ چاچو کا خاص کارندہ سرور! وہ پہلے کے مقابلے میں کچھ زیادہ فربہ ہو گیا تھا، چہرے کی پھٹکار میں مزید اضافہ ہو گیا تھا اور آنکھوں میں وہی منحوس کی چمک تھی۔ میرا دل چاہا کہ میں یہیں اس کا گریبان پکڑ لوں اور اسے اتنا ماروں کہ وہ زندگی کی قید سے آزاد ہو جائے۔

اچانک پیچھے سے کسی نے میرے کندھے پر تھپکی دی۔ میں چونک کر مڑا۔ وہ دانش بھائی تھے۔ انہوں نے غور سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بات ہے خرم؟"

"دانش بھائی! میں نے ابھی سرور کو یہاں دیکھا ہے۔" میں نے کہا۔

"سرور؟" دانش بھائی نے الجھ کر پوچھا۔

"وہ جاچو کا خاص آدمی ہے۔ اسی نے مجھے اور شانو کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"کہاں ہے وہ؟" دانش بھائی چونک کر بولے۔

میں نے گھوم کر دیکھا لیکن سرور اب وہاں نہیں تھا۔ میں نے متلاشی انداز میں اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "وہ ابھی تو یہیں تھا۔"

"خیر، دیکھا جائے گا۔" دانش بھائی نے کہا۔ "تم ٹینشن مت لو۔"

میں قبرستان میں بھی سرور ہی کو تلاش کرتا رہا لیکن وہ مجھے پھر نظر نہیں آیا۔

قبرستان سے واپسی پر ایک ایک کر کے تمام لوگ رخصت ہو گئے تو دانش بھائی نے مجھ سے کہا۔ "میرے خیال میں اب ہم لوگوں کو بھی چلنا چاہیے۔"

"کہاں؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"گھر نہیں چلو گے، کیا اب یہیں رہو گے؟"

"دانش بھائی! میرا خیال تھا کہ میں انکل کے سوئم تک یہیں رہوں گا۔" میں نے کہا۔

"خیال تو میرا بھی یہی تھا۔" دانش بھائی نے کہا۔ "لیکن سرور کی یہاں موجودگی کے بارے میں سن کر میں نے اپنا خیال بدل دیا ہے۔ ہم کل صبح کی فلائٹ سے کراچی واپس چلے جائیں گے۔ تم آنٹی سے کہہ دینا کہ تمہارے امتحانات ہو رہے ہیں اس لیے تم زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتے۔"

"آنٹی بے چاری کیا کہیں گی۔" میں نے کہا۔ "میں خود یہاں رکنا چاہ رہا تھا۔"

"دیکھو خرم!" دانش بھائی نے کہا۔ "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کسی سے بھی نہیں ڈرتا، سوائے اللہ کے۔ لیکن اس وقت مصلحت اسی میں ہے کہ تم ہر قسم کے جھگڑے سے دور رہو۔ اب چند ہی مہینے تو رہ گئے ہیں پھر تم ڈنکے کی چوٹ پر انہیں للکارنا لیکن ابھی نہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ ہم یہاں سے ٹیکسی کے ذریعے لاہور چلتے ہیں، وہاں سے کراچی کی فلائٹ پکڑ لیں گے۔"

میں آنٹی سے رخصت ہو کر کوٹھی سے باہر نکلا تو دانش بھائی ایک گاڑی میں موجود تھے۔ ان کے ساتھ ایک صاحب اور بھی تھے۔ انہوں نے تو مجھے یہ بتایا تھا کہ وہ ٹیکسی لینے جا رہے ہیں، پھر یہ گاڑی؟

دانش بھائی مجھے دیکھ کر گاڑی سے باہر نکل آئے اور بولے۔ "اتنے حیران کیوں ہو خرم! گاڑی میں کیوں نہیں بیٹھتے؟"

"میں حیران اس بات پر ہوں کہ آپ تو ٹیکسی لینے گئے تھے لیکن..."

"ہاں، گیا تو میں ٹیکسی لینے تھا لیکن اچانک مجھے آصف مل گیا۔ آصف ایک سال پہلے میرے ساتھ اخبار میں کام کرتا تھا۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ اس کا تعلق گجرات سے ہے۔ ویسے تو یہاں ظہیر بھی ہے لیکن وہ اس وقت گجرات میں موجود نہیں ہے۔ اب آصف ضد کر رہا ہے کہ رات کو اس کے ساتھ ٹھہریں، چلو گاڑی میں بیٹھو۔" میں بیگ لے کر گاڑی میں بیٹھا تو اسٹیئرنگ پر بیٹھے ہوئے آدمی نے گھوم کر مجھے دیکھا۔ میں نے اسے سلام کیا۔

اس نے خوش خلقی سے میرے سلام کا جواب دیا۔ دانش بھائی نے بتایا کہ یہ میرے دوست آصف ہیں۔ پھر وہ آصف سے مخاطب ہوئے۔ "آصف! یہ میرا کزن خرم ہے۔"

رسمی گفتگو کے بعد ہم لوگ روانہ ہو گئے۔

آصف کا مکان پرانے طرز کا بنا ہوا تھا لیکن بہت کشادہ تھا۔ اس نے اوپر کی منزل پر ہمارے ٹھہرنے کا انتظام کر دیا تھا۔

دانش بھائی نے علی الصباح مجھے بیدار کر دیا۔ آصف صاحب ہمارے لیے چائے لے آئے تھے۔ پھر ہم انہی کی گاڑی میں ائرپورٹ تک پہنچے۔

ہم ڈپارچر لاؤنج میں پہنچے تو مجھے ایک لوڈر نظر آیا۔ مجھے اس کی شکل کچھ جانی پہچانی لگی۔ وہ مزید نزدیک آیا تو میں اسے پہچان گیا۔ وہ نادر چاچا تھے میں نے بے اختیار انہیں آواز دی۔

انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا' پھر بولے "جی فرمایئے؟"

"مجھے پہچانا نہیں نادر چاچا؟"

انہوں نے غور سے مجھے دیکھا، پھر بے اختیار میرے سینے سے لگ گئے اور بولے۔ "خرم بیٹا! آپ... آپ کیسے ہیں؟" وہ بے اختیار سسکنے لگے۔

"میں تو آج کل کراچی میں رہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اور جیسا ہوں، آپ کے سامنے ہوں چاچا۔ آپ سنائیں... آپ تو اس دن زخمی ہو گئے تھے؟"

"ہاں بیٹا!" نادر چاچا نے کہا۔ "میں بہت بری طرح

زخمی ہو گیا تھا لیکن ہوش میں تھا۔ وہ لوگ تو مجھے مُردہ سمجھ کر چھوڑ گئے تھے یا پھر وہ آپ دونوں کو مارنے آئے تھے۔ مجھے یہی فکر تھی کہ کہیں آپ ان لوگوں کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ پھر مجھے جان کر یہ خوشی ہوئی کہ آپ شاہانہ بی بی کو لے کر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ بعد میں ملک نواز نے مجھ پر الزام لگا دیا کہ نادر خان نے میرے بھتیجے اور بھتیجی کو اغوا کیا ہے۔ پولیس نے مجھ پر تشدد کی انتہا کر دی لیکن مجھے کچھ معلوم ہوتا تو بتاتا۔ آخر کورٹ سے مجھے تین سال کی سزا ہو گئی۔ ملک نواز نے مجھ پر چوری اور اغوا سمیت دو تین مزید مقدمے بنا دیے تھے۔ جیل سے رہا ہو کر میں لاہور چلا آیا اور وہاں ایک ٹرانسپورٹ کمپنی میں نوکری کر لی۔ پھر ایک سرکاری افسر کا ڈرائیور ہو گیا۔ اس افسر کا ٹرانسفر کراچی ہوا تو میں نے ملازمت چھوڑ دی اور یہاں عارضی طور پر لوڈر کی ملازمت کر لی۔"

دانش بھائی بہت غور سے نادر چاچا کی باتیں سن رہے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ وہی نادر چاچا ہیں...

"جوگاؤں میں تمہارے گارڈ تھے اور تمہیں بچاتے ہوئے خود زخمی ہو گئے تھے۔" دانش بھائی نے میرا جملہ پورا کر دیا۔

میں نے نادر چاچا کو بتایا کہ دانش بھائی میرے دوست بھی ہیں اور بڑے بھائی بھی۔

"نادر چاچا!" میں نے کہا۔ "یہ ملازمت چھوڑیں اور میرے ساتھ کراچی چلیں۔"

"آپ مجھے اپنا پتا دے دیں۔ میں دو چار دن بعد کراچی پہنچ جاؤں گا۔"

میں نے نہ صرف انہیں اپنا ایڈریس دیا بلکہ گھر اور دکان کا ٹیلی فون نمبر اور اپنا سیل نمبر بھی دے دیا۔

اسی وقت تمام مسافروں کو طیارے میں سوار ہونے کی ہدایت دی جانے لگی۔ میں، نادر چاچا سے رخصت ہو کر روانہ ہو گیا۔

کراچی پہنچ کر ایک اور المناک خبر ملی۔ رات کے وقت آنٹی کا انتقال ہو گیا تھا۔ ظفر بھائی اور شانو دونوں ہی غم سے نڈھال تھے۔ ان کی موت کی خبر سن کر ایسا لگا جیسے اماں کو ایک بار پھر سانپ نے ڈس لیا ہو۔ ظفر بھائی اور شانو مجھے دیکھ کر بھی بلک بلک کر رونے لگے۔

دانش بھائی، ظفر بھائی سمیت ہم سب کو دلاسے دے رہے تھے۔ وہ خود بھی بہت افسردہ تھے۔ رات کو آنٹی کو ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچا دیا گیا۔ شانو کی حالت ظفر بھائی سے بھی زیادہ خراب تھی۔

☆☆☆

آنٹی کی موت کو ایک ماہ سے زیادہ ہو چکا تھا۔ رفتہ رفتہ زندگی پھر معمول پر آ گئی تھی لیکن ظفر بھائی میں اب پہلے جیسی شوخی اور شگفتگی نہیں رہی تھی۔ شانو بھی مرجھا کر رہ گئی تھی۔

ایک دن میں باہر جانے کو تیار ہوا تو مجھے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں کسی چیز کا احساس ہوا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ وہی لفافہ ہے جو انکل احسان کی موت کے بعد آنٹی نے میرے حوالے کیا تھا۔ میں نے جلدی سے لفافہ چاک کیا۔ اس میں ایک خط اور دس لاکھ روپے کا ایک چیک تھا۔ میں نے خط پڑھنا شروع کیا۔

"خرم بیٹا! ہمیشہ خوش رہو۔ میری خواہش تو یہ ہے کہ یہ لفافہ تمہیں کبھی نہ ملے اور رقم کا یہ چیک میں اپنے ہاتھوں سے تمہیں دوں... لیکن بیٹا! زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ موت نہ جانے کس لمحے زندگی کا چراغ گل کر دے۔ وکیل ہوں نا اس لیے میں بہت آگے تک سوچتا ہوں۔ میں نے تمہارے چچا ملک نواز سے تمہارے ماہانہ اخراجات کا مطالبہ کیا تھا۔ اس نے مجھ سے یہ کہا کہ میرا بھتیجا اور بھتیجی اب زندہ نہیں ہیں۔ آپ پہلے ان کے زندہ ہونے کی تصدیق کریں، پھر میں ماہانہ اخراجات بھی ضرور دوں گا۔ بیٹا! میں نہیں چاہتا تھا کہ نواز کو تمہارے بارے میں کچھ علم ہو۔ اس وقت تک تو تم اس سے محفوظ تھے لیکن اگر اسے تمہارا سراغ مل جاتا تو وہ پھر تمہیں اور شاہانہ کو قتل کرانے کی کوشش کرتا۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ جب تک تم قانونی طور پر اپنا حق وصول کرنے کے قابل نہیں ہو جاتے، اس وقت تک میں بھی اسے کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تمہارے باپ کے مجھ پر بے شمار احسانات تھے۔ پھر وہ میرا دوست بھی تھا۔ میں نے سوچا کہ میں تمہیں اپنی طرف سے ہر ماہ اخراجات کے لیے کچھ رقم بھیج دوں۔ یوں میں تمہیں ہر ماہ رقم بھیجتا رہا۔ یہ میں تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم جب اپنا مقدمہ کورٹ میں لے کر جاؤ تو وہاں یہ بھی بتا سکو کہ ملک نواز نے تو وصیت نامے کے پہلے ہی حصے پر عمل نہیں کیا۔ اگر اس وقت تک میں موجود رہا تو تمہارا کیس میں ہی لڑوں گا اور اگر میں نہ رہا تو تم بیرسٹر سرفراز احمد سے مل لینا۔ ان کا پتا اور ٹیلی فون نمبر بھی اسی خط میں موجود ہے۔ وہ بہت بہترین وکیل ہیں اور تمہارے بابا کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ ملک نواز کی کمینی فطرت سے بھی آگاہ ہیں۔ وہ تمہارا مقدمہ بہت محنت اور ذہانت سے لڑیں گے۔ ہاں، یہ جو رقم کا چیک ہے، یہ میری طرف سے تمہاری شادی کا تحفہ ہے۔ بیٹا! اس تحفے کو قبول

کرنے سے انکار مت کرنا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھے، تمہارا انکل۔"

خط پڑھ کر میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ انکل احسان نے واقعی دوستی کا حق ادا کر دیا تھا۔ میرا دل غم سے اتنا بوجھل تھا کہ میں نے باہر جانے کا ارادہ ہی ملتوی کر دیا۔ شانو اس وقت اسکول میں تھی اور ظفر بھائی دکان پر۔ گھر میں میرے علاوہ صرف قمرل تھا۔ آنٹی سے وہ بھی بہت محبت کرتا تھا۔ وہ دس سال کی عمر سے آنٹی کے گھر میں کام کر رہا تھا۔

ڈور بیل بجی تو میں چونک اٹھا۔ فوراً ہی قمرل میرے پاس آیا اور بولا۔ "صاب! باہر کوئی آدمی آیا ہے نادر خان، وہ آپ کو پوچھ رہا ہے۔"

"اچھا، انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ میں آرہا ہوں۔"

نادر چاچا بہت گرم جوشی سے ملے اور بولے۔ "آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ نادر خان بھی دھوکے باز نکلا لیکن میں..."

"نادر چاچا! میں ایسا سوچ ہی نہیں سکتا۔" میں نے کہا۔

"شانو بیٹی کہاں ہے؟" نادر چاچا نے پوچھا۔

"وہ اسکول گئی ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "ایک گھنٹے تک آجائے گی۔"

"اسکول!" نادر چاچا نے حیرت سے کہا۔ "شانو بیٹی اسکول میں پڑھتی ہے؟"

"نادر چاچا! آپ کیا سمجھ رہے تھے کہ شانو ابھی تک وہی ڈیڑھ، دو سال کی چھوٹی سی بچی ہوگی۔"

"ہاں۔" نادر چاچا ہنس کر بولے۔ "ایک لمحے کو تو میرے ذہن سے یہ بھی نکل گیا تھا کہ وقت بہت زیادہ گزر چکا ہے۔"

"آپ سفر کر کے آئے ہیں چاچا! نہا دھو کر تازہ دم ہو جائیں۔ میں آپ کے لیے کھانا لگواتا ہوں۔"

میں نادر چاچا کو مہمانوں کے لیے مخصوص ایک کمرے میں لے آیا۔

نادر چاچا کو کمرے میں پہنچا کر میں نے قمرل سے کہا کہ تم جلدی سے کھانا لگاؤ۔ نادر چاچا میرے خاص مہمان ہیں۔

ہم کھانے کے لیے بیٹھنے ہی والے تھے کہ شانو آگئی۔ اسے دیکھ کر نادر چاچا ایک دم کھڑے ہو گئے اور بولے۔ "ناممکن... یہ لڑکی تو بالکل مالکن کی طرح ہے۔"

"یہ شانو ہے نادر چاچا۔" میں نے کہا۔

"شانو!" نادر چاچا نے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ "ماشاء اللہ یہ تو بہت بڑی ہو گئی ہے اور بالکل مالکن کی تصویر ہے۔" وہ اماں کو مالکن ہی کہتے تھے۔

شانو حیرت سے پلکیں جھپکا جھپکا کر انہیں دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "شانو! یہ نادر چاچا ہیں۔ تمہیں یاد تو نہیں ہوگا لیکن تم نے ان کا نام ضرور سنا ہوگا۔"

شانو نے سلام کیا تو نادر چاچا نے بے اختیار اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے دعائیں دیں۔

"لیکن بھیا!" شانو نے کہا۔ "آپ نے تو بتایا تھا کہ نادر چاچا..."

"مر گئے ہیں۔" نادر چاچا نے اس کا جملہ پورا کر دیا۔ "بس زندگی ہی تھی گڑبڑ یا جو میں بچ گیا۔"

"شانو بیٹا! تم جلدی سے کپڑے بدلو اور کھانا کھالو۔" میں نے کہا۔

کھانے کے بعد شانو اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں نادر چاچا کے ساتھ نیچے آگیا۔ میں نے انہیں تفصیل سے بتایا کہ وہاں سے فرار ہونے کے بعد میں کیسے گجرات پہنچا، پھر گجرات سے کراچی پہنچا اور ظفر بھائی سے کن حالات میں ملاقات ہوئی۔ آنٹی کی موت کے بارے میں سن کر وہ بھی افسردہ ہو گئے۔

میں نے ان سے کہا۔ "نادر چاچا! آپ سفر کر کے آئے ہیں۔ اب کچھ دیر آرام کر لیں۔"

شام کو ظفر بھائی آئے تو وہ بھی نادر چاچا سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد دانش بھائی بھی آگئے۔ آنٹی کے انتقال کے بعد وہ بلاناغہ رات کو ظفر بھائی کے پاس آیا کرتے تھے۔ وہ بھی نادر چاچا کے ساتھ بہت گرم جوشی سے ملے۔

☆☆☆

وہ دن میری زندگی کا بہت اہم دن تھا جس دن میری اکیسویں سالگرہ تھی۔ میں اب قانونی طور پر اپنا حق وصول کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اس دن ظفر بھائی، دانش بھائی اور شانو بھی بہت خوش تھے۔ ظفر بھائی نے میری سالگرہ منانے کا اچھا خاصا اہتمام کر ڈالا تھا... اور میرے لیے تو ہر ہی ایک یادگار دن۔

دوسرے ہی دن میں نے ظفر بھائی سے کہا۔ "ظفر بھائی! اب وہ وصیت نامہ نکالیں۔ میں آج ہی بیرسٹر سرفراز احمد سے رابطہ کرنا چاہتا ہوں۔"

ظفر بھائی نے حیرت سے کہا۔ "وصیت نامہ... میرے

پاس تو وہ وصیت نامہ نہیں ہے۔"

"ظفر بھائی! مذاق بعد میں کر لیجیے گا پہلے..."

"یار! میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ تم نے وصیت نامہ مجھے کب دیا تھا؟"

میرا دل بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے ذہن پر زور دیا تو مجھے یاد آگیا کہ میں نے وہ وصیت نامہ آنٹی کو دیا تھا کہ اسے حفاظت سے رکھ دیں۔

"ظفر بھائی! مجھے یاد آگیا۔ میں نے وصیت نامہ آنٹی کو دیا تھا۔"

"یار! تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔" ظفر بھائی سکون کا سانس لے کر بولے۔ "امی کو دیا تھا تو ان کے سیف میں ہوگا یا پھر ان کے اس ٹرنک میں جسے وہ ہمیشہ مقفل رکھتی تھیں۔"

وہ آنٹی کے کمرے میں وصیت نامہ تلاش کرنے چلے گئے۔

میں کافی دیر تک ان کا انتظار کرتا رہا، پھر خود بھی آنٹی کے کمرے میں پہنچ گیا۔ ظفر بھائی نے پورا سیف خالی کر دیا تھا اور اس کا تمام سامان بیڈ پر ڈھیر کر دیا تھا۔ اس سامان میں بے شمار پرانی تصویریں تھیں، ظفر بھائی کے مکان اور دکان کے کاغذات تھے، کچھ پرانے خطوط تھے، زیورات کے چند سیٹ تھے اور نقد رقم تھی لیکن وصیت نامہ نہیں تھا۔

انہوں نے سیف کی ایک ایک چیز کا جائزہ لینے کے بعد وہ تمام چیزیں دوبارہ سیف میں رکھیں اور مجھ سے بولے۔ "یار! اگر وصیت نامہ اس میں نہیں ہے تو پھر اس ٹرنک میں ہوگا۔" انہوں نے جست کے ایک بڑے سے ٹرنک کی طرف اشارہ کیا۔ اس میں دونوں سروں پر کنڈے تھے جن میں تالے لگے ہوئے تھے۔

ظفر بھائی نے آنٹی کی الماری کھول کر اس میں سے چابیوں کے بہت سے گچھے نکالے۔ آنٹی نے جانے کب کب کی چابیاں جمع کر رکھی تھیں۔

ظفر بھائی کافی دیر تک کوشش کرتے رہے کہ کوئی چابی اس ٹرنک کے تالوں میں لگ جائے لیکن انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ ان کے چہرے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے پھر وہ جھنجلا کر بولے۔ "یار! میں یہ تالے ہی توڑ دیتا ہوں۔"

"ذرا صبر کریں۔" میں نے کہا۔ "آپ ذرا آرام کر لیں۔ میں کوشش کرتا ہوں۔" میں نے چابیوں کا گچھا اٹھاتے ہوئے کہا۔

اسی وقت شانو آگئی تو مجھے احساس ہوا کہ ہم دو گھنٹے سے وصیت نامہ تلاش کر رہے ہیں۔

"کیا ڈھونڈ رہے ہیں بھیا؟" شانو نے پوچھا۔

"شانو بیٹا! تمہیں معلوم ہے کہ امی اس ٹرنک کی تالوں کی چابیاں کہاں رکھتی تھیں؟" ظفر بھائی نے پوچھا۔

"جی ہاں، مجھے معلوم ہے۔" شانو نے کہا اور بچن میں جا کر ایک چائے دانی اٹھا لائی۔ اس چائے دانی میں ٹرنک کی چابیاں تھیں۔

"یار! امی بھی کمال کرتی تھیں۔" ظفر بھائی نے گہرا سانس لے کر کہا۔ "یہ بھی کوئی جگہ ہے چابیاں رکھنے کی؟"

پھر انہوں نے ٹرنک کھول لیا۔ اس میں آنٹی کے کئی دار کپڑے، ساڑھیاں، چاندی کے کچھ برتن، لحاف اور گدّوں کے استر، سویٹر اور اسی قسم کی دوسری چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ اس ٹرنک میں شاہانہ کے وہ کپڑے بھی تھے جو یہاں پہن کر آئی تھی۔ مزید ایک گھنٹے تک ٹرنک اور کمرے کی تلاشی لینے کے بعد ہم دونوں ہلکان ہو گئے۔

میری حالت اس مسافر کی طرح تھی جو پانی کی تلاش میں میلوں کا سفر طے کر کے کنویں تک پہنچے تو اسے معلوم ہو اس کنویں میں تو بھی پانی تھا ہی نہیں۔

مجھے جامداد سے زیادہ افسوس اس بات کا تھا کہ اب میں چاچو سے انتقام نہیں لے سکوں گا۔ آنٹی نے وہ وصیت نامہ جانے کہاں رکھ دیا تھا۔

کچھ دم لینے کے بعد ہم دونوں پھر وصیت نامے کی تلاش میں جُت گئے۔ ہم نے گھر کا ایک ایک کونہ چھان مارا لیکن وصیت نامہ نہ ملا۔

ظفر بھائی شرمندہ نظر آرہے تھے جیسے وہ وصیت نامہ انہوں نے ہی گم کیا ہو۔

دانش بھائی کو وصیت نامے کی گمشدگی کا علم ہوا تو انہیں بھی بہت افسوس ہوا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ "یار خرم! کس زمانے میں زندہ ہو۔ اب سے پچاس، ساٹھ سال پہلے لوگ اس قسم کی دستاویزات گھروں میں رکھتے تھے۔ اب بینک موجود ہیں۔ تم کسی بھی بینک میں لاکر لے کر وصیت نامہ اس میں رکھوا سکتے تھے۔"

"بات بن سکتی ہے۔" اچانک ظفر بھائی نے کہا۔ "بیرسٹر صاحب نے بتایا تھا کہ ان کے پاس وصیت نامے کی ایک نقل موجود ہے۔"

"نہیں ظفر بھائی۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "عدالت نقل کو نہیں، اصل کو مانتی ہے۔" میں خود قانون کا طالبِ علم تھا اس لیے یہ بات اچھی طرح جانتا تھا۔

ہم کئی دن تک وصیت نامہ تلاش کرتے رہے لیکن

وصیت نامہ نہ ملنا تھا، نہ ملا۔ وصیت نامے کی گمشدگی سے نادر چاچا بھی بہت مایوس نظر آرہے تھے۔

ایک رات میں دیر تک اس صورتِ حال پر غور کرتا رہا، پھر میں نے جائداد اور زمینوں کا خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ مجھے صرف ایک قلق تھا کہ میں چاچو سے انتقام نہیں لے سکا۔ شاید اللہ کی طرف سے اس کا وقت نہیں آیا تھا اور ان کی رسّی مزید دراز کردی گئی تھی۔ اس رات میں نے کئی اہم فیصلے کیے اور ساری فکریں اور پریشانیاں ذہن سے جھٹک کر لمبی تان کر سو گیا۔

صبح ناشتے کی میز پر میں نے ظفر بھائی سے کہا۔ ''ظفر بھائی! میں آپ کے کاروبار میں پیسا لگانا چاہتا ہوں۔''

ظفر بھائی نے چونک کر مجھے دیکھا پھر بولے۔ ''یار! یہ بیٹھے بٹھائے تمہیں کیا سوجھی؟''

''بیٹھے بٹھائے نہیں بلکہ بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب میں زندگی بھر یونہی ہاتھ پر ہاتھ رکھے تو بیٹھ نہیں سکتا۔ میرے پاس جو تھوڑا بہت سرمایہ ہے، وہ میں کاروبار میں لگانا چاہتا ہوں۔ اگلے مہینے تک میرا رزلٹ آجائے گا تو میں کسی سینئر وکیل کے ساتھ پریکٹس شروع کر دوں گا۔''

''خرم! مجھے کاروبار میں تمہارا سرمایہ لگانے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن میں چاہتا تھا کہ وہ رقم تم شانو کی شادی کے لیے مخصوص کردو۔''

''آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں ظفر بھائی!'' میں نے کہا۔ ''شانو کی شادی میں بہت دیر ہے۔ اس وقت تک تو ہم اس رقم سے کروڑ بنا چکے ہوں گے۔ آپ کیسے بزنس مین ہیں کہ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے۔ پھر اس وقت تک میری پریکٹس بھی جم چکی ہوگی۔ آپ بسم اللہ کریں۔''

''ٹھیک ہے!'' ظفر بھائی نے کہا۔ ''اب تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

نادر چاچا اب ہمارے ہی ساتھ رہتے تھے اور دکان پر ظفر بھائی کا ہاتھ بٹایا کرتے تھے۔ ظفر بھائی نے اس ایک دکان سے اب تک تین دکانیں بنالی تھیں۔ انہوں نے اپنی دکان کے اردگرد کی دو دکانیں اور خرید لی تھیں اور وہ اپنے جنرل اسٹور کو ڈپارٹمینٹل اسٹور بنانا چاہ رہے تھے۔

میں نے بینک سے ساری رقم نکال کر ظفر بھائی کے حوالے کردی۔ وصیت نامے کی گمشدگی کا صرف چار افراد کو علم تھا۔ ظفر بھائی، دانش بھائی، نادر چاچا اور میں۔ میں چاہتا تھا کہ مجھے میرا حق نہ ملے لیکن چاچو کے سر پر خوف کی ایک تلوار تو لٹکی رہے۔ میں نے اب نئی زندگی کی ابتدا کردی تھی۔ اب میں انکل احسان کی طرح ایک کامیاب اور نامور بیرسٹر بننا چاہتا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اب بار ایٹ لاء بھی ضرور کروں گا۔

☆☆☆

دیکھتے ہی دیکھتے دس سال گویا وقت کی آندھی میں گرد بن کر اڑ گئے۔ میں اب ایک کامیاب اور معروف وکیل تھا۔ ظفر بھائی نے اپنا کاروبار مزید پھیلا لیا تھا۔ اب انہوں نے چمڑے کی مصنوعات کی برآمد بھی شروع کردی تھی اور ایک گارمنٹ فیکٹری بھی لگالی تھی۔ گھر میں ہر طرح سے خوش حالی تھی لیکن میرے اور شانو کے لاکھ اصرار پر بھی انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔ وہ اکثر ہنس کر کہتے تھے کہ شادی تو بیکاری کا مشغلہ ہے، جب میں کاروبار سے ریٹائر ہو جاؤں گا تو شادی بھی کرلوں گا۔

میری بھی ساری توجہ کا مرکز اب شانو تھی۔ وہ اب کالج میں پڑھ رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بی اے کرے تو کوئی اچھا سا رشتہ دیکھ کر اس کی شادی کردوں اور خود بار ایٹ لاء کے لیے لندن چلا جاؤں۔

میں کئی دنوں سے یہ بات محسوس کر رہا تھا کہ شانو کچھ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی ہے۔ میں نے اس سے اس کا سبب جاننے کی کوشش کی لیکن اس نے مجھے ٹال دیا۔ مجھے اس کی طرف سے اب فکر ہوگئی تھی کہ ایسی کیا وجہ ہے کہ شانو ہر وقت پریشان سی رہتی ہے۔

اس دن اتوار تھا۔ اتوار کو ظفر بھائی ناشتے کا خصوصی اہتمام کرتے تھے۔

ناشتے کی میز پر بیٹھ کر میں نے شانو کو آواز دی۔

وہ بیزار بیزار سی اپنے کمرے سے نکلی اور بولی۔ ''جی، کہیے؟''

''تمہیں ناشتا نہیں کرنا ہے؟'' میں نے کہا۔

''نہیں۔'' اس نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف مڑی۔

''شانو!'' میں نے پیار سے اسے پکارا۔ ''ادھر آ گڑیا! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''میری طبیعت کو کیا ہوا ہے؟'' اس نے تڑخ کر کہا۔ ''اور آپ یہ مجھے گڑیا وڑیا نہ کہا کریں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

''اچھا، تم ناشتا تو کرو۔'' ظفر بھائی نے کہا۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' شانو نے جواب دیا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اس کی گفتگو سے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ وہ شانو ہی نہیں ہے۔ یہ تو مجھے کوئی اجنبی لڑکی لگ رہی تھی۔

''شاید کسی بات پر روٹھ گئی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں اسے لے کر آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں اس کے کمرے کی طرف بڑھا۔

وہ بیڈ پر لیٹی خلا میں تک رہی تھی۔ میں نے اسے پیار سے پکارا۔ ''شانو!''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا لیکن بولی کچھ نہیں۔

''بیٹا! تو مجھے کیوں پریشان کر رہی ہے... کیا میری کوئی بات بُری لگی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''فار گاڈ سیک!'' اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر انتہائی بدتمیزی سے کہا۔ ''مجھے کوئی بات بُری نہیں لگی ہے۔ اب پلیز یہاں سے جائیں۔''

مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے دل میں سوئی چبھودی ہو۔ جس شانو کو میں نے ماں باپ کا پیار دیا، جس کی خاطر میں نے اپنی راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کیا، وہی مجھ سے اتنی گستاخی سے بات کر رہی تھی۔ نہ جانے اسے کیا ہوگیا تھا۔

میں بوجھل قدموں سے باہر نکل آیا۔

ظفر بھائی میرے انتظار میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے بھی اب تک ناشتا شروع نہیں کیا تھا۔ وہ مجھ سے بولے۔ ''تم لوگوں کے مزاج ہی نہیں ملتے۔ یہاں بھوک کے مارے جان نکلی جارہی ہے اور تم...''

''ظفر بھائی! آپ ناشتا شروع کریں۔ میری بھوک مرگئی ہے۔''

''کیا؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔ ''بہت ہی کمزور بھوک تھی جو اچانک مرگئی۔ چلو، تم ناشتا شروع کرو، بھوک بھی زندہ ہوجائے گی۔''

''ظفر بھائی! واقعی میرا دل بالکل نہیں چاہ رہا ہے۔''

''تو ٹھیک ہے، پھر میں بھی ناشتا نہیں کروں گا۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

''ارے، آپ تو ناشتا کریں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

وہ کبھی روٹھتے تھے تو پھر بہت مشکل سے راضی ہوتے تھے۔

''چلیے، میں بھی ناشتا کر رہا ہوں۔'' میں نے انہیں زبردستی کرسی پر بٹھادیا اور خود بھی بیٹھ گیا لیکن اچھی طرح ناشتا ہم دونوں میں سے کسی نے نہیں کیا۔

ناشتا کرنے کے بعد میں چائے کا کپ لے کر ٹیرس پر چلا آیا۔

ظفر بھائی بھی میرے پیچھے پیچھے وہیں آگئے اور مجھ سے بولے۔ ''میں جانتا ہوں خرم! تم کیوں پریشان ہو۔ تم شانو کی وجہ سے پریشان ہو نا؟ مجھے بھی بہت پریشانی ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اس پر غصہ کریں، بس یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ آخر اس کے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔ تم اسے اس کے حال پر چھوڑو۔ میں معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ اس کے اس رویّے کی وجہ کیا ہے۔ اس کے کالج میں دانش کی ایک کزن بھی پڑھتی ہے۔ میں اس سے کہوں گا کہ وہ شانو سے معلوم کرے۔ بہت سے مسائل ایسے ہوتے ہیں خرم کہ لڑکیاں صرف ماؤں سے کہہ سکتی ہیں۔ اس کی تو ماں ہے نہ کوئی بہن۔ وہ اپنا کوئی مسئلہ کس سے کہے۔ دانش کی کزن صائمہ بہت اچھی اور سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔ ممکن ہے وہ شانو کو جانتی بھی ہو بلکہ یقیناً جانتی ہوگی۔ وہی اس وقت ہمارے کام آسکتی ہے۔''

ظفر بھائی نے مجھے یوں سمجھایا جیسے بچوں کو بہلاتے ہیں۔ ان کی باتوں سے اتنا ضرور ہوا کہ میرا صدمہ کچھ کم ہو گیا۔

دوسرے دن میں حسبِ معمول کورٹ اور شانو کالج چلی گئی۔

میں نے کورٹ کے نزدیک ہی ایک بلڈنگ میں آفس لے رکھا تھا۔ کورٹ سے فارغ ہونے کے بعد میں لنچ اپنے آفس میں کرتا تھا۔

اس دن میں کورٹ سے فارغ ہو کر آیا ہی تھا کہ ظفر بھائی وہاں پہنچ گئے۔ ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ وہ کبھی میرے آفس نہیں آئے تھے۔ کوئی کام بھی ہوتا تھا تو وہ سیل فون پر کہہ دیتے تھے۔

میں بھی پریشان ہوگیا، میں نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے ظفر بھائی! آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟''

''خرم! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بات تمہیں کیسے بتاؤں؟'' ظفر بھائی عالمِ اضطراب میں ہونٹ چباتے ہوئے بولے۔

میں ان کی بات سے مزید بوکھلا گیا۔ میں نے پوچھا۔ ''ظفر بھائی! سب خیریت تو ہے نا؟''

''خیریت نہیں ہے خرم۔'' انہوں نے کہا۔ ''وہ شانو...''

''کیا ہوا شانو کو؟'' میں وحشت میں کھڑا ہوگیا۔

''وہ... ہماری... عزت نیلام کرنے پر تُل گئی ہے۔''
ظفر بھائی نے بمشکل کہا۔ ''میں نے آج اسے ادھیڑ عمر کے باوقار سے شخص کے ساتھ دیکھا ہے۔''

میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ میں نے پانی کا گلاس اٹھا کر پورا حلق میں انڈیل لیا اور ان سے پوچھا۔ ''آپ نے شانو کو اس شخص کے ساتھ کہاں دیکھا؟''

''میں اپنی فیکٹری سے واپس آرہا تھا۔ مجھے ڈیفنس میں بھی کچھ کام تھا۔ میں نے ڈیفنس کے ایک بنگلے سے شانو کو نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اس شخص کے ساتھ گاڑی میں تھی۔''

خون میری کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ ظفر بھائی کے علاوہ کوئی اور شخص یہ بات کہتا تو میں اس کا منہ توڑ دیتا لیکن ظفر بھائی اتنی بڑی بات یونہی نہیں کہہ سکتے تھے۔

''کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، میں اسے نہیں جانتا۔'' ظفر بھائی نے کہا۔ ''لیکن میرا خیال تھا کہ شانو آج کالج گئی ہی نہیں۔ میں وہاں سے سیدھا شانو کے کالج پہنچا۔ اس وقت چھٹی میں دیر تھی۔ خود اندر جانے کے بجائے میں نے گیٹ پر کھڑے ہوئے چوکیدار سے کہا کہ شاہانہ ملک کو بھیج دو۔ ان سے کہنا کہ ان کے بھائی آئے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد چوکیدار نے واپس آکر بتایا کہ مس شاہانہ آج کالج ہی نہیں آئیں۔ میں نے چوکیدار سے کہا... ہاں، میں بھول گیا تھا۔ میں نے خود ہی اس سے چھٹی کرنے کو کہا تھا۔''

''ظفر بھائی! میرا تو دماغ ماؤف ہو رہا ہے۔ میں ابھی شاہانہ سے پوچھتا ہوں کہ وہ کس کے ساتھ تھی اور کہاں گئی تھی؟''

''اتنی جلد بازی مت کرو خرم!'' ظفر بھائی نے کہا۔ ''ممکن ہے بات کچھ اور ہو۔ مجھے پہلے اچھی طرح تصدیق کر لینے دو، پھر کوئی قدم اٹھانا۔''

مجھ سے آفس میں بیٹھا نہیں گیا۔ اسٹاف کو ضروری ہدایت دے کر گھر چلا آیا۔

میں ظفر بھائی کے ساتھ ہی باہر نکل آیا۔ ظفر بھائی اپنی گاڑی میں آئے تھے۔ وہ مجھ سے بولے۔ ''دیکھو خرم! میں تم سے پھر ایک دفعہ کہوں گا کہ جلد بازی اور جوش میں کوئی قدم مت اٹھانا۔''

میں گھر پہنچا تو شانو واپس آچکی تھی اور اپنے کمرے میں تھی۔ میرا خون کھول رہا تھا لیکن مجھے ظفر بھائی کی بات یاد تھی۔ یہی واقعہ اگر گاؤں میں پیش آیا ہوتا تو شاید اب تک شانو اور وہ شخص دونوں میرے ہاتھوں مارے جا چکے ہوتے۔

میں کچھ کھائے پیے بغیر اپنے کمرے میں آگیا۔ میری تقدیر بھی عجیب تھی۔ وہ مجھے قدم قدم پر دھچکے پہنچاتی آئی تھی۔ اس مرتبہ تو تقدیر نے میرے دل کے بجائے روح پر وار کیا تھا۔ میں نے شانو کے لیے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ اس کی دیکھ بھال میں اپنی ذات کو فراموش کر دیا تھا۔ اس پیار اور محبت کا اس نے یہ صلہ دیا تھا مجھے؟ میرے دل میں غم و غصے کی ایک شدید لہر اٹھی اور میرا دل چاہا کہ میں ابھی شانو سے جا کر پوچھوں لیکن میں نے بہت مشکل سے خود کو روکا۔

شام کو ظفر بھائی بھی آگئے۔ وہ مجھ سے بولے۔ ''میں کل شاہانہ کے پیچھے جاؤں گا اور دیکھوں گا کہ وہ کہاں جاتی ہے۔''

دوسرے دن میں بہت بے دلی سے کورٹ گیا اور تمام مقدموں کی اگلی تاریخیں لے لیں۔ میں نے ظفر بھائی کو ٹیلی فون کر دیا تھا کہ میں کورٹ سے سیدھا گھر آؤں گا۔ آپ بھی گھر آجائیے گا۔

میں گھر پہنچا تو ظفر بھائی بھی آچکے تھے۔ میں یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ ظفر بھائی نے کیا معلوم کیا ہے؟

میرے پوچھے بغیر انہوں نے بتایا۔ ''شاہانہ یہاں سے سیدھی کالج گئی تھی۔ میں مطمئن ہو کر واپس آنے والا تھا کہ مجھے وہی شخص پھر دکھائی دیا جس کے ساتھ شاہانہ کل نظر آئی تھی۔ اس نے شاید سیل فون پر شاہانہ کو اطلاع دی تھی۔ وہ فوراً ہی کالج سے باہر نکل آئی اور اس شخص کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ان کے روانہ ہونے کے بعد میں بھی ان کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ آج میرا بھی خون کھول رہا تھا۔ وہ شخص ڈیفنس کے اسی بنگلے پر پہنچا۔ میں نے بھی اچانک اس کے نزدیک گاڑی روک دی۔ شاہانہ مجھے دیکھ کر چونکی، وہ لمحہ بھر کو گھبرائی، پھر اس نے خود پر قابو پا لیا۔ بنگلے کا گیٹ کھل چکا تھا لیکن مجھے دیکھ کر اس شخص نے بھی گاڑی اندر لے جانے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے خود پر قابو پایا اور مسکرا کر بولا۔ ''شانو بیٹا! تم یہاں کیا کر رہی ہو اور یہ صاحب کون ہیں؟'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''ظفر بھائی، یہ میری دوست فریدہ کے ابو ہیں۔ میں اس سے ملنے آئی ہوں۔ وہ کئی دن سے بیمار ہے۔ میں تو کل بھی آئی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''اچھا تم اس سے مل لو تو میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' اس پر شاہانہ نے جواب دیا۔ ''ظفر بھائی، آپ چلے جائیں۔ مجھے انکل ڈراپ کر دیں گے۔'' میں واپس آگیا۔

''ظفر بھائی! آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔'' میں نے سکون کا سانس لے کر کہا۔

''میں تو خود ڈر گیا تھا۔'' ظفر بھائی نے کہا۔ ''لیکن خدا کا شکر ہے کہ تم نے جذبات میں آکر کوئی حماقت نہیں کی۔''

''ظفر بھائی! میں نادر چاچا سے کہہ دیتا ہوں کہ وہ شانو کی نگرانی کریں اور معلوم کریں کہ اس بنگلے میں کون رہتا ہے۔''

''تمہیں میری بات پر یقین نہیں آیا؟'' ظفر بھائی نے کہا۔

''مجھے آپ پر بھی یقین ہے اور شانو پر بھی۔'' میں نے کہا۔ ''یہ تو میں احتیاط کے طور پر کر رہا ہوں۔''

دوسرے دن میں نے نادر چاچا کو شانو کے پیچھے روانہ کر دیا اور انہیں ہدایت کر دی کہ اس نگرانی کا علم شانو کو نہیں ہونا چاہیے۔

نادر چاچا نے ایسی خبر سنائی کہ میں سکتے میں رہ گیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ شخص ملک نواز ہے۔

''ملک نواز!'' میرے سر میں دھماکے سے ہونے لگے۔ ''شانو اس کے ساتھ کیا کر رہی ہے؟ شانو اسے کیسے جانتی ہے؟'' میں چیخ کر بولا۔

''خرم!'' ظفر بھائی نے کہا۔ ''تم شانو سے کوئی بات مت کرنا، میں خود اس سے بات کروں گا۔ تم غصے میں آکر بات کو مزید بگاڑ دو گے۔''

اسی وقت شانو آگئی اور ہم لوگوں کی طرف دیکھے بغیر اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔

''شانو!'' ظفر بھائی کا لہجہ درشت تھا۔

شانو ٹھٹک کر رک گئی۔

''کہاں سے آرہی ہو؟'' ظفر بھائی نے سختی سے پوچھا۔

''کیا ہو گیا ظفر بھائی؟ میں...''

''تم اس وقت کہاں سے آرہی ہو؟'' ظفر بھائی نے اس کی بات کاٹ دی۔ میں نے ظفر بھائی کو کبھی غصے میں نہیں دیکھا تھا، ہاں دانش بھائی سے ان کے لڑائی جھگڑے کے قصے بہت سنے تھے۔ اس وقت وہ بالکل بدلے ہوئے آدمی لگ رہے تھے۔

''ظفر... بھائی... وہ... میں... اپنی دوست کے گھر...''

''جھوٹ مت بولو۔'' ظفر بھائی چیخ کر بولے۔ ''وہ شخص تمہاری کسی دوست کا باپ نہیں ہے۔''

''ہاں، وہ میری دوست کے ابو نہیں ہیں۔'' شانو بھی بلند آواز میں بولی۔ ''وہ چاچو ہیں، ملک نواز!''

میں بھنا کر کھڑا ہو گیا اور لاؤنج سے نکل کر اس کوریڈور میں پہنچ گیا جہاں شانو اور ظفر بھائی کھڑے تھے۔

ظفر بھائی نے مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن میں نے ان کا ہاتھ بھی جھٹک دیا اور شانو سے بولا۔ ''تو جانتی بھی ہے کہ ملک نواز کون ہے؟''

''ہاں، میں جانتی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''ملک نواز میرے چاچو ہیں۔'' وہ چیخ کے بولی۔ ''اور آپ تو مجھ سے بات ہی نہ کریں۔ مجھے چاچو نے یہ بھی بتایا ہے کہ آپ نے جائداد کے لالچ میں بابا اور اماں کو قتل کیا ہے اور چاچو کو بھی قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔''

''شانو! وہ شخص جھوٹ بول رہا ہے بیٹا! میں...''

''مت کریں یہ ڈھکوسلا۔'' شانو چیخ کر بولی۔ ''آپ میرے بھائی نہیں ہیں، میرے ماں باپ کے قاتل ہیں۔ آپ...''

میرے جسم میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ میں نے شانو کے منہ پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ وہ دیوار سے ٹکرا کر گر گئی اور خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اسے بال پکڑ کر اٹھایا اور دوسرا تھپڑ مارا۔ وہ پھر چکرا کر گر پڑی۔ میں نے تو کبھی اس سے تیز آواز میں بات نہیں کی تھی اور اسے مارنے کا تو میں تصور ہی نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے پھر اسے بال پکڑ کر اٹھا لیا۔ وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔ ''مجھے مت ماریں بھیّا... آ... پ... نے... مجھے... تھپڑ مارے...'' وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

میں نے اسے سینے سے لگا لیا اور کہا۔ ''تو یہ کیوں بھول گئی شانو کہ ملک نواز ہمارے خون کا پیاسا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے اماں اور بابا کو قتل کیا ہے؟ اس وقت میری عمر ہی کیا تھی؟ اور انہیں قتل کرنے کی ضرورت کیا تھی مجھے؟ ان کی ساری جائداد تو میری ہی تھی۔ مجھے جائداد کا لالچ ہوتا تو میں تجھے قتل کرتا کیونکہ جائداد میں تو بھی تو حصے دار تھی۔ میں نے تجھے اپنی جان پر کھیل کر وہاں سے نکالا تھا ورنہ ملک نواز تو ہمارے نسل کا پورا بندوست کر چکا تھا۔ نادر چاچا سے پوچھ جو ملک نواز کے آدمیوں کے ہاتھوں زخمی ہوئے تھے پھر ہماری حفاظت کرنے کے جرم میں کئی برس تک جیل میں سڑتے رہے ظفر بھائی سے پوچھ کہ میں تجھے گود میں لے کر مزدوری کرنے نکلا تھا۔ تجھے میں نے اس لیے پال پوس کر بڑا کیا تھا کہ تو میرے دشمنوں کی باتوں میں آکر مجھے ہی اپنا دشمن سمجھ لے۔ تو نے آج مجھے جیتے جی مار دیا شانو... تو نے آج مجھے مار دیا بیٹا...'' میں بلک بلک کر رونے لگا۔ پھر میں نے جیب سے

اپنا ریوالور نکالا اور شانو کے ہاتھوں میں دے دیا۔ ”میں تیرے ماں باپ کا قاتل ہوں نا! مجھے گولی مار دے...“ میں نے آنکھیں بند کرلیں... ”گولی چلا شانو!“ میں چیخ کر بولا۔ ”اگر تجھے یہ خطرہ ہے کہ میرے قتل کی سزا تجھے ملے گی تو اس کی فکر مت کر... قتل کا الزام نادر چاچا اپنے سر لے لیں گے۔“

شانو حواس باختہ اور نادم سی ریوالور ہاتھ میں لیے کھڑی رہی۔

”اچھا لا... یہ ریوالور مجھے دے۔“ میں نے ریوالور اس سے چھین لیا۔ ”میں خود ہی اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے ریوالور کی نال اپنی کنپٹی پر رکھ کر ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔

میں ٹریگر دبانے ہی والا تھا کہ شانو چیخ کر میری طرف لپکی۔ ”نہیں بھیّا... نہیں...“ وہ میرے ریوالور والے ہاتھ میں جھول گئی۔

ظفر بھائی نے لپک کر ریوالور میرے ہاتھ سے چھین لیا اور چیخ کر بولے۔ ”خرم! کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟“

شانو بے اختیار میرے سینے سے لگ گئی اور سسکتے ہوئے بولی۔ ”بھیّا... مجھے معاف کر دیں... پلیز بھیّا...“ میں چاچو کی باتوں میں آ گئی تھی۔“

اسے سینے سے لگا کر میں بھی رونے لگا اور بولا۔ ”شانو گڑیا! تیرے لیے تو میں نے اپنی زندگی تج دی۔ تیرے منہ سے ایسی باتیں سن کر مجھے بہت شدید تکلیف پہنچی ہے۔“

”بھیّا!“ شانو نے سسکتے ہوئے کہا۔ ”چاچو کے ساتھ ساتھ طارق بھی یہی کہتا ہے کہ...“

”کون طارق شانو؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”وہ میرے ساتھ کالج میں پڑھتا ہے بھیّا۔ وہ چاچو کا بیٹا ہے۔“

”چاچو کا بیٹا؟“ میں نے کہا۔ ”بکواس کرتا ہے وہ... چاچو کی تو کوئی اولاد ہی نہیں ہے۔“ پھر میں چونک کر بولا۔ ”کیا عمر ہے اس کی؟“

”وہ مجھ سے تین، چار سال بڑا ہوگا۔“

”جھوٹا ہے وہ۔“ میں نے کہا۔ ”جب میں تجھے لے کر وہاں سے فرار ہوا تھا تو چاچو کی تو کوئی اولاد ہی نہیں تھی۔ چاچی اولاد کے لیے تعویذ گنڈے کراتی تھیں، مزاروں پر ماری ماری پھرتی تھیں لیکن ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی... پھر یہ طارق کہاں سے آ گیا.....؟ کیا وہ کالج میں خود تجھ سے ملا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، ایک دن یونہی باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ طارق گجرات کے ایک بہت بڑے جاگیردار ملک نواز کا بیٹا ہے۔ میری ایک دوست جانتی تھی کہ میں بھی گجرات کے ایک جاگیردار خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ یوں اس دوست نے طارق سے ملاقات کرائی۔ پھر ایک دن چاچو بھی کالج آ گئے۔ وہ مجھے دیکھ کر رونے لگے اور بولے کہ شانو بیٹا! تجھے دیکھ کر مجھے بھابی یاد آ گئیں۔ میں ان کی چکنی چپڑی باتوں میں آ گئی۔ وہ ایک دو دفعہ مجھے اپنے گھر بھی لے گئے۔ وہاں گاؤں کی دو تین عورتیں بھی تھیں۔ ان سب نے بھی یہی کہا کہ خرم نے اپنے ماں باپ کو قتل کیا ہے۔“

”شانو! یہ طارق کیسا لڑکا ہے؟“ ظفر بھائی نے اچانک پوچھا۔

”بہت ذہین اور اسمارٹ لڑکا ہے ظفر بھائی اور...“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی اور اس نے شرما کر سر جھکا لیا۔

میرے دل پر گویا آرے چل گئے۔ اس کے شرمانے کے انداز ہی سے میں سمجھ گیا کہ وہ طارق کو پسند کرتی ہے، میرے دشمن کو۔ وہ تو چاچو کا بیٹا بھی نہیں تھا۔ وہ نہ جانے کون تھا اور چاچو نے اسے اپنا بیٹا کیوں مشہور کیا تھا؟ لیکن زیادہ پریشانی اور فکرمندی کی بات یہ تھی کہ شانو اسے پسند کرتی تھی۔

”شانو! تم ابھی اپنے چاچو یا طارق پر یہ ظاہر مت کرنا کہ تم نے ان کا جھوٹ پکڑ لیا ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم سے محبت جتا کر چاچو کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں؟“

رات کو جب دانش بھائی آئے تو میں نے چاچو کے بارے میں انہیں بھی سب کچھ بتا دیا۔

”اس کا سیدھا اور آسان حل یہ ہے کہ ہم طارق سے پوچھ گچھ کریں۔“ انہوں نے ”پوچھ گچھ“ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”لیکن دانش بھائی! ایک پرابلم ہے۔ ہم طارق کو رکھیں گے کہاں؟“

”یہ کوئی پرابلم نہیں ہے۔“ دانش بھائی نے کہا۔ ”میمن گوٹھ میں میرے ایک دوست اکبر سومرو کا فارم ہاؤس ہے۔ اس کا نام ڈریم ورلڈ ہے اور سومرو اسے پبلک کے لیے تفریحی پارک بنانا چاہتا تھا لیکن اپنی سیاسی مصروفیات میں الجھ کر رہ گیا ہے۔ وہ فارم ہاؤس کئی ایکڑ تک پھیلا ہوا ہے۔ وہاں صرف ایک چوکیدار ہوتا ہے۔ فارم ہاؤس کے عقبی حصے میں آم اور امرود کے کچھ درخت ہیں یا پھر جھاڑ جھنکاڑ ہے۔ میں ابھی اس..... سے بات کرلوں گا۔“

☆☆☆

میں نادر چاچا کے ساتھ کالج سے کچھ فاصلے پر موجود تھا۔ اس موقع کے لیے نادر چاچا ایک لینڈ کروزر لے آئے تھے۔

”نادر چاچا!“ میں نے کہا۔ ”اگر کسی نے اس گاڑی کا نمبر ذہن نشین کر لیا تو ہمارے لیے مشکل ہو جائے گی۔“

میرے اندر کا وکیل بولا۔

”نمبر کوئی سو دفعہ نوٹ کر لے۔“ نادر چاچا نے کہا۔ ”اس کا نمبر جعلی ہے۔ اس کی اصل نمبر پلیٹ ڈیش بورڈ میں موجود ہے۔“

”گویا اس وقت ہم ایک ایسی گاڑی میں موجود ہیں جسے اگر پولیس والے روک لیں تو ہم پر تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ...“

”وہ آ رہا ہے خرم صاحب!“ نادر چاچا نے کہا۔

میں نے سیاہ رنگ کی ایک ہنڈا سٹی کو کالج کے گیٹ سے روانہ ہوتے دیکھا۔ اسٹیئرنگ پر جو نوجوان تھا، وہ واقعی مردانہ وجاہت کا نمونہ تھا۔

گاڑی کے روانہ ہوتے ہی نادر چاچا نے بھی لینڈ کروزر اس کے پیچھے لگا دی۔

طارق کی گاڑی میں دو لڑکے مزید تھے۔ وہ تینوں ہنستے بولتے ہوئے بے فکری سے جا رہے تھے۔

اچانک طارق نے بریک لگائے، دوسرے ہی لمحے لینڈ کروزر ہنڈا سٹی سے ٹکرا گئی۔ دھماکے کے ساتھ ہی شیشہ اور پلاسٹک ٹوٹنے کی ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔

لینڈ کروزر کے آگے اس قسم کے کسی ٹکراؤ سے حفاظت کے لیے لوہے کے پائپ کا مضبوط حفاظتی جال لگا ہوا تھا۔

طارق بکتا جھکتا اپنی گاڑی سے اترا اور شدید طیش کے عالم میں ہماری طرف بڑھا۔

نادر چاچا اطمینان سے اپنی جگہ بیٹھے رہے۔

طارق نے پہلے اپنی گاڑی کا جائزہ لیا، پھر چیخ کر نادر چاچا سے بولا۔ ”جب تمہیں ڈرائیونگ نہیں آتی ہے تو گاڑی سڑک پر لے کر نکلتے ہی کیوں ہو؟“

”غلطی ہو گئی صاحب!“ نادر چاچا نے ندامت کا مظاہرہ کیا۔

”غلطی کے بچے۔“ طارق دہاڑا۔ ”تمہاری ایک ذرا سی غلطی سے میرا تو ہزاروں روپے کا نقصان ہو گیا۔ تم اتنے نواب ہو کہ گاڑی سے اترنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کر رہے۔“

میں گاڑی کی عقبی نشست پر بیٹھا تھا۔ میں نے اپنی طرف کا شیشہ نیچے کیا اور طارق سے باوقار لہجے میں بولا۔ ”یہ آپ بات کس انداز میں کر رہے ہیں؟ کتنا نقصان ہوا ہے آپ کا؟ میں وہ نقصان پورا کرنے کو تیار ہوں۔“ یہ کہہ کر میں گاڑی سے نیچے اتر گیا۔ طارق کی گاڑی کی ایک بیک لائٹ اور بمپر ٹوٹ چکا تھا اور اس کی ڈکی اندر دھنس گئی تھی۔ اس کے مقابلے میں لینڈ کروزر کو ذرہ برابر بھی نقصان نہیں پہنچا تھا، صرف اس کے بونٹ پر لگا ہوا حفاظتی جنگلا کچھ اندر کی طرف دب گیا تھا۔

”ہاں، نقصان تو آپ کا اچھا خاصا ہو گیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن گاڑی سڑک کے بیچ میں سے تو ہٹائیے۔ ہماری وجہ سے پورا ٹریفک جام ہو گیا ہے۔“

”طارق! تم ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھو۔“ اس کا ایک ساتھی بولا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ گاڑی ہٹانے کے بہانے میں وہاں سے فرار ہونا چاہتا ہوں۔

”آپ شوق سے میری گاڑی میں بیٹھیں۔“ میں نے کہا اور خود سڑک کے کنارے چلا گیا۔

طارق کے دوست نے گاڑی وہاں سے ہٹا کر سڑک کے کنارے لگا دی۔ نادر چاچا نے بھی اپنی گاڑی وہاں سے ہٹا لی۔

اسی وقت ایک ٹریفک سارجنٹ وہاں آ گیا۔ اس نے پہلے طارق کی گاڑی کا جائزہ لیا پھر ہماری گاڑی پر نظر ڈالی اور بولا۔ ”غلطی تو سراسر اس لینڈ کروزر والے کی ہے۔“

”ہاں غلطی تو ہے۔“ نادر چاچا درشت لہجے میں بولے۔ پھر...“

”آپ کے پاس لائسنس ہے؟“ اس نے نادر چاچا سے پوچھا۔

میں نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”میرے ڈرائیور کے پاس لائسنس بھی ہے اور بقیہ کاغذات بھی لیکن کیا آپ اس سلسلے میں کوئی قانونی کارروائی کرنا چاہتے ہیں؟“

”آپ لوگ آپس میں ہی فیصلہ کر لیں تو مناسب ہے۔“ سارجنٹ میری شخصیت اور لہجے سے مرعوب ہو گیا۔

”ہم لوگ وہی کر رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔ پھر طارق سے بولا۔ ”آپ بتائیں، آپ کا کتنا نقصان ہوا ہے؟“

”یہ تو کوئی ڈینٹر... پینٹر ہی بتا سکتا ہے۔“

”تو پھر میرے ساتھ کسی ڈینٹر پینٹر تک چلیں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ نقصان کا اندازہ لگانے کے بعد جو بھی رقم بتائے گا، میں ادا کر دوں گا۔“

”ٹھیک ہے طارق!“ اس کا ایک دوست بولا۔ ”تم ان کی گاڑی میں آؤ، میں گاڑی کو کسی ڈینٹر کی ورک شاپ پر لے جاتا ہوں۔ قریب ہی بہت سے ڈینٹر ہیں۔“

طارق ہمارے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ لوگ طارق کی گاڑی میں ہم سے پہلے روانہ ہوگئے۔

نیپا سے کچھ پہلے نادر چاچا نے مجھ سے پوچھا۔ ''صاحب! وہ سومرو صاحب بھی انتظار کررہے ہوں گے۔''

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ میں نے عقب نما آئینے میں دیکھ کر نفی میں سر ہلا دیا۔ اگر اس وقت ہم طارق کو لے کر جاتے تو نہ صرف اس کے دوست بلکہ ٹریفک کا وہ سارجنٹ بھی ہمیں شناخت کرلیتا کیونکہ اس نے بھی مجھے اور نادر چاچا کو اچھی طرح دیکھا تھا۔

مجھے رہ رہ کر نادر چاچا پر غصہ آرہا تھا کہ انہوں نے ایسا کمزور پلان بنایا ہی کیوں؟ اگر وہ سارجنٹ نہ بھی آتا تو بھی اس کے دوست فوراً پولیس رپورٹ درج کرادیتے کہ ان کے دوست کو اغوا کرلیا گیا ہے۔ پھر ظاہر ہے چاچو بھی حرکت میں آجاتے۔ میرے مقابلے میں ان کا کہیں زیادہ اثر رسوخ تھا۔ یہی سب سوچ کر میں نے اس وقت طارق کے اغوا کا پروگرام ملتوی کردیا۔

طارق کا دوست ایک ڈینٹر کی ورک شاپ پر رک گیا۔ چند منٹ بعد ہم بھی وہاں پہنچ گئے۔

ڈینٹر نے گاڑی کا جائزہ لیا اور بولا۔ ''اس میں تو اچھا خاصا خرچہ ہوجائے گا۔''

''اچھا خاصا کتنا، دو لاکھ یا ڈھائی لاکھ؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ یہ فضول کے اخراجات بھی مجھے کھل رہے تھے۔

ڈینٹر منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ''تقریباً پچیس ہزار روپے خرچ ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے، تم کام شروع کرو۔ میں اپنے ڈرائیور کو بینک بھیج کر ابھی رقم منگوالیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

میں نے نادر چاچا کو چیک دیا تو وہ بولے۔ ''میرے پاس کیش موجود ہے۔ مجھے ایک پارٹی کو پے منٹ کرنا تھی۔ میں یہ چیک بعد میں کیش کرالوں گا۔'' انہوں نے اپنی جیب سے پیسے نکالے اور ہزار ہزار کے پچیس نوٹ نکال کر باقی رقم اپنی جیب میں رکھ لی۔

''یار طارق! تمہیں تو ابھی دیر لگے گی۔ میں چلتا ہوں۔'' اس کا ایک دوست بولا۔ ''میں یہاں سے ٹیکسی پکڑ لوں گا۔''

''تم بھی فرید کے ساتھ ہی نکل جاؤ۔ میرے ساتھ کیوں وقت ضائع کررہے ہو؟'' طارق نے دوسرے لڑکے سے کہا۔

ان دونوں کے جاتے ہی میں نے نادر چاچا سے کہا۔ ''چلو، ہم بھی چلیں۔''

''صاحب! آپ بھی چلے جائیں۔'' ڈینٹر نے کہا۔ ''یہ کام توکل سے پہلے نہیں ہوگا۔''

اس وقت تک ہم ورک شاپ سے باہر آچکے تھے اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد میں نے طارق کو بھی ورک شاپ سے نکلتے دیکھا، وہ کسی ٹیکسی کی تلاش میں ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا پھر وہ ورک شاپ سے آگے بڑھ گیا۔

میں نے نادر چاچا سے کہا۔ ''اب ہم اس لڑکے کو اٹھا سکتے ہیں۔ تم گاڑی اس کے نزدیک روک لینا۔''

نادر چاچا نے گاڑی اس کے نزدیک ہی روک لی۔ میں نے گاڑی کا شیشہ اتار کے اسے آواز دی۔ ''طارق صاحب!''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر بولا۔ ''ارے آپ؟''

''ہاں، میں نے سوچا کہ آپ کہاں ٹیکسی ڈھونڈتے پھریں گے، میں آپ کو ڈراپ کردیتا ہوں۔''

''نہیں سر!'' طارق ہنس کر بولا۔ ''آپ کو فضول میں زحمت ہوگی۔ ویسے آپ کس طرف جارہے ہیں؟''

''میں ڈیفنس کی طرف جارہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اوہ... تب تو میں آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں۔'' وہ ہنس کر بولا۔ پھر عقبی نشست کا دروازہ کھول کر میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

''آپ کا تعلق کس شہر سے ہے طارق صاحب!'' میں نے کہا۔ ''آپ مجھے کراچی کے تو نہیں لگتے۔''

''آپ کا اندازہ درست ہے۔'' طارق نے کہا۔ ''میرا تعلق گجرات کے ایک گاؤں سے ہے۔ وہاں ہماری بہت بڑی جاگیر ہے۔''

''عجیب اتفاق ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میرا تعلق بھی گجرات ہی سے ہے۔ میری بھی اچھی خاصی زمینیں ہیں وہاں۔'' میں نے کہا۔ پھر چونک کر بولا۔ ''تم اپنے ڈیڈی کا نام بتاؤ، شاید میں انہیں جانتا ہوں؟''

''میرے ڈیڈی کا نام ملک نواز ہے۔'' اس نے گردن اکڑا کر یوں کہا جیسے اس کے ڈیڈی صدر امریکا ہوں۔

''میں تو انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اچھا، آپ انہیں جانتے ہیں؟'' طارق نے پوچھا پھر باہر دیکھتے ہوئے چونک کر بولا۔ ''یہ آپ کہاں جارہے ہیں۔

یہ راستہ تو شہر سے باہر جاتا ہے۔''

''ہم شہر سے باہر ہی جارہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر آپ مجھے یہیں اتار دیں۔'' طارق نے کہا۔

''اب ہمارے ساتھ آئے ہو تو ساتھ ہی چلو بھی۔'' میں نے کہا۔

''یہ کیا مذاق ہے؟'' طارق بھنّا کر بولا۔ ''ڈرائیور! گاڑی روکو۔''

نادر چاچا خاموشی سے ڈرائیونگ کرتے رہے۔

''میں کہتا ہوں گاڑی روکو۔'' طارق چیخ کر بولا۔

''خاموشی سے بیٹھے رہو۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا اور اچانک اپنا ریوالور نکال لیا۔ ''اب تم نے بولنے کی کوشش کی تو اس ریوالور کی گولی تمہاری پسلیاں توڑتی ہوئی گزر جائے گی۔''

''یہ... یہ... سب کیا ہے... میں...''

میں نے اس کے چہرے پر چٹاخ سے ایک زوردار تھپڑ دے مارا۔ ''اب اگر بولا تو ہاتھ کے بجائے میرا ریوالور چلے گا۔'' میں نے غرا کر کہا۔ اسے تھپڑ مارنا ضروری تھا تاکہ اس کے غبارے کی ساری ہوا نکل جائے۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ طارق فارم ہاؤس کا راستہ بھی دیکھے۔ میں نے اچانک ریوالور کے دستے سے اس کے سر پر وار کردیا۔

وہ فوراً ہی ہوش و حواس سے بیگانہ ہوگیا اور سیٹ پر ایک طرف لڑھک گیا۔

نادر چاچا تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بہت کم وقت میں میمن گوٹھ کے اس علاقے میں پہنچ گئے جہاں کئی فارم ہاؤس تھے۔

ڈریم ورلڈ واقعی وہاں کے تمام فارم ہاؤسز سے بہت زیادہ بڑا تھا۔ دانش بھائی کا دوست چوکیدار کو پہلے ہی اطلاع دے چکا تھا۔ اکبر سومرو کے حوالے پر چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔

ہم وہاں سے سیدھے فارم ہاؤس کے اس حصے کی طرف بڑھے جو مین گیٹ سے خاصا دور تھا اور درختوں میں گھرا ہوا تھا۔

نادر چاچا نے طارق کو ایک اندرونی کمرے میں منتقل کیا اور اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگے۔

طارق کے چہرے پر پانی کے چھینٹے پڑے تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ چند لمحے غائب دماغی کی کیفیت میں رہا پھر اچانک اٹھ کر بیٹھ گیا لیکن وہ بیڈ سے اتر نہیں سکتا تھا۔

نادر چاچا نے اس کے دونوں پاؤں باندھنے کے بعد رسّی کا ایک سرا بیڈ کے ساتھ ہی بنی ہوئی ایک کھڑکی کی گرل میں باندھ دیا تھا۔

''کون ہو تم لوگ اور مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟'' طارق جھنجلا کر بولا۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ بزدل نہیں ہے۔

میں نے آگے بڑھ کر پھر اس کے چہرے پر ایک تھپڑ مارا اور کہا۔ ''سوال کرنے کا حق صرف ہمیں ہے۔''

''یہ تم لوگ اچھا نہیں کررہے ہو۔ میرے ڈیڈی...''

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ اس مرتبہ نادر چاچا نے اس کے منہ پر بھرپور تھپڑ مارا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''ملک نواز سے تیرا کیا رشتہ ہے؟''

''میں نے بتایا تو ہے کہ وہ میرے ڈیڈی ہیں۔''

''جھوٹ مت بول۔'' میں نے گرج کر کہا۔ ''ملک نواز کا تو کوئی بیٹا نہیں تھا۔''

''کوئی بیٹا نہیں تھا تو پھر میں کہاں سے آگیا؟'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

میں نے اس کے منہ پر ایک تھپڑ اور لگاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے جانتے ہو؟''

''نہیں، میں نے آپ کو پہلی دفعہ دیکھا ہے۔'' طارق نے کہا۔

''میں خرم ہوں۔ ملک نواز کا بھتیجا۔''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا پھر بولا۔ ''اچھا آپ وہ خرم ہیں جس نے اپنے ماں باپ کا قتل کیا اور اپنی بہن کو لے کر فرار ہوگیا۔''

''یہ بات تمہیں کس نے بتائی کہ میں نے اپنے والدین کو قتل کیا ہے؟'' میں نے کہا۔

''مجھے یہ بات ڈیڈی نے بتائی ہے۔''

''تم پھر بکواس کررہے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ ملک نواز کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔''

''میں... میں... ان کا لے پالک ہوں۔'' طارق نے کہا۔

''گاؤں کے کس آدمی نے تمہیں یہ بتایا کہ خرم نے اپنے والدین کو قتل کیا ہے؟''

''مجھے کسی گاؤں والے سے کیا لینا؟'' طارق بیزاری سے بولا۔

اچانک باہر ایک گاڑی رکنے کی آواز آئی پھر دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔

نادر چاچا نے رائفل سنبھالی اور ایک طرف بیٹھ گیا۔ میں بھی دروازے کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا۔

اچانک باہر سے کسی نے لات مار کے دروازہ کھولا اور دو آدمی اندر آ گئے۔ دوسرے ہی لمحے فائر.... کے دو دھماکے ہوئے اور وہ کربناک انداز میں چیختے ہوئے فرش پر گر گئے۔

اچانک مجھے نادر چاچا کی چیخ سنائی دی۔ کسی نے ان پر باہر کھڑکی سے فائر کیا تھا۔ وہ فرش پر اوندھے منہ گر پڑے۔

میں نے جھپٹ کر ان کی رائفل اٹھالی اور قلابازی کھا کر کمرے کے دوسرے کونے میں چلا گیا۔

اچانک مجھے شانو دکھائی دی۔ اس کے عقب میں چاچو تھے۔

چاچو کو دیکھ کر میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ مجھے ہر طرف خون ہی خون دکھائی دینے لگا۔

میں نے نشانہ لے کر چاچو پر فائر کر دیا۔ گولی ان کی کھوپڑی توڑتی ہوئی نکل گئی۔

شانو چیخ کر بولی۔ ''چاچو... آنکھیں کھولیے چاچو، آپ ٹھیک کہتے تھے کہ خرم بھائی ہی میرے ماں باپ کے قاتل ہیں۔ آخر انہوں نے آپ کی جان بھی لے لی۔''

اس کے الفاظ میرے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اتر رہے تھے۔ گویا ایک مرتبہ پھر میری جمع پونجی لٹ چکی تھی۔ میں ایک مرتبہ پھر ہی دست ہو گیا تھا۔ شانو نے میری کسی بات کا یقین ہی نہیں کیا تھا۔ غصے کی زیادتی کی وجہ سے میرے جسم میں انگارے سے بھر گئے۔

''چاچو!'' شانو پھر چیخی۔ ''آپ کو میں ہی یہاں لائی تھی نا۔ میں بھی آپ کی موت میں برابر کی شریک ہوں۔''

مجھ سے مزید برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے شانو کا نشانہ لیا اور آنکھیں بند کر کے فائر کر دیا۔ فائر کا دھماکا ہوا اور شانو کی کربناک چیخ سنائی دی۔ گولی اس کے سینے میں پیوست ہو گئی تھی۔ اس نے میری طرف حیران نظروں سے دیکھا... اس کی آنکھوں میں ایک وحشت سی تھی... چہرے پر وہی معصومیت تھی جو میں بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔

اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''بھیا... آپ نے... مجھے... بھ... بھ... یا!''

''شانو۔'' میں چیخ کر بولا۔

شانو کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ ''میری گڑیا، میری جان... مجھ سے روٹھ گئی۔ میں نے خود ہی اس کی جان لے لی۔''

میں چیخ چیخ کر رونے لگا۔ مجھے ہر طرف خون ہی خون

دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے گھوم کر طارق کو دیکھا، وہ سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

میں نے رائفل اس کی طرف تانی تو وہ چیخ کر بولا۔ ''خرم صاحب! فائر مت کیجیے گا... میں تو... آپ کا... دشمن...''

گولی کے دھماکے میں اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ میں نے اس کی بھی کھوپڑی کا نشانہ لیا تھا۔ اس کی کھوپڑی تربوز کی طرح بکھر گئی۔

☆☆☆

میں آج کل جیل میں ہوں۔ مجھے پھانسی کی سزا ہو چکی ہے اور اب میں اپنی پھانسی کا انتظار کر رہا ہوں۔

اس رات شانو نے ہمارا سب پلان سن لیا تھا۔ اس نے اکبر سومرو اور ڈریم ورلڈ کا نام یاد رکھا کیونکہ ہم طارق کو وہیں لے جانے والے تھے۔ وہ سیدھی ملک نواز کے پاس پہنچی اور اسے سب کچھ بتا دیا۔

پھر ملک نواز اپنے دو آدمیوں کو لے کر میسن گوٹھ آ گیا۔ شانو بھی ان کے ساتھ تھی۔ ملک نواز نے بھی چوکیدار کو اکبر سومرو کا حوالہ دیا تھا۔

باقی باتیں تو میں جانتا ہی تھا۔ وہ لوگ اس کمرے تک پہنچ گئے تھے جہاں شانو... میری زندگی بھر کی کمائی... میری متاعِ حیات... میرے ہی ہاتھوں ماری گئی۔

ستم ظریفی دیکھیے کہ جس دن مجھے پھانسی کی سزا سنائی گئی، اسی دن میری سالگرہ تھی اور اسی دن ظفر بھائی نے مجھے بتایا کہ کچن کے سلیب پر بچھے ہوئے ایک پلاسٹک کے نیچے وصیت نامہ محفوظ تھا۔

مجھے تقدیر کے اس سنگین مذاق پر بے اختیار ہنسی آ گئی۔

اب تو میں ہوں یا میرے خیالات ہیں، یادیں ہیں جو مجھے ہر لمحہ ڈستی رہتی ہیں۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی بہن کی جان لے لی... کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں کہ کہیں میں ہی تو اپنے والدین کا قاتل نہیں ہوں۔

بس یہی یادیں مجھے چرکے لگاتی رہتی ہیں۔ میں شدت سے اس دن کا منتظر ہوں جب میرے گلے میں پھانسی کا پھندا پڑے گا اور یادوں کے یہ گھاؤ ہمیشہ کے لیے بھر جائیں گے۔

لیکن وہ دن بھی آ کے نہیں دے رہا ہے... میں سوچتا ہوں اس تمام سفر کا حاصلِ سفر کیا تھا؟ صرف موت! چاچو کی موت، نادر چاچا کی موت، طارق کی موت اور... اور... میری... شانو کی موت... اب آخر میں میری موت!

غلطی کا پھل

محمد عفان آزاد

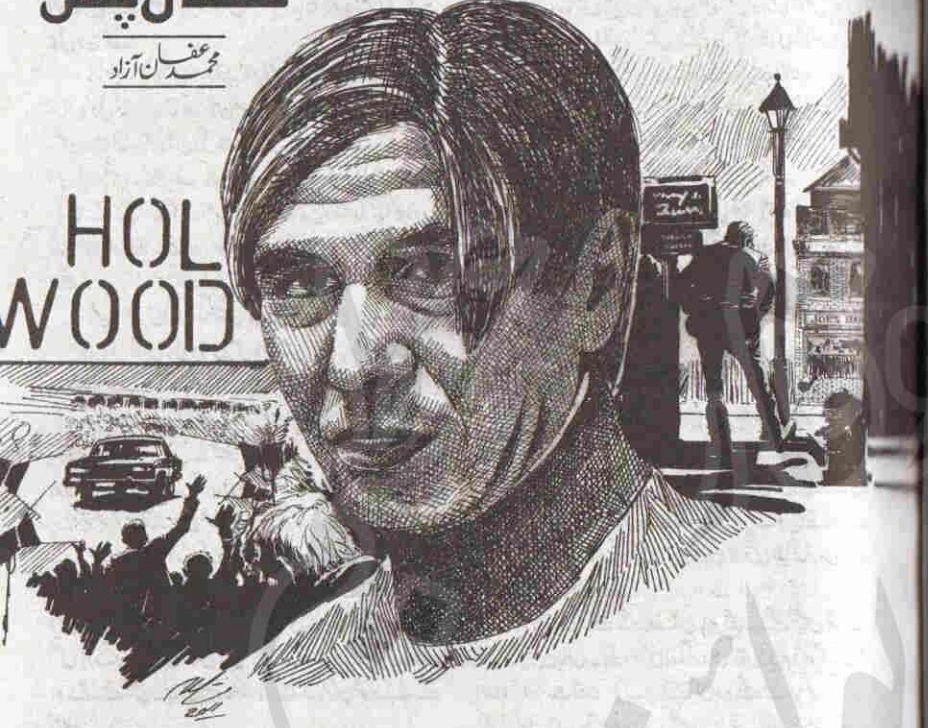

دانستہ یا نادانستہ ہر شخص سے کچھ نہ کچھ سرزد ہو جاتا ہے... کبھی غلط... اور کبھی صحیح... خوش قسمتی سے اچھا ہونے کی صورت میں زندگی میں رنگینیاں اور دلکشی بڑھ جاتی ہے... اور برا ہو جائے تو پھر سب کچھ خسارے میں چلا جاتا ہے... ایک ایسی ہی غلطی جو کسی کے مستقبل کے لیے تبدیلی کی نوید بن گئی تھی۔

فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والے کرداروں کے گرد پھیلی دنیا کی ایک جھلک

مارلن مجھے کبھی کبھار ہی ملنے کا موقع دیتا تھا۔ اس لیے جب اس نے صبح کے دس بجے مجھے از خود ملاقات کا پیغام بھجوایا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ مارلن کی عمر ستر برس کے قریب تھی۔ اس کے متعلق ہالی وڈ کے نو وارد فنکاروں میں یہ افواہیں اکثر گردش کرتی رہتی تھیں کہ وہ ہالی وڈ کا ایک ابھرتا ہوا ستارہ تھا لیکن شراب نوشی اور شوٹنگ کے دوران پیش آنے والے ایک حادثے کے باعث اس کا فلمی کیریئر ختم ہو گیا۔ یوں اب وہ ایجنٹ سے وابستہ ہو کر دو وقت کی روٹی کا سامان کرتا ہے۔

میں نے بھی مارلن سے متعلق افواہیں سنی تھیں کہ اس کے سب سے بہترین دوست جیکسن نے اس کے خلاف کچھ ایسی خطرناک سازش کی تھی جس کے باعث اس کا فلمی کیریئر ختم ہو

کر رہ گیا۔ وہ سازش کیا تھی؟ میں اس کے بارے میں آج تک بھی جان نہ پایا اور نہ ہی مارلن نے کبھی اس بارے میں لب کشائی کی۔ کسی انٹرویو میں اگر اس سے اس طرح کی افواہوں سے متعلق کوئی سوال کیا بھی جاتا تو وہ مسکرا کر بات ٹال دیتا تھا۔

مارلن اس کا فلمی نام تھا۔ اس کا اصل نام کیا تھا، یہ بات یہاں کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ من موجی بندہ تھا۔ اپنی ہی دنیا میں مگن رہتا تھا۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اسے کچھ کہہ سکے یا اس کی مرضی کے خلاف کچھ پوچھ سکے۔ اس کی ذاتی زندگی ہم سب کے لیے معمّا تھی۔ ہم سب ہالی وڈ کے نوآموز اداکاروں میں شمار ہوتے تھے اور سب احتراماً مارلن کو گاڈ فادر کہتے تھے۔

میں، میری لین، کیپٹن اور سپرمین بھی کئی دوسرے ساتھیوں کی طرح ہالی وڈ کی فلمی دنیا میں اپنی پہچان بنانے کی جدوجہد کر رہے تھے لیکن اب تک کسی کو خاص کامیابی نہیں ملی تھی۔ ہم سب ہالی وڈ بلیوارڈ اسٹریٹ پر واقع چائنیز تھیٹر سے وابستہ تھے۔ انہوں نے تھیٹر کے باسمنٹ میں ہی رہائش دی ہوئی تھی۔ تھیٹر ہفتے میں تین دن ہوتا تھا۔ میں تھیٹر کے باہر اسٹیج پر لائیو شو کرتا تھا۔ اس شو کا بنیادی کردار مارلن تھا جو برانڈو کے نام سے گاڈ فادر کا کردار ادا کرتا تھا۔ شو میں میرا کردار اس کے نائب کا تھا۔ جس دن مارلن شو کرنے سے انکار کر دیتا، اُس دن میری بھی چھٹی ہو جاتی۔ میری مالی حالت بہت پتلی تھی اور تین دن کی کمائی میں ہفتے کے سات دن گزارنے ہوتے تھے اس لیے ہمیشہ دعا کرتا رہتا کہ مارلن شو کرنے سے انکار نہ کر دے۔

میں اسے پچھلے چار پانچ سال سے جانتا تھا۔ وہ خاموش طبع شخص تھا۔ بہت کم بات کیا کرتا تھا۔ اُس دن پہلی بار اس نے مجھے اپنے کمرے میں بلوایا۔ میرے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات تھی کہ آخر اسے مجھ سے کوئی کام پڑ گیا ہے۔ ویسے بھی میرے لیے اس کی خوشنودی حاصل کرنا فائدے کی بات تھی۔

میں جب اس کے کمرے میں پہنچا تو اس نے مجھے ایسے دیکھا جیسے اسے مجھ سے کسی شے کی طلب ہے۔ ''ہمگی۔'' اگرچہ یہ میرا اصل نام نہیں تھا لیکن اسٹیج کی دنیا میں سب مجھے ہمگی جیک مین کے نام سے پہچانتے تھے۔

''کہیے۔'' میں نے تابع داری سے جواب دیا۔

''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ مارلن اور میری مدد... میں چونک گیا اور پورے دھیان سے اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''میں آج کل ایک شخص کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔ جب دیکھو وہ میرے اردگرد منڈلاتا رہتا ہے۔''

''اوہ... میں پہچان گیا۔ یہ وہی شخص تو نہیں جو کل ٹیرس پر کھڑا تمہیں تک رہا تھا؟'' میں نے فوراً قطع کلامی کی اور اپنی بات مکمل کر کے تائیدی نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

''بالکل... یہ وہی شخص ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''تم اُس آدمی کا پتا کرو۔ معلوم تو ہو کہ آخر وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔'' مارلن نے نرم لہجے میں کہا۔

مارلن نے جس کی طرف اشارہ کیا تھا، اُسے میں بھی کئی بار دیکھ چکا تھا۔ وہ اجنبی اکثر شو کے دوران میں اسٹیج کے قریب منڈلاتا رہتا تھا۔ اس کی نظریں ہر جگہ مارلن کا تعاقب کرتی رہتی تھیں لیکن میں نے کبھی ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی جس سے لگتا ہو کہ وہ شخص اس کے لیے کوئی خطرہ ہے۔

''اس بات نے مجھے ذہنی طور پر بہت پریشان کر رکھا ہے۔'' میں اس کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر تک خاموش رہا پھر سکوت کو توڑتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے، میں تمہاری خاطر اس آدمی کا پتا چلانے کی کوشش کرتا ہوں۔'' میں نے مارلن کی طرف دیکھتے ہوئے اس طرح کہا جیسے میں کوئی سپرمین ہوں جو چٹکی بجاتے ہی اس کا مسئلہ فوراً حل کر دے گا۔

مارلن سے ملنے کے بعد میں باہر نکلا۔ مجھے یقین تھا کہ جب مارلن یہاں ہے تو وہ بھی اِردگرد ہی کہیں موجود ہوگا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ سڑک پر پہنچتے ہی وہ مجھے فٹ پاتھ پر کھڑا نظر آ گیا۔ اس وقت وہ ایک کھمبے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس نے جینز اور قیمتی شرٹ پہن رکھی تھی۔ آنکھوں پر دھوپ کا خوبصورت چشمہ تھا اور سر پر بیس بال کیپ تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر تیس، پینتیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ بظاہر وہ خوش باش نظر آ رہا تھا۔ یہ جگہ سیاحوں کی پسندیدہ تھی لیکن اسے دیکھ کر مجھے لگا کہ یہ سیاح نہیں ہو سکتا۔ وہ آتے جاتے ہوئے لوگوں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

''تمہاری شخصیت بہت جاذبِ نظر ہے۔'' میں اس کے سامنے پہنچ کر مسکرایا اور دوستانہ لہجے میں تعریف سے گفتگو کا آغاز کیا۔

''شکریہ...'' اس نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ ''ویسے دیکھنے میں تم بالکل ہمگی جیک مین لگتے ہو۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں جیک مین نہیں ہوں؟'' یہ ہم دونوں کی پہلی

ملاقات تھی۔

''یہ بات اس لیے کہہ سکتا ہوں کہ وہ کم از کم تم سے چھ انچ لمبا ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''خیر چھوڑو... تم اس وقت یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟'' میں نے دائیں بائیں نظریں گھماتے ہوئے کہا۔ ''کیا سیاحوں سے بھیک مانگنے کے لیے کھڑے ہو؟'' اس وقت فٹ پاتھ پر چار پانچ سیاحوں کا ایک ٹولہ گزر رہا تھا۔

''جی نہیں...'' اس نے نرم لیکن ناراض لہجے میں جواب دیا۔ ''میں بھیک نہیں مانگتا بلکہ ایک فلم کے لیے نئے چہروں کی تلاش میں ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

''میں فلم کاسٹنگ ڈائریکٹر ہوں اور ایک فلم کے لیے نئے چہرے تلاش کر رہا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے جینز کی پچھلی جیب میں ہاتھ ڈالا اور بٹوا کھول کر اس میں سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری طرف بڑھایا۔

''اسٹیل ویل اینڈ ایسوسی ایٹس... کنسلٹنٹ۔'' میں نے کارڈ پر نظر ڈالی۔ نیچے واضح لفظوں میں اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ رابن اسٹیل ویل... اور اس کے بعد فون نمبر تھا۔ ''بہت خوب۔'' میں نے کارڈ پر درج تفصیلات پڑھنے کے بعد اس کے سراپا پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں تم رابن ویل ہو؟'' میں نے جاننے کے باوجود تصدیق چاہی۔

''بالکل درست... میں ہی ہوں رابن ویل۔'' اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''تم تو مارلن کو اچھی طرح جانتے ہو گے۔'' اس نے استفساریہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میرا داہنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا اور بائیں ہاتھ میں اس کا وزیٹنگ کارڈ۔

''جی ہاں... وہ ہمارے ساتھی فنکار ہیں۔''

''میں ایک فیچر فلم پر کام کر رہا ہوں۔ اس کا ہیرو جان ہیف مین ہے۔ اس میں ایک کردار ایسا ہے جیسے کہ تم... اور ایک کردار بالکل ایسا ہے جیسے مارلن کے لیے ہی لکھا گیا ہو۔'' اس نے اپنی دانست میں تفصیل سے بتایا۔

''تو تم چاہتے ہو کہ میں، مارلن...''

''یہی نہیں... بلکہ کیپٹن، سپرمین اور میری لین بھی اس فلم کے لیے مجھے موزوں لگتے ہیں۔''

''کیا؟'' میں چونکا۔

''میرا خیال ہے کہ میری تلاش ختم ہو گئی۔ تم مارلن اور اپنے دیگر ساتھیوں تک یہ اطلاع پہنچا دو۔ اگر وہ چاہیں تو اس فلم میں انہیں کردار مل سکتے ہیں۔'' رابن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''فلم کی کہانی کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں کل لاس اینجلس سے باہر جا رہا ہوں۔ چند روز بعد واپس لوٹوں گا۔ پھر میں تمہیں کہانی سنا دوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا پھر کچھ سوچنے کے بعد کہنے لگا۔ ''ویسے تم مارلن اور اپنے دیگر ساتھیوں تک یہ بات پہنچا دو۔ اگر وہ کام کرنے پر آمادہ ہوئے تو پھر مناسب ہوگا کہ ہم سب اکٹھے بیٹھ کر کہانی کا جائزہ لیں۔'' اس کے چہرے پر مسکراہٹ رقصاں تھی۔

''یہ بھی اچھا خیال ہے۔'' میں نے آہستہ سے جواب دیا۔ میرے لیے یہی بہت بڑی خوشی کی بات تھی کہ فلم میں کام مل رہا ہے، کہانی چاہے کچھ بھی کیوں نہ ہو۔

''میں نے جب سے اسے دیکھا ہے، تب سے بس یہی سوچ رہا ہوں کہ وہ ایک بار پھر بڑے پردے پر کیسا دکھائی دے گا۔ میں تو اب ہر وقت بس مارلن کے خیالوں میں ہی گم رہتا ہوں مگر پتا نہیں وہ میری پیشکش قبول بھی کرتا ہے یا نہیں۔''

''فکر نہ کرو، میں اُس سے بات کروں گا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''مما... یہ ویل ورین ہے نا۔'' اچانک کسی بچے نے میری پتلون کھینچتے ہوئے اپنی ماں سے کہا۔ میں نے گردن موڑ کر پہلے بچے کو اور پھر سامنے نظر ڈالی تو پانچ چھ جاپانی سیاح میرے گرد کھڑے تھے۔ میری توجہ ملتے ہی سب نے گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا اور میرے ساتھ تصویریں کھنچوائیں۔ کچھ عرصے پہلے میں نے بچوں کے لیے بنائی گئی ایک سیریل میں کام کیا تھا۔ وہ بچوں میں بہت مقبول ہوئی تھی اسی لیے وہ بچہ مجھے پہچان گیا۔ اس سڑک پر عموماً مجھ جیسے چھوٹے موٹے اداکار پرستاروں کے ساتھ تصویر کھنچوانے کا معاوضہ لیتے ہیں لیکن میں کبھی اپنے منہ سے کچھ نہیں مانگتا۔ البتہ اگر کسی نے کچھ دینا چاہا تو انکار بھی نہیں کرتا۔ انہوں نے میرے ساتھ فوٹو کھنچوائے، آٹوگراف لیے اور شکریہ ادا کرتے ہوئے چل دیے۔ اس بار بھی تجربہ پہلے سے کچھ مختلف نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے، اب میں چلتا ہوں۔'' سیاحوں کے جانے کے بعد میں نے رابن سے کہا۔

''ٹھیک ہے، پھر کچھ دنوں بعد یہیں ملتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

یہ سن کر میں نے اس کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور پھر فٹ پاتھ کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ تھوڑا آگے جا کر میں نے سر پیچھے کی طرف گھمایا۔ اس وقت وہ ایک جوکر سے باتیں کر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ سرخ و سفید رنگ چہرے پر تھوپا ہوا یہ جوکر بھی شاید ہالی وڈ میں ایک بڑا اور نامور ایکٹر بننے کے لیے آیا ہوگا مگر قسمت نے اسے ایک جوکر بنا دیا۔ جوکر... جو کسی کی شکایت نہیں کرتا، کبھی دلبرداشتہ نظر نہیں آتا۔ ہر وقت دوسروں کو ہنسانے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس کے دل پر یہ سب کچھ کرتے ہوئے کیا گزرتی ہے، وہ تو جوکر جانے یا اُس کا دل۔ ہم تو اس کا ہنستا مسکراتا رنگ زدہ چہرہ ہی دیکھتے ہیں جس کے پیچھے وہ اپنا اصل چہرہ کب کا کھو چکا ہوتا ہے۔

جوکر کو دیکھ کر مجھ پر افسردگی کا دورہ پڑ گیا۔ میں ہالی وڈ اور اس جوکر کے درمیان قائم رشتے پر غور کرتا ہوا اپنی ہی دھن میں آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک ایک ہلکی سے ٹھوکر لگی۔ میں ذرا سا لڑکھڑایا اور ایک بار پھر حقیقت کی دنیا میں لوٹ آیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مارلن سے ملوں اور اسے یہ بتاؤں کہ جس شخص کے بارے میں وہ فکرمند تھا، اس سے میری ملاقات کیسی رہی۔

☆☆☆

"ہاں تو بتاؤ، اس سے کیسی ملاقات رہی؟" گھنٹا بھر بعد میں اُس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں اسے یہ خوشخبری سنا چکا تھا کہ اس سے ملاقات کر کے آ رہا ہوں، جس کے بارے میں وہ پریشان ہے۔ جب میں کرسی پر بیٹھ کر اپنی سانسیں درست کر چکا تو اس نے اشتیاق بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ فلم لائن سے ہے، کاسٹنگ ڈائریکٹر ہے۔ اس کا نام رابن اسٹیل ویل ہے اور اس وقت کسی فیچر فلم کے لیے چہروں کی تلاش میں ہے۔" یہ کہہ کر میں لمحہ بھر کے لیے رُکا اور مارلن کے چہرے پر نظر ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں ایسی چمک نظر آ رہی تھی، جیسے کسی نادار کا لاٹری میں بڑی مالیت کا انعامی نمبر لگ گیا ہو۔

"اسے کس طرح کے کرداروں کی ضرورت ہے؟" مارلن نے تجسس کے انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ جواب میں، میں نے اسے پوری رُوداد سنا دی۔ وہ خاموشی سے میری بات سنتا رہا۔ میرے خاموش ہونے پر بھی اس نے ایک لفظ نہیں کہا۔ "اچھا... اب میں چلتا ہوں۔" جب اس نے کسی بھی قسم کے ردِعمل سے گریز کیا تو میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ تم سے پھر کب ملے گا؟" مارلن نے مجھے کھڑا ہوتے دیکھ کر سوال کیا۔

"کہہ تو رہا تھا کہ وہ کچھ دن کے لیے لاس اینجلس سے باہر جا رہا ہے۔ جیسے ہی لوٹے گا، ملاقات کرے گا۔"

"اچھا..." اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے... تو پھر میں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں وہاں سے اٹھ گیا۔

☆☆☆

اگلے ڈیڑھ ہفتے کے دوران میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ نہ تو رابن ملا اور نہ ہی اس کا کوئی پیغام آیا۔ اُس دن فٹ پاتھ پر پہلی ملاقات میں اس نے کہا تھا کہ وہ واپسی پر فلم کی کہانی اور عکس بند کیے جانے والے مناظر کے اُن حصوں کے بارے میں تفصیل سے مجھے بتائے گا جس کے کرداروں کے لیے بقول رابن، شاید میں اور مارلن موزوں ہیں۔ مجھے اس کی واپسی کا بے تابی سے انتظار تھا۔ ایک وعدہ تھا جو میرے لیے کچھ مالی بہتری کی امید دلا گیا تھا۔ ویسے بھی ہالی وڈ وعدوں کی دنیا ہے۔ یہاں وعدے اور زبانی کلامی دعوؤں پر ہی زیادہ تر کام چلتا ہے۔

میں اکثر وہاں کے چکر لگاتا رہتا تھا جہاں پہلی بار میری رابن سے ملاقات ہوئی تھی۔ جب ڈیڑھ ہفتہ گزر جانے کے باوجود وہ نہ ملا تو میں کئی بار دل ہی دل میں سخت مایوس ہوا کہ شاید اُس کی فلم بھی ہالی وڈ کی اُن فلموں کی طرح ہی تھی جس کے بارے میں باتیں تو بہت لوگ کر جاتے ہیں لیکن شوٹنگ کی نوبت کبھی نہیں آتی۔ اسی طرح رابن کا وعدہ بھی ہالی وڈ کے ان وعدوں کی طرح نہ ہو جو کیے تو جاتے ہیں مگر نبھائے نہیں جاتے۔

دوسری طرف مارلن کا وہی پرانا حال تھا۔ اس ڈیڑھ ہفتوں کے دوران اُس سے تین چار بار ملاقات ہوئی لیکن ہر بار وہ چڑچڑا سا نظر آیا۔ وہی قنوطیت اس پر طاری تھی جسے وہ اپنی نظر میں شاید سوبر پن سمجھتا ہوگا۔ اگرچہ اس نے مجھ سے براہِ راست کبھی رابن کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا لیکن اس کی نظروں سے یہ محسوس ہوتا تھا جیسے وہ چاہتا ہے کہ اگر اس کے حوالے سے میرے پاس کوئی خبر ہے تو میں خود اسے سناؤں۔ لیکن میں کیا کرتا؟ میں تو خود لاعلم تھا، اس لیے جانتے بوجھتے انجان بن جاتا۔

وہ اتوار کا دن تھا۔ یہ دن تھیٹر کی دنیا میں مصروف ترین کاروباری دن سمجھا جاتا ہے۔ مجھے مارلن کے معاون کا چھوٹا

ا کردار کرنا تھا لیکن دوپہر کو اس نے حکم صادر کر دیا کہ وہ کام ... کرے گا۔ ہدایت کار بے چارہ کیا کرتا، اس نے کچھ ... یلیاں کیں اور مارلن کے بغیر ہی ڈراما شو کرنے کا فیصلہ کیا۔ رہ گیا میں... تو مارلن کے بغیر میرا کردار بھی کٹ ہو گیا تھا۔

وہ میرے لیے ایک بُرا دن تھا۔ کردار نہ ملنے کی وجہ سے مجھے مالی نقصان ہوا تھا لیکن اس دن مجھے ایک بڑا سرپرائز مل گیا۔ رابن لوٹ آیا تھا۔

سہ پہر کے وقت میں وہیں سے گزر رہا تھا جہاں رابن سے پہلی بار ملاقات ہوئی تھی۔ اچانک میری نظر فٹ پاتھ پر پڑی۔ وہ شاندار شرٹ، مہنگی جینز اور سر پر اُلٹی بیس بال کیپ پہنے ہوئے کچھ لوگوں کے ہجوم میں شانِ بے نیازی سے کھڑا ہوا باتیں کر رہا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں نے فوراً سڑک عبور کی اور فٹ پاتھ پر آ گیا۔

"کیا حال ہیں؟" جیسے ہی مجھ پر نظر پڑی، اس نے خوش مزاجی سے کہا۔

"کیا کر رہے ہو؟" میں نے بھی رسماً پوچھا، حالانکہ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ صرف خوش گپیاں ہی کر رہا ہے۔

"گدھا بنا ہوا ہوں ان کے بیچ اور یہ میرا تماشا ہے۔" اس نے ہاتھ سے اپنے اطراف کھڑے لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"گدھے ہو تو پھر صحیح شہر میں موجود ہو۔" میں نے بھی ... کر جواب دیا۔ یہ سن کر اس نے قہقہہ لگایا۔ "فلم کا کیا ہوا؟" وہ خاموش ہوا تو میں نے تجسس کے انداز میں سوال کیا۔

"شوٹنگ شروع ہونے والی ہے۔"

"کیا؟" میں یہ سن کر چونک گیا۔ "میں، مارلن، سپر ... جیک..." میں نے دبے دبے لہجے میں اشارتاً کہا۔

"تم لوگ نہیں ہو اس فلم میں۔" اس نے سادہ لہجے میں جواب دیا۔

"مگر کیوں... تم تو کہہ رہے تھے کہ..." میں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی اور کن انکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ہمیں باتیں کرتا دیکھ کر اس کے گرد موجود مجمع چھٹ چکا تھا۔

"بات یہ ہے کہ تم سب کاپی رائٹ ایکٹر ہو۔ اب تمہیں فلم میں سائن کرنے کا مطلب ہے کہ درجن بھر اداروں سے این او سی لینے میں سر کھپاؤ اور پیسا خرچ کرتے ...۔" اس نے بڑے سکون سے کہنا شروع کیا۔ "بس، اسی لیے سوچا کہ تم لوگوں کو کٹ کر دیا جائے ورنہ بجٹ بڑھ جائے گا۔"

"اچھا..." میں نے مرے مرے لہجے میں کہا۔ ڈیڑھ ہفتے کا طویل انتظار مایوسی پر اختتام پذیر ہوا تھا۔

"میں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ مڑا اور بے فکروں کے انداز میں گنگناتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس کے جانے کے بعد میرا وہاں کھڑا رہنا بے مقصد تھا۔ میں بھی پلٹا اور واپس تھیٹر ہاسٹل کی طرف چل دیا۔ میں فوراً مارلن تک پہنچ کر اسے یہ بُری خبر سنانا چاہتا تھا۔

"خیر... رابن نے جو کہا، اس کا اصل پس منظر تو مجھے نہیں معلوم البتہ تم سُن لو کہ میں کاپی رائٹ ایکٹر نہیں ہوں۔" کچھ دیر بعد جب میں نے اس کے کمرے میں پہنچ کر تفصیل سے ساری اطلاع فراہم کر دی تو اس نے بظاہر بے دلی سے جواب دیا۔ شاید وہ کوشش کر رہا تھا کہ اس بُری خبر کو سُن کر وہ جو کچھ کہے، اس سے اس کے دلی جذبات کا مجھے قطعی اندازہ نہ ہو سکے۔ وہ ہر معاملے میں خود کو بے نیاز ظاہر کرنے کا عادی تھا۔ اس وقت بھی وہ اسی شانِ بے نیازی کا مظاہرہ کرنے کی قدرے کامیاب کوشش کر رہا تھا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ اسے یہ بات سن کر صدمہ پہنچا ہے۔ "تم مجھے چھوڑو۔ سپرمین اور کیپٹن جیک کا معاملہ دیکھو۔ اُن بے چاروں کا بھی تو اس نے ذکر کیا تھا اس فلم کے لیے۔" کچھ دیر تک سوچنے کے بعد اس نے سر اٹھایا اور مجھ سے کہا۔

"ہاں... کہا تو تھا۔ میں نے ان دونوں کو بھی یہ بات بتا دی تھی۔ وہ بھی بے صبری سے اُس کے لوٹنے کے منتظر تھے۔" میرے لہجے سے مایوسی صاف جھلک رہی تھی۔

"انہیں کہو کہ وہ رابن سے خود مل کر بات کریں۔ ہو سکتا ہے اُن کی بات بن جائے۔" مارلن نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مشورہ دیا۔

"تمہاری یہ بات اُن تک پہنچا دیتا ہوں۔" مجھے بھی اس کا یہ مشورہ خاصا معقول لگا۔

مارلن سے ملنے کے بعد میں کیپٹن جیک اور سپرمین کے پاس پہنچا تاکہ انہیں بھی یہ بُری خبر سنا سکوں۔

جب میں نے یہ بات ان دونوں کو بتائی کہ رابن واپس تو آ گیا ہے لیکن اس نے تم دونوں کو مسترد کر دیا ہے، اس وقت سپرمین کافی پی رہا تھا۔ یہ سنتے ہی اس نے مگ فرش پر دے مارا۔ "آخر لوگ مجھ سے کیوں نفرت کرتے ہیں؟" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ "میری تو قسمت ہی ایسی ہے۔ جسے دیکھو وعدہ کر لیتا ہے مگر..." اپنی بات

ادھوری چھوڑ کر اس نے سر جھکا لیا۔

''رابن نے تمہیں وزیٹنگ کارڈ دیا تھا نا؟'' سپرمین کی حالت دیکھ کر جیک نے استفسار یہ لہجے میں کہا۔

''ہاں... وہ تو میرے پاس ہے۔''

''تو تم اسے فون کر کے دیکھو۔'' جیک نے مشورہ دیا۔ ''تم نے اس سے سڑک پر بات کی ہے۔ اس وقت وہاں اور بہت سے لوگ موجود تھے۔ فون پر تفصیل سے بات کرو، اسے قائل کرنے کی کوشش کرو۔''

''مارلن بھی کچھ ایسا ہی مشورہ دے رہا تھا۔'' میں نے یہ بات سن کر کہا۔

''میرے سامنے تو اس کی بات ہی نہ کرو۔'' مارلن کی بات سنتے ہی وہ طیش میں آ گیا۔ ویسے بھی وہ اس کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ میں بے وفائی میں یہ بات کر گیا تھا ورنہ اس کے سامنے مارلن کا نام لینے سے گریز کرتا ہوں۔

میں نے رابن کا فون نمبر ملایا لیکن دوسری طرف سے فون نہیں اٹھایا گیا۔ ''وہ فون نہیں اٹھا رہا۔ ہو سکتا ہے، موجود نہ ہو۔'' میں نے اپنا موبائل فون بند کر کے جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

''چلو... جو قسمت میں لکھا ہے، وہ تو ہو کر ہی رہے گا۔''

سپرمین نے مایوسی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ویسے میں اس سے بات کرنے کی کوشش کروں گا۔'' وہاں سے اٹھتے ہوئے میں نے انہیں یقین دلایا۔ یہ اور بات ہے کہ مجھے خود یقین نہیں تھا کہ رابن کے ذریعے ان دونوں کو کوئی کام مل سکتا ہے۔ جیک کی بات کچھ اور تھی۔ وہ اسٹیج پر کچھ کما ہی لیتا تھا لیکن مجھے سپرمین پر واقعی افسوس ہو رہا تھا۔ وہ اسکرین پلے رائٹر بننے کے چکر میں اداکار بھی نہ بن سکا۔ وہ ڈبل مائنڈڈ تھا۔ اسی وجہ سے وہ جیک کی نسبت زیادہ پریشان حال تھا۔ وہ خوش تھا کہ فلم مل گئی تو اکٹھے چار پیسے ہاتھ لگ جائیں گے اور ممکن ہے کہ اس فلم کے ذریعے اسکرین پلے رائٹر کا بھی کوئی چانس مل جائے لیکن اب اس کے تمام منصوبوں پر رابن کے ایک ہی جملے نے پانی پھیر دیا تھا۔ میں سچے دل سے چاہتا تھا کہ کچھ ایسا ہو جائے کہ سپرمین کی بات بن جائے۔

دوسرے دن میں نے سوچا کہ مارلن سے ملا جائے لیکن جب میں اس کی طرف پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ کہیں گیا ہوا ہے۔ کئی دن گزر گئے لیکن اس کا پتا نہ چلا۔ میرے لیے یہ تشویش کی بات تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں گیا ہے۔ ویسے تو وہ اپنے ہی مزاج کا آدمی تھا لیکن میرے لیے اس کی پریشانی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس کی عدم موجودگی کے باعث ڈرامے سے میرا کردار بھی کٹ ہو چکا تھا۔ میں اس بے روزگاری کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

''مارلن کہاں جا سکتا ہے؟'' یہ بات مجھے کئی دن تک پریشان کیے رہی۔ آخر میں نے اسے ڈھونڈنے کا فیصلہ کیا۔ ڈرامے کے سبب ہم لوگ تھیٹر کے ہاسٹل میں رہ رہے تھے لیکن مجھے علم تھا کہ لاس اینجلس میں مارلن کا اپارٹمنٹ بھی ہے۔ میں کئی دن کی بے روزگاری سے تنگ آ چکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر مارلن نہ ہو تو میرا اس ڈرامے میں کوئی کردار نہیں، جس کا مطلب ہے کوڑی کوڑی کا محتاج ہو جانا۔ لگ بھگ چار دن گزر گئے تھے۔ میرے پاس جمع پونجی تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔ روزمرہ کے اخراجات پورا کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ایک صبح ناشتے کے بعد میں اسی بارے میں سوچ رہا تھا کہ اچانک خیال آیا، مارلن کو تلاش کرنے کے لیے اس کے اپارٹمنٹ پہنچا جائے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اپنی جیبی ڈائری نکالی۔ اس میں اپارٹمنٹ کا پتا درج تھا۔ کچھ دیر بعد میں ہالی وڈ کے پانچ منزلہ پارکنگ پلازا کی طرف جا رہا تھا، جہاں میری کار کھڑی ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں بہ آسانی وہاں پہنچ جاؤں گا۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد میں ایلیوڈور پہنچ چکا تھا۔ یہ علاقہ کم آمدنی والے لوگوں کا علاقہ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کثیر المنزلہ اپارٹمنٹس پر مشتمل عمارتیں جنگل میں درختوں کی صورت اُگی ہوئی ہیں۔ نظر اوپر اٹھاؤ تو ہر طرف کنکریٹ کی عمارتیں ہی عمارتیں نظر آتی ہیں۔ خاصا گنجان آباد علاقہ ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں ایک محفوظ جگہ پر کار پارک کر رہا تھا۔ پہلے تو مجھے یقین تھا کہ میں اس کے اپارٹمنٹ تک آسانی سے پہنچ جاؤں گا لیکن جب میں وہاں پہنچا تو چکرا کر رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد میں اس احاطے میں تھا جس میں اپارٹمنٹس کے کئی کثیر المنزلہ بلاک موجود تھے۔ مارلن ساتویں بلاک کی پانچویں منزل پر تیئس نمبر اپارٹمنٹ میں رہتا تھا۔ مجھے اپارٹمنٹ تلاش کرنے میں خاصی دشواری ہوئی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ کسی بھی دروازے پر اس کا نمبر نہیں لکھا ہوا تھا۔ کافی کوششوں کے بعد آخر میں ایک اپارٹمنٹ کی ڈور بیل بجا رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہی اس کا فلیٹ ہے۔ کافی دیر تک جواب نہ ملا۔ اس لیے میں نے ایک بار پھر ڈور بیل پر انگلی کا دباؤ ڈالا اور دیوار میں لگے انٹر کام کے قریب منہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''مارلن... میں ہوں ہمگی۔''

''کون ہمگی... اوہ، تو کیا تم بلیوارڈ سے آئے ہو؟''

اندر سے بھاری مردانہ آواز میں کہا گیا۔ مجھے یہ آواز سن کر بڑی حیرت ہوئی۔

''جی ہاں۔'' میں نے تصدیق کی۔

''ایک منٹ ٹھہرو۔'' اندر سے جواب ملا۔

مارلن ہمیشہ مصنوعی لہجے میں گفتگو کرتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ آواز اسی کی ہے۔ مجھے خوشی تھی کہ آج میں پہلی بار اس کی اصل آواز سن رہا تھا لیکن جب دروازہ کھلا تو میری ساری خوش گوار حیرت پلک جھپکتے ہی غائب ہو گئی۔ دروازے میں ایک موٹا آدمی نمودار ہوا۔ سوٹ میں ملبوس وہ شخص اتنا موٹا تھا کہ کھلے دروازے میں اس کے کھڑے ہونے کے بعد نہ تو کسی کے اندر جانے کی گنجائش تھی اور نہ ہی اندر کا کچھ حصہ دیکھا جا سکتا تھا۔

''تم کون ہو؟'' اسے دیکھتے ہی میں نے حیرت سے سوال کیا۔ مجھے تو امید تھی کہ مارلن دروازہ کھولے گا مگر یہ موٹا... میں تو اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

''پیٹرسن زینک... سراغ رساں لاس اینجلس پولیس ڈپارٹمنٹ۔ اب تمہاری باری ہے۔'' اس نے اپنا تعارف کروایا۔ وہ میری آمد کی تفصیل جاننے کا خواہش مند نظر آ رہا تھا۔

''میرا نام تم جان چکے ہو۔ یہ میرا ڈرائیونگ لائسنس ہے۔'' اس وقت اپنے بارے میں تفصیل سے بتانے کے لیے میرے پاس اس ڈرائیونگ لائسنس کے علاوہ کوئی اور دستاویز نہیں تھی۔ وہ پولیس والا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ اسے مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے۔ ''میں مارلن کے ساتھ کام کرتا ہوں۔ وہ کئی دن سے نظر نہیں آیا ہے، اسی لیے میں یہاں چلا آیا کہ پتا تو کروں کہ سب خیریت تو ہے۔ کہیں خدانخواستہ کچھ بُرا تو نہیں ہو گیا اُس کے ساتھ۔'' جب وہ لائسنس پر لکھے مندرجات پڑھنے میں مصروف تھا، تب میں نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ تمہارا خدشہ درست تھا۔ تمہارے ساتھی کا قتل ہو چکا ہے۔'' اس نے میرا لائسنس واپس کرتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' یہ سنتے ہی میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ قتل کا سنتے ہی میرے اوسان خطا ہو گئے۔ ''کیسے ہوا یہ سب کچھ؟ کس نے کیا؟'' میرے منہ سے ایک ساتھ کئی سوال نکلے۔

یہ سُن کر اس نے مجھے معنی خیز نظروں سے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ''اگر تمہارے ان سوالوں کے جوابات مجھے معلوم ہوتے تو اُس وقت کیا میں یہاں جھک مار رہا ہوتا؟ اپنے گھر میں بڑے آرام سے لیٹا ہوائی وی دیکھ رہا ہوتا۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''لیکن یہ سب کچھ ہوا کیسے؟'' میں ابھی تک مارلن کے قتل کی خبر سن کر لگنے والے شاک سے باہر نہیں نکل پایا تھا۔

''کل رات اپارٹمنٹس کے منیجر نے فون کر کے اطلاع دی کہ تیئس نمبر اپارٹمنٹ میں ایک ہلکے سے دھماکے کی آواز سنی ہے اور جب وہ اندر پہنچا تو بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر پہنچا تو دروازے کے قریب ہی مسٹر ہیلمر کی لاش پڑی ہوئی تھی۔'' سراغ رساں نے بتایا۔ ''کسی نے بیس بال بیٹ سے ان کے سر پر وار کیا تھا۔ ان کا ایک گھٹنا بھی ٹوٹا ہوا پایا گیا ہے۔''

''وہ دھماکا؟'' میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''دراصل وہ دھماکا میتھین گیس کے باعث گٹر میں ہوا تھا لیکن منیجر کو کسی نے غلط اطلاع دی تھی۔''

''تو مارلن کا اصل نام جیک ہیلمر تھا؟''

''جی ہاں...'' اس نے میرے اوپر نظریں گڑاتے ہوئے کہا۔ ''انہیں بیس بال بیٹ سے قتل کیا گیا ہے اور تم...'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور ایک بار پھر میرا جائزہ لینے لگا۔ ''تم بھی تو بیس بال کے کھلاڑی لگتے ہو۔''

''میں اور بیس بال...'' اس نے ڈرامائی لہجے میں بات مکمل کی تو میں چونک گیا۔ میرا حلق ایک بار پھر خشک ہو گیا۔ مجھے سراغ رساں کا اپنے اوپر کیا گیا شک پریشان کر گیا۔

''قاتل، آلۂ قتل چھوڑ کر فرار ہوا ہے۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ ''اگرچہ وہ اس پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کر گیا ہے، دوسرے وہ مقتول کے خون میں بھی لتھڑا ہوا ہے مگر پھر بھی ہمیں یقین ہے کہ یہ قاتل کو پکڑنے میں بہت مدد کرے گا۔'' اس نے ایک بار پھر مجھے گھورتے ہوئے معنی خیز انداز میں اپنی بات مکمل کی۔ ''خیر، مجھے تم صرف ایک بات کا جواب دو۔ تم مسٹر جیک ہیلمر کو کتنی اچھی طرح جانتے تھے؟''

''ہم دونوں اسٹیج پر کام کرتے تھے۔ میرا کردار ان کے نائب کا ہوتا تھا۔ ایک طرح سے یہ لازم و ملزوم کردار تھا اور بس...'' میں نے اس کا شک دور کرنے کے لیے کہا۔ ''اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں جانتا۔ میں تو ان کا اصل نام بھی نہیں جانتا۔ مجھے تو صرف ان کا فلمی نام معلوم تھا۔ یہ تو آج میرے علم میں پہلی بار آیا کہ ان کا اصل نام جیک ہیلمر ہے۔'' میں نے اپنی دانست میں اس کے سوال کا تسلی بخش جواب دیتے ہوئے بات مکمل کی۔

"اور اب تم یہ بات بھی جان چکے ہو کہ وہ کہاں رہتے تھے؟" اس کا لہجہ استفسار یہ تھا۔ مجھے لگا کہ وہ بدستور مشتبہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا ہے۔

میں نے ایک کے بعد ایک کر کے سراغ رساں کے متعدد سوالوں کے جوابات دیے لیکن آخر میں، میں نے یہ بات محسوس کی کہ وہ شروع سے ہی مجھے مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا اور اتنی باتوں کے باوجود بھی اس کا شک برقرار تھا۔ میرے تمام جوابات بھی اس کی تسلی کرنے میں ناکام رہے۔ اس وقت میں خود کو کوس رہا تھا کہ غلط وقت پر درست پتے پر پہنچ گیا۔ ویسے بھی لاس اینجلس میں مجھ جیسے احمقوں کی کمی نہیں تھی جو خود آگے بڑھ کر کہتے تھے کہ آ بیل مجھے مار۔ وہ خاموش کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ جس انداز سے وہ مجھے گھور رہا تھا، ڈر کے مارے میری ٹانگیں لرزنے لگیں۔ اچانک اندر سے کسی نے اونچی آواز میں پکارا۔ "اے پیٹرسن... ذرا ایک منٹ کے لیے اِدھر آؤ۔" یہ سنتے ہی وہ مڑا اور مجھے بھی اپنے پیچھے پیچھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

یہ ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ تھا جس میں پلاسٹک اور ایلومینیم شیٹ کی مدد سے پارٹیشن بنائے گئے تھے۔ اندر بہت زیادہ روشنی نہیں تھی۔ میں نے سامنے کی طرف نظر کی تو سادہ لباس میں ایک نوجوان پولیس افسر موجود تھا۔

"کیا ہوا... کچھ ملا ہے کیا؟" پیٹرسن نے سوال کیا۔

"اِدھر... ذرا بیڈ روم میں آؤ۔" اس نے برابر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا مگر وہ بیڈ روم کی طرف جانے کے بجائے میری طرف مڑا۔

"مجھے تم سے جتنی معلومات چاہیے تھیں، وہ مل گئی ہیں۔" اس نے کہنا شروع کیا۔ "تم اپنا پتا اور فون نمبر لکھوا دو۔ اگر مزید ضرورت پڑی تو میں تم سے رابطہ کرلوں گا۔" اس نے جیب سے نوٹ بک نکالتے ہوئے کہا۔

میں نے اسے پتا اور فون نمبر لکھوایا۔ "بہت بہت شکریہ... مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے مشتبہ نہیں سمجھ رہے۔" وہ نوٹ بک واپس جیب میں رکھ رہا تھا، تب میں نے خوشی سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں، ابھی میں نے تمہیں حتمی طور پر اس کیس سے خارج نہیں کیا ہے۔" اس نے گمبھیر آواز میں کہا۔ یہ سنتے ہی میری ساری خوشی یکدم رفو چکر ہوگئی۔ "اب تم جاسکتے ہو۔" اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"شکریہ۔" میں بوجھل قدموں سے اپارٹمنٹ سے باہر نکل آیا۔ دل تو چاہتا تھا کہ جتنا جلد ہو سکے، اس منحوس عمارت سے دور بھاگ جاؤں لیکن میں جیسے ہی باہر نکل کر کوریڈور میں پہنچا، اچانک میرے کانوں میں آواز آئی۔ "بتاؤ... کیا ملا ہے؟" یہ سن کر میں ٹھہر گیا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ انہیں کیا شے ملی ہے۔

"مجھے بیڈ کی سائڈ ٹیبل سے یہ تصویر ملی ہے۔" دوسرے پولیس افسر کی آواز سنائی دی۔ "اس کی پشت پر کچھ لکھا ہوا ہے۔ مجھے یہ بات حیران کر رہی ہے کہ اس پر 'پوائزن' کیوں لکھا ہوا ہے؟"

"مجھے دکھاؤ۔" پیٹرسن کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ میرے کان دروازے پر لگے ہوئے تھے۔

"احمق... یہ پوائزن نہیں بلکہ پائزون لکھا ہوا ہے۔ یہ عبارت اطالوی زبان میں ہے اور اس لفظ کا مطلب دوست ہوتا ہے۔" پیٹرسن اسے بتا رہا تھا۔ "اس پر لکھا ہوا ہے کہ میرے دوست جیک ہیلمر کے کریئر کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ، فرینک سناترا۔"

"یہ کیا ڈرپی سناترا والا ہے؟" نوجوان افسر نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔" پیٹرسن نے جواب دیا۔

"تو پھر کون ہوسکتا ہے؟"

"میں ابھی کیا کہہ سکتا ہوں۔" پیٹرسن کی جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ میں نے ایک منٹ تک انتظار کیا اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے باہر نکل آیا۔ یہ عمارت خاصی بدبودار تھی۔ اگر میں کچھ دیر اور وہاں کھڑا رہتا تو بدبو کے مارے مجھے قے آجاتی۔ میں نے کار میں بیٹھتے ہی ساری کھڑکیاں کھول دیں اور ٹھنڈی ہوا میں لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔

جب ذرا طبیعت سنبھلی تو میں نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ میں واپس جا رہا تھا اپنے ہاسٹل۔ "جیک ہیلمر۔" میرے ذہن میں بار بار یہ نام گونج رہا تھا۔ یہ درست ہے کہ میں مارلن کے بارے میں بہت زیادہ نہیں جانتا تھا لیکن اب میں اس کا اصل نام جان چکا تھا۔ میرے دل میں تجسس بیدار ہو چکا تھا۔ اب میں اس کی زندگی کے بارے میں سب کچھ جان لینے کے لیے بے قرار تھا۔ اچانک میرے دماغ میں ایک خیال آیا۔ میں نے فوراً گاڑی کا رخ موڑا۔ اب میں ہاسٹل کے بجائے لاس فیلو پبلک لائبریری جا رہا تھا۔ یہ لائبریری اس لیے خاص الخاص تھی کہ یہاں امریکا کے ہر اُس اداکار کے بارے میں معلومات تھیں جو اپنی پوری

زندگی میں صرف ایک بار ہی کیمرے کے سامنے آیا ہو... اور چاہے ایک ہی ڈائیلاگ کیوں نہ ادا کیا ہو۔ یہ ساری معلومات کمپیوٹر پر موجود تھیں، کوئی بھی شخص اُس سے استفادہ کرسکتا تھا۔

کچھ دیر کی کوششوں کے بعد میں جو کچھ جان پایا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ جیک ہیلمر 1941ء میں پیدا ہوا۔ 60ء کی دہائی کے آخر میں اس کے فلمی کیریئر کا آغاز ہوا۔ 80ء کی دہائی کے وسط میں اس کا فنی سفر فلم کی دنیا پر اپنا کوئی خاص تاثر قائم کیے بغیر ختم ہوگیا۔ مجھے یہ پڑھ کر بھی حیرت ہوئی کہ اس نے فرینک سناترا کے ساتھ ایک مزاحیہ فلم میں بھی کام کیا تھا۔ اس فلم میں وہ فوج کا لیفٹیننٹ تھا لیکن یہ کردار اتنا غیر اہم تھا کہ فلم کی کریڈٹ لائن پر بھی اس کا نام نہیں دیا گیا تھا۔

جیک پر لکھے گئے تبصروں کے مطابق وہ کئی دوسرے اداکاروں کی طرح نشے کی لت کا شکار تھا۔ وہ اتنی زیادہ شراب پیتا تھا کہ ایک بار اس نے شوٹنگ کے دوران نشے کی حالت میں ایک ایکسٹرا اداکارہ کو اپنی کار تلے کچل کر شدید زخمی کر دیا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ اسے ہوٹل کے داخلی دروازے کے سامنے سے کار چلاتے ہوئے سیدھے آگے جانا تھا لیکن نشے کے باعث وہ توازن نہ رکھ سکا۔ اسٹیئرنگ لڑکھڑایا اور کار برابر میں کھڑی ہوئی ایکسٹرا پر چڑھ گئی۔ جیک جور چڑ برٹن ہنسے کے سینے دیکھتا تھا، اس واقعے کے بعد اس کا فلمی کیریئر لگ بھگ ختم ہی ہوگیا۔ اس کے بعد اس نے کچھ ٹی وی ڈراموں اور نہایت فضول سی فلموں میں چھوٹے موٹے کردار ادا کیے لیکن ہالی وڈ میں اس کی شراب نوشی اور بے پروائی کے چرچے اتنے عام ہوگئے تھے کہ اس کا فلمی ستارہ پھر کبھی فن کے آسمان پر اپنی چمک کی انفرادیت قائم نہ کرسکا۔

جیک ہیلمر یا مارلن کے متعلق میں نے جو کچھ پڑھا، اس نے مجھے افسردہ کر دیا۔ میں خود بھی ایک ایسا اداکار تھا جو برسوں گزر جانے کے باوجود ہالی وڈ میں اپنی پہچان بنانے کے لیے اب تک ہاتھ پاؤں مار رہا تھا مگر کوئی اہم کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اب جو مارلن کا اصل احوال جانا تو ڈر لگنے لگا کہ کہیں میرا انجام بھی اس جیسا نہ ہو۔

دوسرے دن میں حسبِ معمول آٹھ بجے سو کر اٹھا، ناشتا کیا اور پھر کھیر چلا آیا۔ میں چاہتا تھا کہ ساتھی اداکارہ میری لین کو مارلن کے قتل کی اطلاع کردوں۔ وہ بھی میری طرح ہاتھ پاؤں چلا کر کچھ بننے کی خواہش مند تھی۔

میں گیارہ بجے تھیٹر پہنچا۔ مجھے بے تابی سے میری لین کی آمد کا انتظار تھا۔ آخر خدا خدا کر کے وہ دو بجے کے قریب پہنچی۔ اسے دیکھتے ہی میں نے اسے جالیا۔ "مجھے تم سے نہایت ضروری بات کرنی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے اسے بازو سے پکڑا اور ایک کونے میں لے گیا۔ "مارلن کا قتل ہوگیا ہے۔"

میں نے جیسے ہی یہ کہا، اس کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ "کب... کیسے؟" اس نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ جواب میں، میں نے اسے ساری کہانی سنادی۔

"اوہ میرے خدا۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامتے ہوئے کہا۔ "جو کچھ تم کہہ رہے ہو، مجھے تو اس پر اب تک یقین نہیں آرہا ہے۔"

"جب میں نے یہ سنا تھا، اس وقت مجھے بھی اس بُری خبر پر یقین نہیں آیا تھا مگر یقین کرنا ہوگا، یہی سچ ہے۔" میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "ویسے تمہارے پاس کوئی ایسی اطلاع ہے اس بارے میں جس سے پولیس کو قاتل کو پکڑنے میں مدد مل سکے؟" میں نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"یقیناً نہیں... میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جو میں پولیس کو بتا سکوں۔" اس نے میری بات سن کر گہری سانس لی اور پھر قطعی لہجے میں جواب دیا۔

"دیکھو میری..." میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس نے میری بات بیچ میں ہی کاٹ دی۔

"میں نے تم سے کہا ہے نا کہ میں کچھ نہیں جانتی۔ میں پولیس کو کچھ نہیں بتا سکتی۔ اگر میں نے دیکھا کہ یہاں پولیس والے آرہے ہیں تو میں دوسرے راستے سے بھاگ جاؤں گی۔" اس کے لہجے میں جھنجلاہٹ آگئی۔

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔" اس کی بات سن کر میں نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ "پولیس یہ بات جانتی ہے کہ وہ یہاں کام کرتا تھا اور ہم سب اس کے ساتھی اداکار تھے۔ ہوسکتا ہے کہ جب ہم یہ بات کر رہے ہیں، وہ تفتیش کے لیے پہنچنے ہی والے ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"کیا مصیبت ہے یہ۔" اس نے جھنجلا کر آہستہ سے کہا اور پھر خاموشی سے میری... طرف غور سے دیکھنے لگی۔ "ٹھیک ہے۔" اس نے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا۔ "تم ہمیشہ مجھے دوسروں سے کچھ مختلف لگتے ہو۔ اگر میں تم سے کوئی بات کہوں تو کیا اسے راز رکھ سکو گے؟" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی اور سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

"کیا یہ مارلن سے متعلق ہے؟" اس کی بات سن کر میں

نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اُلٹا سوال کر ڈالا۔

''سارا تو نہیں، البتہ اس کا کچھ حصہ اُس سے متعلق ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم مجھ پر اعتبار کر سکتی ہو۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہم یہاں کھل کر بات نہیں کر سکتے۔'' اس نے چاروں طرف نظریں گھماتے ہوئے کہا۔ ''کہیں اور چل کر بات کرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، باہر چلو۔'' میں نے آہستہ سے کہا اور پھر ہم باہر آ گئے۔

نیچے زیرِ زمین پارکنگ میں کھڑی میری کار سب سے محفوظ جگہ تھی۔ وہاں ہم کھل کر بات کر سکتے تھے۔ کچھ دیر بعد میری اور میں کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے نہایت مسحور کن پرفیوم لگایا ہوا تھا۔ ''اب بتاؤ، کیا بات ہے؟'' میں نے کار کے شیشوں کے پار اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''پہلی بات تو یہ کہ میرا نام بیڈی ہے۔'' اس نے آواز بدل کر کہا۔ اس کی آواز خاصی بھاری ہو چکی تھی۔ شاید وہ ڈرتی تھی کہ کہیں میں اس کے بیان کو اپنے موبائل فون کے ذریعے ریکارڈنگ نہ کر لوں۔ ''میں جانتی ہوں کہ رابن اور گاڈ فادر نے خفیہ طور پر ملاقات کی تھی۔ وہ ڈنر پر گریسو ریستوران میں ملے تھے۔'' یہ ہالی وڈ کے اُن باقی ماندہ چند ریستورانوں میں سے ایک تھا جو بہت پرانے تھے اور اب تک اُن کی وضع قطع اور انداز وہی تھا جو بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں کا فیشن تھا۔ ''چند روز پہلے ہی میرے علم میں یہ بات آئی تھی کہ رابن نے اپنی فلم کے لیے مارلن کا انتخاب کر لیا تھا لیکن اس نے ہم سب کو نظر انداز کر دیا۔''

''یہ بات تم کیسے جانتی ہو؟ کیا اُن کا پیچھا کر رہی تھیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں ہفتے میں تین رات، جب ڈراما نہیں ہوتا، اُس ریستوران میں کام کرتی ہوں۔ اُس رات بھی ڈراما نہیں تھا۔ میں ڈیوٹی پر تھی۔ میں نے انہیں ڈنر کرتے ہوئے دیکھا۔'' اس نے کہا۔ ''وہ دونوں خوش گوار موڈ میں باتیں کر رہے تھے۔''

''ویسے ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' میں نے کہا۔

''کیا؟''

''یہ کیسے ممکن ہے کہ تم نے تو اُن دونوں کو دیکھ لیا مگر وہ تمہیں نہیں دیکھ پائے؟ میرا خیال ہے کہ اگر مارلن کی اُچٹتی ہوئی نظر بھی پڑ جاتی، تب بھی وہ تمہیں پہچان لیتا۔''

میری بات سن کر وہ سوچ میں پڑ گئی اور اپنے سنہری بالوں کی لٹ کو انگلیوں میں لپیٹنے لگی۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ایک بار اس کی نظر مجھ پر پڑی تھی مگر اس وقت میں وردی میں تھی اور بالوں کو کس کر جوڑا باندھا ہوا تھا۔ ویسے بھی ڈائننگ ہال میں روشنی مدھم تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اس حلیے میں وہ مجھے نہیں پہچان سکے ہوں گے۔ ویسے جب مارلن کی نظر مجھ پر پڑی تو لمحے بھر کے لیے میں بھی ڈر گئی تھی کہ کہیں وہ مجھے پہچان نہ لیں۔'' اس نے وضاحت کی۔

''تم نے اُن کی گفتگو سنی تھی؟''

''کوشش کی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ویسے زیادہ تر رابن بول رہا تھا۔ اس کی آواز خاصی اونچی تھی۔ اس کا لہجہ پُرجوش تھا۔ اس کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ اس نے کوئی ایسا چہرہ دریافت کر لیا ہے جو ہالی وڈ میں تہلکہ مچا دے گا۔'' میری نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''تمہاری باتوں سے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے تم مارلن سے بہت زیادہ نفرت کرتی تھیں۔ یہ دیکھ کر تمہیں حسد ہوا کہ مارلن کو کیسے اتنا بڑا کردار مل رہا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''اگر کسی کو یہ موقع ملنا چاہیے تھا تو وہ میں ہوں۔'' اس نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔ ''میں بہترین اداکاری کرتی ہوں۔ گاڈ فادر کو چاہیے تھا کہ مجھ جیسی اداکارہ کی مدد کرتے لیکن وہ ہم جیسے نو واردوں کے سرپرست بننے کے بجائے خود اپنا مقصد حاصل کرنے میں لگ گئے۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں تیرتی ہوئی نمی صاف نظر آ رہی تھی۔

''آئی ایم سوری۔'' اس کی حالت دیکھ کر میرا بھی دل بھر آیا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دینا چاہی، وہ بدستور خاموش تھی۔ ''میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ تمہیں یہ بات پولیس کو بتا دینی چاہیے۔''

یہ سن کر وہ مسکرائی اور طنزیہ لہجے میں کہنے لگی۔ ''لاس اینجلس پولیس کے ساتھ میرا ایک بار واسطہ پڑ چکا ہے۔ میں ایک بار پھر اس تجربے کو دُہرانا نہیں چاہتی۔'' یہ کہہ کر وہ چند لمحے کے لیے خاموش ہوئی اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اگر تمہیں پولیس والوں سے اتنی ہی ہمدردی ہے تو جاؤ اپنے اُن دوستوں کے پاس... ساری بات بتا دو انہیں...

مگر ایک بات یاد رکھنا، اس پورے قضیے میں کہیں پر بھی میرا ذکر نہ آئے۔'' اس نے آخری جملہ اس انداز میں کہا کہ اگر میں نے اس کا نام لیا تو وہ مجھے جان سے مار ڈالے گی۔

''ٹھیک ہے، تمہارا نام کہیں نہیں آئے گا۔'' میں نے اسے یقین دلایا۔

''ٹھیک ہے تو پھر ملتے ہیں۔'' اس نے کار کے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا اور اپنا ہینڈ بیگ سنبھالتے ہوئے باہر نکل گئی۔ میں بدستور اندر بیٹھا رہا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا دیا اور سوچنے لگا کہ کس طرح پولیس کو یہ بات بتائی جائے کہ بیچ میں میری کا نام بھی نہ آئے اور اُن تک معلومات بھی پہنچ جائے۔

آخر میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ ''یہ ٹھیک ہے۔ اس طرح میری کا نام بھی نہیں آئے گا اور میرا مقصد بھی پورا ہو جائے گا۔'' یہ خیال آتے ہی میں بڑبڑایا اور پھر اگلے ہی لمحے میں کار اسٹارٹ کر رہا تھا۔ ابھی میں بلیوارڈ اسٹریٹ پر ہی پہنچا تھا کہ مجھے فٹ پاتھ پر سراغ رساں پیٹرسن نظر آ گیا۔ وہ جوکر کے ساتھ کھڑا ہوا باتیں کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے گاڑی کو کنارے پر روکا اور سڑک عبور کر کے اس کی طرف بڑھنے لگا۔

''ہائے سراغ رساں پیٹرسن۔'' میں نے اس کے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔ اس وقت جوکر ہوش مندوں کی طرح اس سے باتیں کر رہا تھا۔ میری آواز سن کر وہ خاموش ہوا اور سراغ رساں میری طرف پلٹا۔ ''میں آپ سے ملنے ہی جا رہا تھا، یہاں دیکھا تو...''

''اوہ...'' یہ سن کر وہ چونکا۔ ''کچھ خاص بات ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میرے خیال میں ایک بات تو ہے جو کل میں نہیں بتا سکا تھا۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جوکر کی موجودگی میں بات کروں۔

یہ سن کر اس نے جوکر کو ہاتھ سے جانے کا اشارہ کیا۔ جوکر کے جانے کے بعد اس نے چاروں طرف نظریں گھما کر تسلی کی کہ کہیں کوئی ان کی باتیں تو نہیں سن رہا، پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''ہاں اب کہو، کیا بات ہے؟''

''ایک شخص ایسا بھی ہے جس سے آپ کو بات کرنی چاہیے۔''

''کون ہے؟'' اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''اس کا نام رابن اسٹیل ویل ہے اور وہ فلم کا سٹنگ ڈائریکٹر ہے۔ کچھ دنوں پہلے مارلن اور اس نے گریسو ریستوران میں ڈنر کیا تھا۔ ان کے درمیان بہت دیر تک بات چیت ہوئی تھی۔ ممکن ہے کہ وہ کوئی ایسی بات جانتا ہو جس سے قاتل کا سراغ مل سکے۔''

''یہ بات تم نے کل کیوں نہیں بتائی تھی؟'' اس نے مشکوک نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''کل میں بہت ڈر گیا تھا اس لیے یہ بات میرے ذہن میں ہی نہیں آئی۔ اب یاد آئی ہے تو آپ کو بتانے کے لیے ہی جا رہا تھا۔''

''اوکے... تمہارے پاس رابن کا نمبر ہے؟'' اس نے اپنی جیب سے موبائل فون نکالتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں۔'' یہ کہہ کر میں نے کوٹ کی اندرونی جیب سے بٹوا نکالا اور وہ وزیٹنگ کارڈ اس کی طرف نکال کر بڑھایا جو اس نے مجھے دیا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ نمبر ملا رہا تھا۔

''سارجنٹ پیٹرسن، لاس اینجلس پولیس ڈپارٹمنٹ۔ مجھے رابن ویل سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ انہیں کہیں کہ دو منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔'' مجھے یقین تھا کہ یہ سننے کے بعد استقبالیہ کلرک فوراً لائن ملوا رہا ہوگا۔ چند لمحوں تک وہ ہولڈ آن کیے رہا۔

''ہائے... رابن ویل۔'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ دوسری طرف رابن موجود ہے۔ ''دیکھیے... مجھے آپ سے ایک نہایت اہم بات کرنی ہے۔ میں مسٹر جیک ہیملر کے قتل کی تحقیقات کر رہا ہوں۔ یہ وہی بوڑھے اداکار ہیں جو چائنیز تھیٹر میں برانڈو کا کردار ادا کرتے تھے۔ امید ہے کہ آپ پہچان گئے ہوں گے۔'' یہ کہہ کر وہ چند لمحے کے لیے رکا۔ اس کی نظریں مجھ پر گڑی ہوئی تھیں۔ ''کیا آپ ہیگی جیک مین کو جانتے ہیں؟'' یہ کہہ کر وہ چند لمحے کے لیے خاموش ہوا اور دوسری طرف سے کہی گئی بات سننے لگا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو پریشان کیا۔ معذرت چاہتا ہوں۔ تعاون کے لیے شکریہ۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کیا اور جیب میں رکھتے ہوئے گہری نگاہوں سے مجھے گھورنے لگا۔ ''اس کا کہنا ہے کہ آج سے پہلے اس نے یہ دونوں نام سنے بھی نہیں ہیں۔'' اس نے درشت لہجے میں کہا۔

''وہ جھوٹ بول رہا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے پیٹرسن کے خوف سے میری ٹانگیں کپکپانے لگیں۔

''وہ جھوٹ نہیں بول سکتا۔'' اس نے مجھے گھورا۔

''ہو سکتا ہے کہ اس بات کی کوئی وجہ ہو۔'' خوف کے مارے میری آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔

"تمہارے کہنے کے مطابق رابن مرد ہے لیکن جس نمبر پر فون کیا گیا ہے، وہاں رابن ویل مرد نہیں عورت ہے، سمجھے؟ اس لیے وہ نہیں، تم جھوٹ بول رہے ہو۔" اس نے دانت کچکچاتے ہوئے انکشاف کیا تو میرا سر چکرا کر رہ گیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اپنی بات کہہ نہ سکا۔ میں نے سر تھام لیا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں۔

"تم سوچ رہے ہو گے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔" مجھے گھگیاتے دیکھ کر پیٹرسن نے دبنگ آواز میں کہا۔ "مجھ پر یقین نہیں ہے تو خود فون کر کے تصدیق کر لو۔" اس نے اپنی جیب سے موبائل فون نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میرا یقین کریں میں..."

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" اس نے قطع کلامی کی اور اپنی جیب سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری طرف بڑھایا۔ "تم نے پولیس کی مدد کرنے کی کوشش کی ہے، اس کے لیے شکریہ۔ یہ رکھ لو اور اگر اب تمہارے علم میں ایسی کوئی بات آئے جس کا تمہارے خیال میں کوئی نہ کوئی تعلق تمہارے ساتھی کے قتل سے ہو سکتا ہے تو مجھے اس نمبر پر فون کر دینا۔" یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے آگے بڑھا لیکن اگلے ہی لمحے اس کے قدم رک گئے۔ وہ پلٹا اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہنے لگا۔ "ہاں سنو... فون کر لینے سے پہلے سوچ لینا کہ میرے پاس فضول کاموں میں ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ اس لیے جو بات کرنا، سوچ سمجھ کر کرنا۔"

رابن سے متعلق جو چونکا دینے والی حقیقت سامنے آئی، وہ سمجھ سے بالاتر تھی۔ میرا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ میں اپنے دماغ میں وہ سب باتیں ترتیب سے دہرا رہا تھا جو اُس دن رابن نے مجھ سے کہی تھیں۔

یہی سب کچھ سوچتا ہوا میں واپس اپنے کمرے میں پہنچا۔ بہت دیر تک میں بستر پر لیٹا تمام واقعات کو اپنے ذہن میں ترتیب دے کر یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس قضیے کی ابتدا مارلن سے ہونے والی میری ملاقات سے شروع ہوئی اور .... پھر اس کہانی نے اُس کے قتل سے ایک اور رخ بدلا۔ پھر ایک موڑ پر میری لین آ گئی اور اب یہ رابن اسٹیل ویل... جو میری نگاہوں کے مطابق سو فیصد مرد تھا لیکن پیٹرسن کا کہنا ہے کہ اس نے جس..... سے بات کی وہ تو عورت ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ رابن کے علاوہ ایک گمنام عورت بھی اس کہانی میں شامل ہو چکی ہے۔ میں بہت دیر تک سوچتا رہا لیکن نہ تو مجھے اس پوری کہانی میں کوئی کردار ایک دوسرے سے جڑا ہوا نظر آیا اور نہ ہی مارلن کے قتل سے بظاہر اس کا کوئی تعلق بنا۔ آخر میں سوچتے سوچتے تھک گیا اور نہانے چلا گیا۔

نہاتے نہاتے اچانک میرے دماغ میں بجلی سی کوندی۔ "رابن کے وزیٹنگ کارڈ سے ہی سارا بھید کھل سکتا ہے۔" میں سوچ رہا تھا کہ یہ بات درست ہو کہ جس شخص نے خود کو رابن ظاہر کر کے مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ تھمایا تھا، ممکن ہے کہ وہ رابن اسٹیل ویل ہی نہ ہو اور پیٹرسن نے جس عورت سے بات کی ہے، وہی درست ہو۔ ممکن ہے کہ خود کو رابن ظاہر کرنے والے شخص نے اُس کے وزیٹنگ کارڈ چرا لیے ہوں اور اب وہ انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہا ہو۔ میرا دماغ تیزی سے چل رہا تھا اور میں اس قضیے کے ہر پہلو پر سوچ رہا تھا۔ جو کچھ ہوا، اس میں ہر بات ممکن تھی۔ انہی ممکنات کے تجزیے سے حقیقت کا پتا چل سکتا تھا۔

جب میں باتھ روم سے باہر نکلا تو سہ پہر ہو رہی تھی۔ میرے ذہن میں مکمل منصوبہ موجود تھا۔ میں بنیادی طور پر اداکار ... ہوں اور خود کو کسی بھی کردار میں ڈھالنے کے لیے مناسب میک اپ کا استعمال جاننے کے علاوہ کردار کی چال ڈھال اور لب و لہجے کو اختیار کرنے کی خداداد صلاحیتوں کا مالک ہوں۔ میں نے اپنے ذہن میں خود کو رابن اسٹیل ویل کہنے والے شخص کا حلیہ دُہرایا اور ایک گھنٹے بعد جب باہر نکلا تو یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ دور سے دیکھنے پر بالکل اُس جیسا لگ رہا تھا۔ جینز، سفید شرٹ، دھوپ کا چشمہ، سر پر اُلٹی بیس بال کیپ اور آسٹریلوی لہجہ... میرا منصوبہ تھا کہ اس حلیے میں اُس پتے پر پہنچوں جو مبینہ رابن ویل کے دفتر کا تھا۔

شہر کے جس علاقے میں یہ عمارت واقع تھی، وہ فلم سازی کے منصوبوں کے حوالے سے مشہور تھا۔ یہاں کئی فلم کمپنیوں کے دفاتر موجود تھے۔ میرا مطلوبہ دفتر پندرھویں منزل پر تھا۔ میں لفٹ سے باہر نکلا تو سامنے ہی ایک بڑا سا شیشے کا دروازہ تھا جس پر نیلے رنگ کے بڑے بڑے حروف میں لکھا ہوا تھا:

"اسٹیل ویل اینڈ ایسوسی ایٹس... کنسلٹنٹ۔"

میں دروازے کی طرف بڑھا۔ شیشے کے پار صاف ستھری لابی میں ایک بڑی سی میز کے پیچھے ایک سیاہ فام حسینہ بیٹھی ہوئی تھی۔ یقیناً وہ استقبالیہ کلرک تھی۔ میں نے انگلی سے دستک دی تو اس نے نیچے ہاتھ کر کے الیکٹرانک لاک کا بٹن دبایا اور ہاتھ سے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

"ہیلو... کیسی ہو... لگتا ہے تم یہاں نئی آئی ہو؟" میں

نے میبل رابن کے انداز بے فکری کی نقل کرتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں..." وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔ "میں پچھلے چار ماہ سے یہاں کام کر رہی ہوں۔"

"اوہ... خیر، میں ہی بہت دنوں کے بعد یہاں آیا ہوں۔"

"کہیے... میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟" وہ ایک بار پھر کاروباری مسکراہٹ اپنے موٹے موٹے سیاہ لبوں پر سجاتے ہوئے بولی۔

"میں ہینکی جیک مین ہوں، کیا رابن اسٹیل ویل ہیں؟" میرا انداز اب بھی ویسا ہی تھا۔

"آپ بیٹھیے۔" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا اور انٹر کام اٹھاتے ہوئے بولی۔ "میں دیکھتی ہوں۔"

"اسٹیو! کیا وہ بیٹھی ہوئی ہیں؟" یہ کہہ کر اس نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا اور پھر ریسیور پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "وہ دفتر سے باہر جا چکی ہیں۔ کیا ان سے آپ کی ملاقات طے تھی؟"

"جی نہیں۔"

"او کے اسٹیو! میں دیکھ لیتی ہوں۔" میری بات سنتے ہی اس نے فون رکھا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "کہیے، میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟"

"نہیں، ایسی کوئی خاص بات نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں تو بس یہاں سے گزر رہا تھا، سوچا ملتا چلوں۔ کافی دن ہو گئے ہیں ان سے ملے ہوئے، ورنہ اور تو کوئی خاص بات نہیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ویسے کیا میں اسٹیو سے مل سکتا ہوں؟"

"کوئی خاص بات؟" اُس نے سوال کیا۔

"نہیں، بس ویسے ہی ہیلو ہائے۔"

"آپ جا سکتے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے دائیں طرف اشارہ کیا۔ یہ ایک بڑا سا ہال تھا جس میں قطار سے شیشے کے کئی کیبن بنے ہوئے تھے۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جس شخص کی مجھے تلاش ہے، کیا وہ یہیں کام کرتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس وقت اسے دفتر میں موجود ہونا چاہیے تھا۔ ہر کیبن میں بیٹھے ہوئے شخص کا رخ کوریڈور کی طرف تھا لیکن مجھے مطلوبہ چہرہ نظر نہیں آیا۔ ایک کیبن سے گزرا تو وہاں لکھا ہوا تھا: اسٹیفن ایڈیز۔ اندر موجود شخص کی نظر مجھ پر پڑی تو میں نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا۔ ایسا لگا جیسے وہ مجھے دیکھ کر چونک گیا ہو۔ میں نے یہ بات محسوس کر لی لیکن بظاہر نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ چند منٹ کے بعد میں واپس پلٹا اور مسکرا کر استقبالیہ کلرک کا شکریہ ادا کر کے باہر آ گیا۔ جب میں لفٹ کا انتظار کر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ مجھے دیکھ کر چونکنے والا شخص استقبالیہ کلرک سے کچھ باتیں کر رہا ہے۔ شیشے کے پار سے ان کی نگاہیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ اتنی دیر میں لفٹ آ گئی اور دروازہ کھلنے کی گھنٹی بجتے ہی میں نے فوراً قدم اٹھائے اور جلدی سے لفٹ میں آ گیا۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں غلط بیانی کر کے دفتر میں گھسنے کے جرم میں وہ مجھے گرفتار نہ کروا دیں۔

ویسے بھی مجھے دیکھ کر اس شخص کے چہرے پر آنے والے حیرت کے تاثرات، اس کی استقبالیہ کلرک سے پوچھ گچھ اور پھر مسکرا کر مجھے دیکھنا... یہ سب معنی خیز اشارے تھے لیکن میں ان کا مطلب اب تک سمجھ نہیں سکا تھا۔ البتہ یہ بات صاف ہو گئی تھی کہ رابن اسٹیل ویل مرد نہیں عورت ہی تھی اور جس شخص کا روپ میں نے دھارا ہوا تھا، اس کے بارے میں اسٹیفن کچھ تو ایسا ضرور جانتا تھا جو اس کے لیے حیرت کا باعث بنا۔

لفٹ بالکل خالی تھی۔ دروازہ خود کار طریقے سے بند ہو رہا تھا جب اچانک مجھے کوریڈور میں کسی کے چلّانے کی آواز سنائی دی۔ "روکو اُسے۔" اس سے پہلے کہ لفٹ کا

Monthly Digest
SUSPENSE
سسپنس
SARGUZASHT
سرگزشت
PAKEEZA
پاکیزہ
JASOOSI
جاسوسی
مکتبہ اہلا وسہلا
Sole Distributor
ویلکم بک شاپ
WELCOME BOOK SHOP
P.O.Box 27869
Karama, Dubai
Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015
Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae
JD Group of Publications

دروازہ خود کار طریقے سے پوری طرح بند ہوتا، میں جلدی سے بورڈ کی طرف بڑھا اور دروازہ بند کرنے والے بٹن کو دبانے لگا لیکن اسی دوران میں کسی نے دونوں پٹ کے بیچ میں اپنا ہاتھ ڈال دیا۔ دروازہ بند نہیں ہوا۔ وہ شخص اپنے ہاتھ کی پوری قوت لگا کر دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا اور میں دروازہ بند کرنے والا بٹن دبائے جا رہا تھا۔ میں سخت خوف زدہ ہو چکا تھا۔ سمجھ گیا کہ چوری پکڑی گئی اور اب یہ مجھے پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ میں نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ جیسے ہی میں نے بٹن پر سے انگلی اٹھائی، دروازہ کھلتا چلا گیا۔ میرے سامنے جو شخص کھڑا تھا، اُسے دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ یہ وہ تھا جسے میں رابن اسٹیل ویل کے نام سے جانتا تھا لیکن جب میں نے اس کے گلے میں پڑے ہوئے شناختی کارڈ کی طرف نظر دوڑائی تو وہاں لکھا ہوا تھا: ''جیسن رڈیم... آفس بوائے۔''

جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی، وہ ششدر رہ گیا۔ ایسا لگا جیسے وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ ''اوہ تم۔'' اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے حیرت سے کہا۔ ''مجھے یقین نہیں تھا کہ تم میرے پیچھے پیچھے یہاں تک پہنچ جاؤ گے۔''

''بے فکر رہو۔ میں واپس جا رہا ہوں۔'' اس کے لہجے سے گھبراہٹ عیاں تھی۔ یہ بات محسوس کر کے میرا حوصلہ بلند ہو گیا۔ میرا خوف دور ہو چکا تھا اور اب میں نہایت اعتماد سے بات کر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس بار پریشان اور خوف زدہ ہونے کی باری اس کی ہے۔

''تم یہاں کیوں آئے ہو؟'' اس نے پریشانی کے عالم میں کہا اور لفٹ کے اندر گھس آیا۔ میں نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے دروازہ بند ہوتے ہی آگے بڑھ کر لابی کا بٹن دبا دیا۔ وہ بھی آگے بڑھا۔ اس نے بیسمنٹ کا بٹن دبایا۔ ''کیا تم مجھے ملازمت سے نکلوانے کے لیے یہاں آئے تھے؟'' لفٹ چل پڑی تو وہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور گھورتے ہوئے بولا۔

''میں ایسا کیوں کروں گا؟'' میں نے جواب دینے کے بجائے الٹا اس سے سوال کر دیا۔

''تو پھر یہاں آنے کا مقصد کیا ہے؟'' اس نے غصیلی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

''تم جیک ہیلمر کے قتل کے بارے میں کیا کچھ جانتے ہو؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''ہاں... اب کہیں یہ مت کہہ دینا کہ تم اسے پہچانتے ہی نہیں ہو۔'' یہ کہہ کر میں خاموش ہوا اور مسکرانے لگا۔ میں اپنی بات کا اثر اس کے چہرے کے تاثرات میں تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں شدید نفرت کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اس کے ماتھے پر شکنیں اور چہرے پر تناؤ تھا۔ وحشت کے یہ آثار دیکھ کر میں ڈر گیا۔ میں نے اوپر نظر ڈالی۔ لفٹ گیارھویں منزل سے اتر رہی تھی۔ یہ خاصی اونچی عمارت تھی۔ کسی نہ کسی منزل پر کوئی نہ کوئی تو لفٹ کے انتظار میں کھڑا ہوگا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ جیسے ہی لفٹ کسی فلور پر رکے گی، میں چھلانگ مار کر باہر نکل جاؤں گا۔ بار بار میرے دل میں یہ خیال آ رہا تھا کہ اس نے بیسمنٹ کا بٹن کیوں دبایا ہے۔ آخر وہ چاہتا کیا ہے؟

تیز رفتار لفٹ ایک کے بعد ایک کر کے تمام فلور کراس کر گئی مگر کہیں بھی کسی نے اسے نہیں روکا۔ مجھے اس بات پر حیرت ہو رہی تھی۔ لابی کا فلور آیا تو گھنٹی بجی۔ جیسے ہی میں آگے بڑھا، اس نے مجھے دھکا دیا اور جیسے ہی دروازہ کھلنے لگا، اس نے اسے بند کرنے والا بٹن دبا دیا۔ اگلے ہی لمحے لفٹ بیسمنٹ میں جا رہی تھی۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

چند لمحوں کے بعد لفٹ بیسمنٹ میں رکی۔ ''باہر نکلو۔'' دروازہ کھلتے ہی اس نے مجھے آگے دھکیلتے ہوئے درشت لہجے میں حکم دیا۔ جسمانی طور پر نہ تو میں بہت مضبوط ہوں اور نہ ہی لڑائی بھڑائی کا کوئی خاص تجربہ ہے لیکن اس وقت میری جان پر بن آئی تھی۔ میں نے فوراً فیصلہ کیا کہ اسے دھکا دے کر باہر کی طرف بھاگوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں کوئی ہو اور میں اس کے ہاتھ سے بچ جاؤں۔ جیسے ہی میں باہر نکلنے لگا، میں نے پلٹ کر اس کے سینے پر کہنی ماری اور بھاگا لیکن اگلے ہی لمحے ایک زوردار لات مجھ پر پڑی۔ میں لفٹ کے سامنے ہی ڈھیر ہو گیا۔ میں اٹھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ہنس رہا تھا اور اس کے ہاتھوں میں ایک بڑا سا باکس کٹر موجود تھا، جس کا تیز دھار بلیڈ میری شہ رگ کاٹنے کے لیے بہت خوب تھا۔ اس نے کٹر میری آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

''کیا تم سمجھتے تھے کہ بچ کر بھاگ جاؤ گے؟'' وہ ایک بار پھر ہنسا۔ ''آگے بڑھو۔'' میں کھڑا ہوا تو خالی ہاتھ سے اس نے میری پیٹھ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ میں مرے مرے قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ میرا چہرہ خوف سے پیلا پڑ چکا تھا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اس نے کٹر کا بلیڈ میری گردن سے لگایا ہوا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ میرے ساتھ اب کیا سلوک کرنے والا ہے۔ میں بدستور آگے بڑھ رہا تھا۔

''دروازہ کھولو۔'' ''ہم بیسمنٹ میں کافی آگے چلتے ہوئے

لگے۔ خوش ہوں کہ اسے اپنے کیے کی سزا مل گئی۔''

''تو کیا وہ ایکسٹرا جو شوٹنگ کے دوران میں اس کی گاڑی تلے آ کر کچلی گئی تھی، وہ تمہاری ماں تھی؟''

''وہ ایکسٹرا نہیں تھی۔'' اس نے یہ سنتے ہی غصے سے کہا۔

''آئی ایم سوری... میں غلط کہہ گیا۔ وہ ایک اداکارہ تھی۔'' میں اس کے بدلتے ہوئے لہجے کو بھانپ کر ایک بار پھر ڈر گیا۔

''وہ بہت خوبصورت اداکارہ تھی۔'' اس کا لہجہ ایک بار پھر نرم پڑ گیا۔

''جانتا ہوں۔'' میں نے تائید کی۔ اُس وقت اس کی ہاں میں ہاں ملانے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

''تمہیں معلوم ہی نہیں کہ اس کمینے کی وجہ سے میری ماں اور میں نے کتنی مصیبتیں اٹھائی ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ ''میری ماں کی ٹانگیں، پسلیاں، بازو... جسم کی ہر ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔ یہ سب کچھ اُسی منحوس کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس حادثے کے بعد وہ کئی مہینے اسپتال میں رہی اور جب گھر لوٹی تو اس حالت میں کہ نہ تو چل پھر سکتی تھی اور نہ ہی صحیح طریقے سے سو سکتی تھی۔'' یہ کہہ کر وہ رُکا اور اپنی آنکھیں صاف کرنے لگا۔ اس وقت وہ چند لمحے پہلے والے جیسن سے بالکل مختلف نظر آ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ماں کو پیش آنے والے حادثے کے بعد اس نے جو تکالیف سہی تھیں، وہ کرب اس کے چہرے پر ایک بار پھر چھا چکا تھا۔ میں دم بخود اس کی آپ بیتی سن رہا تھا۔

''میں اس وقت صرف سات سال کا تھا۔'' اس نے ایک بار پھر کہنا شروع کیا۔ ''حادثے کے بعد ایک ڈیڑھ سال تک تو میرے باپ نے سب کچھ برداشت کیا لیکن آخر اس کی اپنی بھی زندگی تھی۔ ایک دن وہ خاموشی سے کہیں غائب ہو گیا اور اس کے بعد میں اور میری ماں تنہا رہ گئے۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ''حادثے کے بعد پروڈیوسر نے کچھ پیسے میری ماں کو علاج معالجے کے لیے دیے تھے۔ باپ کے جانے کے بعد، اس پیسے سے چند مہینے تو گھر اور علاج کا خرچہ چلا لیکن کب تک؟ جب پیسے ختم ہو گئے تو میں نے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کیے اور یوں زندگی کی گاڑی بدقت تمام چلنے لگی۔ میں نے کئی سال یہ عذاب برداشت کیا۔ میں جوان ہو گیا لیکن میری ماں کی تکلیف کم نہیں ہوئی۔ وہ برسوں سے مُردوں سے بدتر زندگی گزار رہی تھی۔ آخر میں نے بہت سوچ سمجھ کر نہایت مشکل فیصلہ کیا اور

دروازے کے سامنے پہنچے تب اس نے مجھے حکم دیا۔ ''اندر جاؤ۔'' میں نے دروازہ کھول دیا تو اس نے ایک بار پھر حکم دیا۔

یہ ایک بڑا سا کمرا تھا جسے شاید سپلائی اسٹور کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اندر ہلکی سی روشنی تھی اور ہر جگہ سامان رکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اندر آ کر اس نے دوسرے ہاتھ سے دروازہ بند کیا۔ مجھے موت اپنی آنکھوں کے سامنے کھڑی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

''یہ تم کیا کرنے جا رہے ہو، دیکھو مجھے مارو مت۔ تمہیں مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' میں نے اپنی جان بچانے کی کوشش کی۔ میری آواز میں گھگیاہٹ نمایاں تھی۔

''یہ تو مجھے خود معلوم نہیں کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں۔'' اس نے شیطانی مسکراہٹ اپنے لبوں پر سجاتے ہوئے کہا۔ یہ سن کر میں اور ڈر گیا۔

''دیکھو، کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تم کچھ کرنے سے پہلے میری بات سُن لو۔'' میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے لفاظی کا حربہ استعمال کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری بات کا اس پر کچھ اثر ہوا ہے۔ کٹر کا دباؤ گردن پر کچھ کم ہو گیا جس سے مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ ''میں اس وقت تمہارے رحم و کرم پر ہوں۔ کہیں بھاگ کر نہیں جا سکتا۔ ویسے بھی مجھے مار کر تمہیں کیا ملے گا؟''

''بولو، کیا کہنا چاہتے ہو۔'' اس نے میری گردن پر سے ہاتھ اٹھایا۔

''یہ بات کوئی نہیں جانتا کہ تم نے جیک ہیلمر کو قتل کیا ہے۔ میں بھی نہیں لیکن اُس کے بعد تم مجھے قتل کر کے بہت بڑی غلطی کر رہے ہو۔'' میں نے ہر ممکن طور پر اپنے لہجے کو نرم بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''تم کون ہوتے ہو فیصلہ کرنے والے؟ کیا جج ہو جو کہہ رہے ہو کہ میں نے جیک ہیلمر کو قتل کیا ہے؟'' اس نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس کا لہجہ بدل گیا ہے۔ ''ویسے بھی میں نے اسے قتل نہیں کیا بلکہ اس کے جرم کی سزا دی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ افسردہ ہو گیا۔

''جرم کی سزا؟'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

''اس نے میری ماں کو اپنی کار تلے کچلا تھا۔''

''یہ واقعہ کب ہوا؟'' میں نے اس کا اعتراف سن کر چونکتے ہوئے کہا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

''تیس سال پہلے۔'' وہ بدستور افسردہ تھا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر کہنے لگا۔ ''اسے سزا دینے میں تیس سال

پھر انہیں تمام تکلیفوں سے نجات دلا دی۔''

''تم نے اپنی ماں کی بھی جان لی ہے؟'' یہ سنتے ہی میں نے قطع کلامی کی اور حیرت سے کہا۔

''نہیں...'' وہ جلدی سے بول اٹھا۔ ''اس کی جان ہیلمر نے لی تھی، میں نے تو بس اسے تکلیف سے نجات دلوائی ہے۔''

''اوکے...''

''ماں کے بعد میں نے ہیلمر کو ڈھونڈنے میں کئی سال گزار دیے۔ آخر اسے ڈھونڈ ہی لیا۔ اسے میں نے اپنی ماں کو قتل کرنے کے جرم کی سزا دی ہے۔'' مارلن کے ذکر پر جیسن کی آنکھوں میں ایک بار پھر نفرت کے آثار ابھر آئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ وہ اونچی آواز سے رو رہا تھا۔ میں بھی اس کے برابر بیٹھ گیا اور اس کا سر پکڑ کر اپنے کندھے سے لگا لیا۔ مجھے ساری بات سمجھ آچکی تھی۔

مارلن کا شک درست تھا۔ اُس دن جب اس نے مجھے بلا کر کہا تھا کہ میں اس اجنبی کا پتا چلاؤں کہ وہ اس کے اِردگرد کیوں منڈلا رہا ہے، اس وقت تو مجھے معلوم نہیں تھا لیکن اب مجھے یقین ہو گیا کہ مارلن کے اندر کے چور نے اس کو خطرے سے خبردار کر دیا تھا۔ جیسن نے اس تک پہنچنے کا خوب طریقہ اختیار کیا تھا۔ کاروبار مسٹر رابن ویل کا تھا جسے اُن کی بیوی چلاتی تھی۔ اس نے اُن کے دفتر سے وزیٹنگ کارڈ چرائے اور پھر اس کارڈ کے ذریعے خود کو کاسٹنگ ڈائریکٹر ظاہر کر کے اس نے میرے ذریعے مارلن تک اپنا تعارف پہنچایا اور پھر اس تک پہنچ کر اعتماد حاصل کیا اور بالآخر اپنے مجرم کو اُس کے انجام تک پہنچا دیا۔ وہ بدستور بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ اس کی ہچکیاں بندھ چکی تھیں۔ میں اسے دلاسا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اب تم ہی بتاؤ، کیا میں نے کچھ غلط کام کیا ہے؟'' کافی دیر بعد اس نے سر اٹھا کر بھرائی ہوئی آواز میں مجھ سے پوچھا۔

''بالکل نہیں... اس کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔'' میں قانون پسند شہری تھا لیکن اس وقت غلط بات کی تائید کرنا میری اپنی زندگی کے لیے ضروری تھا۔ اس لیے میں نے ایک بار پھر اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''یہ ایک حادثہ تھا۔ میں تمہیں اب قاتل نہیں سمجھتا۔'' وہ اب تک اپنے ہاتھ میں کٹر کو خنجر کی طرح مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔ ''تم مجھے چھوڑ دو، میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔'' میں نے اسے بہلانے کی کوشش کی۔ یہ سنتے ہی وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''اب تمہارا مرنا یقینی ہے۔'' اس نے میری آنکھوں کے سامنے کٹر لہراتے ہوئے جنونی انداز میں کہا۔ ''تم نے کیسے سمجھ لیا کہ یہ سب کچھ جاننے کے بعد میں تمہیں زندہ چھوڑ دوں گا؟'' یہ بات سن کر میرا دل اس تیزی سے دھڑکا جیسے ابھی اچھل کر حلق میں آجائے گا۔ آواز اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہتا، اچانک دروازہ کھلنے کی آئی۔ جیسن کی توجہ لمحہ بھر کے لیے جیسے ہی مجھ پر سے ہٹی، میں نے برابر میں رکھا ہوا ایک وزنی ڈبا اس کے اوپر پھینکا اور مدد کے لیے چلایا۔ ڈبا لگنے سے وہ لڑکھڑایا، اگلے ہی لمحے ایک اور ڈبا اس کے اوپر پھینک دیا۔ وہ اس کے سر پر لگا۔ جیسن لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ کٹر اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ میرے برابر میں ہی سینیٹری کا سامان رکھا ہوا تھا۔ اس کے گرتے ہی میں نے ایک پائپ اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ ساتھ ہی میں زور زور سے مدد کے لیے بھی چلا رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں تین سیکیورٹی گارڈز اندر پہنچ گئے۔ جیسن فرش پر گرا ہوا تھا۔ ''یہ قاتل ہے، اسے پکڑو۔'' میں چلایا۔ انہوں نے جیسے ہی اس پر قابو پایا، میں نے موبائل فون نکال کر پیٹرسن کا نمبر ملایا۔ اسے جلدی جلدی ساری صورتِ حال بتائی۔ کچھ ہی دیر کے اندر پیٹرسن اور تین دیگر پولیس والے جیسن کی ہتھکڑیاں کس کر گاڑی میں بٹھا کر لے جا رہے تھے۔

اس واقعے نے راتوں رات مجھے شہرت کے آسمان پر پہنچا دیا۔ ہالی وڈ جہاں میں مدتوں سے مشہور ہونے کے لیے ہاتھ پیر مار رہا تھا، اب وہاں کے ہر اخبار، رسالے اور ٹی وی چینل پر میرا ذکر ہو رہا تھا۔ مجھے برسوں کی محنت کے باوجود بھی کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی مگر ایک ناکام اداکار کی مدتوں پرانی غلطی نے میرے اوپر کامیابی کے دروازے کھول دیے۔

آج اس واقعے کو بیتے ہوئے کئی برس گزر چکے ہیں۔ صرف میں ہی نہیں میری لین بھی آج مصروف اداکارہ ہے۔ ویسے بھی یہ کیس میری لین کے بیان کی وجہ سے ہی حل ہوا تھا، اس لیے میں سمجھتا تھا کہ اگر وہ نہ ہوتی تو شاید یہ کامیابی میرا مقدر نہ بنتی۔ اس لیے میں نے اس کے اعتراف میں اس سے شادی کر لی۔ کیپٹن جیک آج بھی بلیوارڈ اسٹریٹ پر چائنیز تھیٹر میں کام کرتا ہے، البتہ سپرمین کامیاب اسکرین پلے رائٹر ہے اور ہالی وڈ میں اس کی کافی مانگ ہے۔

ہیری نے اپنی انگلی کی نوک بار کاؤنٹر کے شفاف شیشے کے کنارے پر پھیرتے ہوئے اس عورت کا بغور جائزہ لیا جو اس سے قدرے فاصلے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس عورت کی عمر لگ بھگ پینتالیس برس رہی ہو گی۔ اس کے ہاتھ میں شادی کی انگوٹھی نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ ایک سادہ سی عورت تھی جس نے عام سا لباس پہنا ہوا تھا۔ جسم پر مختصر سی جیولری تھی۔ ائر رنگز کا چھوٹا سا سیٹ۔ اس نے بریسلیٹ بھی نہیں پہنا ہوا تھا۔ چہرے پر تنہائی اور اداسی کے تاثرات تھے۔

ہیری نے مطمئن انداز میں کھنکھارتے ہوئے گلا صاف کیا اور عورت پر نظریں جمائے رہا۔

پرفیکٹ!

تب عورت نے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ نگاہیں ملتے ہی ہیری کو یوں لگا جیسے وہ عورت ہلکے سے مسکرائی ہو۔ ''گڈ!'' اس نے دل ہی دل میں کہا۔

اس نے سوچا کہ وہ چند منٹ مزید انتظار کرے گا اور پھر اس عورت کے پاس جائے گا۔ اس نے اپنا گلاس اٹھایا اور ہونٹوں تک لے جاتے ہوئے ایک چھوٹا سا گھونٹ بھر لیا۔ وہ اس وقت زیادہ پینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنے ذہن کو صاف ستھرا رکھنا چاہتا تھا تاکہ اپنے کام کی تکمیل تک بہکنے نہ پائے۔

ہیری کے تمام شکار ایک خاص ترتیب میں فٹ بیٹھتے تھے۔ اخبارات جب بھی کیے بعد دیگرے قتل کی ان وارداتوں کا تذکرہ کرتے جس نے گزشتہ چھ ماہ سے شہر میں

دو شکاریوں کی مہم جوئی جن کا ہدف مشترک تھا

ہر شخص در حقیقت نفسیاتی الجھن کا شکار ہوتا ہے ... کسی کسی میں یہ الجھن نمایاں تر ہو جاتی ہے ... ایک الجھے ہوئے آدمی کی کہانی ... اسے ہمہ وقت اپنے مطلوبہ ہدف کی تلاش سرگرداں رکھتی تھی....

جیسی کوتیسا

بابر نعیم

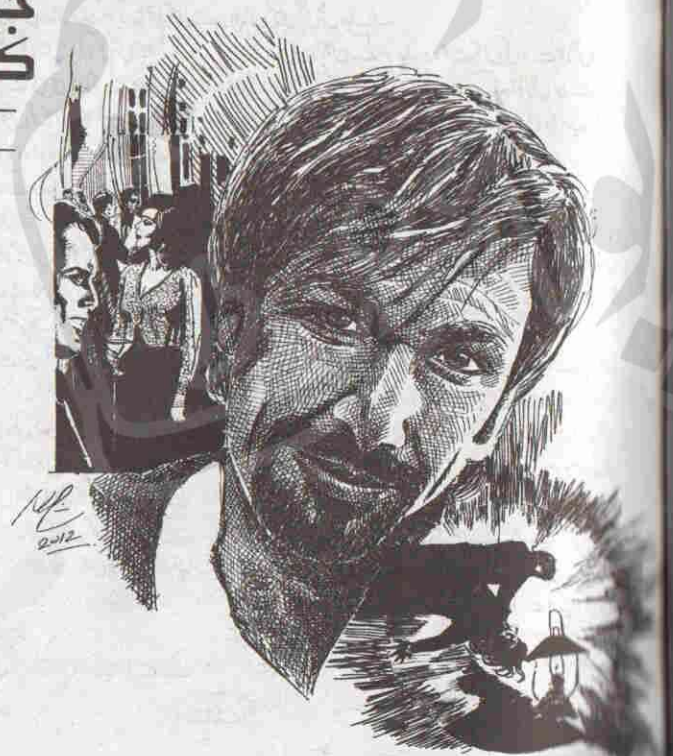

خوف و ہراس پھیلا رکھا تھا تو وہ اس خاص ترتیب کا تذکرہ ضرور کرتے تھے۔

گزشتہ ستمبر میں سیریل کلر کا سب سے پہلا شکار سارہ وانٹگٹن نامی عورت بنی تھی۔ اس کے بعد دوسرا قتل میری جونسن نامی چالیس سالہ بیوہ کا ہوا تھا جس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ لیکن ہیری کو اپنے شکار میں سب سے زیادہ جینی ہوپ پسند آئی تھی۔ وہ ایک سادہ مزاج غیر شادی شدہ عورت تھی جو تنہا رہتی تھی، ماسوائے ایک بلی کے جو اس نے پالی ہوئی تھی۔

جب ہیری نے اس پر حملہ کیا تھا تو وہ اس سے کسی ٹائیگر کے مانند الجھ گئی تھی لیکن یہ اس سنسنی کا ایک حصہ تھا جو ہیری محسوس کیا کرتا تھا۔ اپنے شکار کی جدوجہد اور زور آزمائی ہیری کی سنسنی کی کیفیت کو مزید اطمینان بخشتی تھی اور اسے اس قسم کے شکار کو نشانہ بنانے میں خوب لطف آتا تھا۔

ہیری نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہاں موجود چاقو کے دستے پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ ساتھ ہی اس کی نگاہیں اپنے اگلے شکار کے چہرے کا طواف کرنے لگیں۔

اسی لمحے بار میں موجود ٹی وی پر شہر میں ہونے والی قتل کی ایک اور واردات کی خبر نشر ہونے لگی۔

اس مرتبہ قاتل کا نشانہ پچاس سالہ ایک مرد بنا تھا جس کی لاش ایک شراب خانے کی عقبی گلی میں پائی گئی تھی۔

ہیری کے حلق سے غراہٹ کی سی آواز بلند ہوئی۔ یہ کسی اور کا کارنامہ تھا۔ مردوں کو قتل کرنا اس کا شیوا نہیں تھا اور نہ ہی وہ کبھی کسی مرد کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ یکے بعد دیگرے قتل کرنے والے معدودے چند ہی سیریل کلرز تھے جو مردوں کا شکار کیا کرتے تھے۔ مردوں کے شکار کے تصور سے ہیری کو جھرجھری سی آگئی۔

اس نے اپنی توجہ ایک بار پھر اس عورت کی جانب مبذول کرلی۔ وہ عورت اپنے مشروب کے گلاس سے کھیل رہی تھی۔ ہیری کی طرح وہ عورت بھی بار بار ایک اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈال رہی تھی۔

''ہاں!'' ہیری نے دل ہی دل میں کہا۔ ''وہ عورت بھی مجھ میں دلچسپی لے رہی ہے۔ گڈ!''

تب ہیری نے اپنا گلاس اٹھایا اور کاؤنٹر کے سامنے رکھے ہوئے اسٹول پر سے اتر کر بار کے اس گوشے کی جانب دھیرے دھیرے قدموں سے بڑھنے لگا جہاں وہ عورت تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔

☆☆☆

ہیلن اس شخص کو دیکھ رہی تھی جو کاؤنٹر کے سامنے سے اٹھ کر آہستہ آہستہ قدموں سے اس گوشے کی جانب آرہا تھا جہاں وہ تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔

یقینی طور پر وہ اسی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ہیلن کی نظروں ہی نظروں میں دعوت اور معنی خیز مسکراہٹ نے اسے نہ صرف اس کی جانب متوجہ کیا تھا بلکہ اسے یہ حوصلہ بھی دیا تھا کہ بلا جھجک پیش قدمی کرلے۔

ہیلن نے جان بوجھ کر اپنا حلیہ ایسا بنایا ہوا تھا کہ اپنی اصلی عمر سے کہیں زیادہ بڑی دکھائی دے۔ اسے اس بات کی کوئی خواہش نہیں تھی کہ نوجوان اس کی جانب متوجہ ہوں۔ اسے نوجوانوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

''نہیں!'' اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ''نوجوانوں سے نمٹنے کے لیے اور بہت سی عورتیں موجود ہیں۔ یہ معاملہ ان پر چھوڑ دو۔''

اسے تو ایسے مرد پسند تھے جیسا اس وقت اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ہیلن دل ہی دل میں مسکرانے لگی۔

یہ پرفیکٹ مرد تھا۔

اس کی عمر بھی ٹھیک تھی۔ بظاہر تنہا لگ رہا تھا اور پیار کا بھوکا دکھائی دے رہا تھا۔ اسے محبت کی تلاش تھی، چاہے جہاں کہیں بھی مل جائے۔

ویل، ہیلن نے سوچا۔ وہ محبت جس کی اسے تلاش ہے میرے پاس تو نہیں ملے گی۔ لیکن اسے کچھ اور مل جائے گا۔ البتہ وہ کچھ نہیں ملے گا جس کی توقع پر وہ اس کی جانب بڑھ رہا ہے۔

جب وہ شخص نزدیک آنے کے بعد ہیلن کے برابر خالی اسٹول پر بیٹھ گیا تو ہیلن کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی۔ اس کا ہاتھ خود بہ خود پرس میں رینگ گیا۔ اس نے پرس میں موجود رومال کے نیچے بند چاقو کے دستے کو پیار سے سہلانا شروع کردیا۔

اس کی معنی خیز مسکراہٹ اور نظروں کے بے باک پیغام نے اس کے اگلے شکار کو اس کی دسترس میں پہنچا دیا تھا۔

ہیلن کو میڈیا اور پریس کے اس مفروضے پر دل ہی دل میں ہنسی آنے لگی کہ تمام سیریل قاتل صرف مرد ہوتے ہیں، کوئی عورت نہیں ہوسکتی۔

اور پھر اپنے شکار کو دام میں لانے کے لیے ہیلن نے اپنی پوری توجہ ہیری پر مرکوز کردی۔ پچاس سالہ مرد کے بعد وہ دوسرا معقول آدمی تھا جو بہت آسانی سے اسے اپنے جال میں آتا ہوا نظر آرہا تھا۔

جذبات و احساسات کو جکڑ لینے والے حالات و واقعات کی کڑی در کڑی

امریکی پروفیسر

مختار آزاد

دل تک ہر کسی کی رسائی ممکن نہیں... کوئی ایک ہی شخص ہوتا ہے جسے محبوب کے دل کی بادشاہی تفویض ہوتی ہے... ان دو دلوں کے درمیان اچانک ہی ایک دراڑ آگئی... ایک تیسرے فریق کی آمد سے ایک نیا موڑ اختیار کرلینے والی کہانی...

دوپہر کے کھانے کا وقفہ تھا۔ ٹونر قیمتی سوٹ میں ملبوس کھانا لینے والوں کی لائن میں لگا اپنی باری کا منتظر تھا۔ ویلس، سیلف سروس ریستوران تھا اور اس کا کھانا بہت ہی ذائقہ دار تھا۔ لنچ کا وقت شروع ہوتے ہی یہاں کھانا کھانے والوں کی بھیڑ لگ جاتی تھی۔ سامنے سفید لباس میں ملبوس خوبصورت لڑکی باری آنے پر ہر شخص سے اُس کی پسند پوچھ کر کھانا نکال کر ٹرے میں ڈالتی جارہی تھی۔ سامنے ہلکی آنچ پر رکھے ذائقہ دار پکوانوں سے اٹھنے والی اشتہا انگیز مہک ٹونر کی بھوک کو اور بڑھا رہی تھی۔

وہ ڈبلن میں ہفتہ وار 'مقدس گھنٹا' کی روایت منانے کا

دن تھا۔ ٹونر اگرچہ اس دن کو منانے کے بارے میں شدید مخالف جذبات رکھتا تھا لیکن ڈبلن کا شہری ہونے کے ناتے دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی اس دن کا احترام کرنے پر مجبور تھا۔ اس ریستوران میں اُس کی دوست نیڈی بھی کام کرتی تھی۔ اس وقت وہ لنچ کے وقفے پر تھی اور ہال میں ایک چھوٹی سی گول میز کے ساتھ رکھے اسٹول پر بیٹھی، ٹونر پر نظریں جمائے انتظار میں تھی کہ کب وہ کھانا لاتا ہے، خود ٹونر بھی یہی چاہتا تھا کہ مقدس اوقات کے آغاز سے پہلے ہی لنچ کرلے۔ ویسے بھی آج اسے ریستوران پہنچنے میں خاصی دیر ہوگئی تھی۔ قطار خاصی لمبی تھی اور اب وہ انتظار میں تھا کہ جلدی سے کھانا ملے تاکہ وہ ریستوران کا دروازہ بند ہونے سے پہلے ہی کھانا ختم کرکے نیڈی کے ساتھ گپ شپ میں یہ مصیبت بھرا ایک گھنٹا گزار لے ورنہ تو شہر کی زندگی کو ساکت کردینے والا یہ ایک گھنٹا اس سے تنہائی میں کاٹے نہیں کٹتا تھا۔

''کیا ایلس کا دوست آج نہیں آرہا؟'' کھانا کھاتے ہوئے نیڈی نے ٹونر سے پوچھا۔ ''کہیں یہ وہی امریکی پروفیسر تو نہیں ہے؟''

''میرے خیال میں تو یہ وہی ہے۔'' ٹونر نے ہاتھ روک کر نیڈی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے ایک لمحے کو سوچا کہ اسے یقین سے کہہ دے کہ ہاں یہ وہی ہے مگر اس نے نہ جانے کیوں ایسا نہیں کہا۔ اس نے بے یقینی کے انداز میں نیڈی کو جواب دیا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ وہ نہ صرف پروفیسر کی آمد کے بارے میں بہت اچھی طرح جانتا تھا بلکہ اسے یہاں تک بھی معلوم تھا کہ وہ رات کے پچھلے پہر نیویارک سے آنے والی پرواز کے ذریعے ڈبلن پہنچ چکا ہے اور صبح سویرے ایلس کا دَر کھٹکھٹا رہا تھا لیکن اس نے یہ کہنے سے گریز کیا۔

''تم نے میری براڈی سے متعلق تازہ ترین خبر سنی ہے؟'' نیڈی نے کھانا کھاتے ہوئے ٹونر سے سوال کیا۔

''دراصل، ایسا کچھ خاص تو نہیں سنا۔'' ٹونر نے سادگی سے جواب دیا اور کھانا کھانے لگا۔ نیڈی کی بات سن کر اس کی نگاہوں میں ایک بار پھر ایلس کا چہرہ گھوم گیا۔

یہ کل دوپہر کی بات ہے۔ وہ اُسے اتفاق سے بس میں ملی تھی۔ اُس وقت بس بالکل خالی تھی۔ ایلس کے کندھے پر لٹکا ہوا بڑا سا پرس جھول رہا تھا اور وہ دونوں ہاتھ گود میں رکھے بیٹھی تھی۔ ٹونر نے اسے پیشکش کی کہ اگر وہ چاہے تو اپنے دوست کو ائرپورٹ سے پک کرنے کے لیے اُس کی کار لے سکتی ہے مگر اُس نے یہ پیشکش شکریہ کے ساتھ لوٹا دی تھی۔ ''وہ ائرپورٹ سے ٹیکسی لے گا۔ ویسے بھی اسے شہر گھومنے کے لیے میری راہنمائی کی ضرورت ہے، ائرپورٹ سے پک کرنے کے لیے نہیں۔'' اس نے انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟''

''کچھ خاص نہیں، بس ذرا ایسے ہی ایک خیال آگیا تھا۔'' نیڈی کی بات سن کر وہ چونک گیا اور حقیقت کی دنیا میں لوٹ آیا۔

''کہیں یہ خیال ایلس کا تو نہیں تھا؟''

''ارے نہیں۔'' نیڈی نے شرارت سے آنکھ مارتے ہوئے کہا تو وہ شرما گیا۔ ''ویسے تم بتاؤ، میری براڈی کے بارے میں تازہ ترین صورتِ حال کیا ہے؟'' ٹونر نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

''ابھی تک تو کوئی بھی ملزم گرفتار نہیں ہوا۔'' نیڈی نے کہا۔ ''ویسے کچھ لوگوں نے شہر میں یہ افواہ پھیلا دی ہے کہ وہ اُن لڑکوں کی مخبری کرواتی تھی جنہوں نے .... ہوٹل پر حملہ کیا تھا مگر میرا خیال ہے کہ یہ کسی نے بالکل بے پر کی اڑائی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے نیڈی آگے کو جھکی اور اپنا چہرہ ٹونر کے قریب کرتے ہوئے بولی۔ ''ویسے اطلاعات ہیں کہ وہ عام سے اوباش یا آوارہ لڑکے نہیں ہیں بلکہ السٹر ڈیفنس آرگنائزیشن سے علیحدہ ہونے والے آئرش ری پبلکن کے کچھ لوگ ہیں۔'' وہ سرگوشی میں اسے بتا رہی تھی۔ وہ بھی پورے دھیان سے سن رہا تھا۔ ''خبر گرم ہے کہ اس گروہ میں چار لڑکے شامل ہیں جن میں سے ایک امریکی بھی ہے۔ اب ان کے کالے کرتوتوں کا الزام بھی السٹر ڈیفنس کے سر ہی دھر دیا جائے گا۔''

''عجیب بات ہے۔'' ٹونر نے کندھے اُچکا کر کہا اور ایک بار پھر کھانا کھانے میں مصروف ہوگیا۔

''مجھے ان نام نہاد محبِ وطن لوگوں سے سخت نفرت ہے جو گرمیاں آتے ہی دفاعِ وطن کے نام پر دہشت گرد سرگرمیوں میں مصروف ہوجاتے ہیں اور پہلی برف باری کے ساتھ ہی اپنے اپنے بلوں میں گھس جاتے ہیں... گندے چوہوں کی طرح۔'' نیڈی آگے جھکی اور سرگوشی میں ٹونر سے کہا۔ اس کا لہجہ خاصا نفرت انگیز تھا۔ ''یہ معصوم عورت کے قاتل ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی اور پھر بدستور نفرت بھرے لہجے میں کہنے لگی۔ ''انہوں نے ہی بے چاری میری براڈی کو قتل کیا۔ یقیناً اس کارروائی کے بعد اپنے امریکی پب میں جشن منانے کے لیے اس طرح پہنچے ہوں

گے جیسے وہ کوئی بہت بڑے ہیرو ہیں اور سلطنت فتح کرکے لوٹے ہیں۔'' اپنی بات ختم کرکے ایک بار پھر نیڈی کھانے کی پلیٹ پر جھک گئی۔

ٹونر اُس کی بات کے جواب میں خاموش رہا۔ وہ جانتا تھا کہ نیڈی کو بہت زیادہ بولنے کی عادت ہے۔ اس کے دل میں جو آتا ہے، وہ بولتی جاتی ہے۔ ضروری نہیں کہ اس کی ہر بات کا جواب دیا جائے۔

کھانا ختم کرکے اس نے جیبی گھڑی نکالی۔ 'مقدس گھنٹا' شروع ہونے والا تھا۔ ''شکر ہے کہ اس سے پہلے ہی کھانا ختم ہوگیا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے گھڑی واپس جیب میں ڈال لی۔ نیڈی نے بھی یہ سنا مگر کچھ کہنے کے بجائے خاموشی سے اپنی پلیٹ صاف کرتی رہی۔

ٹونر کھانے سے فارغ ہوچکا تھا۔ چند لمحوں تک وہ نیڈی کو بھوک مٹاتے دیکھتا رہا اور پھر کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ ایک بار پھر اس کے خیالوں میں ایلس کا چہرہ گھوم گیا۔ اس کا خیال کیا آیا کہ اس سے جُڑی کئی باتیں ذہن میں گردش کرنے لگیں۔

ایلس اُسے کئی ہفتے پہلے ہی بتا چکی تھی کہ امریکی پروفیسر جون میں آنے والا ہے۔ اُس نے نہایت پُرجوش انداز میں یہ بات اُسے تب بتائی تھی، جب وہ اس سے ملنے کے لیے دوپہر سے ذرا پہلے اس کے فلیٹ پر پہنچا تھا۔ جس وقت وہ یہ بات اسے بتا رہی تھی، اس وقت اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں ڈاک سے موصول ہونے والا ایک خط دبا ہوا تھا۔ یقیناً یہ اطلاع اس خط کے ذریعے ہی اُس تک پہنچی تھی۔ امریکی پروفیسر اپنی سالانہ تعطیلات کے موقع پر گزشتہ برس ایلس سے ملا تھا۔ ان کی یہ ملاقات ڈبلن سے بہت دور کاؤنٹی کیری کے ایک فارم ہاؤس پر ہوئی تھی۔ یہ ملاقات واقعی اتفاقی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایلس بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ اُسی فارم ہاؤس پر چھٹیاں منانے کے لیے گئی ہوئی تھی۔ پروفیسر نے واپس جانے کے بعد ایلس کو متعدد بار خطوط لکھے تھے۔ وہ گزشتہ سال بھی اس سے ملنے ڈبلن آچکا تھا۔ اُس وقت ایلس نے اپنے ہاتھ میں جو خط تھام رکھا تھا، وہ پروفیسر کا تازہ ترین خط تھا جس میں اس نے ایلس کو اطلاع دی تھی کہ وہ آئرلینڈ کے مشہور ادیب مسٹر جے ایم سانج کے ادبی کارناموں پر ایک تحقیقی مقالہ لکھنے کے لیے ڈبلن آرہا ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ اس کام کے لیے یونیورسٹی نے نہ صرف اُسے طویل رخصت دے دی تھی بلکہ سفری اخراجات بمع تنخواہ کے ادا کیے جارہے تھے۔

''میرے خیال میں تو اس کام کے لیے اسے ڈبلن سے باہر مضافاتی علاقوں میں جانے کی ضرورت ہے۔'' جب ایلس نے ٹونر کو پروفیسر کے کام کے بارے میں بتایا تو اس نے کہا۔ ''اُسے کم از کم ارانس اور کیلوے تو جانا ہی چاہیے۔''

''یقیناً۔'' ٹونر کی بات سن کر ایلس نے جواب دیا۔ ''مگر وہ یہاں مقررہ وقت سے مہینا بھر پہلے پہنچ رہا ہے۔ وہ یہ وقت میرے ساتھ گزارنا چاہتا ہے، اس دو کمروں کے فلیٹ میں۔'' یہ کہہ کر وہ چند لمحے کے لیے خاموش ہوئی۔ ''میں نے اس کے رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے کے لیے تمام ضروری انتظامات کرلیے ہیں۔ جب وہ یہاں آئے گا تو ہفتہ بھر کے لیے دو خادمائیں بھی آئیں گی جو دن رات اُس کی دیکھ بھال اور خدمت پر مامور رہیں گی۔'' یہ بتا کر وہ خاموش ہوگئی۔ ''ویسے میرا خیال ہے کہ اسے یہاں میرے ہوتے ہوئے کوئی تکلیف تو ہونے سے رہی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے نہایت فخریہ انداز میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور سامنے لگے آئینے میں اپنا سراپا دیکھ کر مسکرانے لگی۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' ٹونر نے کہا۔ ''واقعی ایک نرس کے گھر میں، اس کے ساتھ رہنے والے کسی مہمان کو کیونکر تکلیف ہوسکتی ہے۔ ویسے بھی نرس سے اچھی دیکھ بھال شاید ہی کوئی کرسکتا ہو۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں پوشیدہ طنز صاف نظر آرہا تھا مگر وہ پروفیسر کی آمد کا سن کر اتنی زیادہ خوش تھی کہ یہ سمجھ ہی نہ سکی کہ وہ کیا کہہ گیا ہے۔

''تمہیں معلوم نہیں کہ وہ کتنا اہم ادبی اور تحقیقی کام کرنے جارہا ہے...'' ایلس بولتی رہی۔ وہ امریکی پروفیسر کی صلاحیتوں کے بارے میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جارہی تھی اور وہ بڑے دھیان سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ وہ ایلس تو نہیں جسے وہ پروفیسر سے ملاقات سے پہلے جانتا تھا۔ ٹونر کو ایلس کے اس روپ پر خاصی حیرانی ہو رہی تھی۔ اس بار ایلس نے اسے اکٹھے لنچ کرنے پر اصرار نہیں کیا تھا حالانکہ لنچ کا وقت ہوچکا تھا۔ ایک وقت ایسا تھا کہ اس کے ساتھ لنچ کرنے کو وہ اپنی زندگی کا یادگار لمحہ قرار دیتی تھی مگر اُس دن جبکہ وہ اس کے ساتھ لنچ کرنا چاہتا تھا، وہ اس کے بجائے پروفیسر کے قصوں میں کھوئی ہوئی تھی۔

پہلے وہ ایلس کے بارے میں کسی اور طرح سوچتا تھا لیکن اب اسے یقین آرہا تھا کہ وہ اُس کی زندگی میں آنے والا آخری مرد نہیں ہے۔ ایلس کی تقدیر میں اس کے سوا بھی کسی اور مرد کا نام لکھا ہوا ہے، شاید... وہ اس سے آگے کچھ

سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں، سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ نیڈی کھانا کھا چکی تھی۔ کچھ ہی دیر میں 'مقدس گھنٹا' شروع ہونے ہی والا تھا۔

ڈبلن میں اتوار اور سنیچر کے علاوہ ہفتے کے کسی ایک دن 'مقدس گھنٹا' کا یہ تہوار منایا جاتا تھا۔ یہ ایک گھنٹا دوپہر کے ڈھائی سے ساڑھے تین بجے کے دورانیے پر مشتمل تھا۔ اس دوران شہر کے تمام ریستورانوں، بارز اور پب میں روشنیاں مدھم کر دی جاتی تھیں، گانا بجانا روک دیا جاتا اور آوارہ گرد لڑکے لڑکیاں شہر کی سڑکوں سے غائب ہو جاتے تھے۔ ٹونر کی طرح کئی اور ڈبلن کے باسیوں کو شدید حیرت تھی کہ آئرلینڈ کے قانون نے اب تک چرچ کے اس حکم کو کیوں برقرار رکھا ہوا ہے؟ وہ سوچتا تھا کہ فیکٹری مالکان کیوں ایک گھنٹے کے لیے اپنا سارا کام کاج بند ہو جانے پر احتجاج نہیں کرتے؟ مگر پھر سوچتے کہ وہ آخر کر بھی کیا کر سکتے ہیں۔ یہ قدیم روایت چرچ کے حکم پر چلی آ رہی تھی اور نہ چاہتے ہوئے بھی ٹونر جیسے لوگ اس کی پاسداری پر مجبور تھے۔

اس نے ہال پر نظر دوڑائی۔ ان دو نوں کے سوا وہاں کوئی اور نہیں تھا۔ ہال ہی نہیں، کاؤنٹر بھی خالی پڑا ہوا تھا۔ ویسے تو ویلس ریستوران صرف دن کے اوقات میں ہی نہیں بلکہ رات گئے تک کھلا رہتا تھا لیکن مقدس اوقات والے دن اس ہال پر گھنٹا بھر کے لیے اسی طرح کا سناٹا چھایا رہتا تھا۔ اچانک سائرن کی آواز آئی۔ مقدس وقت کا آغاز ہو چکا تھا۔

نیڈی نے سائرن کی آواز سنتے ہی مشروب کا کین میز پر رکھا اور اٹھ کر ریستوران کا دروازہ بند کر دیا۔ اس کے بعد وہ میز پر سے چمچے، کانٹے، چھریاں اور خالی ٹرے اٹھا اٹھا کر گندے برتنوں کے لیے مخصوص ریک میں رکھنے لگی۔ ہال میں خاصی مدھم روشنی تھی۔ خلافِ عادت نیڈی اس وقت بالکل خاموش تھی۔ ٹونر کی نسبت وہ مقدس وقت کا دل سے احترام کرتی تھی۔ یہ بات ٹونر بہت اچھی طرح جانتا تھا لیکن اسے علم تھا کہ ایلس کے بعد اب وہی اس کی ایک ایسی دوست بچی ہے جس کے ساتھ وہ یہ بُرا وقت کاٹ سکتا ہے۔ وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا اور اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ تقریباً آدھ گھنٹے میں نیڈی کا سارا کام ختم ہو چکا تھا۔ ساڑھے تین بجے کے بعد گاہک ایک بار پھر ریستوران کا رخ کرنے لگتے۔ اب ہال ہر طرح سے ان کی میزبانی کے لیے تیار تھا۔ نیڈی نے چاروں طرف طائرانہ نظر دوڑائی اور اطمینان کر لیا کہ اب مزید کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ ایک بار پھر اپنی میز پر لوٹ آئی اور کین ہاتھ میں اٹھا لیا۔ ''تم کچھ لو گے؟'' اس نے ٹونر کی طرف دیکھ کر آہستہ سے پوچھا مگر اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ پچھلے آدھ گھنٹے میں یہ پہلے الفاظ تھے جو اُس کے منہ سے نکلے تھے۔ اگر یہ مقدس وقت نہ ہوتا تو فارغ وقت میں اس کی زبان شہر بھر کی خبریں سنانے کے لیے قینچی کی طرح چل رہی ہوتی۔

خدا خدا کر کے ایک گھنٹا پورا ہوا اور جیسے ہی ایک بار پھر سائرن بجا، نیڈی اپنی جگہ سے اٹھی۔ ساری لائٹیں روشن کیں اور ہال کا دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھ گئی۔

جیسے ہی دروازہ کھلا، ٹونر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ایلس دروازے کے عین وسط میں کھڑی تھی۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کی جینز، سرخ بلاؤز اور اونچی ہیل کی سینڈل پہن رکھی تھی۔ سنہری خم دار لمبے بال کھلے ہوئے تھے اور شرارتی انداز میں اس کے کندھوں پر لہرا رہے تھے۔ اس نے ہلکا سا میک اَپ بھی کیا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ اور زیادہ خوبصورت دکھائی دے رہی تھی حالانکہ عام طور پر اس کا چہرہ ہر قسم کے میک اَپ سے عاری رہتا تھا۔ بال جوڑے میں بندھے ہوتے تھے مگر آج، وہ پہلے کے مقابلے میں بالکل مختلف لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔

اسے دیکھتے ہی نیڈی ایک طرف ہٹ گئی اور ہاتھ کے اشارے سے اندر آنے کا کہا۔ اس کے پیچھے چھوٹی داڑھی والا درمیانی عمر کا ایک مرد بھی اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی طاری تھی۔ اس نے نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ ایلس نے بھی اندر داخل ہوتے ہوئے ٹونر کو دیکھ لیا تھا۔ ہال خالی پڑا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے اس کے قریب آ گئی۔ اسے آگے بڑھتا دیکھ کر وہ بھی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''ہائے ٹونر...'' قریب پہنچ کر اس نے شانِ دلبری سے کہا مگر یہ ادائے دلبری اس کے لیے نہیں تھی۔ اس کے ساتھ آنے والا مرد بھی اس کے برابر آ کر کھڑا ہوا تھا۔ ''یہ ہیں ٹونر ہیرالڈ۔'' وہ برابر کھڑے مرد کے اور قریب ہوتے ہوئے بولی۔ ''اور ٹونر... یہ ہیں میرے دوست مائیکل نیکنٹ۔''

''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' ٹونر نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ یہ اور بات ہے کہ اس وقت وہ دل ہی دل میں اُس پر لعنت بھیج رہا تھا۔ مائیکل نے اس سے مصافحہ کیا تو وہ کہنے لگا۔ ''امریکا سے آئرلینڈ آمد پر خوش آمدید۔ ہم معذرت خواہ ہیں کہ موسم کچھ اچھا نہیں لیکن ان دنوں یہاں موسم ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس لیے شاید معذرت

کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے نہایت سلیقے اور مہذبانہ انداز میں اپنی بات کہی۔

''واقعی معذرت کی کوئی بات نہیں۔'' مائیکل بھی مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میں اس سے پہلے بھی اس طرح کے موسم میں ڈبلن آ چکا ہوں اور موسم کی ان اداؤں کو پہچانتا ہوں۔''

''ہاں، ایلس یہ بات پہلے ہی بتا چکی ہے مگر بدقسمتی سے پچھلی بار آپ سے ملاقات کا موقع نہیں مل سکا۔ اُس وقت میں آئرلینڈ سے باہر گیا ہوا تھا۔'' ٹونر اُن دونوں کو لے کر کونے میں لگی میز کی طرف بڑھتے ہوئے بولا جہاں سے باہر کا منظر بہت خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ ''آپ دونوں ساتھ بیٹھیے۔'' اس نے اصرار کر کے ایلس اور مائیکل کو ایک دوسرے کے برابر رکھی کرسیوں پر بٹھایا اور خود اُن کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کا رویہ نہایت شائستہ تھا۔

''سنا ہے کہ اس بار آپ ہمارے ہاں کے ایک بہت بڑے ادیب پر تحقیقی مقالہ لکھنے کے لیے آئے ہیں۔'' اِدھر اُدھر کی دو چار رسمی باتوں کے بعد ٹونر نے برسبیلِ تذکرہ کہا، حالانکہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا۔

''جی ہاں... سائمن میرے ادبی مقالے کا موضوع ہے۔'' پروفیسر مائیکل نے متانت سے جواب دیا۔

''بہت اچھا۔'' ٹونر نے آہستہ سے کہا۔ اسی دوران میں نیڈی کھانے پینے کے لوازمات سے بھری دو ٹرے لے کر آئی اور ان کے سامنے کھانا چُننے لگی۔ ٹونر نے خاصا کچھ منگوا لیا تھا۔ ویسے اس کے جذبات چاہے کچھ بھی ہوں مگر وہ پروفیسر، ایلس کا دوست تھا اور یہی بات اس کے لیے اہم تھی۔ اسی لیے وہ اس کی خاطر مدارات بہت عمدہ طریقے سے کر رہا تھا۔ جس وقت وہ دونوں خاموشی سے کھانے پینے میں مصروف تھے، ٹونر چور نظروں سے پروفیسر کے سراپا کا جائزہ لینے لگا... اس کے بال سیاہ گھنگرالے تھے۔ آنکھیں نیلی اور جسم قدرے نحیف لگ رہا تھا۔ قد بھی اس کی توقع سے کچھ چھوٹا تھا۔ اس کے ہاتھ اور انگلیاں جسم کی مناسبت سے بہت چھوٹے تھے البتہ اس کی آواز خاصی پاٹ دار تھی۔ اُس کی رنگت سانولی نہیں بلکہ سیاہ مائل تھی۔

ٹونر دل ہی دل میں پروفیسر اور اپنی شخصیت کا موازنہ کرنے لگا۔ مالی لحاظ سے وہ پروفیسر کے مقابلے میں خاصا خوشحال تھا۔ وہ ایک اہم سرکاری عہدے پر فائز تھا۔ اس کی تنخواہ اور دیگر مراعات اُس کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ تھیں۔ اس کی آواز نرم لیکن مردانگی سے بھرپور تھی۔ جسم بھی بھرا بھرا تھا، قد بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔ اس کا رنگ بھی صاف تھا۔ آنکھیں سبز مائل اور بال سنہری تھے، جنہیں وہ نہایت نفاست سے سنوارے رکھتا تھا۔ مجموعی طور پر وہ ہر لحاظ سے مائیکل کی شخصیت پر بھاری تھا۔

ایلس اور پروفیسر چپ چاپ کھانے پینے میں مصروف تھے۔ ٹونر نے اس موقع کا فائدہ اٹھایا اور کچھ کہنے کے بجائے ایک بار پھر اپنے تقابلی جائزے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے پروفیسر کے لباس پر گہری نظر ڈالی۔ وہ کچھ خاص نہیں تھا جبکہ وہ خود اس وقت بہترین تراش خراش کا قیمتی سوٹ پہنے ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر ایلس کو اس کے مقابلے میں پروفیسر کی شخصیت میں ایسی کون سی خاص بات نظر آئی ہے جو وہ بُری طرح اس پر مرمٹی ہے۔ کافی سوچ بچار کے بعد وہ ایک ہی بات سمجھ پایا۔ وہ پروفیسر تھا۔ بس یہی بات اُسے ٹونر کے مقابلے میں قدآور بنا رہی تھی۔

''یہ میری براڈی کا کیا واقعہ ہوا تھا میرے یہاں سے چلے جانے کے بعد؟'' کھانا کھاتے ہوئے پروفیسر نے پوچھا۔ اس کا لہجہ کسی قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔

''اوہ، تو تم میری براڈی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے؟'' ٹونر نے حیرت سے کہا۔ ''حالانکہ پچھلے موسمِ گرما میں تو تم یہیں پر تھے۔'' یہ سن کر ایلس اور ذرا سا سمٹ کر مائیکل کے نزدیک ہو گئی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ پروفیسر کو بے خبری کی خفت اٹھانے سے بچانا چاہتی ہو۔ ساتھ ہی اس نے آنکھ سے ٹونر کو اشارہ کیا۔ وہ سمجھ گیا کہ ایلس چاہتی ہے کہ پروفیسر کی لاعلمی دور کرنے کے لیے وہ میری براڈی کا واقعہ اس کے گوش گزار کر دے۔

''میری براڈی آئرلینڈ حکومت کی سیکریٹری تھیں۔'' ٹونر نے کہنا شروع کیا۔

''یہ بات تو میں جانتا ہوں۔'' پروفیسر نے پلیٹ کی طرف بڑھتا ہوا اپنا ہاتھ روک کر جواب دیا۔

''وہ طویل عرصے سے چھٹیوں پر نہیں گئی تھیں۔'' ٹونر نے کچھ کہے بغیر قصہ شروع کیا۔ ''مستقل مصروفیات کی بنا پر انہیں صحت کے بعض مسائل دوچار ہو گئے تھے جس پر ڈاکٹروں نے انہیں کسی تفریحی مقام پر طویل چھٹیاں گزارنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے سرحدی علاقے کے پُرفضا مقام پر واقع ایک ہوٹل کو تعطیلات گزارنے کے لیے منتخب کیا۔ وہ بڑے مزے سے تعطیلات گزار رہی تھیں۔ جس دن انہیں ہوٹل چھوڑنا تھا، اس دن انہوں نے ہوٹل انتظامیہ کو فون کر کے مزید ایک روز رہنے کی

خواہش کا اظہار کیا اور بدقسمتی سے اُسی رات وہ سانحہ ہوگیا۔“

”کیا ہوا تھا اُس رات؟“ مائیکل نے پوچھا۔

”رات کا وقت تھا، وہ اپنے کمرے میں آرام کررہی تھیں کہ کچھ شرپسندوں نے بموں سے ہوٹل پر حملہ کردیا۔“ ٹونز نے بتایا۔ پروفیسر کھانے کے ساتھ ساتھ دلچسپی سے اس کا قصہ بھی سن رہا تھا۔ ”ہوٹل میں آگ بھڑک اٹھی جس نے بہت جلد پوری عمارت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جب فائر بریگیڈ کا عملہ دھوئیں اور آگ کے شعلوں سے بچتا بچاتا اُن کے کمرے میں پہنچا تو وہ اپنے بستر کے نیچے پائی گئیں۔ وہ کافی جھلس چکی تھیں لیکن زندہ تھیں مگر افسوس کہ وہ زخموں کی تاب نہ لاسکیں۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے کے لیے خاموش ہوگیا۔

مائیکل نے اس کی خاموشی کا کوئی نوٹس نہ لیا اور نہ ہی یہ جاننے کی خواہش ظاہر کی کہ پھر کیا ہوا۔ وہ بڑے مزے سے اپنی پلیٹ صاف کررہا تھا۔ ”کھانا لذیذ ہے۔“ کافی دیر بعد اس نے ٹونز کو مخاطب کر کے صرف یہ ایک جملہ کہا مگر میری براڈی... پروفیسر اس بارے میں کچھ کہنے سے گریزاں تھا یا پھر کھانے میں اس کی مشغولیت، اسے اس بارے میں کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دے رہی تھی۔

”سنو ایلس...“ ٹونز نے اس کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا۔ ”گارڈی اس سلسلے میں کچھ نئی خبریں لایا ہے۔“

”کیا کہتا ہے وہ۔“ اس نے مشروب کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

”کہہ رہا تھا بہت جلد یہ پتا چل جائے گا کہ وہ عام لڑکے تھے یا السٹر ڈیفنس سے علیحدہ ہوجانے والے دھڑے کے لوگ۔“ ٹونز نے اپنی دانست میں اسے نہایت اہم معلومات فراہم کیں۔ ”ویسے جس نے بھی یہ حملہ کیا، اس کی منصوبہ بندی یہی تھی کہ الزام السٹر ڈیفنس کے سر تھوپا جائے۔“ اس نے جان بوجھ کر اُسے یہ بتانے سے گریز کیا تھا کہ ان لڑکوں کی ٹولی میں ایک امریکی بھی شامل ہے۔ وہ مائیکل کی موجودگی میں یہ بات کہنا مناسب نہیں سمجھ رہا تھا۔ آخر کو وہ بھی تو ایک امریکی شہری ہی تھا۔

”ایک منٹ...“ یہ سن کر مائیکل نے ہاتھ روکا اور ٹونز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ذرا مجھے پوری بات سمجھنے دو۔“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور کنپٹی پر انگلی رکھ کر یہ ظاہر کرنے لگا جیسے وہ کچھ سمجھنے اور سوچنے کی کوشش کررہا ہے۔ ”جس بم حملے میں میری براڈی ماری گئی، وہ حملہ آئرش ری پبلکن آرمی نے کیا تھا؟“ اس کا لہجہ استفساریہ تھا۔

”اس سے علیحدہ ہوجانے والے ایک دھڑے کا... مگر یہ صرف قیاس ہے۔ ممکن ہے کہ وہ صرف جرائم پیشہ ہی ہوں...“ ٹونز نے فوراً کہا۔

”او کے۔“ مائیکل نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”دیکھو مائیکل۔“ ایلس نے ٹونز کے بجائے پروفیسر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”اصل معاملہ یہ ہے کہ ایک حملہ ہوا جس میں میری براڈی نام کی ایک عورت ماری جاتی ہے اور اب تک اس کی موت کے ذمے دار پکڑے نہیں جاسکے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے ٹونز کی طرف دیکھا۔ ”تو بات یہ ہے کہ قاتل اور حملے کے ذمے دار پکڑے نہیں گئے جس کی وجہ سے افواہیں پھیل رہی ہیں۔ جب تک حملہ آور پکڑے نہیں جاتے، قیاس آرائیاں افواہوں میں تبدیل ہوتی رہیں گی۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہوئی اور مائیکل کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ چپ سادھے گفتگو سن رہا تھا۔ ”ممکن ہے کہ یہ حملہ السٹر ڈیفنس نے ہی کیا ہو، اس میں آوارہ لڑکوں کا کوئی ہاتھ ہی نہ ہو۔ ویسے بھی وہ لڑکے میرے خیال میں اس طرح کے جرم نہیں کرسکتے۔“

”نہیں... اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔ اگر تم انہیں اس طرح جانتی ہوتیں جیسا کہ میں جانتا ہوں تو کبھی یہ بات نہ کرتیں۔“ ٹونز نے ایلس کی رائے سن کر فوراً وضاحت کی۔

ٹونز بیری ٹاؤن کے کئی ایسے لڑکوں کو بخوبی جانتا تھا جو ہائی اسکول کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر آوارہ گردی میں پڑ گئے تھے۔ اب ان میں سے اکثر دن کے اوقات میں محنت مزدوری کرتے تھے اور پھر شام ہوتے ہی سب کچھ منشیات استعمال کرنے پر لٹا دیتے تھے۔ زیادہ تر آوارہ لڑکے ہفتے کی شام کو لینس ڈاؤن اسٹیڈیم پر جمع ہوتے تھے۔ نشہ کرتے، غل غپاڑا مچاتے اور موقع ملتا تو لطف اندوزی کے لیے واردات بھی کرڈالتے تھے۔ ان کے لیے جرم فائدے کے ساتھ ساتھ لذت اٹھانے کا بھی ایک دلچسپ ذریعہ تھا۔ ”اگر میں یہ کہوں کہ ایسے آوارہ گردوں میں سے بعض کو میں جانتا ہوں جو جرائم کی وارداتیں اس ڈھنگ سے کرتے ہیں کہ جن کا الزام بہ آسانی تنظیم کے سر تھوپا جاسکتا ہے تو پھر تم کیا کہو گی؟“ پروفیسر تو اجنبی تھا۔ وہ ٹاؤن بیری کے حالات سے شاید اچھی طرح آگاہ نہیں تھا مگر ایلس یہیں کی رہنے والی تھی اسی لیے ٹونز نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔

”ہاں مائیکل... ٹونز اس طرح کے بہت سارے لڑکوں کو جانتا ہے جن کا کام ہی ہنگامہ آرائی کرنا ہے۔“ ایلس نے ٹونز کو جواب دینے کے بجائے پروفیسر سے کہا۔ یہ سن کر

پروفیسر نے بھی آہستہ سے سر ہلا دیا۔ اس کے بعد کافی دیر تک خاموشی طاری رہی۔ وہ دونوں چپ چاپ کھانا کھانے میں مگن تھے جبکہ ٹونز مہذب میزبان کی طرح بیٹھا ہوا انہیں تک رہا تھا۔

”اچھا... اب ہمیں چلنا چاہیے۔“ کھانا ختم کر کے نیپکن سے ہاتھ منہ صاف کرتے ہوئے ایلس نے پروفیسر سے کہا۔

”اتنی بھی کیا جلدی ہے، کچھ دیر تو اور بیٹھیے۔“ ٹونز نے ان کے جانے کا سن کر جلدی سے اچھے میزبانوں کی طرح کہا۔

”نہیں...“ ایلس کھڑی ہوگئی اور اپنا پرس سنبھالنے لگی۔ مائیکل بھی کھڑا ہوچکا تھا۔ ”ہمیں کافی دور جانا ہے، مزید کچھ دیر ٹھہرے تو اور دیر ہوجائے گی۔“ ایلس نے ٹونز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ لوگ کس طرف جارہے ہیں؟“

”مغرب کی طرف۔“ ایلس نے جواب دیا۔

”مغرب کی طرف...“ اس نے ایلس کا جملہ دہرایا مگر سوالیہ انداز میں۔

”میں نے تمہیں وہ بروشر تو دکھایا تھا نا۔“ اس کے حیرت بھرے لہجے میں چھپے استفسار کو سن کر ایلس نے جلدی سے کہا۔

ایلس کی بات سن کر ٹونز کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔ کچھ دیر پہلے جب وہ انہیں میری براڈی کی کہانی سنا رہا تھا تو اس وقت ٹونز کو اپنے پاؤں مضبوطی سے فرش پر جمے ہوئے محسوس ہورہے تھے لیکن یہ سن کر تو اسے ایسا لگا جیسے وہ برف پر پھسل رہا ہے۔ اسے یاد آگیا کہ کچھ دن پہلے ایلس نے اسے ایک بروشر دکھاتے ہوئے کہا تھا کہ وہ پروفیسر کو یہاں لے جانا چاہتی ہے۔ وہ مغرب میں واقع جس علاقے کی طرف اُسے لے جانا چاہتی تھی، امن وامان کے حوالے سے اس کی شہرت اچھی نہیں تھی البتہ بہت خوبصورت مناظر والی جگہ تھی۔ اسی لیے ٹونز نے کہا۔ ”امریکی پروفیسر کے لیے یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔“ یہ سن کر اُس وقت تو وہ کچھ نہیں بولی مگر اب اُسی جگہ جانے کا کہہ رہی تھی۔

”دراصل مائیکل کیرے دیکھنا چاہتا ہے۔“ ایلس نے جلدی سے کہا۔

”ہاں...“ کافی دیر بعد پروفیسر نے مداخلت کی۔ ”ایلس بتارہی تھی کہ کیرے بالکل اُس کے آبائی علاقے کیری کی طرح خوبصورت اور مناظرِ فطرت سے مالا مال ہے۔ اس نے اتنی تعریفیں کیں کہ میں اب وہاں جانے سے خود کو روک نہیں پارہا ہوں۔ ویسے میں نے وہاں ایک گھر کچھ عرصے کے لیے کرائے پر بھی لے لیا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ایک ہاتھ ایلس کے شانے پر رکھا اور دوسرے سے اس کی کلائی تھام لی۔ ”میرے خیال میں اب ہمیں چلنا چاہیے۔“ اس نے ایلس کے مزید قریب ہوتے ہوئے کہا۔ اس کے انداز سے والہانہ پن جھلک رہا تھا۔

”ہاں ہاں... بس چلتے ہیں۔“ اس نے کندھے پر لٹکے اپنے بڑے سے پرس کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔ ٹونز بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ دو قدم آگے بڑھی اور اس کے گالوں پر الوداعی بوسہ دیا۔ ”ضیافت کا شکریہ۔“

”ارے ہاں... واقعی یہاں کا کھانا... تو بہت ہی مزے دار ہے۔“ مائیکل نے ہال پر نظر ڈالتے ہوئے۔

”اسی لیے دن میں یہاں تل دھرنے کی جگہ بھی نہیں ہوتی۔“ نیڈی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ان تینوں کو کھڑا ہوتا دیکھ کر وہ میز پر سے برتن سمیٹنے کے لیے چلی آئی تھی۔

”واقعی...“ اس نے نیڈی کی بات سن کر اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ ”خیر... ابھی میں یہیں ہوں۔ کسی دن لنچ ٹائم بھی دیکھ لیں گے۔“

”پیشگی خوش آمدید۔“ یہ کہتے ہوئے وہ برتن سمیٹ کر چل دی۔

”اچھا ٹونز... جلد ملیں گے، فی الحال تو ذرا جلدی میں ہیں۔“ مائیکل نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ٹونز نے اچھے میزبان کی طرح گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اس کے بن بلائے مہمان تھے۔

”ارے ایک منٹ...“ وہ دونوں آگے بڑھے تو اچانک جیسے ٹونز کو کچھ یاد آگیا۔ اس نے جیب سے اپنا ڈیجیٹل کیمرا نکالتے ہوئے کہا۔ جیسے ہی وہ مڑے اس نے جھٹ سے ان دونوں کی تصویر کھینچ لی۔ پروفیسر نے بُرا سا منہ بنایا مگر تصویر کھنچ چکی تھی۔ البتہ ٹونز پروفیسر کے چہرے کے تاثرات کو نہیں دیکھ سکا تھا۔

”اسے فوٹو گرافی کا بہت شوق ہے۔ اکثر دوستوں کی تصویریں اتارتا رہتا ہے۔“ ایلس نے الوداعی انداز میں اس کی طرف ہاتھ ہلاتے ہوئے پروفیسر سے کہا۔ اگلے لمحے وہ دونوں ریستوران سے باہر نکل کر سڑک کے کنارے کھڑی شاندار کار کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پروفیسر نے ایلس کو بتایا تھا کہ اس نے یہ کار آج ہی ماہانہ کرائے پر ایک کمپنی سے لی تھی۔

☆☆☆

ٹونز کی ماں کئی ہفتوں سے بگوٹ اسٹریٹ اسپتال میں داخل تھی۔ اُس سمیت کوئی یہ بات نہیں جانتا تھا کہ وہ اس کی زندگی کا آخری ہفتہ ہے۔ اُس دن بھی وہ حسبِ سابق ماں سے ملنے کے لیے اسپتال کے اس کمرے میں پہنچا تھا۔ جب ٹونز اندر داخل ہوا تو اس وقت سفید لباس میں ملبوس دو نرسیں اس کے کمرے میں موجود تھیں۔ ٹونز نے لبوں پر مصنوعی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے انہیں دیکھا حالانکہ اس میں سے ایک تو اس قابل بھی نہیں تھی کہ اسے نظر بھر کر دیکھا بھی جاسکے۔ وہ لمبے قد، خرانٹ چہرے اور کھا جانے والی نظروں کی مالک تھی۔ البتہ دوسری قدرے مختلف اور اس کے مقابلے میں جونیئر نظر آرہی تھی۔ اس کے سنہری بال تھے۔ نکلتا ہوا قد اور نہایت خوبصورت آنکھیں تھیں۔ سفید لباس میں اس کا ملکوتی حسن نہایت پاکیزہ لگ رہا تھا۔ یہ ٹونز کی ایلس سے پہلی ملاقات تھی جو بہت جلد دوستی میں بدلنے والی تھی۔

ماں بدستور اسپتال میں داخل تھی اور اپنی زندگی کی سانسیں پوری کررہی تھی۔ ٹونز کو یقین تھا کہ وہ وقت بہت قریب آچکا ہے جب اسے کوئی بُری خبر سننے کو ملے گی۔ وہ اس بُری خبر اور اس کے بعد کے حالات سے نمٹنے کے لیے خود کو تیار کرچکا تھا۔

وہ فروری کی ایک صبح تھی۔ دن کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ سورج نکل چکا تھا لیکن موسمِ سرما کے اُس دن کی یخ بستگی بدستور قائم تھی۔ جب ٹونز اسپتال پہنچا تو ڈاکٹرز نے اسے انتظار گاہ میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ یہ سنتے ہی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسے خدشہ تھا کہ وہ وقت قریب آپہنچا ہے جس کا اسے کئی ہفتوں سے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ وہ انتظار گاہ میں پہنچا اور بدقت تمام خود کو ایک صوفے پر گرالیا۔ اگرچہ اب تک ڈاکٹرز نے اس کی ماں کے حوالے سے کوئی اطلاع نہیں دی تھی لیکن انجانے خدشے نے اس کے ذہن و دل کو بُری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

وہ کافی دیر تک وہاں بیٹھا اطلاع کا منتظر رہا مگر اس کا انتظار ختم نہ ہوا، البتہ اسی دوران دوپہر کے کھانے کا وقفہ ہوگیا۔ وقفے کے دوران اچانک اسے سامنے سے ایلس آتی ہوئی نظر آئی۔ ماں کی بیماری کے ان ایام میں اسپتال کے چکر کاٹتے ہوئے اس کی ایلس کے ساتھ بہت اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ وہ اُس کی طرف ہی آرہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد وہ اس کے برابر میں بیٹھ چکی تھی۔ پہلے تو اسے محسوس ہوا کہ شاید وہ اس کی ماں کے بارے میں کوئی بری خبر دینے آئی ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔

”کیا خیال ہے، تم میرے ساتھ اسپتال کے کیفے ٹیریا میں لنچ کرنا پسند کروگے؟“ ایلس نے جب یہ کہا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔

”کیا خاص بات ہے اس کیفے ٹیریا کے کھانوں میں؟“

”ان کے سینڈوچ بہت مزے دار ہوتے ہیں، چائے بھی بڑی ذائقے دار ہے اور چپس کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔“ ایلس نے آخری بات اس طرح کہی جیسے چپس کے تذکرے کے ساتھ ہی اس کے منہ میں پانی بھر آیا ہو۔ جب سے ٹونز اسے جانتا تھا، یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب آئے تھے کہ ساتھ لنچ کرسکیں۔

ایلس کا تعلق ڈبلن سے نہیں تھا۔ وہ آئرلینڈ کے ایک نواحی علاقے سے یہاں منتقل ہوئی تھی اور اسپتال کے قریب دو کمروں کے ایک فلیٹ میں دوسری لڑکی کے ساتھ رہ رہی تھی۔ لنچ کے دوران میں وہ اسے نہایت لگاوٹ سے اپنی ذاتی زندگی، فلیٹ اور اس میں رہنے والی اپنی پارٹنر کے بارے میں بتاتی رہی۔

”میرے خیال میں تمہارے لیے یہ لنچ بہت زیادہ بہتر نہیں ہے۔“ جب وہ لنچ کررہے تھے تو ٹونز نے اس سے کہا۔ یہ سن کر ایلس نے منہ سے تو کچھ نہیں کہا، البتہ سوالیہ نظروں سے ایک بار اسے دیکھا ضرور تھا۔

”میرا مطلب اس کھانے کے معیار سے نہیں بلکہ غذائیت سے ہے۔“ اس نے فوراً ہڑبڑا کر وضاحت کی۔ ”تم دن بھر یہاں سے وہاں چلتی پھرتی رہتی ہو۔ ایسی صورت میں یہ کھانا درکار توانائی فراہم کرنے کے لیے ناکافی ہے۔ البتہ میرے جیسے آدمی کے لیے یہ کھانا ٹھیک ہے۔“

”جانتی ہوں۔“ اس نے آہستگی سے جواب دیا اور کیتلی سے اپنے کپ میں چائے اُنڈیلنے لگی۔ ”میں یہاں کام کرتی ہوں اور جتنی دیر کا لنچ بریک ہوتا ہے، اس میں یہ ممکن نہیں کہ باہر جاکر کھانا کھاسکوں۔“ یہ کہہ کر اس نے سر اوپر اٹھایا، چائے کا گھونٹ بھرا اور پھر کہنے لگی۔ ”کیا خیال ہے، کسی دن اچھے سے ریستوران میں بیٹھ کر شاندار لنچ نہ کیا جائے؟“

”اگر یہ دعوت ہے تو میں قبول کرتا ہوں اور اگر یہ صرف ایک بات ہے تو پھر تم نے بہت اچھی بات کہی ہے۔“ ٹونز نے شرارت بھرے انداز میں کہا تو وہ مسکرادی۔ ویسے اس کے لیے اطمینان کی بات یہ تھی کہ صبح سے ماں کے کئی ٹیسٹ لیے جارہے تھے، اس لیے ڈاکٹروں نے اسے ملنے نہیں دیا تھا۔ یہ بات ایلس نے اسے پہلے ہی بتادی تھی جس کی وجہ سے اس کی پریشانی ختم ہوچکی تھی اور اب ایلس کے ساتھ گزرتے ان

لمحات میں وہ خود کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کررہا تھا۔ اسی لیے اس کے جملوں میں بھی شوخی در آئی تھی۔

”تم کہاں لنچ کرنا چاہوگے میرے ساتھ؟“ چائے پینے کے دوران ایلس نے پوچھا۔

”میرے خیال میں ویلس ٹھیک رہے گا... جمعرات کو لنچ کرتے ہیں۔“ اس نے بڑے یقین سے کہا۔

”مگر...“ یہ سن کر وہ سوچ میں پڑگئی۔ ”سنا ہے کہ وہاں تو بہت رش ہوتا ہے۔“ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے بھیڑ بھاڑ سے بہت اُلجھن ہوتی ہے۔“

”نہیں... اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ ہفتے میں ایک دن وہاں کا ماحول نہایت ہی پُرسکون ہوتا ہے۔“

”وہ کون سا دن ہے؟“ ایلس کی آنکھوں میں حیرت نظر آرہی تھی۔

”مقدس گھنٹے کے دوران وہ تقریباً خالی ہوتا ہے۔“

”اوہ...“ یہ سن کر ایلس نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔ ”بہت خوب، یہ اچھا وقت ہوگا وہاں لنچ کرنے کا۔“

”جانتا ہوں، اسی لیے تجویز کیا ہے۔“ ٹونز نے اس کی رضامندی جان کر خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ویسے بھی وہ اس کا پسندیدہ ریستوران تھا اور اس کے کھانے تو اسے بہت ہی پسند تھے۔

اگلے ہفتے وہ مقدس گھنٹے کے وقفے کے دوران ویلس ریستوران کے خالی ہال میں ایلس کے ساتھ بیٹھا ہوا لنچ کررہا تھا۔ اُس دن یہاں کا سناٹا ایلس کو بہت پسند آیا۔ نیڈی نے بھی اس لنچ کو مزید پُرلطف بنانے کے لیے کئی قسم کے کھانے اس کے سامنے چُن دیے تھے۔ وہ ٹونز کی ایک اچھی دوست تھی اور چاہتی تھی کہ اس ریستوران میں ٹونز کے ساتھ یہ پہلا لنچ ایلس کے لیے یادگار بن جائے۔ واقعی ایسا ہوا۔ بعد کے مہینوں میں ایلس نے باتوں باتوں میں کئی بار اس لنچ کو یادگاری قرار دیا تھا۔ جس دن وہ ویلس میں پہلا لنچ کررہے تھے، اس دوران میں ٹونز کی ماں کا انتقال ہوگیا۔

ماں کی موت کے بعد ٹونز کا اسپتال آنے جانے کا سلسلہ تو ختم ہوگیا تھا البتہ وہ ایلس کے فلیٹ کا چکر ضرور لگاتا رہتا تھا۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ وہ ایلس کی زندگی میں آنے والا آخری مرد ہے مگر بُرا ہو اس امریکی پروفیسر کا جو اچانک بیچ میں آگیا تھا۔

☆☆☆

ویلس ریستوران نارتھ ٹمبرلینڈ روڈ پر واقع تھا۔ سڑک کے پار واقع بلڈنگ کے ایک اپارٹمنٹ میں ٹونز رہتا تھا۔ اس کے کمرے کی کھڑکی سے ریستوران کی شیشے سے بنی دیوار کے پار، اندر کا منظر صاف نظر آتا تھا۔ جب تک ایلس پروفیسر سے نہیں ملی تھی، وہ ہر ہفتے مقدس گھنٹے کے وقفے میں یہاں لنچ کرتے تھے مگر جب سے وہ تحقیقی مقالہ لکھنے کے لیے یہاں پہنچا تھا، ایلس ہر ہفتے مقدس گھنٹے کے وقفے میں اس کے ساتھ یہاں لنچ کرنے آتی تھی اور وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھ کر یہ منظر دیکھتا اور دل ہی دل میں کڑھتا رہتا۔ ایسا کئی ہفتوں سے ہورہا تھا۔ ٹونز سوچتا تھا کہ اسے تحقیقی کام کرنے کے لیے کب وقت ملتا ہوگا۔

پچھلے سال جب پہلی بار پروفیسر اس سے ملنے کے لیے پہنچا تھا تو اس کے جانے کے بعد سے ہی ایلس نے ٹونز کے ساتھ سرد مہری کا رویہ اپنالیا تھا مگر اس بار جب سے وہ یہاں آیا تھا، تب سے ایلس نے اس کی طرف سے بالکل ہی نگاہیں پھیر لی تھیں۔ یہ بات اس کے دل میں تیر کی طرح پیوست ہوچکی تھی مگر اس کی لاکھ بے التفاتی کے باوجود وہ خود کو ترکِ تعلق پر آمادہ نہیں کرپارہا تھا۔

اُس دن ویک اینڈ تھا۔ رات کی سیاہی ہر طرف پھیل چکی تھی۔ وہ بیڈ روم میں لیٹا ہوا ایلس کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ وہ پروفیسر کے ساتھ مغرب میں واقع کیرے گئی ہوئی تھی۔ ٹونز بستر پر لیٹا ہوا بدستور ایلس اور پروفیسر کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ ”ہیلو...“ اس نے لپک کر سائیڈ ٹیبل سے فون اٹھایا۔

”ہاں ٹونز... کیا ہورہا ہے؟“ دوسری طرف برائن تھا۔

”بُرے وقت سے گزر رہا ہوں لیکن یہ بتاؤ تم اس وقت کہاں ہو؟“ ٹونز نے ہنستے ہوئے کہا۔ برائن کی آواز سن کر اسے محسوس ہوا کہ وہ اس وقت کہیں باہر ہے۔ پس منظر میں کچھ اور آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

”تمہارے گھر کے اگلے دروازے سے بول رہا ہوں۔“ برائن نے کہا۔ یہ سن کر وہ سمجھ گیا کہ برائن اس وقت کہاں پر ہے۔ دراصل ٹونز کے اپارٹمنٹ کے بالکل برابر میں ایک پب واقع تھا۔ یہ نوجوانوں میں بہت مقبول تھا۔ اس وقت وہ پب سے ہی بول رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ فون میں اس کے ساتھ ساتھ کئی اور آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

”مزے کرو، مجھے کس لیے فون کیا ہے؟“

”میرے ساتھ کچھ خواتین بھی ہیں جو تم سے ملنا چاہتی ہیں۔ بالخصوص ایک خاتون تو تم سے ملاقات کی شدید تمنا رکھتی ہے۔“ برائن کے شوخ لہجے سے شرارت ٹپک رہی تھی۔

”کیا ابھی...“ ٹونز نے حیرت سے کہا اور کچھ سوچنے

لگا۔

ٹونر ڈبلن کے آؤٹ ڈپارٹمنٹ میں سینئر عہدے پر کام کرتا تھا۔ برائن اس کا جونیئر آڈیٹر تھا۔ چند ماہ قبل اس نے براہِ راست ٹونر کی ماتحتی میں کام کیا تھا۔ وہ شوخ و چنچل طبیعت کا مالک تھا۔ تھوڑے عرصے میں ہی ان کے درمیان بہت اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ برائن کی بیوی ایک دوا ساز کمپنی میں مارکیٹنگ ڈائریکٹر کے عہدے پر کام کرتی تھی۔ اکثر و بیشتر ملکی و غیر ملکی دوروں پر ہوتی تھی۔ یوں برائن کو اپنی من موجیوں کے لیے اچھا خاصا وقت مل جاتا تھا۔

''کیا ہوا ٹونر... خاموش کیوں ہوگئے؟'' جب کچھ دیر گزر گئی تو برائن نے تشویش سے پوچھا۔ ''میری بیوی تو شہر سے باہر ہے اور وہ تمہاری نرس... کیا اس وقت وہ تمہارے ساتھ ہے یا پھر اوور ٹائم کے لیے اسپتال میں۔'' برائن نے شرارتی لہجے میں کہا۔

''نہیں یار!'' ٹونر نے بیزاری سے کہا۔ ''اس کا ایک امریکی دوست آیا ہوا ہے۔''

''اور اس نے تمہیں فی الحال شہر گھمانے کے فرض سے چھٹی دے کر اس کا ہاتھ تھام لیا ہے۔'' برائن نے پوری بات سنے بغیر لقمہ دیا۔ برائن جانتا تھا کہ ایلس کو سڑکوں پر گھومنے پھرنے میں بہت لطف آتا تھا اور ٹونر اسے گھمانے پھرانے میں خوشی محسوس کرتا تھا۔ وہ دونوں کئی بار اسے ڈبلن کی سڑکوں پر گھومتے ہوئے ملے تھے۔

''اب ایسا بھی نہیں ہے۔'' ٹونر یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ ایلس اس پروفیسر کو اپنی زندگی میں شامل کرسکتی ہے۔ اس لیے جب برائن نے یہ کہا تو اس کے دل پر ہلکی سے چوٹ لگی۔

''میں سب کچھ اچھی طرح جانتا ہوں، اتنا بے خبر نہیں ہوں۔'' برائن نے اسے چڑانے والے لہجے میں کہا۔ ''مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اب وہ نرس مقدس گھنٹے کے وقفے میں اس پروفیسر کے ساتھ کتنی باقاعدگی سے ویلس میں لنچ کے لیے آتی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا مگر ٹونر کچھ نہ بولا۔ ''دیکھو، میری بات مان لو۔ اس کی خاطر دل بھاری نہ کرو اور میری طرح موج مستی کر کے خوشی خوشی دن گزارو ورنہ کسی دن نہایت شرمندگی کے ساتھ بیٹھے سوچ رہے ہوگے کہ جوانی کدھر گئی۔''

''شاید ایسا نہیں ہوگا۔'' ٹونر نے یقین سے کہا۔

''تو پھر ٹھیک ہے، آجاؤں خواتین کے ساتھ تمہارے فلیٹ پر یا تم یہاں آرہے ہو؟''

''آج نہیں...'' ٹونر نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

''طبیعت ٹھیک نہیں ہے، پھر کسی دن۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' برائن نے جواب دیا۔ ''اپنی زندگی کو بیٹھ کر مزید بور بناؤ اور مجھے موج مستی کرنے کی اجازت دو... بائے۔''

ٹونر نے فون بند کر کے ایک طرف رکھا اور ایک بار پھر بستر پر لیٹ گیا۔ اس کے دماغ پر اب بھی ایلس کا سراپا چھایا ہوا تھا مگر وہ پروفیسر... کم بخت ٹونر کی زندگی میں اس بُری طرح داخل ہو چکا تھا کہ جہاں وہ ایلس کو سوچتا، یہ جھٹ سے مہیب سایہ بن کر سامنے آ کھڑا ہوتا۔ اس وقت بھی ٹونر اسی کیفیت سے دوچار تھا۔ اس کے خیالوں میں ایلس اور مائیکل لازم و ملزوم بن چکے تھے۔

کافی دیر بعد ٹونر بستر سے اٹھا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس نے فریج سے مشروب کا کین نکالا اور کمرے کی کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا۔ وہ کرسی پر بیٹھا ہوا باہر دیکھ رہا تھا۔

وہ ویک اینڈ نائٹ تھی۔ سامنے سڑک پر دونوں جانب کئی بارز، پب اور نائٹ کلبز تھے جو رات ساڑھے گیارہ بجے تک کھلے رہتے تھے..... سڑک پر خاصی چہل پہل تھی۔ نوجوان جوڑے ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے اِدھر سے اُدھر آجا رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے اسے برائن کا خیال آیا، وہ مسکرا دیا۔ اگلے لمحے ایلس ایک بار پھر اس کی نگاہوں کے سامنے آگئی تھی۔

مجموعی طور پر ایلس شائستہ اور نفیس لڑکی تھی۔ وہ کوئی دو سال پہلے ملازمت کے سلسلے میں ڈبلن آئی تھی۔ اسے گٹار بجانے کا بہت شوق تھا۔ وہ اچھی موسیقی کی دلدادہ تھی۔ ڈبلن میں اس کی زندگی کا پہلا مرد ٹونر تھا۔ یہ اعتراف خود ایلس نے کیا تھا۔ ایلس نے ایک دن ٹونر کے سامنے یہ بھی اعتراف کیا تھا کہ اس کے کئی مردوں کے ساتھ مراسم رہے ہیں مگر ان میں سے کوئی ایک بھی اس کے دل کی گہرائیوں کو چھو نہ سکا اسی لیے شادی کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ البتہ یہ سن کر ٹونر کو محسوس ہونے لگا تھا کہ شاید وہ اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر چکا ہے۔ بات سچ بھی تھی مگر پھر یہ ہوا کہ ان دونوں کے درمیان پروفیسر آگیا۔

پچھلے سال موسم بہار میں ایلس نے ملازمت سے طویل چھٹی لی۔ وہ یہ چھٹیاں اپنے گھر والوں کے ساتھ پسندیدہ تفریحی مقام پر گزارنا چاہتی تھی۔ اب یہ اتفاق تھا کہ اُنہی دنوں پروفیسر بھی چھٹیاں گزارنے کے لیے وہیں پہنچا ہوا تھا۔ مائیکل بھی اسی ہوٹل میں ٹھہرا جہاں پر ایلس اپنے گھر والوں کے ساتھ ٹھہری تھی۔ اسی ہوٹل میں ان دونوں کی پہلی ملاقات

اتفاقیہ طور پر ہوئی تھی۔

کچھ ہی روز بعد دونوں کو یہاں سے چلے جانا تھا۔ ان کی اتفاقی ملاقات سے شروع ہونے والا ملاقاتوں کا یہ سلسلہ شاید طویل نہ ہو پاتا مگر جب وہ لوٹ آئی تو بعد کے مہینوں میں اسے پروفیسر کے کئی خطوط ملے۔ چند ماہ بعد وہ اس سے ملنے کے لیے چند روز کے لیے ڈبلن بھی چلا آیا۔ اب ان کے درمیان مراسم کی نوعیت کافی گہری ہوچکی تھی۔ اس سال وہ طویل رخصت لے کر تحقیقی مقالے کے نام پر مہینوں سے ایلس کے ساتھ رہ رہا تھا۔

ٹونر کے سارے دوست نرس کے ساتھ چلنے والے اس کے معاشقے کے بارے میں جانتے تھے۔ اب امریکی پروفیسر کے ساتھ اس کے مراسم کسی سے بھی ڈھکے چھپے نہیں تھے مگر ان سب باتوں کے باوجود ٹونر اسے بھلانے پر تیار نہیں تھا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہی اس کی حقیقی محبوبہ ہے مگر ایلس کے دل میں کیا ہے، وہ اُس کے سوا سب دوست جان گئے تھے۔ امریکی پروفیسر کے ساتھ ایلس کے اتنے قریبی مراسم دوستی سے آگے بڑھ چکے تھے مگر ٹونر یہ بات ماننے کو تیار ہی نہیں تھا۔ اسے اپنے دل میں اب بھی یقین تھا کہ ایک وہی مرد ہے جس نے اُس کے دل کی گہرائیوں کو چھوا ہے۔

آہستہ آہستہ باہر سڑک پر نظر آنے والا بے فکروں کا ہجوم گھٹنے لگا۔ ٹونر بھی بیٹھے بیٹھے اکتا گیا تھا، وہ بے دلی سے اٹھا۔ کچن میں جا کر فریج سے اورنج جوس کی بوتل نکالی اور ٹی وی کھول کر سامنے صوفے پر بیٹھ کر خبریں سننے لگا۔ اس وقت رات بارہ بجے کا بلیٹن نشر ہو رہا تھا۔ اچانک میری براڈی کیس کے بارے میں خصوصی رپورٹ نشر ہونے لگی۔ اس نے ٹی وی کی آواز تھوڑی تیز کردی اور نیم دراز ہو کر رپورٹ دیکھنے لگا۔

''پولیس آرٹسٹ گارڈی نے عینی شاہدین کے بیانات کی مدد سے اُن چاروں حملہ آوروں کے تازہ ترین خاکے تیار کر لیے ہیں جنہوں نے ہوٹل پر بم پھینکے تھے۔ اس حملے کے نتیجے میں اسٹیٹ سیکریٹری میری براڈی جھلس کر ہلاک ہوگئی تھیں۔'' اس کے ساتھ ہی ٹی وی پر وہ چاروں خاکے دکھائے جانے لگے۔

''اوہ میرے خدا۔'' یہ دیکھتے ہی ٹونر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ وہ ان خاکوں کو دیکھ کر بُری طرح چونکا تھا۔ رہی سہی کسر نیوز ریڈر کے جملے نے پوری کردی تھی۔ ''عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ یہی وہ لوگ تھے جو حملے کی رات مشکوک انداز میں ہوٹل کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھے گئے تھے۔'' ٹی وی پر رپورٹ بدستور نشر ہو رہی تھی۔ ''ملزمان کے خاکے پولیس ڈپارٹمنٹ کی ویب سائٹ پر جاری کر دیے گئے ہیں۔ شہری اپنی سہولت کے پیشِ نظر ان خاکوں کو ڈاؤن لوڈ بھی کرسکتے ہیں۔''

کچھ دیر پہلے ٹونر نہایت بیزار نظر آرہا تھا مگر اب اس ٹی وی رپورٹ نے اس کے جسم میں بجلی بھر دی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھا اور لیپ ٹاپ کھولنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ پولیس ڈپارٹمنٹ کی ویب سائٹ پر موجود چار میں سے ایک خاکہ ڈاؤن لوڈ کر رہا تھا۔

تقریباً سال بھر پہلے دہشت گردی کی کارروائی میں میری براڈی ماری گئی تھی۔ میری براڈی حکومت کی ایک اہم عہدے دار تھی۔ یہ ہائی پروفائل کیس تھا مگر پولیس کو لاکھ کوشش کے باوجود کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔ پولیس اب تک مکمل طور پر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی تھی۔ پولیس کو مہینوں سے ایسے عینی شاہدین کی تلاش تھی جنہوں نے واقعے سے قبل ہوٹل کے اردگرد کسی بھی قسم کے مشکوک لوگوں کو دیکھا ہو۔ آخر طویل تلاش کے بعد انہیں کچھ ایسے لوگ مل گئے تھے۔ یہ خاکے آئرش پولیس کے ایک افسر اور شوقیہ مصور گارڈی نے تیار کیے تھے۔

اتفاق سے گارڈی، ٹونر اور نیڈی کا مشترکا دوست بھی تھا۔ میری براڈی کا قتل ڈبلن میں گفتگو کا اب تک سب سے سرگرم موضوع تھا۔ قاتل ابھی تک مفرور تھے۔ اس لیے ہر روز طرح طرح کی افواہیں بھی سننے کو ملتی تھیں مگر نیڈی اور ٹونر کے لیے وہی خبر سب سے مصدقہ ہوتی تھی جو گارڈی کے ذریعے ان تک پہنچتی تھی۔ چند روز پیشتر تک گارڈی ان سے یہی کہتا رہا تھا کہ پولیس اب تک ملزمان کا پتا چلانے میں کامیاب نہیں ہوئی ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ قاتلوں کے خاکے جاری کیے گئے تھے۔ ویب سائٹ پر خاکوں کی تیاری کا کریڈٹ گارڈی کو دیا گیا تھا۔

ٹونر شوقیہ طور پر فوٹو گرافی کرتا تھا۔ خاکے ڈاؤن لوڈ کر کے وہ ایک خاص تصویر اپنے ذخیرے میں تلاش کرنے لگا، آخر وہ اسے مل ہی گئی۔ اس کے لیپ ٹاپ پر کئی جدید سوفٹ ویئر موجود تھے۔ کچھ دیر تک وہ پولیس کے تیار کردہ خاکے اور اپنی تصویر میں فوٹو شاپ کے ذریعے مختلف قسم کے ردّوبدل کرتا رہا۔ آخر اسے مطلوبہ نتیجہ مل گیا۔ یہ دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہ صوفے پر گر گیا اور گہری سانسیں لے کر اپنے حواس درست کرتا رہا۔

''ہائے گارڈی...'' کچھ دیر بعد جب اس کے حواس

قابو میں آئے تو اس نے فون ملایا۔ ''کہاں ہو تم؟'' اس نے اگلی سانس میں پوچھا۔

''ارے بھئی خیریت ہے، تم اب تک سوئے نہیں؟'' گارڈی نے اس کی آواز پہچان لی تھی۔ اسے حیرت ہوئی کہ وہ اتنی رات میں اسے کیوں فون کر رہا ہے۔

''شاید خیریت نہیں ہے۔'' ٹونر نے ہیجانی لہجے میں جواب دیا۔ ''تم اس وقت کہاں ہو؟''

''اپنے فارم ہاؤس پر... مگر تم خیریت سے تو ہو نا؟'' گارڈی کو صاف اندازہ ہو گیا تھا کہ اس وقت وہ کچھ پریشان ہے۔

''ہاں، بات ہی کچھ ایسی ہے۔''

''تفصیل سے بتاؤ، کیا بات ہے؟''

''او کے... تو پھر سنو۔'' یہ کہہ کر ٹونر اگلے تین چار منٹ تک اسے اپنی پریشانی کے بارے میں بتاتا رہا۔ ''اب تم ہی کہو، ہے نا یہ تشویش کی بات؟''

''یہ صرف تشویش کی ہی بات نہیں ہے۔'' وہ خاموش ہوا تو گارڈی نے فوراً جواب دیا۔ ''میں سب کچھ جانتا ہوں کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ تم ایسا کرو کہ کیرے پہنچو اور جیسا میں کہتا ہوں، ویسا ہی کرو۔'' یہ کہہ کر گارڈی اسے سمجھانے لگا کہ کیا کرنا ہے۔ ''سمجھ گئے؟ جیسا میں نے کہا ہے ویسا کرو، باقی معاملہ میں دیکھ لوں گا۔'' گارڈی نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں ابھی روانہ ہوتا ہوں۔'' یہ کہہ کر ٹونر نے فون بند کر دیا۔

فون رکھنے کے بعد اس نے لباس تبدیل کیا اور ایک بیگ میں ضرورت کی دیگر چیزیں رکھنے لگا۔ دس منٹ بعد وہ پارکنگ میں کھڑی اپنی کار اسٹارٹ کر رہا تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ سردی میں اضافہ ہو چکا تھا مگر اب اسے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔

☆☆☆

صبح کے نو بج رہے تھے۔ ٹونر کیرے میں واقع ہل ٹاپ اِن ہوٹل کے باہر ایک پہاڑی کے کنارے کھڑا ہوا نیچے وادی کے ایک مکان کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ وقفے وقفے سے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی دوربین کو آنکھوں سے لگاتا اور مکان کا جائزہ لینا شروع کر دیتا۔ دن نکل چکا تھا مگر سورج اب تک آسمان پر چھائے بادلوں کے پیچھے روپوش تھا۔

وہ گزشتہ رات شدید بارش میں ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد کیرے پہنچا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ اس طوفانی بارش اور رات کی تاریکی میں آڑھے ٹیڑھے پہاڑی راستوں پر سفر کرتے ہوئے یہاں تک پہنچنے کا خطرہ مول نہیں لیتا مگر صورتِ حال کچھ ایسی تھی کہ وہ ہر خطرہ مول لینے کو تیار ہو گیا۔

گارڈی کا فارم ہاؤس بھی یہیں تھا لیکن اس نے طے شدہ منصوبے کے مطابق ہل ٹاپ اِن میں ہی رات گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ پہلے بھی کئی بار اس ہوٹل میں ٹھہر چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ جس مکان کے مکینوں کو دیکھنا چاہتا ہے، وہ یہاں سے صاف نظر آئیں گے۔ ہوا بھی ایسا ہی لیکن ابھی تک یہ تصدیق نہیں ہو پا رہی تھی کہ اُس کا خیال درست تھا یا نہیں۔ گارڈی نے بھی اسے نہایت محتاط رہنے کی ہدایت کی تھی۔ وہ گارڈی کے ذریعے پولیس کی مدد لے سکتا تھا مگر گارڈی نے اس خیال کو مسترد کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ پولیس کا ہاتھ اگر ذرا سا بھی غلط پڑ گیا تو پھر وہ کبھی بھی اس تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ اس لیے جو کچھ کرنا تھا، وہ ان دونوں کو ہی کرنا تھا۔ گارڈی اپنے گھر پر تھا اور بے چینی سے اس کے فون کا انتظار کر رہا تھا۔

صبح کے ساڑھے دس بج چکے تھے۔ اب تک اس کی تلاش لاحاصل تھی مگر پھر بھی وہ ثابت قدمی سے اپنے کام میں مصروف تھا۔ آخر خدا خدا کر کے سورج بادلوں کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔ سورج کی حدت سے موسم کی جما دینے والی سردی کچھ کم ہو گئی۔

ٹونر بدستور دوربین آنکھوں سے لگائے نگرانی میں مصروف تھا۔ اچانک اس کی سانسیں تیز ہونے لگیں۔ ایک عورت اور مرد گھر سے باہر نکلے اور لان میں رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ مرد کی پشت اس کی طرف تھی۔ وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ پا رہا تھا مگر وہ اس عورت کو پہچان گیا تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اس کا شک اور تلاش اب تک تو رائگاں نہیں گئی۔

''ہاں... وہی ہیں۔ اس وقت لان میں بیٹھے ہوئے ہیں۔'' ٹونر نے موبائل سے گارڈی کا نمبر ملایا۔ وہ اس کے فون کا ہی منتظر تھا۔

''ٹھیک ہے۔ تم بدستور نگرانی کرتے رہو۔'' گارڈی نے اس کی بات سننے کے بعد کہنا شروع کیا۔ ''میں نے پولیس کار منگوالی ہے۔ جب تک تم مجھے اس کو ہاتھ پیچھے باندھ کر کار میں بٹھاتے ہوئے نہ دیکھ لو، اپنی جگہ سے نہ ہلنا۔ البتہ میرے نکلتے ہی تم وہاں پہنچ جانا۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے میں اپنی ملازمہ کو پیچھے چھوڑ جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ وہ بھی اب بہت جلدی میں تھا۔

ٹونر بدستور گھر کی نگرانی میں مصروف تھا۔ گھر کے لان میں بیٹھا جوڑا نہایت سکون سے دھوپ تاپ رہا تھا۔ گارڈی کو فون کیے ہوئے دس منٹ گزر چکے تھے۔ اچانک اس نے پولیس کی دو گاڑیاں اس گھر کے سامنے رکتے ہوئے دیکھیں۔ اگلے ہی لمحے وہ جوڑا ان کے گھیرے میں تھا۔ پولیس والے انہیں اپنے گھیرے میں لیے ہوئے گھر کے اندر لے گئے۔

دو پولیس والے مستعدی سے باہر کھڑے تھے۔ جوڑے کو اندر لے جانے والے پولیس والوں کے ساتھ گارڈی بھی نظر آرہا تھا۔ ان کے اندر چلے جانے کے بعد ایک عورت آئی اور لان میں رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''شاید یہی وہ ملازمہ ہے۔'' ٹونر نے دوربین کو عورت پر فوکس کرتے ہوئے زیرِ لب کہا۔

تقریباً پندرہ منٹ کے بعد پولیس والے اپنے گھیرے میں ایک شخص کو لیے ہوئے باہر نکلے۔ اس کے ہاتھ پشت کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ سب سے آخر میں گارڈی باہر نکلا۔ وہ عورت بھی اس کے ساتھ ہی باہر آئی تھی۔ وہ کچھ دیر تک کھڑا اس سے باتیں کرتا رہا۔ اسی دوران میں پولیس والے مرد کو کار میں بٹھا کر روانہ ہونے لگے۔ انہوں نے جلدی سے عورت کو اندر کی طرف دھکیلا۔ لان میں بیٹھی عورت بھی اُس کے پیچھے پیچھے اندر چلی گئی۔ اگلے ہی لمحے گارڈی بھی اپنی کار میں بیٹھ کر اس طرف جا رہا تھا جہاں پولیس کی گاڑیاں روانہ ہوئی تھیں۔

''لگتا ہے کام ہو گیا۔'' یہ کہتے ہوئے ٹونر نے گارڈی کا نمبر ملایا۔ ''ہیلو۔''

''مبارک ہو، یہ وہی تھا۔'' گارڈی نے فون اٹھاتے ہی کہا۔ ''سنو... میں ملازمہ کو گھر پر چھوڑ کر آیا ہوں، تم اس کے پاس پہنچو۔ میں پولیس اسٹیشن جا رہا ہوں۔ جب تک میں فون نہ کروں، وہیں رہنا۔''

''ٹھیک ہے۔'' یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد ٹونر کی کار اُس گھر میں داخل ہو رہی تھی جس کی وہ آج صبح سے نگرانی کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایلس اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر شدید پریشانی کے آثار تھے۔ اس نے ٹونر کو دیکھ کر یہ بھی نہ پوچھا کہ وہ ڈبلن سے کیرے اور اس واقعے کے فوراً بعد اُس جگہ تک کیسے پہنچا جس کا شاید اسے پتا بھی نہیں معلوم تھا۔ بظاہر وہ خاصی بدحواس لگ رہی تھی۔ ٹونر اس کی ہمت بندھانے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ بالکل خاموش تھا۔ ٹونر کو دیکھ کر ملازمہ کافی بنانے کا کہہ کر کچن میں چلی گئی۔

''مجھے معلوم نہیں کہ یہ سب کیوں اور کیسے ہوا؟'' ملازمہ

کے جانے کے بعد وہ اس کے کندھے سے سر ٹکا کر رونے لگی اور پھر ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔

''تم بے قصور ہو، تمہارا کوئی قصور نہیں۔'' ٹونز اس کے سنہری بالوں کی لٹوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اسے تسلیاں دے رہا تھا۔ ''میرا خیال ہے کہ پولیس تمہیں اس معاملے میں بے قصور سمجھتی ہے۔ تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر وہ تمہیں بھی قصوروار سمجھتے تو اس کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی لے جاتے۔'' وہ کچھ کہنے کے بجائے خاموشی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کی پلکیں بدستور نم تھیں۔

ایلس کیرے میں بالکل تنہا تھی۔ دکھ کی اس گھڑی میں اسے ٹونز کی شکل میں ایک ہمدرد آشنا مل گیا تھا۔ اس سے آگے اُس کے بارے میں کچھ سوچنا ہی اس کے لیے محال تھا۔ اس وقت تو بس اسے امریکی پروفیسر کا خیال اپنی گرفت میں لیے ہوا تھا۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ کیا کچھ ہو چکا ہے۔ البتہ اب تک اس کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ ٹونز یہاں کیسے پہنچا اور نہ ہی اس نے خود کچھ بتانے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ ان باتوں کے لیے ابھی کافی وقت پڑا ہے۔

کافی پینے کے بعد ایلس کی طبیعت کچھ سنبھل گئی۔ ویسے بھی ٹونز کی موجودگی کے باعث وہ بہت جلد صدمے سے باہر نکل آئی تھی۔ کم از کم اس وقت اسے اپنے اکیلے پن کا خوف نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ایک نہایت ہمدرد اور غم گسار دوست اس کے ساتھ موجود ہے۔

ٹونز نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ دن کے سوا بارہ بج رہے تھے۔ پروفیسر کو پولیس تحویل میں لیے ہوئے لگ بھگ ایک گھنٹے سے زائد وقت گزر چکا تھا مگر اب تک گارڈی کا فون نہیں آیا تھا۔

''ہیلو۔'' جیسے ہی گھنٹی بجی، ٹونز نے لپک کر موبائل اٹھایا اور نمبر دیکھا۔ گارڈی کا فون تھا۔ ''ہیلو... کیا ہوا؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''تم ایلس کو لے کر پولیس اسٹیشن پہنچ جاؤ۔'' گارڈی نے چھوٹتے ہی کہا۔ ''ہاں، اسے کہنا کہ اپنا سامان پیک کر لے۔ یہیں سے تم ڈبلن روانہ ہو جانا۔''

''میں پہنچ رہا ہوں۔'' ٹونز نے جواب دیا۔ پانچ منٹ بعد وہ دونوں کار میں بیٹھ چکے تھے۔

☆☆☆

''یہ تو دہشت گرد اور اسمگلر ہونے کے ساتھ ساتھ قاتل اور بہروپیا بھی نکلا۔'' گارڈی نے پولیس اسٹیشن انچارج کے کمرے میں بیٹھے ہوئے ایلس اور ٹونز کو امریکی پروفیسر کی اصلیت بتاتے ہوئے کہا۔ گارڈی کی بات سن کر ایلس ایک لمحے کے لیے چونک اٹھی۔ اس کے چہرے پر افسوس کی لہر ایک پرچھائیں کی طرح آ کر چلی گئی مگر اگلے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا۔

''ساری کہانی صاف ہو گئی ہے۔ یہی اصل مجرم ہے۔'' یہ کہتے ہوئے گارڈی نے اسے سارا قصہ سنانا شروع کر دیا۔

امریکی پروفیسر کی حیثیت سے خود کو ایلس سے متعارف کروانے والے مائیکل نیگنٹ کا اصل نام جان استھ تھا اور وہ شکاگو کا رہنے والا تھا۔ برسوں پہلے وہ ہائی اسکول کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر فلموں میں کام کرنے کے لیے ہالی وڈ بھاگ گیا تھا مگر کئی برس کی جدوجہد کے باوجود اسے فلموں میں تو کام نہیں ملا البتہ وہ انڈر ورلڈ سے متعارف ہو گیا اور منشیات کی اسمگلنگ کے دھندے میں پڑ گیا۔ جب اس کی تنظیم نے آئرلینڈ میں کوکین اور حشیش کی اسمگلنگ شروع کی تو یہاں مال پہنچانے اور مقامی کارندوں کے انتظام کی ذمے داری اسے سونپی گئی۔ اس نے لینس ڈاؤن اسٹیڈیم کے آوارہ گرد لڑکوں کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ بہت جلد یہ بات حکومتی حلقوں میں گردش کرنے لگی کہ آئرلینڈ میں منشیات استعمال کرنے والے نوجوانوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔

میری براڈی حکومت کے انسدادِ منشیات محکمے کی سیکریٹری تھی۔ اس نے تحقیق کے بعد ایک رپورٹ بنائی تھی جس میں منشیات کی اسمگلنگ کے ضمن میں نہ صرف ایک امریکی باشندے کے ملوث ہونے کی واضح نشاندہی کی گئی تھی بلکہ یہ سفارش بھی کی گئی تھی کہ حکومتی سطح پر ایک پروگرام تیار کر کے لینس ڈاؤن اسٹیڈیم سمیت ملک کے ہر علاقے میں آوارہ نوجوان لڑکے لڑکیوں کی بحالی کے لیے پروگرام شروع کیا جائے۔ اس رپورٹ کی روشنی میں آئرلینڈ کی خفیہ پولیس نے اس امریکی کی گرفتاری کے لیے چھاپے مارنا شروع کر دیے تھے۔

مافیا کے ذرائع سے اس ساری کارروائی کی اطلاع اسے بھی مل چکی تھی جس پر جان استھ نے حلیہ بدل لیا۔ اس نے آنکھوں پر کاسمیٹک کنٹیکٹ لینس لگائے۔ چہرے پر داڑھی بڑھالی اور نظر کے نام پر سادہ سفید شیشوں والا چشمہ لگا لیا۔ معاشرے میں مزید باوقار نظر آنے کے لیے اسے ایک ایسی لڑکی کی ضرورت تھی جو ادبی ذوق کی حامل ہو۔ اتفاقی ملاقات کے ذریعے اسے وہ لڑکی ایلس کی شکل میں مل گئی۔

استھ نے ڈبلن میں طویل عرصے تک اپنی موجودگی کا جواز تحقیقی مطالعے کے نام پر پیدا کر لیا تھا اور ایلس کے دوستوں کے ذریعے شہر کے متعدد حلقوں میں پروفیسر کے ذریعے شناخت بھی بنالی تھی۔ جس رات ٹی وی پر خاکے نشر ہوئے، ٹونز کو اس پر شک ہو گیا اور جب اس نے ایلس کے اُس امریکی پروفیسر کی تصویر میں فوٹو شاپ کے ذریعے تبدیلیاں کرنا شروع کیں تو پہچان گیا کہ یہ وہی مجرم ہے جس پر میری براڈی کے قتل کا الزام ہے۔

استھ نے پولیس کے سامنے اعتراف کر لیا تھا کہ میری براڈی کے قتل میں شامل تینوں آئرش لڑکوں کو اُس نے ثبوت مٹانے کے لیے قتل کر کے ویرانے میں دفن کر دیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ان لڑکوں کے مارے جانے کے بعد وہ کبھی بھی اس بم حملہ کیس میں نہیں پکڑا جا سکے گا مگر ٹونز کی وجہ سے وہ پکڑا گیا۔

جس گھر سے وہ پکڑا گیا تھا، وہ اس نے کچھ عرصہ قبل ہی لیز تھا مگر فرضی نام سے۔ وہ ایلس کو یہ کہہ کر یہاں لایا تھا کہ اسے کیرے دیکھنے کا شوق ہے۔ اس لیے اس نے کچھ عرصے کے لیے پراپرٹی ایجنٹ کے ذریعے کرائے پر گھر لے لیا تاکہ ہوٹل کے بجائے گھر کے آرام دہ ماحول میں سکون سے اپنا تحقیقی کام کر سکے۔

استھ آوارہ لڑکوں کی مدد سے کارروائی کرواتا تھا۔ اس نے میری براڈی پر حملہ بھی اس انداز میں کروایا تھا کہ پولیس کی توجہ آئرش ری پبلکن آرمی کی طرف ہو جائے مگر دوسری طرف وہ بھی حیران تھے کہ ان کی تنظیم سے کوئی دھڑا الگ ہوا ہی نہیں تو وہ کس طرح ان کے انداز میں کارروائی کر سکتے ہیں۔ پولیس نے یہ بات ذرائع ابلاغ کو نہیں بتائی البتہ تنظیم کے اس بیان اور میری براڈی کی تیار کردہ رپورٹ کی روشنی میں انہوں نے تفتیش جاری رکھی۔ چند ہفتوں پہلے چند ایسے لوگوں نے خفیہ پولیس سے رابطہ قائم کر کے بتایا کہ وہ لومڑیوں کے شکاری ہیں۔ واردات والی رات وہ شکار پر جا رہے تھے کہ اچانک ان کی گاڑی ہوٹل کے قریب بند ہو گئی تھی۔ جب وہ گاڑی ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہے تھے، تب انہوں نے دیکھا کہ چار افراد اپنی کار اندھیرے میں کھڑی کر کے ان کے قریب سے گزر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے رک کر ان سے لائٹر مانگ کر اپنی سگریٹ سلگائی تھی، اس لیے وہ ان چاروں کو اچھی طرح دیکھ پائے تھے۔ یہ لوگ ہوٹل کی طرف بڑھ رہے تھے مگر جس انداز سے وہ ہوٹل کی طرف بڑھ رہے تھے، وہ بہت ہی مشکوک تھا۔ انہی افراد کی مدد سے گارڈی نے ان چاروں کے خاکے بنائے تھے۔

''یہ تو خاصا کمزور نکلا۔'' گارڈی نے پورا قصہ سنانے کے بعد کہا۔ ''اتنی جلد اعتراف کر لیا کہ ہمیں یقین ہی نہیں آیا۔ اس کی نشاندہی پر اُس جگہ کھدائی کر کے باقی تین لڑکوں کی لاشوں کی باقیات نکالی جا رہی ہیں جہاں اس نے انہیں قتل کے بعد دفن کیا تھا۔''

''مجھے تو اب تک یقین نہیں آ رہا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا ہے۔'' جب گارڈی نے پورا قصہ بیان کر دیا تو ایلس نے نہایت اداس نگاہوں سے ٹونز کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اتنا ظالم اور گھناؤنا شخص نکلے گا۔''

''خیر... جو ہونا تھا وہ ہو چکا مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ پولیس نے تمہیں اس سارے معاملے میں بے قصور قرار دیا ہے۔'' گارڈی نے ایلس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''شکر ہے خدا کا۔'' یہ سن کر اس نے بے اختیار کہا اور ٹونز کا بازو تھامتے ہوئے بولی۔ ''ٹونز! تم واقعی میرے سچے دوست ہو۔ سچ پوچھو تو تم نے میرے دل کی گہرائیوں میں گھر کر لیا ہے۔''

''واقعی؟'' اس نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم یہ کہو گی۔''

''مگر میں سچے دل سے کہہ رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے گارڈی کی طرف دیکھا۔ ''کیا ہم جا سکتے ہیں؟''

''بالکل...'' گارڈی نے کہا تو وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

اس واقعے کا تذکرہ مہینوں تک ڈبلن کے اخبارات اور ٹی وی پر ہوتا رہا تاہم ٹونز کی درخواست پر گارڈی نے اس پورے قضیے میں کہیں پر بھی اس کا یا ایلس کا نام نہیں آنے دیا۔

ٹونز اور ایلس اب بھی اکثر مقدس گھنٹے کے تہوار کے وقت ویلس ریستوران میں لنچ کرتے ہیں مگر اب انہیں صرف سڑک پار کر کے ریستوران میں آنا ہوتا ہے۔ ڈبلن واپسی کے تیسرے روز ان دونوں نے شادی کر لی تھی۔ حیرت انگیز طور پر شادی کی درخواست ایلس نے یہ کہتے ہوئے کی تھی۔ ''میری تلاش ختم ہوئی۔ تم میری زندگی کے آخری مرد بنو گے؟''

''دیکھا... میں ہمیشہ یہی سوچتا تھا کہ میں تمہاری زندگی کا آخری مرد ہوں۔ میری بات سچ ثابت ہوئی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے اس کی درخواست قبول کر لی۔

چوبیسویں قسط

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبار
خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے۔
خودداری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار
کے طواف میں محو رہتا ہے... مگر آج عشق کی اقدار
میں تبدیلی ... وقت کی ضرورت اور حالات کا
تقاضا ہے... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے...
کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے... سر پھرے عاشق نے اب
ایسے شخص کا روپ دھار ا ہے جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے
کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی
پیشِ نظر رکھتا ہے... ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستان
محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے... عشق میں اس کی
زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے... جبکہ دوسرے
عاشق کا مطمح نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت
نے اس کے قلب و نظر... عقل و شعور اور جذبِ عشق
میں کشادگی کو بھر دیا ہے... کائنات کا ہر
مسئلہ اس کے پیشِ نظر... ایک للکار ہے

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل..... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ایک شرمیلا اور کم گو نوجوان تھا۔ ثروت میری محبت اور منگیتر تھی۔ ہم اپنی شادی کا انتظار گھڑیاں گن گن کر کر رہے تھے لیکن پھر ایک طوفان آیا۔ سیٹھ سراج کے اوباش بیٹے واجد عرف واجی نے ایک چھوٹی سی بات سے مشتعل ہو کر ثروت کو اغوا کرلیا۔ ثروت کے ماتھے پر ایک ایسا داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے والدین کی جان لی بلکہ اسے اور اس کے گھر والوں کو خاموشی سے ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کردیا۔ پھر میری ملاقات ایک خوش باش ہمہ صفت شخص عمران دانش سے ہوئی۔ میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا... جلد ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ سیٹھ سراج لال کوٹھیوں میں رہنے والی ایک دبنگ عورت میڈم صفورا کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ لوگ ٹیکسلا، ہڑپہ وغیرہ سے نوادرات حاصل کرتے تھے۔ میڈم صفورا کی چھوٹی بہن نادیہ عمران پر بری طرح فریفتہ ہوگئی۔ عمران کے ہاتھوں نادیہ کی موت کے بعد میڈم کے ہرکارے ہمارے پیچھے لگ گئے۔ اس خوفناک تعاقب کے نتیجے میں عمران کے سینے پر رائفل کا پورا برسٹ لگا اور وہ ایک ڈیک نالے کے تاریک پانیوں میں اوجھل ہوگیا۔ سفاک سیٹھ سراج اور شیرے نے میری والدہ کو مجبور کردیا کہ وہ موت کو گلے لگالیں۔ ماں کی اندوہناک موت نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ یہاں مجھے ایک راجپوت لڑکی سلطانہ ملی۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ میری بیوی ہے اور ہمارا ایک بچہ بھی ہے۔ پھر مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں اتر پردیش کی ایک دور دراز ریاست میں ہوں اور دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں جس جگہ موجود تھا اسے بھانڈیل اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں دو بڑی آبادیاں ہیں زرگاں اور تل پانی۔ بعدازاں مجھے زرگاں میں پگوڈا پہنچایا گیا جبکہ سلطانہ کو بھی الگ کردیا گیا۔ یہاں میری میڈم صفورا سے ملاقات ہوئی۔ پھر مجھے پگوڈا سے نکال کر جارج کی رہائش گاہ پہنچا دیا گیا۔ پھر میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور بھاگتے بھاگتے ایک غار میں پہنچ گیا اور اپنے ساتھیوں سے مل گیا۔ ہم نے جارج کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کرلیا۔ ہم ماریا کو لے کر وہاں سے نکلے۔ ہمیں ایک عجیب الخلقت آدمی ملا جس کا ایک ہاتھ اور ٹانگ کٹی ہوئی تھی اور وہ نشے میں تھا۔ ہم اسے بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ بعدازاں ہمیں پتا چلا کہ وہ جوڈو کراٹے کا نامور چیمپئن ہے۔ ہم واپس غار میں پہنچ گئے۔ ہمارے ایک ساتھی کی غداری کی وجہ سے ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ میں ساتھیوں سے الگ ہوگیا اور بارونداجیکی تک جا پہنچا۔ مجھے اور جیکی کو تل پانی چھوٹے سرکار کے دیوان میں پہنچا دیا گیا۔ سلطانہ ایک دن خاموشی سے دیوان سے نکل گئی۔ سلطانہ کی تلاش کے دوران ہم شکنتلا تک پہنچ گئے۔ شکنتلا کو دیوان لے آیا گیا۔ جیکی کی حالت خراب تھی۔ جیکی نے دم توڑ دیا۔ ادھر زرگاں میں تین بندے قتل ہونے پر سلطانہ کو پکڑ لیا گیا۔ میں ایک ہندو فیملی کے گھر پہنچ گیا۔ رام پرشاد کے بیٹے ستیش کا تعلق انتہا پسند ہندو تنظیم سے تھا۔ پھر ایک روز ستیش نے بتایا کہ سلطانہ کو سزا دینے کا وقت آن پہنچا ہے۔ ستیش کے مطابق سلطانہ کو زندہ جلایا جانا تھا اور اس کی چتا کو میں آگ دیتا۔ وہاں عمران کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اس نے کہا کہ ہم سلطانہ کو وہاں سے نکال لیں گے۔ عمران اکیلا نہیں تھا بلکہ اقبال بھی اس کے ساتھ تھا۔ ہم وہاں سے فرار ہوئے اور ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچے۔ وہاں ہم نے تاوا افضل نامی شخص کے مکان میں قیام کیا۔ پھر ہم ایک مندر میں آگئے۔ میرا آپریشن ہوگیا اور میری گردن سے وہ منحوس چپ نکال دی گئی۔ میں اور عمران میڈم صفورا کے

پاس پہنچ گئے۔ میڈم کا رویہ فی الحال ہمارے ساتھ ٹھیک ہوگیا۔ پھر میں نے جارج گورا کو سامبر کا چیلنج کر ڈالا۔ سامبر کی تاریخ دے دی گئی۔ میں نے ایک روز عمران کو اپنی کہانی سنانے کو کہا۔ عمران شمالی پنجاب کے ایک گاؤں میں اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ گاؤں کا چودھری عمران عرف عمو کو دور دراز گاؤں کے ایک مزار پر ایک سال خدمت کرنے کے لیے بھیج دیتا ہے۔ ایک روز وہاں کچھ مہمان آئے۔ ان میں ایک عورت ماجھاں تھی۔ اس نے عمو کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ ماجھاں نامی عورت ایک ڈاکو کی بہن تھی۔ وہ عمو سے تعلق قائم کرنا چاہتی تھی تاہم عمو کو اس سے گھن محسوس ہوئی۔ عمو کو وہاں کی ایک ملازمہ شبانہ سے محبت ہوگئی۔ ایک روز موقع پا کر عمو اور شبانہ نے فرار کی کوشش کی مگر وہ پکڑے گئے۔ ماجھاں نے عمو اور شبانہ پر تشدد کیا۔ اب عمو کے پاؤں میں زنگ آلود بیڑی ڈلی رہتی تھی۔ ماجھاں کے راجا نامی مہمان سے عمو کی دوستی ہوگئی۔ پھر راجا نے عمو اور شبانہ کو وہاں سے نکالنے کا پروگرام بنایا اور وہ لوگ بھاگ نکلے۔ راستے میں ماجھاں سے ٹکراؤ ہوگیا مگر اس ٹکراؤ میں ماجھاں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ ماجھاں کی موت کے بعد وہ لوگ شاد پورہ میں روپوش ہوگئے اور کبیر احمد کے گھر رہنے لگے۔ عمو کی والدہ اچانک اپنے گاؤں سے غائب ہوگئی تھی۔ عمو اپنی ماں کو ڈھونڈنا چاہتا تھا۔ عمو کچھ اختلافات کی بنا پر راجا کو چھوڑ کر سرکس کے مالک جان محمد کے پاس آگیا اور ان کی حویلی میں ٹھہر گیا۔ ادھر شبانہ کے گھر والوں کا پتا ٹھکانا معلوم کر کے شبانہ کو اس کے گھر بھیج دیا گیا اور عمران کا رشتہ شبانہ سے طے ہوگیا مگر توہم پرستی کا شکار لوگوں نے عمو اور شبانہ کو جدا ہونے پر مجبور کر دیا۔ شبانہ کی شادی کسی اور سے ہو گئی اور ایک روز گھریلو جھگڑے میں شبانہ یہ دنیا چھوڑ کر چلی گئی ۔ عمو خود کا خاتمہ کرنے کا سوچنے لگا اور یوں وہ خطرات سے کھیلنے لگا۔ عمو نے دکھی لوگوں کی مدد کو اپنا مقصد بنا لیا۔ عمران کی کہانی نے مجھے افسردہ کر دیا۔ پھر جشن کے دن ہمیں راج بھون لے جایا گیا۔ پریوں کے چناؤ کے بعد عمران نے وہاں بونگوں پر کھڑا ہونے کا کرتب دکھایا اور مقابلہ جیت لیا۔ رتنا دیوی عمران سے متاثر ہوئی اور انعام میں ایک جرمن جیپ دی۔ پھر سامبر مقابلے والا دن آگیا۔ میں اور جارج مدمقابل تھے۔ میں نے جارج کو جہنم واصل کر دیا۔ زخمی ہونے کے باعث مجھے زرگاں کے سرکاری اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ عمران نے راہزنی کی واردات کا ڈراما کر کے انعام میں ملنے والی جیپ غائب کر دی پھر ہمیں حمیدہ سمیت زرگاں سے نکلنے کا راستہ دیا گیا۔ مگر یہ سب دھوکا تھا، ایک محدود فاصلے پر پہنچنے کے بعد حکم کے سپاہی ہمارے پیچھے آنے لگے۔ تاہم اس موقع پر عمران کی چھپائی ہوئی جیپ ہمارے کام آئی اور ہم اپنے تعاقب میں آنے والوں کو جل دینے میں کامیاب ہوگئے اور بخیریت مندر کے تہ خانے میں پہنچ گئے۔ وہاں سب نے ہمارا استقبال کیا۔ پھر وہاں رہتے ہوئے میں نے سلطانہ کو آفتاب سے چوری چھپے ملتے دیکھا۔ میں نے سلطانہ اور آفتاب کا پیچھا کیا۔ سلطانہ ایک مندر میں چلی گئی۔ ہم نے آفتاب سے پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ بھاگ نکلا۔ اچانک مندر کے باہر گولی چلنے کی آواز گونجی۔ میں نے لپک کر کسی کو گھوڑا گاڑی میں گھستے دیکھا۔ ایک ٹریکٹر ٹرالی اور کچھ لوگ گھوڑا گاڑی کے پیچھے لپکے۔ ہم بھی اس پر سوار ہوگئے۔ اچانک ایک بستی آنے پر ٹریکٹر ٹرالی ایک احاطے میں رک گئی۔ یہ گاؤں کا شفا خانہ تھا۔ یہ سلطانہ اور آفتاب تھے۔ انہوں نے وہاں موجود مریضوں اور اسٹاف کو یرغمال بنا لیا اور اپنی باتیں منوانے کے لیے آفتاب نے ایک ایک کر کے یرغمالیوں کو مارنا شروع کر دیا۔ حکم کے سپاہیوں نے اسپتال کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ آفتاب، ہاشم رازی کو رہا کروانا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر لی وان بھی یرغمالیوں میں شامل تھا اور آفتاب کے بات نہ ماننے کی وجہ یہ تھی کہ اس جگہ ماریا موجود تھی جو اب آفتاب کے قبضے میں تھی۔ ماریا کی وجہ سے وہاں کافی ہلچل مچ گئی تھی۔ رنجیت پانڈے نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسپتال میں گھسنے کی کوشش کی مگر عمران کے بروقت مطلع کرنے کی وجہ سے آفتاب نے انہیں مار بھگایا۔ ہاشم رازی کو بحفاظت اسپتال پہنچا دیا گیا۔ ہمیں کھیت میں بھرت نامی نوجوان ملا جو ہمیں اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ پھر عمران نے بھرت کے ہاتھ انگریز افسر کو ملاقات کا پیغام بھیجا اور ہماری اس سے ملاقات ہوئی۔ عمران نے اسے اپنی باتوں سے قائل کر لیا کہ وہ سلطانہ کے بدلے ماریا کو وہاں سے بحفاظت نکال سکتا ہے۔ انگریز افسر راضی ہوگیا اور ہمیں خاموشی سے اسپتال کے قریب ایک گھر میں پہنچا دیا گیا۔ ہمیں رائفلیں اور ایمونیشن بھی دیا گیا۔ اچانک ہاشم ایک لڑکے کو پکڑ کر لے آیا۔ وہ لی وان کا پوتا تھا۔ وہ اسے مارنے والا تھا۔ یہ لمحے فیصلہ کن تھے۔ عمران نے ہاشم پر گولی چلا دی۔ ہاشم مارا گیا تاہم عمران آفتاب سے بات کر کے اس سے مذاکرات کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ آفتاب کو باہر نکلنے کا راستہ دیا گیا۔ اس کے ساتھ ماریا سمیت دیگر یرغمالی بھی تھے۔ سلطانہ بھی چھوٹی نال والی رائفل کے ساتھ موجود تھی۔ اچانک کہیں سے فائر ہوا۔ آفتاب کو گولی لگی۔ آفتاب نے بھی فائر کھول دیا اور ماریا ماری گئی۔ درجنوں مسلح کمانڈوز نے بھی گولیوں کی برسات کر دی۔ آفتاب بھی مارا گیا۔ ہم سلطانہ کو بچانا چاہتے تھے مگر انگریز افسر نے دھوکے سے سلطانہ کو باہر بلا کر اسے بھی مار ڈالا۔ ہمیں زرگاں کی جیل میں پہنچا دیا گیا۔ زرگاں کے حالات ٹھیک نہیں تھے۔ یہاں بغاوت ہوگئی تھی اور زوروں کی لڑائی ہو رہی تھی۔ پھر انور خاں بھی زخمی حالت میں پکڑا گیا۔ اس کی حالت خراب تھی۔ بھرت بھی جھوٹے الزام میں گرفتار ہوگیا تھا۔ پھر ہم سب کو ایک دن جیل سے نکالا گیا۔ ہمیں قاسمیہ چوک پر لے جایا گیا۔ ہمیں سولی چڑھایا جانا تھا مگر عمران نے مجھے بتایا کہ یہاں کچھ انوکھا ہونے والا ہے۔ پھر اچانک طلال فائرنگ کرتا ہوا آگے بڑھا۔ ہم بھی حرکت میں آگئے۔ ضیارڈ اور اسٹیل مارے گئے۔ ہم وہاں سے نکل کر پرانے قلعے میں آگئے۔ یہاں کے لوگوں نے مورچے بنا لیے تھے مگر حکم کی فوج کو زیادہ دیر نہیں روکا جا سکتا تھا۔ ستیش اور مالا بھی قلعے میں پہنچ گئے۔ پھر وہاں گیتا مکھی بھی آگئی۔ وہ عمران کو کوئی خاص جانکاری دینا چاہتی تھی مگر عمران کے پوچھنے پر اس نے اس کام کی قیمت مانگی اور خمار آلود نظروں سے دیکھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

وہ سراپا دعوت عمران کے سامنے کھڑی تھی۔ ایک ہاتھ دے... ایک ہاتھ لے کی عملی تفسیر نظر آتی تھی۔ وہ عمران کو "ہونے والی لڑائی" کے حوالے سے کوئی خاص الخاص بات بتانا چاہتی تھی۔ لیکن اپنی اس "انفارمیشن" کے بدلے وہ عمران کی قربت کی خواہش رکھتی تھی... عمران جیسے ایک دوراہے پر کھڑا تھا۔

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "گیتا! ہم اس وقت جنگ کی حالت میں ہیں۔ ایک ایک منٹ قیمتی ہے۔ یہ ساری

باتیں اور شرطیں پھر کسی اور وقت کے لیے رکھ چھوڑو۔ یہ نہ ہو کہ تم مجھے معلومات بھی دے دو اور وہ کسی کام کی بھی نہ رہیں۔"

یوں محسوس ہوا کہ عمران کی بات کسی حد تک گیتا کے دل کو لگی ہے۔ اس نے ذرا ٹھٹک کر عمران کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں ابھریں۔ بہرحال، وہ اتنی جلدی مکمل ہار ماننے والی عورت نہیں تھی۔ اس نے بل کھا کر عمران کی گردن میں بازو ڈالے۔ اس کے کنگنوں کی چھنکار کمرے میں گونجی۔ میں نے الماری کی اوٹ سے دیکھا۔ وہ عمران سے جڑی کھڑی تھی، بڑی ادا سے بولی۔ "محبت اور جنگ دونوں بڑی خاص چیزیں ہیں عمران! ہم ایک کے لیے دوسری کو قربان تو ناہیں کر سکتے۔"

"لیکن گیتا! جو کچھ تم چاہ رہی ہو، اس کے لیے ذہنی سکون اور اندر کی خوشی درکار ہے۔ ہم اس وقت بڑی آزمائش کی گھڑیوں سے گزر رہے ہیں۔ اس آزمائش کو اور زیادہ سخت مت کرو۔"

"میں نے کیا کہا ہے، بس تم سے تھوڑا سا سمے ہی تو مانگا ہے۔" وہ نشیلے لہجے میں بولی۔

"یہ سمے ہی تو قیمتی ہے گیتا۔ میں رات تمہارے پہلو میں گزار دوں گا تو بہت سے کام بگڑ جائیں گے۔"

اس نے ایک طویل آہ بھری... اور اپنے موقف پر ذرا ڈھیلی نظر آنے لگی۔ اس کے بالوں میں انگلیاں چلا کر بولی۔ "چلو کچھ دیر ہی سہی... لیکن اس کے ساتھ ساتھ کوئی وچن بھی تو دو۔"

"کیا وچن؟"

وہ مسکرائی۔ "یہی کہ جب تمہاری یہ آزمائش ختم ہو جاوے گی تو اپنے ہزار برس کے جیون میں سے ایک رات اپنی اس دیوانی کے نام کرو گے۔"

"ٹھٹھ... ٹھیک ہے۔ وچن دیتا ہوں۔"

وہ عمران سے چمٹ گئی۔ اس نے اس کی گردن، چہرے اور ہونٹوں پر گرم بوسوں کی بارش کر دی۔ عمران نے بھی تھوڑی بہت جوابی کارروائی کی۔ وہ عمران کو دھکیلتی ہوئی بستر پر جا گری۔ اس کے لمبے ریشمی بال منتشر ہوگئے۔ عمران بڑے تحمل اور دانش مندی سے اسے اس کی حدود کے اندر رکھنے میں کامیاب رہا۔

دس پندرہ منٹ بعد گیتا کے جذبات کا چڑھا ہوا دریا کسی حد تک اتر گیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور دونوں کہنیاں گاؤ تکیے پر ٹکا کر ٹیک لگا لی۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ وہ ہرگز نہیں جانتی تھی کہ اس خلوت گاہ میں ایک اور شخص بھی موجود ہے اور آبنوسی الماری کے عقب سے یہ سارے مناظر دیکھ رہا ہے۔ عمران کی سوالیہ نظریں گیتا مکھی پر تھیں۔ دور کہیں قاسمیہ کی کسی گلی میں فائرنگ ہو رہی تھی اور یہ گونجتی ہوئی آواز دور دور تک پھیل رہی تھی۔

گیتا مکھی نے محتاط نظروں سے اردگرد دیکھا اور دھیمی آواز میں بولی۔ "اس بڑی بی کی چوتھی پشت اس راجواڑے کے ایک راجا، راہول جگجیت رائے سے ملتی ہے۔ جگجیت رائے کے زمانے میں راجواڑے کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کافی لڑائیاں ہوئی تھیں۔ اس وقت بھی قاسمیہ کے مسلمان اس قلعے کی دیوار گرانے اور اندر گھسنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ کہا جاوت ہے کہ اس لڑائی میں دونوں طرف کے کم از کم چار ہزار لوگن مارے گئے تھے۔ اس لڑائی کے بعد راجا جگجیت رائے نے ایسا انتظام کیا تھا کہ اگر پھر کبھی اسی طرح کی صورتِ حال بن جاوے اور مسلمان قلعے کے اندر بند ہو جاویں تو ان کو باہر نکالنے میں آسانی ہووے۔ کچھ لوگن کا خیال ہے کہ راجا نے اس وقت کوئی ایسا زمین دوز راستہ بنایا تھا جس کو استعمال کر کے قلعے کے اندر داخل ہوا جا سکے۔ لیکن یہ بات سچ ناہیں ہے۔ قلعے کے اندر گھسنے کا کوئی خفیہ راستہ ناہیں ہے۔"

اپنی بات ختم کر کے گیتا داد طلب نظروں سے عمران کو دیکھنے لگی۔

عمران نے اپنی کھوپڑی سہلاتے ہوئے بُرا سا منہ بنایا اور بولا۔ "لیکن تمہاری اس اہم جانکاری سے ہمیں کیا فائدہ پہنچے گا؟"

گیتا نے جھٹ سے عمران کے گال کا بوسہ لیا اور بولی۔ "ابھی میری بات مکمل ناہیں ہوئی۔ لیکن جتنی بات میں نے تم کو بتائی ہے، اس کی تعریف تو کرو۔"

"چلو ٹھیک ہے... تعریف کرتا ہوں۔"

"ناہیں، منہ زبانی تعریف مجھے ناہیں چاہیے۔" وہ اس کے گلے لگ کر بولی۔

چار و ناچار عمران نے اسے چوما، وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "بڑی بی جسے اب بہت سے لوگن بڑی روانی سے بڑی ماتاجی کا خطاب دے رہے ہیں، ایک بڑا خاص الخاص انکشاف سامنے لائی ہے۔ یہاں زرگاں میں بڑی بی کی ایک بڑی پرانی آبائی حویلی ہے۔ اس حویلی میں کچھ جدّی کاغذات پڑے ہوئے تھے۔ یہ کاغذات بڑی بی نے حکم جی کو پیش کیے ہیں۔ ان سے پتا چلا ہے کہ وہ پرانی بات کچھ

ایسی غلط بھی ناہیں تھی جو اس قلعے کے حوالے سے کہی جاوت ہے۔ اس قلعے میں ایک بڑی خامی ہے۔۔۔ اور راجا رائے کے دور میں یہ خامی جان بوجھ کر رکھی گئی تھی۔۔۔ تاکہ اگر کسی آنے والے سمے میں مسلمان اس قلعے میں قلعہ بند ہوں تو ان پر حملہ کیا جاسکے۔۔۔''

عمران کے چہرے پر دلچسپی کے تاثرات ابھرے اور اس کی توجہ بڑھ گئی۔ گیتا، عمران کی اس کیفیت سے محظوظ ہوئی۔ وہ نیم دراز ہوگئی اور اس کی گود میں سر ٹکا کر بولی۔ ''تمہارا کیا خیال ہے عمران! وہ خامی کیا ہووے گی؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

وہ اس کے سینے کے گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ ''یہ وہی خامی ہے جو سات پردوں میں چھپی ہوئی اکیلی ناری کے اندر ہووت ہے۔ اس خامی کو سات پردوں کی وجہ سے دور ناہیں رکھا جاسکتا۔ یہ خامی تو ناری کے اندر ہی ہووت ہے۔ وہ اوپر سے چاہے بڑی مضبوط نظر آوت ہو لیکن اس میں چھپی ہوئی کمزوری اسے مضبوط ناہیں رہنے دیتی۔''

عمران نے کہا۔ ''تمہارا فلسفہ سمجھنے میں مجھے تھوڑی دیر لگے گی۔۔۔ اور ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔''

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔ ''عمران! قلعے کی فصیل پرانی ہونے کے باوجود بہت مضبوط ہے لیکن ایک جگہ ایسی ہے جہاں یہ فصیل بالکل مضبوط ناہیں ہے۔ وہ دیکھنے میں مکمل فصیل نظر آوت ہے لیکن اندر سے بالکل کھوکھلی ہے۔ شاید ایک بڑا فوجی ٹرک بھی اس سے ٹکرا جاوے تو وہ گر سکتی ہے۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''یہ ہے عمران۔ اور میں تمہیں اس کا مکمل ثبوت دے سکت ہوں۔۔۔ فصیل کا وہ حصہ دراصل کبھی ایک بڑا دروازہ ہوا کرت تھا۔ راجا رائے کے زمانے میں وہ دروازہ گرا دیا گیا اور وہاں پر بھی فصیل بنا دی گئی۔ مگر فصیل کا یہ ٹکڑا اندر سے بالکل کھوکھلا بنایا گیا ہے۔ سمجھو کہ نا تک چندی اینٹوں کی دو عام سی دیواریں ہیں جن کے درمیان آٹھ دس فٹ جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے۔ یہ سارا کام راتوں کے اندھیرے میں بڑی رازداری سے کیا گیا ہووے گا۔ ہوسکتا ہے کہ جن کاریگروں نے یہ کام کیا ہو، ان کو ویسے ہی جان سے مار دیا گیا ہو یا پھر قید میں ڈال دیا گیا ہو۔ بہرحال، فصیل کا یہ کھوکھلا ٹکڑا ایک چھپی ہوئی حقیقت ہے اور بڑی ماتا نے یہ حقیقت اپنے جدی کاغذوں کے ذریعے حکم جی وغیرہ پر کھول دی ہے۔''

میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا تھا۔ یقیناً عمران کی کیفیت بھی مجھ سے ملتی جلتی تھی۔ گیتا کا انکشاف اگر درست تھا تو بڑا خطرناک تھا۔ ہماری حالت اس شخص کی سی تھی جو کسی جنگل میں کسی درندے سے بچنے کے لیے درخت پر چڑھ جائے اور اچانک اسے پتا چلے کہ وہ جس درخت پر چڑھا ہے، وہ جڑوں کے بغیر ہے اور زمین بوس ہو رہا ہے۔

''وہ جگہ کون سی ہے؟'' عمران نے گیتا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''دیکھو، سب کچھ مجھ سے چھین رہے ہو اور اس کا صلہ بھی کوئی نہیں۔'' وہ اٹھلا کر بولی۔

''پلیز گیتا۔۔۔ پلیز۔ ہم بڑی نازک سچویشن سے گزر رہے ہیں۔ اور جو کچھ تم بتا رہی ہو، وہ سچ ہے تو پھر سچویشن اور نازک ہو جاتی ہے۔''

''وہ تو میں بھی اچھی طرح جانت ہوں۔'' اس نے عمران کے ہونٹوں پر انگلی چلا کر کہا۔ ''یہ بات تو طے ہے کہ کل سویرے قاسمیہ کے لوگن برٹش فوجیوں اور حکم کے سپاہیوں کا حملہ زیادہ دیر ناہیں روک سکیں گے۔ ہوسکت ہے کہ وہ دس بارہ گھنٹوں کے اندر ہی چاروں طرف سے پسپا ہو کر قلعے کے اندر آجائیں اور دروازے بند کر دیں۔ ہزار ڈیڑھ ہزار عورتیں اور بچے تو اب بھی قلعے میں موجود ہیں۔ پھر یہاں موجود لوگن کی تعداد کئی ہزار تک ہو جاوے گی۔ ان سارے لوگن کے جیون اسی صورت میں بچ رہ سکیں گے جب یہ قلعہ ان کی رکھشا کرے گا۔ اگر قلعہ رکھشا نہ کر سکا تو بڑی جلدی سب کچھ ختم ہو جاوے گا۔''

وہ جو کچھ کہہ رہی تھی، بالکل درست تھا۔ عمران کے تاثرات بھی یہی کہہ رہے تھے کہ وہ گیتا کی بات کے وزن کو پوری طرح محسوس کر رہا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''گیتا! اٹھو۔۔۔ مجھے وہ جگہ دکھاؤ۔''

''لیکن پہلے اپنے وچن کی تصدیق تو کرو۔''

''کیا کروں؟''

''اپنے دستخط کر دو۔''

''کہاں؟''

''یہاں۔'' اس نے اپنے بالائی جسم کو بے لباس کر دیا اور کوئی مارکر نما شے عمران کے ہاتھ میں تھما دی۔

عمران سٹپٹایا ہوا نظر آیا مگر وہ بحث کر کے وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ ڈھلتی جوانی والی طرار گیتا مکھی شاید آج اپنا ہر مطالبہ پورا کرانے پر تلی ہوئی تھی۔ عمران نے اس کا یہ بے ہودہ مطالبہ بھی پورا کیا اور پھر اس کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ گیتا مکھی نے خود کو سر تا پا گرم چادر سے ڈھانپا اور عمران کے پہلو میں چلتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ سیاہ چادر میں سے فقط اس کی آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ عام لوگوں کے لیے یہ اندازہ لگانا ناممکن تھا کہ وہ کون ہے۔ اب میرا وہاں رکنا بھی بیکار تھا۔ میں الماری کی اوٹ سے نکل کر ان کے پیچھے گیا۔ قلعے کے طویل برآمدوں اور وسیع و عریض احاطوں میں لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ بے شمار مشعلیں اور گیس کے ہنڈولے قرب و جوار کو روشن کر رہے تھے۔ لوگوں کے چہروں پر خوف و ہراس کے ساتھ ساتھ جوش و خروش کے آثار بھی تھے۔ عمران اور گیتا مکھی درمیانی احاطے سے گزر کر فصیل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ مل گیا۔ میں نے رسماً عمران سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟ عمران کو بھی معلوم تھا کہ میں سب کچھ جان چکا ہوں۔ اس نے مجھے انگلی کے اشارے سے خاموش رہنے اور اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ حسنات اور چوہان وغیرہ بھی ہمارے ساتھ ہو لیے۔ ہم قلعے کے مرکزی دروازے سے، فصیل کے ساتھ ساتھ چلتے سو ڈیڑھ سو قدم شمال کی طرف آئے۔ یہاں پہنچ کر گیتا مکھی کچھ دیر تک قرب و جوار کا جائزہ لیتی رہی اور وہ نشانیاں ڈھونڈتی رہی جو پہلے سے اس کے ذہن میں موجود تھیں۔ آخر اس نے فصیل کے ایک حصے کو منتخب کیا۔ وہ عمران سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''یہاں سے اینٹیں نکال کر دیکھو۔''

حسنات کی ہدایت پر فوراً ہی دس بارہ افراد وہاں پہنچ گئے۔ ان کو کدالیں وغیرہ فراہم کر دی گئیں۔ فصیل پر کدالیں چلنا شروع ہوئیں۔ پہلی دو چار اینٹیں نکالنے میں دشواری ہوئی لیکن اس کے فوراً بعد اینٹیں گرنا شروع ہوگئیں۔ وہاں موجود تمام افراد کے چہرے تحیر کی آماجگاہ بن گئے۔ فصیل کا یہ حصہ واقعی کھوکھلا تھا۔

یہ ایک تہلکہ خیز انکشاف تھا۔ حسنات کی ہدایت پر اور بھی بہت سے افراد کدالیں اور ہتھوڑے وغیرہ لے کر وہاں پہنچ گئے۔ اگر یہ لوگ چاہتے تو شاید آدھ پون گھنٹے میں فصیل کا یہ ٹکڑا منہدم کر ڈالتے لیکن ہم نے آپس میں مشورے کے بعد انہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔ یہ فصیل جیسی بھی بری بھلی تھی لیکن اس کا کھڑا رہنا اس کے منہدم ہونے سے بہتر تھا۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ فصیل کا یہ حصہ گرنے کی صورت میں دفاع کا متبادل انتظام موجود ہو۔ یہ انتظام کیا ہو؟ اور اسے جلد سے جلد کس طرح مکمل کیا جائے؟ یہ دونوں بڑے اہم سوال تھے۔ اس موقع پر ایک بار پھر عمران کے مشورے

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
جنوری 2012ء
۔۔۔۔۔نئے سال کی
مسحور کن سوغات

آخری رابطہ

کٹھن حالات سے نبرد آزما، محبت کی راہوں میں خوابوں کو گروی رکھنے والی دوشیزہ کا قصۂ الم۔ آخری صفحات پر
ایچ اقبال کے سحر انگیز قلم کا جادو۔۔۔۔۔

جنگ آزما

ظہیر الدین بابر اور خانزادہ۔۔۔۔۔ بہن اور بھائی کا بے مثال پیار اور لازوال قربانیوں کی باکمال داستان۔۔۔۔۔
ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم سے تاریخ کے سنہری اوراق

پکا دھاگا

ازدواجی زندگی کی الجھی ڈور کو سلجھاتی۔۔۔۔۔ ایک اہم معاشرتی مسئلے کو اجاگر کرتی تحریر۔۔۔۔۔
مرزا امجد بیگ کا دلچسپ انداز

حضرت عزیر علیہ السلام

جلاد بادشاہ کا انبیا کو آزمانا۔۔۔۔۔ بھڑکتے شعلوں کا گل و گلزار میں ڈھل جانا۔۔۔۔۔ خوابوں کی حیرت انگیز تعبیریں۔۔۔۔۔ بہت سے سبق آموز حالات و واقعات سے مزین پُرفکر داستان

اس کے علاوہ

کشکول، اناڑی، محفل شعر و سخن، آپ کے خط

مزید

کاشف زبیر، منظر امام، تنویر ریاض، ڈاکٹر شیر شاہ سید، سلیم انور، مختار آزاد، ثمر عباس کی رنگارنگ دلچسپ تحاریر

اور وہ سب جو آپ سسپنس میں دیکھنا چاہتے ہیں!
تازہ شمارہ فوری حاصل کیجیے

نے مجھے طاقت بخشی۔ وہ مجھے ایک طرف لے گیا اور بولا۔ ”بتاؤ اب کیا کرنا ہے؟ سب تمہاری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔“

”یار! تم نے مجھے بُری طرح پھنسا دیا ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ یہ سب کچھ میرے بس کا نہیں ہے۔“

”کسرِ نفسی سے کام مت لو۔ جو شخص جارج گورا کو ہرا سکتا ہے وہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ لوگ تمہیں نجات دہندہ سمجھ رہے ہیں یار۔ کچھ تو خیال کرو ان کے جذبات کا۔“

”میں نے گھونسا مار کر تمہاری بتیسی ہلا دینی ہے۔“ میں دھیمی آواز میں پھنکارا۔

”تمہیں گھونسا مارنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم بس آنکھ سے اشارہ کر دو۔ تمہارے یہ سیکڑوں پرستار میری ہڈیوں کا چورا کر ڈالیں گے۔ آخر کمان دار ہو تم۔ لیڈر شپ ہے تمہارے پاس۔“

”عمران... عمران۔ یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔“ میں نے اسے سختی سے ٹوکا۔

وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ٹھوڑی کھجا کر بولا۔ ”دیکھو، بات میری ہو گی لیکن زبان تمہاری ہو گی۔ اس ”ڈمی“ فصیل کے پیچھے ہمیں ایک اور دفاعی لائن قائم کرنی پڑے گی۔ اتنے تھوڑے وقت میں کوئی دیوار وغیرہ تو بنائی نہیں جاسکتی۔ ہاں، ایک نیم گول خندق ضرور کھودی جاسکتی ہے.....“

”تمہارا مطلب ہے کہ اگر فصیل کا کمزور حصہ ٹوٹ بھی جائے تو آگے خندق ہو؟“

”بالکل... یہ بات جب تم کہو گے تو اس کا زیادہ اثر ہو گا۔ ابھی درجنوں لوگ کام پر لگ جائیں گے۔“

اگلے آدھ گھنٹے میں وہی ہوا جو عمران نے کہا تھا۔ میں نے حسنات اور مبارک علی وغیرہ سے مشورہ کیا اور وہی تجویز دی جو عمران نے میرے کان میں ڈالی تھی۔ اس تجویز کو سب نے مان لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کدالوں اور کسیوں والے قریباً ڈھائی تین سو افراد جمع ہو گئے اور فصیل کے کمزور حصے کے سامنے نیم دائرے میں ستّر فٹ لمبی خندق کھودنے میں مصروف ہو گئے۔ اندازہ ہوا کہ یہ کام حیران کن تیزی سے بس پانچ چھ گھنٹے کے اندر ہی مکمل ہو جائے گا۔

یہی وقت تھا جب تین گھڑ سوار بڑی تیزی سے قلعے کے اندر داخل ہوئے۔ وہ سرپٹ گھوڑے دوڑاتے احاطے میں پہنچے۔ وہیں سے ان کی نظر مجھ پر اور حسنات وغیرہ پر پڑ گئی۔ وہ سیدھا ہماری طرف آئے۔ ان میں انور خان کا ایک اور قریبی ساتھی مبارک علی تھا۔ اس کے علاوہ امر ناتھ اور ایک دوسرا شخص تھا۔ وہ باہر سے کوئی اہم خبر لے کر آئے تھے۔

”کیا بات ہے مبارک؟“ حسنات نے دریافت کیا۔

مبارک بولا۔ ”قاسمیہ کے داخلی دروازے کے پاس بہت بڑا ہجوم ہو گیا ہے۔ وہاں ایک بہت خاص خبر آپ لوگن کا انتظار کر رہی ہے۔“

”کیسی خبر؟“ میں نے پوچھا۔

مبارک نے میری طرف دیکھا اور مؤدب انداز میں کہا۔ ”وہاں ایک چوبارے پر ہم نے بڑا پکّا مورچا بنا رکھا ہے۔ ابھی پہلے پہر کو جو حملہ ہوا تھا، اس کا مقابلہ اس مورچے کے اندر سے بہت ڈٹ کر کیا گیا تھا۔ یہاں ایک بڑی دوربین بھی ہے جی جو کل کی لڑائی میں ہم نے گوروں سے چھینی تھی۔ وہ دوربین چوبارے کی سب سے اونچی جگہ پر لگائی گئی ہے۔ اس دوربین کے ذریعے ہم کو ایک بڑی خاص جانکاری ملی ہے جی۔ ہم نے اس بڑھیا کو دیکھ لیا ہے جسے لوگن بڑی ماتا کہہ رہے ہیں اور اس کو دیوی کا درجہ دے رہے ہیں۔“

”کہاں ہے بڑھیا؟“ میں نے پوچھا۔

”دھرم شالا کے تالاب کے اندر جو اونچا مینارہ ہے اس پر چڑھی ہوئی ہے۔ کوئی خاص قسم کی پوجا پاٹ کر رہی ہے۔ دو اور پجارنیں بھی اس کے ساتھ ہیں۔“

میں نے سوالیہ نظروں سے حسنات احمد کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔ ”یہاں قاسمیہ کے ساتھ ہی ہندو آبادی میں ایک بڑا دھرم شالا ہے۔ دھرم شالا کے تالاب کے اندر ایک چوکور مینارہ ہے۔ اس کو ناگ مینارہ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے اردگرد پتھر کا ایک بڑا سانپ لپٹا ہوا دکھایا گیا ہے۔ پرانے وقتوں سے پنڈت اور پجاری وغیرہ خاص چلے کاٹنے کے لیے یا خاص قسم کی پوجا پاٹ کے لیے اس پر چڑھتے ہیں۔“

یہ خبر واقعی اہم لگتی تھی۔ اگر کہیں سے واقعی بڑی بی نظر آ رہی تھی تو پھر ہم اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ میں نے اور عمران نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم ایک بند جیپ میں سوار مبارک علی کے ساتھ جا رہے تھے۔ مبارک علی اور اس کے ساتھی گھوڑوں پر سوار تھے۔ جیپ میں میرے ساتھ حسنات احمد، عمران اور بھرت تھے۔ ہم قاسمیہ کی مختلف گلیوں سے گزرے۔ جگہ جگہ مورچے نظر آ رہے تھے۔ جو مورچے کھلی جگہوں پر تھے، ان کو ریت کی بوریوں اور اینٹوں وغیرہ سے محفوظ کیا گیا تھا۔ مسلح افراد ہر طرف گشت کر رہے تھے۔ خوراک سے بھرے ہوئے بہت سے چھکڑے قلعے کی طرف جا رہے تھے۔ یہ انتظام اس لیے تھا کہ اگر قلعے میں محصور ہونا پڑے تو دشواری

پیش نہ آئے۔

جلد ہی ہم قاسمیہ کے داخلی راستے کے قریب پہنچ گئے۔ یہاں ہم ایک زیادہ تنگ گلی میں مڑے۔ پھر اپنی سواریوں سے اترے اور بیس تیس قدم فاصلہ طے کر کے ایک دروازے میں داخل ہو گئے۔ اردگرد سیکڑوں افراد جمع تھے۔ ان میں سے کچھ نے ہمیں پہچان لیا اور فلک شگاف نعرے لگائے۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر ایک چار منزلہ چوبارے کی آخری منزل پر پہنچ گئے۔ چوبارے کی ساری منزلوں پر مسلح افراد کا ہجوم تھا۔ وہ بے حد پُرجوش نظر آتے تھے۔ انگریزوں اور حکم کے ہرکاروں کے خلاف زبردست نعرہ زنی کر رہے تھے۔ یہاں مجھے ایک چونکا دینے والا منظر بھی نظر آیا۔ ایک راہداری میں ایک انگریز کی برہنہ لاش کو الٹا لٹکایا گیا تھا۔ غالباً یہ شخص کل صبح ہونے والے معرکے میں مرا تھا یا پکڑا گیا تھا۔ لاش کے جسم پر تشدد کے بہت سے نشان تھے۔ یقیناً یہ لاش اس سفا کی کا ردِّعمل تھی جو ”تہذیب یافتہ گوروں“ کی طرف سے پچھلے پانچ چھ دنوں میں یہاں روا رکھی گئی تھی۔ جیل سے قاسمیہ کی طرف آتے ہوئے ہم نے اپنی آنکھوں سے درجنوں افراد کی درختوں سے جھولتی لاشیں دیکھی تھیں۔ ان بدنصیبوں کو حکم اور اینڈرسن کے جوانوں نے سرِعام پھانسیاں دی تھیں اور لاشیں چیل کوّوں کے لیے چھوڑ رکھی تھیں۔

سیڑھیاں طے کر کے ہم چوبارے کی چھت پر پہنچ گئے۔ اب صبحِ صادق کا اجالا نمودار ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ اس چوبارے کے اردگرد چاروں طرف لاتعداد لوگ گھروں کی چھتوں اور کھڑکیوں میں نظر آ رہے تھے۔ رائفلیں لہرا رہے تھے۔ نعرے لگا رہے تھے۔ چوبارے کی چھت پر قاسمیہ کے سرکردہ افراد اور جنگجو موجود تھے۔ ایک تین فٹ لمبی ٹیلی اسکوپ ایک اسٹینڈ پر رکھی گئی تھی اور اس کے اردگرد ہجوم تھا۔

مجھے دیکھتے ہی ہجوم نے راستہ دیا۔ میں اور عمران، حسنات احمد کے ساتھ ٹیلی اسکوپ پر پہنچے۔ سب سے پہلے مجھے ہی مطلوبہ منظر دکھایا گیا۔ منظر واقعی چونکا دینے والا تھا۔ ٹیلی اسکوپ کو بڑی خوبی سے قریباً نصف کلومیٹر دور ایک مینار پر فوکس کیا گیا تھا۔ مینار کے بالائی سرے پر برقی روشنی نظر آ رہی تھی۔ یقیناً یہ روشنی جنریٹر کی مرہونِ منت رہی ہو گی۔ غور سے دیکھنے پر بڑی بی کی شبیہ نظر آتی تھی۔ وہ آلتی پالتی مارے شاید فرش پر ہی بیٹھی تھی۔ اس کے سر کے عین اوپر ایک بکرے یا بکری کا کٹا ہوا سر جھول رہا تھا۔ خاصی سردی میں بھی بڑی بی کے جسم پر فقط سفید سوتی ساڑی ہی دکھائی دیتی تھی۔ تاہم غور سے دیکھنے پر پتا چلتا تھا کہ اس کے کندھوں پر کوئی شال قسم کی چیز بھی ہے۔ درمیانی عمر کی دو اور عورتیں بھی بڑی بی کے ساتھ تھیں۔

”آپ لوگ بھی دیکھو۔“ میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے عمران اور حسنات وغیرہ کو دعوت دی۔

باری باری سب نے یہ منظر دیکھا۔ آخر میں پھر مجھے دیکھنے کی دعوت دی گئی۔ بڑی بی دوسری طرف منہ کیے بیٹھی تھی۔ تاہم کسی وقت وہ اپنے کندھوں پر پھونک مارنے کے لیے اپنی گردن گھماتی تو اس کا چہرہ بھی نظر آتا تھا۔ اچانک شور اٹھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ قاسمیہ کے کچھ مکین آپس میں ہی گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ تین چار باریش افراد کو لوگ بُری طرح مار رہے تھے۔ انہیں غدار، دھوکے باز اور پتا نہیں کیا کیا قرار دے رہے تھے۔ دیگر افراد انہیں چھڑانے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ میں نے بلند آواز میں پکار کر کہا۔ ”یہ کیا تماشا ہے؟ ختم کرو یہ۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔“

شدید گرما گرمی میں تھوڑی سی کمی واقع ہوئی لیکن پھر بھی کھینچا تانی اور بدزبانی جاری رہی۔ حسنات اور مبارک وغیرہ نے آگے بڑھ کر یہ ہنگامہ بمشکل کنٹرول کیا۔ دو چار افراد اب بھی بُری طرح گرج برس رہے تھے۔ ”تم منافق ہو۔ تم غیروں سے ملے ہوئے ہو۔ تم جیسے لوگن کی وجہ سے یہ دن دیکھنے پڑ رہے ہیں۔“

اس طرح کے فقرے چاروں طرف گونج رہے تھے۔ مار کھانے والے زخمی افراد کو موقع سے ہٹا لیا گیا۔ مارنے والے سیکڑوں کی تعداد میں تھے، وہ اور جوش و خروش سے نعرے لگانے لگے... ان کے نعروں سے پتا چلتا تھا کہ وہ بڑی بی کو فوراً سے پہلے شوٹ کر دینے کے خواہش مند ہیں۔

حسنات مجھے اور عمران کو ایک طرف لے گیا۔ اس نے جھگڑے کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔ ”ایک قبیلے کے لوگوں نے رائے دی ہے کہ بوڑھی عورت پر گولی نہ چلائی جاوے۔ یہ بدشگونی ہووے گی۔“

”بدشگونی سے کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔

”ان کا کہنا ہے کہ ان کے عقیدے کے مطابق جنگ میں کسی پر اس کی بے خبری میں پیچھے سے وار کرنا بالکل غلط ہے... اور جس پر وار کیا جاوے، وہ ناری ہو اور عمر رسیدہ بھی ہو تو یہ اور بھی غلط ہے۔ بس اسی بات پر باقی لوگن غصے میں آ گئے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ کوئی عام عورت نا ہیں، یہ فساد کی جڑ ہے۔ یہ اس لڑائی میں بڑے بڑے فیصلے کر رہی ہے۔ یہ مرے گی تو دشمنوں کی کمر ٹوٹے گی۔ وہ اسے مارنے میں ذرا

سی بھی دیری کرنا نہیں چاہتے۔"

"ظاہر ہے ان حالات میں تو یہ سنہری موقع ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہیے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اتنی دور نشانہ لگ بھی سکے گا؟" عمران نے کہا۔

"وہ دیکھیں جی، جہاں بہت سے لوگن جمع ہیں... چھت کے اس کونے میں۔" مبارک علی نے ایک طرف اشارہ کیا۔

عمران کے ساتھ ساتھ میں نے بھی دیکھا۔ وہاں کافی لوگ جمع تھے۔ پھر مجھے ایک دور مار رائفل بھی نظر آئی۔ یہ کافی بڑی رائفل تھی۔ اس کے اوپر بھی ٹیلی اسکوپ لگی ہوئی تھی۔ کئی اہم جنگجو کمانڈر یہاں جمع تھے۔ حسنات احمد نے کہا۔ "یہ زرگاں کے تین چار بہترین نشانے باز ہیں جی۔ اڑتے پرندے پر سو فیصد ٹھیک نشانہ لگا لیوت ہیں۔ مجھے یقین ہے، ان میں سے کوئی ایک بڑی بی کے کھوپڑے میں سوراخ کر لیوے گا۔"

چھت پر موجود لوگوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ وہ جانتے تھے کہ بالکل غیر متوقع طور پر ان کو ایک بڑی شاندار کامیابی ملنے والی ہے۔ اس ٹیلی اسکوپ نے اتفاقیہ طور پر ایک ایسا کام کر دکھایا تھا جو بظاہر بہت مشکل تھا۔ یہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے کوئی ماہر فلکیات اپنی ٹیلی اسکوپ سے آسمان کا طول و عرض ناپ رہا ہو اور اچانک ایک ایسا ستارہ اسے نظر آجائے جس کی خبر پہلے کسی کو نہ ہو۔ یہ بھی کچھ ایسی ہی حیران کن دریافت تھی۔ وہ بڑی بی جو زرگاں کے شعلوں پر تیل ڈالنے کا کام بڑی ہٹ دھرمی سے کر رہی تھی، اچانک ہی اس ٹیلی اسکوپ کے عدسوں پر نمودار ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا، باریک نقوش اور تیکھی لمبی ناک والا ایک نشانے باز دور مار رائفل میں بلٹ ڈال رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہی شخص بڑھیا پر نشانہ لگانے والا ہے۔ سیکڑوں تماشائیوں کے دل شدت سے دھڑک رہے تھے۔ عمران نے میرا کندھا دبایا۔ ہم نیچے جانے والے زینوں کی طرف بڑھے۔ حسنات احمد اور چوہان نے ہمیں دیکھ لیا۔ اس سے پہلے کہ چوہان ہماری روانگی کے بارے میں پوچھتا، عمران نے اسے انگلی کے اشارے سے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔ اردگرد موجود ہر شخص کا دھیان، دور مار رائفل اور نشانے باز کی طرف تھا۔ سانسیں جیسے رک گئی تھیں اور نگاہیں دھرم شالا کے دور افتادہ مینارے پر جمی ہوئی تھیں۔ کسی نے ہماری طرف توجہ نہیں دی۔ اگر کسی نے دیکھا بھی تو کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں کی۔ زینوں کی تاریکی میں پہنچتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ عمران کوئی خاص کام کرنا چاہ رہا ہے۔

"کچھ بتاؤ گے بھی؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"میں نیوز چینل کا نمائندہ ہوں۔ آن ایئر ہونے سے پہلے کچھ نہیں بتاؤں گا۔" اس نے کہا اور مجھے تقریباً کھینچتا ہوا نچلی منزل پر لے آیا۔ یہاں تاریکی تھی۔ کسی نے ہمیں پہچانا نہیں۔ وہ مجھے لے کر سیدھا ایک کمرے میں گھس گیا اور کمرے کا دروازہ شتابی سے بند کر دیا۔ میں نے دیکھا یہاں بھی ایک کھڑکی کے پاس ایک لمبی رینج کی رائفل پڑی تھی۔ بہرحال، یہ اوپر والی رائفل سے کم طاقتور تھی۔ اس رائفل کو چلانے والا بھی غالباً بڑی بی کی ہلاکت کا منظر دیکھنے کے لیے بالائی منزل پر چلا گیا تھا۔ عمران نے رائفل کو فوراً چیک کیا۔ اس میں دو بلٹس موجود تھیں۔ رائفل پر چھوٹے سائز کی ٹیلی اسکوپ بھی لگی ہوئی تھی۔

"بڑھیا کو مارنا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، اسے زندہ کرنا چاہتا ہوں۔ رائفل لوگوں کو زندہ کرنے کے لیے ہی تو ہوتی ہے... یار... کبھی کبھی کیسا احمقانہ سوال کرتے ہو تم۔"

"لیکن تمہیں پنگا لینے کی کیا ضرورت ہے؟ اوپر بڑی گن سے فائر کرنے تو لگے ہیں وہ لوگ۔"

"میں نشانہ چوکنے کا رسک نہیں لے سکتا۔ اگر نشانہ چوک گیا تو دو تین سیکنڈ میں بڑی بی غائب ہو جائے گی۔ پھر کچھ نہیں ہو سکے گا۔"

"لیکن ان لوگوں کے پاس بڑی گن ہے۔ حسنات بتا رہا ہے کہ وہ لوگ زرگاں کے بہترین نشانے باز ہیں۔"

"زرگاں اور لاہور میں بڑا فرق ہے۔ لاہور... لاہور ہے۔ اور لاہور کا نشانے باز بھی، لاہور کا نشانے باز ہے۔"

"لیکن....."

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تم شکار دیکھو، شکاری دیکھو اور نشانہ دیکھو۔"

وہ بڑے اعتماد سے رائفل کے سامنے جا بیٹھا۔ مینار اور اس کی بالائی روشنی یہاں سے بھی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ رات کی تاریکی بتدریج دن کے اجالے میں ڈھلنے جا رہی تھی۔ عمران نے مجھ سے کہا۔ "میں نشانہ لینے لگا ہوں۔ اگر دروازے پر دستک ہو بلکہ اگر کوئی دروازے کو اکھاڑ بھی دے تو تمہیں دروازہ نہیں کھولنا ہے۔"

"عمران! دیکھ لو۔ بڑا نازک معاملہ ہے۔"

"تمہیں پتا ہے، میں صرف نازک معاملوں کو ہی دیکھتا

ہوں۔ نزاکت مجھے پسند ہی بڑی ہے۔ خاص طور سے اگر لڑکیوں اور ان کے معاملوں میں ہو تو....."

میں سمجھ گیا تھا کہ اب وہ جو کرنے جا رہا ہے، کر کے رہے گا۔ اسے دلیلیں دینا بیکار تھا۔ اسی دوران میں میری نگاہ ایک اور دوربین پر پڑ گئی۔ یہ کمرے کی ایک دیوار پر لگی کھونٹی سے جھول رہی تھی۔ میں نے یہ پیتل کی دوربین اتار کر آنکھوں سے لگا لی۔ عمران رائفل کے سامنے اوندھا لیٹ کر شست باندھ چکا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اوپر تلے دو فائر کر دیے۔ دھماکوں سے فضا گونج اٹھی۔ وہ کمال کا نشانے باز تھا۔ میں نے آج تک اس کا نشانہ خطا ہوتے نہیں دیکھا تھا... مگر آج... اس نے نشانہ خطا کیا۔ اور ایک نہیں دونوں نشانے خطا کیے۔ میں نے ٹیلی اسکوپ میں سے دیکھا۔ بڑھیا ایک دم اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس کی دونوں ساتھی عورتیں بھی اٹھیں۔ میں نے ان کے ہیولوں کو تیزی سے اوجھل ہوتے دیکھا۔

"اوہ شٹ۔" عمران نے دانت پیس کر رائفل پر مکا رسید کیا۔

پھر وہ مجھے لیے تیزی سے باہر نکل آیا۔ چاروں طرف ہاہا کار تھی۔ اوپر تلے ہونے والے دو فائرز کی گرج دار آواز سن کر لوگ بالائی منزل کی طرف دوڑے جا رہے تھے، تاہم کچھ اوپر سے نیچے بھی آ رہے تھے۔ ایک افراتفری سی مچ گئی تھی۔ تاریکی اور بھگدڑ میں کسی نے ہمیں کمرے میں داخل ہوتے یا نکلتے نہیں دیکھا۔ کم از کم کسی نے ہمیں پہچانا ہرگز نہیں۔ ہم بھی زینے طے کر کے اوپر آ گئے۔ یہاں دور مار رائفل کے قریب موجود چوٹی کے نشانے باز، بُری طرح آگ بگولا ہو رہے تھے۔ یقیناً وہ جان چکے تھے کہ ان کے فائر کرنے سے پہلے ہی کسی اور نے گولی چلا دی ہے اور اس اچانک فائرنگ کے نتیجے میں "شکار" اوجھل ہو گیا ہے۔ لمبی ناک والا شخص زینوں کی طرف اشارہ کر رہا تھا اور دہاڑ رہا تھا۔ "نیچے دیکھو۔ وہاں سے گولی چلائی ہے کسی حرامزادے نے۔"

چند مسلح افراد دوڑتے ہوئے زینے اتر گئے۔ "کیا ہوا حسنات؟" عمران نے پوچھا۔

"گڑبڑ ہو گئی عمران بھائی۔ بڑھیا بچ گئی۔ لگتا ہے کہ ہم سے پہلے کسی اور نے گولی چلا دی۔ لیکن وہ اس خبیث کو لگی نہیں۔"

میں جب سے عمران کے ساتھ تھا، مجھے پہلی بار اس پر غصہ آ رہا تھا۔ اس سے جلد بازی ہوئی تھی۔ اس نے نسبتاً چھوٹی گن سے اور افراتفری میں نشانہ لیا تھا... بہرحال، جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب یہی سوچا جا سکتا تھا کہ شاید اس میں کوئی بہتری ہو۔ ایک نشانے باز اب بھی بڑی گن کے پاس موجود تھا۔ اس گن کی دوربین بھی نسبتاً بڑی تھی۔ نشانے باز نے مسلسل دوربین سے آنکھ لگا رکھی تھی۔ مگر اب توقع نہیں تھی کہ بڑھیا پھر نشانے پر آئے گی۔

چوبارے کے اندر اور اردگرد موجود سیکڑوں لوگوں میں مایوسی کی لہری دوڑ گئی۔ تاہم کچھ لوگ امید ظاہر کر رہے تھے کہ شاید بڑھیا کو گولی لگ ہی گئی ہو۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد میں اور عمران دیگر ساتھیوں کے ہمراہ واپس قلعے میں آ گئے۔ فصیل کے کمزور حصے کے سامنے قوس کی شکل کی سرنگ تیزی سے کھودی جا رہی تھی۔ سیکڑوں مرد و زن اور بچے قلعے کے مختلف حصوں میں موجود تھے۔ وہ اپنی اپنی اہلیت کے مطابق مختلف کام انجام دے رہے تھے۔ کہیں ناشتا بنایا جا رہا تھا، کہیں تقسیم کیا جا رہا تھا۔ دفاعی انتظامات میں بھی عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام کر رہی تھیں۔ گیتا بھی اب کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ ان سیکڑوں عورتوں کے درمیان کہیں موجود تھی یا شاید واپس جا چکی تھی۔ میں اور عمران دوبارہ اپنے کمرے میں آ گئے۔ پتا نہیں کیوں، مجھے عمران کی نشانے بازی پر مسلسل شک سا ہو رہا تھا... میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "عمران! تم مجھے ہر وقت ابجھن میں رکھتے ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری کون سی بات کو حقیقت سمجھوں اور کس کو جھوٹ؟"

"بھئی! میڈیا کا تو کام ہی ابجھن میں رکھنا ہوتا ہے۔ ایک ابجھن کے ختم ہونے سے پہلے دوسری ابجھن شروع ہو جانی چاہیے۔ ورنہ ناظرین بھاگ جائیں گے اور اینکر بے چارے پکارتے رہ جائیں گے، جائیے گا نہیں... جائیے گا نہیں۔" وہ شانِ بے نیازی سے بولا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں، میں نہیں بھاگوں گا۔ مگر مجھے سچ سچ بتایا کرو۔"

"ٹھیک ہے، آئندہ سچ بتایا کروں گا۔"

"یعنی تم بالواسطہ اعتراف کر رہے ہو کہ یہ سچ نہیں تھا۔ تم نے... تم نے جان بوجھ کر بڑھیا کو بھگایا ہے؟"

"یار بھگایا تو جوان اور خوب صورت عورتوں کو جاتا ہے۔ بڑھیا کو بھگانے سے کیا فائدہ۔ کتنا بے ہودہ الزام لگا رہے ہو... ہاں تم یہ کہہ سکتے ہو کہ میں نے بڑی بی کی جان بچانے کی کوشش کی ہے۔"

"کیوں؟"

''یار! دشمن پر پیچھے سے وار کرنا مجھے کبھی اچھا نہیں لگا اور دشمن بھی اتنا پرانا، جتنا یہ قلعہ ہے۔ مجھے تو لگتا ہے یہ بڑھیا ضرور بہادر شاہ ظفر کا حقہ تازہ کرتی رہی ہے... یا کم از کم مہاتما گاندھی کی گرل فرینڈز میں شامل رہی ہے۔''

''تم پھر بکواس کررہے ہو۔''

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتا، دروازے پر دستک ہوئی اور پھر حسنات اور ڈاکٹر چوہان اندر آگئے۔ حسنات کچھ دیر پہلے تک کافی افسردہ نظر آتا تھا مگر اب اس کی کیفیت بدلی ہوئی تھی۔ وہ بولا۔ ''میں انور بھائی سے مل کر آرہا ہوں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ جو ہوا اچھا ہی ہوا۔ بڑھیا کا بچ جانا ایک لحاظ سے ٹھیک ہی ہے۔''

''کس لحاظ سے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ کہہ رہے ہیں، اس بڑھیا نے قاسمیہ پر بھرپور حملے کے لیے شبھ گھڑی نکالی ہوئی ہے۔ اس شبھ گھڑی کی وجہ سے ہی ابھی تلک ہندو فوجی حملے سے رکے ہوئے ہیں۔ مجبوراً گورے فوجیوں کو بھی رکنا پڑا ہے۔ حالانکہ یہ گورے وقت ضائع کرنا ناہیں چاہ رہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکت ہیں کہ اگر اب تک ہم پر حملہ ناہیں ہوا تو اس کی وجہ یہ بڑھیا ہی ہے۔ اگر یہ بڑھیا مرجاتی تو ہم پر ابھی حملہ ہوجانا تھا۔''

''یہ بات تو ہے۔'' عمران نے اوپر نیچے سر ہلایا۔

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ اس نے معصوم صورت بنا رکھی تھی۔ کسی کو شبہ تک نہیں ہوسکتا تھا کہ بڑھیا کو بھگانے والا کام عمران نے کیا ہے اور اس طرح سے کیا ہے کہ اس کام سے اختلاف کرنے والوں کو اختلاف کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ حسنات نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''انور بھائی کہہ رہے ہیں، یہ بہت ضروری ہے کہ ابھی دس بارہ گھنٹے تک ہم پر اٹیک نہ ہو۔ امید ہے کہ آج رات تک ہمیں باہر سے زبردست کمک مل جاوے گی۔''

''کمک سے تمہاری مراد نل پانی سے آنے والی مدد ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل جناب! ہمارے مخبر بتا رہے ہیں کہ نل پانی سے کم و بیش چار ہزار سپاہی روانہ ہوچکے ہیں۔ ان کی قیادت خود چھوٹے سرکار کررہے ہیں۔''

یہ بڑی سنسنی خیز اطلاع تھی۔ یہ بات بھی بالکل واضح سمجھ میں آرہی تھی کہ ہم پر حملے کا آغاز جتنی دیر سے ہوگا، اتنا ہی ہمارے لیے بہتر ہوگا۔

☆☆☆

گورے اور کالے فوجیوں کی طرف سے ہم پر حملے کا آغاز شام سے کچھ دیر بعد ہوا۔ یہ بھرپور حملہ تھا اور ہم سب اس حملے کے لیے پوری طرح تیار بھی تھے۔ عمران نے مجھے پابند کردیا تھا کہ میں قلعے میں رہوں اور یہاں کے معاملات کو کنٹرول کروں۔ خود وہ حسنات، چوہان اور مبارک علی کے ساتھ لڑائی کی جگہ پر تھا۔ قاسمیہ پر دو طرف سے حملہ کیا گیا تھا۔ لڑائی کی شدت سے در و دیوار لرزنے لگے اور قاسمیہ کے مختلف حصوں میں آگ بھڑکتی دکھائی دی۔

انور خاں کی حالت اب بہتر تھی۔ ہم دونوں قلعے کی بالائی منزل پر موجود تھے۔ انور خاں بستر پر نیم دراز تھا اور گاہے بگاہے مجھ سے بات بھی کررہا تھا۔ انور خاں نے عمران کو پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ اس کی شخصیت سے متاثر ہوا تھا۔ خاص طور سے ایسے سنگین حالات میں عمران کا ٹھہراؤ اور اس کا مطمئن انداز انور خاں کو بہت پسند آیا تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''تابش! تم نے پہلے کبھی اپنے اس دوست کے بارے میں نہیں بتایا۔ کیا یہ بھی پاکستان سے تمہارے ساتھ آیا تھا؟''

''نہیں انور بھائی! یہ مجھے ڈھونڈتا ہوا یہاں پہنچا ہے۔ میرا ایک دوسرا دوست اقبال بھی اس کے ساتھ ہے۔''

انور خاں نے کہا۔ ''مجھے اس شخص کی آنکھوں میں ایسی چمک نظر آتی ہے جو بُرے سے بُرے حالات میں بھی بجھتی نہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہ مردِ میدان ہے۔ نہ صرف خود لڑ سکتا ہے بلکہ ساتھیوں کو بھی لڑا سکتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''انور بھائی! سچ پوچھو تو میں نے یہاں ابھی تک جو فیصلے کیے ہیں، وہ اسی کے مشورے سے ہوئے ہیں۔ ظاہری طور پر میں کمان دار کا کردار ادا کررہا ہوں لیکن اصل میں سب کچھ عمران ہی کررہا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو میں کچھ بھی نہیں ہوں۔''

انور خاں نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ کراہتے ہوئے ذرا پہلو بدلا اور بولا۔ ''خیر، ایسی بھی بات نہیں ہے تابش! تم نے یہاں زرگاں میں جو کچھ کیا ہے وہ مدتوں یاد رکھا جائے گا۔ تم نے ایک دوبدو مقابلے میں اس شخص کو مات اور موت دی ہے جو خود کو ناقابلِ شکست سمجھتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم نے ایک بہت بڑا بت توڑا ہے۔ اس بت کے ٹوٹنے سے ہی لوگ زندہ ہوئے ہیں اور اپنا آپ منوانے کے لیے گلی کوچوں میں آئے ہیں.....''

ہم باتیں کررہے تھے اور فائرنگ کی آوازیں بتدریج پھیلتی اور بڑھتی جارہی تھیں۔ یہ قیامت کا شور تھا جس میں گاہے بگاہے لرزہ خیز بارودی دھماکے بھی سنائی دیتے تھے۔

قلعے کے طول و عرض میں پُرجوش مسلمان نوجوانوں کے نعرے سنائی دے رہے تھے... ''شہادت یا موت۔''

انور خاں نے کہا۔ ''انسان حوصلہ نہ ہارے تو کچھ نہیں ہارتا۔'' پھر وہ تکیے سے سر اٹھا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ اینڈرسن اور حکم کے دستے آگے بڑھ رہے ہیں۔ شاید وہ قاسمیہ کے درمیان تک پہنچ چکے ہیں۔''

انور بولا۔ ''یہ بات تو طے ہے کہ ہمیں پیچھے ہٹنا پڑے گا۔ ہمارا آخری مورچا یہ قلعہ ہی ہوگا۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ہم کتنی دیر تک اپنے حریفوں کو قاسمیہ کے گلی کوچوں میں روک سکتے ہیں۔ اس بارے میں تمہارا اندازہ کیا ہے؟''

میں نے کھڑکی میں کھڑے ہوکر بغور اردگرد کا جائزہ لیا۔ مجھے صورتِ حال زیادہ حوصلہ افزا نظر نہیں آئی۔ ظاہر ہے عام شہری اور نیم فوجی دستے ایک باقاعدہ فوج کا مقابلہ زیادہ دیر نہیں کرسکتے تھے۔ میں صاف دیکھ رہا تھا کہ اب لڑائی قاسمیہ کے عین وسط میں ہورہی ہے۔

میں نے کہا۔ ''انور بھائی! لگتا ہے کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے تک ہمیں قلعے میں محصور ہونا پڑے گا۔''

''جو خندق تم کھدوا رہے ہو، اس کی پوزیشن کیا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''وہ جگہ مجھے یہاں سے نظر نہیں آرہی لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ مکمل ہوچکی ہے۔''

''یہ اللہ کا خاص کرم ہوا ہے۔'' انور خاں بولا۔ ''لیکن... وہ عورت کون تھی جس نے تمہیں فصیل کے کمزور حصے کے بارے میں بتایا؟''

''سچی بات یہ ہے انور بھائی کہ اس میں بھی مجھ سے زیادہ عمران کا کردار ہے۔ وہ عورت عمران کی کوئی جاننے والی تھی۔ اسی نے عمران کو یہ اطلاع دی تھی۔''

''تابش! اگر ہم یہ لڑائی جیتنے میں کامیاب ہوگئے تو اس میں اس ''اطلاع'' کا بھی بہت بڑا حصہ ہوگا۔''

زخمی انور خاں نے جو اگلا سوال مجھ سے کیا، اس نے ایک بار پھر مجھے غم کے اتھاہ سمندر میں ڈبو دیا۔ اس نے پوچھا۔ ''تابش! تمہارا بچہ ماں کے بغیر بے حال ہے۔ سلطانہ اب کہاں ہے؟''

میں ایک دم خاموش ہوگیا۔ ایک ٹیس سینے سے اٹھی اور پورے جسم میں پھیل گئی۔

میں نے کہا۔ ''انور بھائی! سلطانہ اب وہاں ہے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ شاید تمہیں پتا نہیں چل سکا۔ وہ زرگاں کے قبرستان میں سو رہی ہے۔''

انور خاں کا چہرہ زرد ہوگیا۔ وہ کتنی ہی دیر گم صم رہا۔ میری آنکھوں کے سامنے بھی سلطانہ کے آخری لمحات کا منظر گھومنے لگا۔ اس کا سر میری گود میں تھا۔ رخساروں کے انار، آنکھوں کی روشنی کی طرح بجھتے چلے جارہے تھے... اس نے خاموشی کی زبان میں کہا تھا... خدا حافظ میرے شریکِ حیات۔ لیکن میں ہمیشہ آپ کے پاس رہوں گی۔ میں موتیے اور گیندے کے پھولوں میں آپ کو ملوں گی... اور چاندنی راتوں کی ٹھنڈک میں اور صبح دم چلنے والی ہوا میں۔ اور مہروج! جب کسی تپتی دوپہر میں برسات کے بادل چھائیں گے تو میں آپ کے پاس آجاؤں گی اور.....

انور خاں کی بھرّائی ہوئی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ ''یہ کب ہوا تابش... اور کیسے؟''

میں نے مختصر الفاظ میں انور خاں کو وہ ساری دل فگار روداد سنادی۔ سلطانہ اور آفتاب خاں کا گھیرے میں آنا۔ ہاشم رازی عرف ہاشو کی ہٹ دھرمی۔ رنجیت پانڈے کی عیاری... اور پھر ماریا کے ساتھ ساتھ سلطانہ کی موت... میں نے سب کچھ انور کے گوش گزار کیا.....

ہمارے ٹھکانے یعنی پرانے قلعے کے گرد لڑائی کا گھیرا تنگ ہوتا جارہا تھا۔ قاسمیہ کے گلی کوچوں میں لڑائی ہورہی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر طرح کے ہتھیار استعمال ہورہے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ حکم اور اینڈرسن کے سپاہیوں کے پاس ایل ایم جی... اور ایم جی تھری ٹائپ کی گنز بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ دستی بموں اور راکٹ لانچرز کے دھماکے بھی تواتر سے سنائی دے رہے تھے۔ مرکزی حصے میں جگہ جگہ آگ بھڑکی ہوئی تھی... زخمی تیزی سے قلعے میں آرہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ان زخمیوں کی جگہ لینے کے لیے تازہ دم جوانوں کو باہر بھیجنا ضروری ہے۔ میں انور خاں سے اجازت لے کر نیچے چلا گیا۔ مجھے دیکھتے ہی بے شمار مسلح افراد میرے گرد جمع ہوگئے۔ ان کا جوش و خروش دیدنی تھا... میں نے ایک کمان دار سے کہا کہ وہ فوری طور پر سو ڈیڑھ سو افراد کا دستہ تیار کرے اور دفاع کرنے والوں کو کمک مہیا کرے۔

میرے کہنے کی دیر تھی کہ اس ہدایت پر عمل ہوگیا۔ دو منٹ کے اندر ایک لہریے دار جھنڈے کے نیچے ڈیڑھ دو سو جنگجو جمع ہوگئے اور پھر اپنے کمان دار کے عقب میں گھوڑے دوڑاتے قلعے سے باہر نکل گئے۔ جوں جوں لڑائی کی شدت بڑھ رہی تھی، عمران اور چوہان وغیرہ کی سلامتی کے حوالے سے میرے خدشے بھی بڑھتے جارہے تھے۔ یہی وقت تھا

جب قلعے سے صرف نصف فرلانگ کی دوری پر کئی زوردار دھماکے ہوئے۔ بھڑکنے والے شعلوں کا نارنجی عکس اب قلعے کے اندر تک پہنچ رہا تھا۔ چند گھڑسوار بڑی تیزی سے گھوڑے دوڑاتے اندر داخل ہوئے۔ ان میں مبارک علی بھی شامل تھا۔ اس کا کندھا زخمی تھا اور خون اس کے سفید لباس کو تر بتر کر رہا تھا۔ وہ سیدھا میری طرف آیا۔ ادب سے سلام کرنے کے بعد اس نے کہا۔ ''جناب! لڑائی قلعے کے سامنے ہو رہی ہے۔ حسنات بھائی اور ان کے قریباً ایک ہزار جانثاروں نے کہا ہے کہ وہ آخر دم تک لڑیں گے۔ انہوں نے کہا ہے کہ باقی سب لوگن اپنی پوزیشنیں چھوڑ کر قلعے میں گھس جاویں اور دروازے بند کر لیویں۔ انہوں نے اس بارے میں آپ سے اجازت مانگی ہے.....''

''عمران صاحب کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بھی اگلی صفوں میں ہیں۔ انہوں نے بھی یہی بات کہی ہے۔'' پھر مبارک علی نے اپنی خود آلود قمیص میں ہاتھ ڈالا اور ایک تہ شدہ کاغذ نکال کر بولا۔ ''عمران صاحب نے یہ رقعہ بھی بھیجا ہے آپ کے لیے۔''

میں نے جلدی سے رقعہ کھولا، اس پر بس ایک ہی جملہ لکھا تھا۔ ''میری رائے ہے کہ باہر لڑنے والوں کو اب اندر آنے کی اجازت دے دی جائے۔''

میں نے مبارک علی سے کہا۔ ''ٹھیک ہے، تم لوگ موقع پر موجود ہو۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اب واپس آجانا چاہیے اور دروازے بند کر لینے چاہئیں تو ایسا کر لو۔''

مبارک علی تعظیمی انداز میں سر جھکا کر واپس چلا گیا۔ اس کے چاروں پانچوں ساتھی بھی واپس چلے گئے۔ میں بالائی منزل پر انور خاں کے پاس پہنچا تو وہ شدید زخمی ہونے کے باوجود اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور مختلف دستہ سالاروں کو پوزیشن سنبھالنے کے بارے میں ہدایات دے رہا تھا۔

... ایک گھنٹے کے اندر اندر لڑائی قلعے کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ پھر قلعے کے دو بڑے دروازے کھول دیے گئے اور مزاحمت کرنے والے مسلح شہری اور جنگجو تیزی سے قلعے میں داخل ہونے لگے۔ ان میں لڑکے، کم عمر نوجوان یہاں تک کہ عورتیں بھی شامل تھیں۔ انہوں نے لڑائی کی تربیت حاصل نہیں کر رکھی تھی، صرف اپنے جذبے اور حوصلے کی مدد سے انہوں نے کئی گھنٹوں تک حکم کی باقاعدہ فوج کا مقابلہ کیا تھا۔

پروگرام کے مطابق حسنات احمد اور اس کے جانثار ساتھیوں نے حملہ آور دستوں کو آخر وقت تک روکے رکھا یہاں تک کہ قلعے کے دروازے بند کر دیے گئے۔

میں قلعے کی بالائی منزل سے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے ایسے مناظر کے بارے میں تاریخ کی کتابوں میں پڑھا تھا یا فلموں میں دیکھا تھا۔ آج یہ سب کچھ جیتی جاگتی حالت میں نگاہوں کے سامنے تھا۔ گولیوں کی بوچھاڑیں، زخمیوں کی پکاریں، جگہ جگہ پڑی ہوئی لاشیں، بارود کی بُو، دھواں اور شعلے۔ شاید میں ڈیڑھ سو سال پہلے کی دہلی میں تھا۔ انگریزوں اور سکھوں نے لال قلعے کا گھیراؤ کر لیا تھا۔ تاجدار ہندوستان پر آخری ضرب لگانے کے لیے اور ہمیشہ سے تاراج ہونے والی دہلی کو پھر سے تاراج کرنے کے لیے وہ اپنی توپوں کو لوڈ کر رہے تھے اور اپنی سنگینوں کو چمکا رہے تھے۔ لیکن یہ دہلی نہیں تھا، یہ بھانڈیل اسٹیٹ تھی۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ مگر کیا تاریخ نے آخر تک خود کو دہرانا تھا؟

قلعے کے اندر واپس آنے والوں میں مجھے عمران نظر نہیں آیا۔ میری نگاہیں بے قراری سے اسے تلاش کرنے لگیں۔ آخر اس کی جھلک دکھائی دی اور میرے سینے سے اطمینان کی طویل سانس خارج ہوئی۔ وہ اور چوہان صحیح سلامت تھے۔ ایک گن اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے ہونٹوں میں بڑے اسٹائل سے سگریٹ دبا رکھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اس نہایت سنگین صورتِ حال کو بھی انجوائے کر رہا ہے۔ عمران اور چوہان سیدھے میرے پاس آئے۔ دونوں کے چہرے دھوئیں اور گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ قلعے کے دروازے بند ہو جانے کے بعد لڑائی کچھ دیر کے لیے تھم گئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ قلعے پر فیصلہ کن حملہ کرنے سے پہلے کمانڈر اینڈ رسن صف بندی کر رہا ہے۔

اسی دوران میں، میں نے حسنات احمد کو بھی دیکھ لیا۔ وہ بھی اپنے بیشتر ساتھیوں کے ساتھ بالکل آخری وقت میں قلعے کے اندر گھسنے میں کامیاب ہوا تھا۔ یہ حوصلہ افزا بات تھی... عمران نے سگریٹ کا دھواں میری طرف چھوڑتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ''ٹھیک ٹھیک بتانا... میں اس وقت فرسٹ بلڈ کے ہیرو جان ریمبو کی طرح نہیں لگ رہا؟''

''لگ رہے ہو۔ لیکن فرسٹ بلڈ میں جان ریمبو زندہ بچ گیا تھا۔ یہاں ایسا سین نظر نہیں آ رہا۔''

''جگر! تمہاری سوچ ہمیشہ منفی ہوتی ہے۔ ہم یہ لڑائی جیتیں گے اور زندہ بھی رہیں گے... نہ صرف زندہ رہیں گے بلکہ لاہور بھی پہنچیں گے... نہ صرف لاہور پہنچیں گے بلکہ ہفتے کی کسی خوب صورت شام کو پی سی میں بوفے ڈنر بھی کریں

گے... اور نہ صرف ڈنر کریں گے بلکہ واپسی پر میں تمہیں رکشے میں بھی بٹھاؤں گا.....“

”کیا مطلب؟“

”بھئی واپسی پر تم میرے ساتھ موٹر سائیکل پر نہیں بیٹھ سکو گے نا۔ میرے ساتھ تو ریما جی ہوں گی۔ ہم نہر کے ساتھ ساتھ ٹھنڈی ہوا میں دور تک جائیں گے... اوہو ہو... جب ریما جی میرے ساتھ چپک کر بیٹھی ہوں، موٹر سائیکل اڑی جا رہی ہو اور راستے میں اسپیڈ بریکر آجائے... تو تمہاری قسم مزہ ہی آجاتا ہے۔ ایک بار تو شوٹنگ پر.....“

یکایک رائفل کا ایک برسٹ آیا۔ کھڑکی کے تختوں میں چھید ہو گئے اور ہماری عقبی دیوار سے بہت سا پرانا پلاستر اکھڑ کر فرش پر آگرا۔

میں اور عمران بے ساختہ نیچے جھک گئے تھے۔ کچھ فاصلے پر حسنات اور چوہان بھی موجود تھے۔ بہر حال، کوئی نقصان نہیں ہوا۔ میں نے کہا۔ ”تم جب بھی جھوٹ بولتے ہو اس طرح کا کوئی واقعہ ہو جاتا ہے۔“

”میں نے تو ابھی کچھ کہا ہی نہیں تھا۔“

”لیکن کہنے تو لگے تھے۔“

”مجھے لگتا ہے اینڈرسن کے فوجیوں میں ضرور کوئی ریما جی کا عاشق موجود ہے۔“ اس نے ہولے سے کہا اور اپنی گر جانے والی پی کیپ اٹھا کر پھر سر پر رکھ لی۔

لڑائی کی شدت میں واقع ہونے والی کمی صرف پانچ دس منٹ تک رہی۔ اس دوران میں ہم سب نے اپنی پوزیشنیں سنبھال لیں۔ اچانک ہی اینڈرسن کی زیر کمان باقاعدہ فوج نے قلعے پر زبردست ہلا بول دیا۔ اس بات میں شبہ نہیں تھا کہ جدید ہتھیاروں سے لیس یہ دستے زبردست تربیت یافتہ تھے۔ وہ طوفان کی طرح قلعے کی طرف بڑھے۔ فصیل کے اوپر سے مسلمان سپاہیوں اور مسلح نوجوانوں نے ان پر زبردست فائرنگ اور خشت باری کی۔ اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ وہی ہوا جس کی توقع تھی اور جس کے بارے میں گیتا لکھی نے پیش گوئی کی تھی۔ اینڈرسن نے فصیل کے اسی کمزور حصے کو نشانہ بنایا جس کے سامنے ہم قوس نما خندق کھدوا چکے تھے۔ خندق سے نکلنے والی مٹی کنارے کے ساتھ ساتھ جما دی گئی تھی اور اس مٹی نے خندق کو اور بھی ناقابل عبور بنا دیا تھا۔

راکٹ لانچروں کے پے در پے دھماکے ہوئے۔ یہ بڑے سائز کے ڈیڑھ دو درجن راکٹ فصیل کے اسی کمزور حصے پر داغے گئے جو اینڈرسن اور اس کے ساتھیوں کے لیے ترپ کے پتے کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس جگہ سے فصیل میں بڑے بڑے شگاف ہو گئے اور وہ مسمار ہو گئی۔ ہر طرف دھواں اور بارود کی تیز بو پھیل گئی۔ مسمار ہونے والی فصیل کے عین سامنے قلعے کے احاطے میں ہم نے ایک مضبوط مورچا بنا رکھا تھا۔ انور خاں کے دو درجن بہترین ”لڑاکے“ اس مورچے میں میرے اور عمران کے ساتھ موجود تھے۔ جب وہی کچھ ہو جو بندے نے سوچ رکھا ہو تو اس کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔ یہاں بھی جو کچھ ہوا تھا، ہماری توقع کے عین مطابق ہوا تھا۔ جونہی فصیل کا کمزور حصہ مسمار ہوا، اینڈرسن کے گورے اور کالے فوجی سیلابی ریلے کی طرح اندر گھسے... تب انہیں علم ہوا کہ ان کے لیے راستہ صاف نہیں ہے۔ ان کے سامنے گہری خندق کی صورت میں ایک زبردست رکاوٹ موجود ہے۔ وہ رک گئے... ان کے رکنے، پلٹنے اور پوزیشنیں سنبھالنے میں جو دو تین منٹ کا وقت لگا، اس نے ان پر قیامت ڈھا دی۔ ہمارے مورچے سے ان پر گولیوں کی بارش کر دی گئی۔ یہ لرزہ خیز منظر تھا۔ اس وقت کی کیفیت کو لفظوں میں بیان کرنا شاید میرے لیے ممکن نہ ہو۔ ٹریگر دبا کر کسی زندہ شخص پر گولی چلانا اور پھر اسے گھائل ہو کر گرتے ہوئے دیکھنا... اور پھر دوسرے کو نشانہ بنانا۔ ان کی بے بسی، ان کی ناکام جدوجہد اور ان کی تڑپ پھڑک کو دیکھنا، یہ سب کچھ اور ہی طرح کا عمل تھا۔ مرنے اور زخمی ہونے والوں کی آخری کرب ناک آوازیں ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھیں.....

تین چار منٹ کے اندر فصیل کو گرانے والے اپنی غلطی کا خمیازہ بھگت چکے تھے۔ وہاں درجنوں لاشیں گری ہوئی تھیں۔ کچھ ہلاک شدگان خندق کے اندر بھی گر گئے تھے۔ اس فوری صدمے سے سنبھلنے کے بعد اینڈرسن کے گورے اور مقامی فوجیوں نے پیچھے ہٹ کر مختلف جگہوں پر پوزیشنیں لے لیں اور فائرنگ میں مصروف ہو گئے۔ ایک لحاظ سے ہم قلعے پر اینڈرسن اور حکم کا پہلا بڑا حملہ روکنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ لڑائی کی شدت میں بتدریج کمی آتی چلی گئی۔ ظاہر تھا کہ اب اینڈرسن اور اس کے اہم کمان دار ساتھی سر جوڑ کر بیٹھیں گے اور کوشش کریں گے کہ یہ رات گزرنے سے پہلے پہلے کسی اور طرف سے زوردار حملہ کیا جائے۔ قلعے کی بالائی منزل سے ہمیں صاف دکھائی دے رہا تھا کہ گھیرا ڈالنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ انہوں نے پورے قلعے کو گھیرا ہوا تھا۔ اردگرد کی سیکڑوں عمارتوں کی چھتوں پر بھی یہ لوگ موجود

تھے۔ ان کی کثیر تعداد کا اندازہ ان کی حرکت کرتی ہوئی مشعلوں اور ٹارچوں وغیرہ سے بھی ہوتا تھا۔ ان کا زیادہ اجتماع قلعے کے مرکزی دروازے کی طرف دکھائی دیتا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اگر وہ سیلابی ریلے کی طرح دروازے کی طرف بڑھے اور انہوں نے دروازہ توڑنا چاہا تو تادیر انہیں روکا نہیں جا سکے گا۔

میں نے عمران سے کہا۔ ”یار! اگر اب بھی نل پانی سے کوئی مدد نہ آئی تو پھر کب آئے گی؟“

”ہاں، اب تو انہیں آ جانا چاہیے.....“ عمران کے بجائے چوہان نے جواب دیا۔

یہ بڑے قیمتی لمحے تھے اور ان کی قدر و قیمت ہم سب کو معلوم تھی۔ اسی دوران میں حسنات احمد کا ایک ساتھی بڑے گھبرائے ہوئے انداز میں اندر داخل ہوا۔ اس نے حسنات احمد کے کان میں کچھ کہا۔ حسنات کا چہرہ بھی متغیر ہو گیا۔ وہ کچھ دیر جھجکتا رہا پھر میرے قریب آ کر بولا۔ ”جناب! ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔ آپ میرے ساتھ آئیں۔“

میں اور عمران، حسنات کے ساتھ سیڑھیاں اترے۔ حسنات کے دو تین ساتھی ہمارے ساتھ تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ وہ بھی کچھ سراسیمہ نظر آتے تھے۔ ہم قلعے کے برآمدے سے گزرے اور پھر ایک چھوٹے سے تہ خانے میں پہنچ گئے۔ یہ تہ خانہ کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوا تھا۔ ٹوٹے ہوئے شہتیر، بالے، لکڑی کے قدیم تختے، نہ جانے کیا کچھ یہاں بھرا ہوا تھا۔ اور ان سب چیزوں کے بیچ ٹوٹے پھوٹے فرش پر گیتا لکھی کی خون آلود لاش پڑی تھی۔ اس کے سینے پر بائیں طرف کسی تیز دھار آلے سے وار کیا گیا تھا۔ گیتا لکھی کے مرمریں گالوں پر انگلیوں کے گہرے نشانوں سے واضح ہوتا تھا کہ اس کا منہ کافی دیر تک دبا کر رکھا گیا ہے۔ گیتا نیم عریاں پڑی تھی۔ اس کے جسم پر سگریٹ سے داغنے کے کئی نشان بھی تھے۔

ہم حیرت اور صدمے سے گنگ کھڑے رہ گئے۔ حسنات کے ساتھی نے آگے بڑھ کر ایک گرم چادر گیتا کے لوچکاں جسم پر پھیلا دی۔

حسنات بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں نے اسے پہچان لیا ہے۔ یہ گیتا لکھی ہے۔ یہ راج بھون کی خاص ملازماؤں میں سے ہے۔ یہ راج بھون میں ناچنے والی لڑکیوں کو ٹریننگ دیوت تھی۔ اس کے سمبندھ بڑے بڑے لوگن سے تھے۔ اوہ خدایا! یقین نہیں آ رہا کہ یہ یہاں مری پڑی ہے۔“

عمران نے تاسف انگیز انداز میں کہا۔ ”اس پر دست درازی کی گئی ہے اور مارا پیٹا بھی گیا ہے.....“

عمران بغور موقعِ واردات کو دیکھنے لگا۔ حسنات کے ساتھی نے ایک گیس لیمپ اور پکڑ لیا۔ فرش پر قدموں کے نشان تھے۔ اس کے علاوہ گیتا لکھی کو گھسیٹے جانے اور مارنے پیٹنے کے شواہد بھی ملتے تھے۔ ایک نم کپڑا بھی ملا۔ اندازہ ہوا کہ یہ کپڑا گیتا لکھی کے منہ میں ٹھونسا گیا تھا یا ٹھونسنے کی کوشش کی گئی تھی۔ گیتا کی ایک ہاتھ کی انگلیوں سے خون رس رہا تھا۔ عمران نے غور سے انگلیوں کا معائنہ کیا۔

”لاش سب سے پہلے کس نے دیکھی؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے جناب!“ حسنات کا ایک ساتھی بولا۔ ”ہمیں مشعلوں کے لیے لکڑیوں کی جرورت تھی۔ ہم یہاں آئے تو درواجے کو باہر سے کنڈی چڑھی ہوئی تھی۔ ہم نے درواجا کھولا تو خون کی لکیر نجر آئی۔ جرا آگے بڑھے تو یہ لاش تھی۔“

”تمہیں پتا چل گیا کہ یہ کس کی لاش ہے؟“

”ج... جی ہاں۔“ دوسرا شخص بولا۔ ”یہ بڑی مشہور عورت ہیں جی۔ ہم نے ان کی بہت سی تصویریں بھی دیکھی ہوئی ہیں۔“

”تم لوگ کسی پر شک کر سکتے ہو؟“

”ناہیں جی۔ ہمیں کچھ اندا جا ناہیں۔ ہم تو اس بات پر حیران ہو رہے ہیں کہ یہ لال بھون کے ناچ گھر سے یہاں اس قلعے میں کیسے پہنچی ہیں؟“

عمران کا چہرہ تو سپاٹ تھا لیکن اس کے اندر کا گہرا دکھ میں نے محسوس کیا۔ یہ جواں سال عورت جس کا نام گیتا لکھی تھا، اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود اب تک ہمارے لیے سودمند ہی ثابت ہوئی تھی۔ صرف ایک رات پہلے تک یہ عمران کے ساتھ ایک تنہا کمرے میں موجود تھی اور اپنی معلومات کے عوض اس کے پیار اور قربت کی طالب ہو رہی تھی۔ اب وہ اپنی تمام خواہشات سمیت مٹی کا ڈھیر ہو چکی تھی۔ اور یوں لگتا تھا کہ وہ عمران سے اپنی خفیہ ملاقات کی وجہ سے ہی موت کا شکار ہوئی ہے۔

لاش کے بارے میں حسنات کے آدمیوں کو ضروری ہدایات دینے کے بعد ہم اوپر واپس انور خاں کے پاس آ گئے۔ وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے دو جاں نثار محافظ اس کی دونوں جانب چوکس کھڑے تھے۔

عمران کے اشارے پر میں نے ان محافظوں کو باہر

بھیج دیا۔ اب کمرے میں میرے اور عمران کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ انور خاں کو اس سارے معاملے کی خبر تھی جو یہاں ہمارے اور گیتا کھی کے درمیان ہوا تھا اور جس کے نتیجے میں ہم نے خندق کھدوانے والا نہایت مفید کام کیا تھا۔

گیتا کھی کے اس بہیمانہ قتل کی اطلاع نے انور خاں کو بھی پریشان کر دیا۔ وہ بولا۔ ”میرے اندازے کے مطابق یہ کافی پیچیدہ معاملہ ہے برادرز... میں نے تمہیں جیل میں بتایا تھا نا کہ جیل پر ہم نے ایک زبردست حملہ کیا تھا۔ اگر وہ حملہ ناکام ہوا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ ہمارے اندر سے یہ غداری ہوئی۔ ہمارے شب خون کی اطلاع پہلے سے جیل کے گارڈز کو ہو چکی تھی۔ اب یہاں بھی کوئی ایسی ہی بات لگ رہی ہے۔ ہمارے اندر ہی کوئی ایسا بندہ موجود ہے جو ہمیں نقصان پہنچا رہا ہے۔ اس بندے کو گیتا کھی اور عمران کی ملاقات کا علم ہوا ہے اور اس کا نتیجہ گیتا کھی کی موت کی شکل میں نکلا ہے۔“

”کون ہو سکتا ہے؟“ عمران کی کشادہ پیشانی پر سوچ کی لکیریں پھیل گئیں۔

”میں بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ انور خاں نے کہا۔ ”جیل والے واقعے کے بعد مجھے اپنے ایک ساتھی پر شبہ تھا مگر وہ شبہ درست نہیں نکلا۔ ہاں، اس بات کا یقین مجھے اب پہلے سے زیادہ ہو گیا ہے کہ وہ بندہ ہمارے قریبی ساتھیوں میں موجود ہے۔“

میں نے اپنی سوچ کے گھوڑے دوڑائے۔ کون ہو سکتا تھا؟ انور خاں کے ساتھ جو لوگ یہاں زرگاں پہنچے تھے، وہ تو سب بھروسے کے تھے اور انہیں ہم اچھی طرح جانتے بھی تھے۔ ان میں ڈاکٹر چوہان، عبدالرحیم اور اجے کمار بھی شامل تھے۔ اس کے بعد بھرت اور امرناتھ تھے۔ مالا تھی اور اس کا شوہر ستیش جو اب کافی حد تک بدل چکا تھا۔ مبارک علی، منیر فیروز اور حسنات کے بارے میں بھی کسی طرح کا شبہ رکھنا غلط تھا۔ وہ انور خاں کے جاں نثار تھے اور ان کی اب تک کی کارکردگی سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل تھی۔

ہم دیر تک اس معاملے پر غور کرتے رہے، کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ انور خاں کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ جس شخص یا اشخاص نے جیل کا شب خون ناکام بنایا تھا، وہی اب گیتا کھی کی دردناک موت کا بھی ذمے دار ہے... یا ذمے دار ہیں۔

”اس کا مطلب ہے کہ ہم سب کو حد سے زیادہ چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔“ میں نے کہا۔

عمران اور انور خاں نے میری بات کی تائید کی۔ میں نے حسنات اور مبارک علی کو بتایا اور ان دونوں کو اس سلسلے میں ضروری ہدایات دیں۔ انور خاں کو بولنے میں کافی دقت ہو رہی تھی، اس لیے زیادہ تر ہدایات میری زبانی ہی جاری ہو رہی تھیں۔ ہم نے اسلحے کے گودام کی سیکیورٹی تین گنا کر دی۔ دیگر اہم مقامات پر بھی نفری میں اضافہ کر دیا گیا۔

ڈاکٹر چوہان جی جان سے زخمیوں کی دیکھ بھال میں لگا ہوا تھا۔ چند اور افراد بھی اس کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ ان میں آنجہانی ڈاکٹر لی وان کا ایک اسسٹنٹ بھی شامل تھا۔ میں چوہان کی حوصلہ افزائی کے لیے شفاخانے کی طرف گیا۔ یہ عارضی شفاخانہ ہنگامی بنیادوں پر قلعے کے شمالی حصے میں قائم کیا گیا تھا۔ یہاں دو تین جنریٹرز کا اہتمام بھی تھا۔

زخمیوں میں سے زیادہ تر کو گولیوں اور تلواروں کے زخم آئے تھے۔ ہر طرف زخمیوں کی کراہیں اور سسکیاں گونج رہی تھیں۔ ان کو حتی الامکان طبی امداد دی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر چوہان ہمیں کہیں نظر نہیں آیا۔ آخر عمران نے اسے شفاخانے کے انٹینسو وارڈ میں دیکھ لیا۔ یہاں زیادہ نازک حالت والے زخمی تھے۔ ان میں سے کچھ کو جلنے سے زخم آئے تھے۔ ایک زخمی کے پیٹ میں راکٹ کے پرخچے لگے تھے۔ وہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ ایک شخص کا بازو بارود کی دھماکے میں جھلس گیا تھا۔ چوہان ایک نرس کی مدد سے اس کی مرہم پٹی کرنے میں مصروف تھا۔ میں نے ہولے سے اس کا کندھا تھپکا۔ وہ مڑ کر میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے سے تھکن ٹپک پڑ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ بس ایک چھوٹے سے وقفے کے سوا پچھلے چوبیس گھنٹے سے کام کر رہا ہے۔ اسے آرام اور اچھے کھانے کی ضرورت تھی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ اگر وہ اپنا خیال نہیں رکھے گا تو پھر خود بھی مریضوں میں شامل ہو جائے گا۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے، دو تین گھنٹے بعد وہ کچھ دیر کے لیے اوپر جا کر آرام کر لے گا۔

بھرت بھی ہمارے ساتھ تھا۔ وہ مسلمانوں جیسے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اونچی ذات کا ہندو ہے۔ وہ ایک مریض کے پاؤں سے بہنے والا خون اپنے ہاتھ سے صاف کر رہا تھا۔ بھرت کی شخصیت اسے ایک مختلف فرد بناتی تھی۔ وہ ایک ناکردہ گناہ کی سزا میں گوروں کے جبر کا شکار ہوا تھا اور پھر یہاں پہنچا تھا۔ وہ اپنا نہیں تھا لیکن بیگانہ بھی نہیں تھا۔

میں اپنے سامنے لیٹے ایک تنومند زخمی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا سینہ اور چہرہ بھی جھلسا ہوا نظر آتا تھا۔ پورے چہرے پر پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ اس نے سینے تک ایک سفید چادر کھینچی

ہوئی تھی۔ اس نے چادر ہٹائی تو نیچے خطرناک سیون ایم ایم رائفل نظر آئی۔ بڑی پھرتی سے اس نے رائفل میری اور عمران کی طرف سیدھی کی اور ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”خبردار... چھلنی کر دوں گا۔“ وہ دہاڑا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے مہارت سے گولی چلائی۔ ایک گارڈ جو رائفل سیدھی کرنی چاہ رہا تھا، الٹ کر دروازے کے پاس گرا۔ گولی عین اس کے دل کے مقام پر لگی تھی۔

”خبردار... اڑا دوں گا۔ اڑا دوں گا۔ ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔“ رائفل بردار پھر بولا۔ اس کی صورت نظر نہیں آ رہی تھی مگر اس کی آواز نے بتا دیا کہ وہ رنجیت پانڈے ہے۔

بھانڈیل اسٹیٹ کا عیار ترین اور خطرناک قاتل۔ اس کا سارا چہرہ پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا اور یہ پٹیاں یقیناً صرف چہرہ چھپانے کے لیے ہی لپیٹی گئی تھیں۔

میں نے اور عمران نے ہاتھ کھڑے کر دیے۔ چوہان چونکہ رنجیت کے بستر سے قریب تھا، اس نے بلا کی تیزی سے رنجیت پانڈے کی رائفل پر جھپٹا مارا۔ مگر یہ جعلی مریض، اصلی ڈاکٹر کو مات دے گیا۔ اس سے پہلے کہ چوہان اپنا ہاتھ پانڈے کی رائفل تک پہنچاتا، سیون ایم ایم کی گولی اس کی پیشانی توڑ کر اندر گھس گئی۔ رائفل پر سائیلنسر چڑھا ہوا تھا۔ یہ سب کچھ ناقابلِ یقین تھا۔

اس سے بہت پہلے کہ چوہان کا جسم فرش سے ٹکراتا، پانڈے کی رائفل پھر ہماری طرف سیدھی ہو چکی تھی۔ وہ ذرا سا موقع دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میری سکتہ زدہ نظریں چوہان پر جمی تھیں، اس کی پیشانی سے خون کی پہلی بوندیں خارج ہو رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہو کر پانڈے پر جھپٹتا، میری گردن سے کوئی سخت چیز آ لگی۔

”خبردار! گولی مار دوں گا۔“ عقب سے ایک جانی پہچانی آواز ابھری۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ عبدالرحیم کی آواز تھی۔ میں نے اور عمران نے تقریباً ایک ساتھ ہی مڑ کر دیکھا۔ عبدالرحیم ایک بھالا ہوا شخص نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے پر اجنبیت اور خفگی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اسی دوران میں ایک اور مریض اچھل کر بستر سے نیچے اتر آیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی چھوٹے بیرل کی رائفل نظر آئی۔

ڈاکٹر چوہان کی اچانک موت کا صدمہ اتنا شدید تھا کہ میں چکرا کر رہ گیا تھا۔ ایک لحظے کے لیے مجھے لگا کہ میں برداشت کھو دوں گا اور کچھ ایسا ہو جائے گا جو نہیں ہونا چاہیے... لیکن پھر عمران کے اوپر اٹھے ہوئے ہاتھ اور اس کے تاثرات دیکھ کر میں نے خود کو سنبھالا... اس سچویشن میں مزاحمت کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔ سفید پٹیوں کے اندر سے پانڈے کی فقط آنکھیں ہی نظر آتی تھیں... اور یہ آنکھیں گواہی دے رہی تھیں کہ ان کے اندر خون کی پیاس... جنون بن کر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ جنون، ان نازک لمحوں میں کوئی بھی قیامت برپا کر سکتا تھا۔ میں نے بھی اپنے ہاتھ اٹھا دیے۔

ایک بار پھر رنجیت پانڈے نے بیدردی سے کئی بار رائفل کا ٹریگر دبایا۔ سائیلنسر لگی رائفل سے سات آٹھ بار ”ٹھک ٹھک“ کی آواز بلند ہوئی۔ اس اسپیشل وارڈ میں موجود پانچ چھ مریض پلک جھپکتے میں زندگی سے موت کی طرف روانہ ہو گئے۔ پانڈے نے بڑی مہارت سے ان کے سینوں یا سروں میں گولیاں ماری تھیں۔ یہ بربریت کی انتہا تھی۔ عبدالرحیم اور پانڈے کے دوسرے ساتھی کی رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ یہ جدید رائفلیں تھیں، ایک سیکنڈ میں گولیوں کی بوچھاڑ کر سکتی تھیں۔ ان کی موجودگی میں صبر کا دامن چھوڑنے کا مطلب، خود موت کے جبڑوں میں اپنا سر دے دینے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

یہ دردناک منظر تھا۔ وارڈ میں موجود کم و بیش چھ مریض جو پہلے ہی اپنے جان لیوا زخموں کی وجہ سے کراہ رہے تھے، تین چار سیکنڈ کے اندر خون میں نہا گئے۔ ایک درمیانی عمر کے باریش شخص نے سینے پر گولی کھانے کے باوجود اٹھنے کی کوشش کی مگر پانڈے کی اگلی گولی نے اس کی شہ رگ چیر کر رکھ دی اور وہ بستر سے گر کر ٹھنڈا ہو گیا۔

”چلو آگے لگو میرے پیچھے۔“ پانڈے نے مجھ سے مخاطب ہو کر جنونی لہجے میں کہا۔ اس کی انگلی رائفل کے ٹریگر پر تھی۔

میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ ہم دونوں کے درمیان جیسے ایک ٹیلی پیتھی جیسا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ اکثر اوقات ہم بغیر کچھ کہے سنے بھی ایک دوسرے کی بات سمجھ لیتے تھے... شاید اکثر دوست جو پُرہنگام حالات میں زیادہ دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں اور کٹھن واقعات کا سامنا کرتے ہیں، اسی طرح ایک دوسرے کے رمز شناس ہو جاتے ہیں۔ ہم دونوں نے پانڈے کی ہدایت پر بے چون و چرا عمل کیا اور دروازے کی طرف بڑھے۔ بھرت بھی ہمارے ساتھ تھا۔

یہ لوگ ہمیں اندرونی سیڑھیوں کی طرف لے گئے۔ یہ نسبتاً تنگ اور تاریک سیڑھیاں تھیں۔ ہم قلعے کی بالائی منزل

پر پہنچے۔ جب ہم ایک غلام گردش سے گزر رہے تھے، کئی افراد نے ہمیں اس حالت میں دیکھا اور حیران ہوئے لیکن ان افراد میں سے کوئی بھی خاص ردِعمل ظاہر نہیں کر سکا۔ یہ سب لوگ چونکے ضرور لیکن اس سے پہلے کہ ان کا چونکنا کسی طرح کی کارروائی کا سبب بنتا، ہم اس کمرے میں داخل ہو چکے تھے جہاں انور خاں ایک بستر پر نیم دراز تھا۔ مبارک علی بھی اس کے پاس موجود تھا اور اس کے زخمی کندھے کی پٹی بدل رہا تھا۔

اس سچویشن نے ان دونوں کو بھی بُری طرح چونکایا۔ اندر داخل ہوتے ہی پانڈے نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا اور کھڑکیوں کو بھی چٹخنیاں چڑھا دیں۔ کمرے میں موجود ایک گارڈ نے جاں بازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے ہولسٹر سے پستول نکالا... مگر اس کے پستول سیدھا کرنے سے پہلے ہی ٹھک کی منحوس آواز بلند ہوئی اور یہ گارڈ ماتھے پر گولی کھا کر ایک میز پر گرا اور اسے چکناچور کر کے فرش بوس ہو گیا۔

''میرا نشانہ چوکتا نا ہیں حرامجادو۔ گولی چلا کر اڑتی مکھی کا پر کاٹتا ہوں۔'' پانڈے زہری ناگ کی طرح پھنکارا۔ لگتا تھا کہ وہ آج سفاکی کی ہر حد سے گزرنے کو تیار ہے۔

اس نے اپنے چہرے کی طویل پٹیاں اتار کر ایک طرف پھینک دیں۔ وہ ایک بنگی ٹائپ جیکٹ اور پتلون میں ملبوس تھا۔ اس نے جیکٹ کے اندر سے لوہے کے دو کڑے نکالے۔ دیکھنے میں یہ کڑے بائیسکل کو لگائے جانے والے تالے کی طرح لگتے تھے مگر اس تالے سے کچھ بڑے تھے۔ اسٹیل کے بنے ہوئے ان کڑوں کی ایک جانب ایک ڈیجیٹل میٹر بھی بنا ہوا تھا اور ہندسے حرکت کر رہے تھے۔ پانڈے نے اپنی قاتل رائفل ہماری طرف سیدھی رکھی اور ایک کڑا اپنے تنومند ساتھی کو تھما دیا... اس نے آگے بڑھ کر اسٹیل کا یہ کڑا شدید زخمی انور خاں کی گردن میں پہنا دیا۔ ''کھٹ'' کی آواز سے کڑا لاک ہوا اور اس پر ایک سرخ بلب جل اٹھا۔ یہ سارا عمل بس چار پانچ سیکنڈ کے اندر مکمل ہو گیا۔

دروازے سے باہر ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ کچھ لوگ دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ پھر حسنات احمد کی پریشان آواز سنائی دی۔ ''مبارک! دروازہ کھولو... کون ہے اندر؟''

جب حسنات نے یہ فقرہ دو تین بار دہرایا تو پانڈے کرخت آواز میں مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''پپو! دیکھتا کیا ہے۔ سسرے کھڑکی کھول... اور اس ذلیل سے بول کہ ابھی کچھ دیر چھری کے نیچے سانس لے۔ اندر انور خاں کی ماں، بہن کے ساتھ جروری کام ہو رہا ہے۔''

میں نے یہ فقرہ بمشکل برداشت کیا اور عمران کی طرف دیکھا۔ عمران نے آنکھوں آنکھوں میں کہا کہ فی الحال پانڈے کی ہدایت پر عمل کرنا ہی مناسب ہے۔

میں نے کھڑکی تھوڑی سی کھولی۔ باہر حسنات اور مبارک کے مشتعل ساتھیوں کا ہجوم نظر آیا۔ ہر ایک کا چہرہ سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔

''کھبر دار! کوئی فالتو بات کی تو تیرا گندا بھیجا دیوار سے چپکا دوں گا۔'' پانڈے پھنکارا۔

میں نے حسنات سے کہا۔ ''پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ہم کچھ مشورہ کر رہے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں دروازہ کھولتے ہیں۔''

''لیکن... آپ پر رائفلیں اٹھانے والے یہ لوگ کون ہیں؟ اور ان میں سے ایک تو شاید عبدالرحیم ہے۔''

''ہاں... وہ بھی ہے لیکن اب معاملہ طے ہو رہا ہے۔ کچھ دیر میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' میں نے حسنات احمد کو تسلی دی۔

''ہمارے پاس زیادہ ٹائم نا ہیں ہے جی۔ بڑے دروازے کے سامنے اینڈرسن کے لڑاکا دستے جمع ہو رہے ہیں۔ وہ کسی بھی وقت ہلا بول سکت ہیں.....'' حسنات نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ ہم زیادہ وقت نا ہیں لگائیں گے۔'' میں نے کہا اور کھڑکی بند کر دی۔

پانڈے آتشیں نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے گہرے سانولے چہرے پر جلنے کا کوئی نشان نہیں تھا۔ یہ بات واضح تھی کہ اس نے پسپا ہوتے مسلمان سپاہیوں کے ساتھ قلعے میں گھسنے کے لیے یہ ڈھونگ رچایا تھا۔ اس نے ایک زخمی کی حیثیت سے اپنا منحوس تھوبڑا پٹیوں میں لپیٹ لیا تھا اور یہاں پہنچ گیا تھا۔ اس کی عیاری اور خطرات پسندی کے بارے میں ہم نے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ آج یہ سب کچھ درست ثابت ہوا تھا۔ نل پانی کے دیوان کی طرح وہ یہاں بھی بے خوف گھس آیا تھا اور اب ایک جنونی قاتل کی حیثیت سے ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے عقب میں دائیں طرف عبدالرحیم کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ یہ اسی بدترین شخص کا چہرہ تھا جو ہمیشہ سے مسلمانوں کے اندر رہا ہے اور آستین کے سانپ کا کردار ادا کرتا رہا ہے۔ تاریخ کے اوراق پیچھے کی

طرف پلٹتے جائیں، یہ شخص اپنی تمام تر نحوست کے ساتھ ہر کٹھن وقت میں پایا جائے گا۔ عبداللہ بن ابی سے لے کر میر جعفر اور میر صادق تک، اور پھر وہاں سے لے کر موجودہ دور کے نامی گرامی غداروں تک یہ شخص ہر جگہ کھڑا نظر آتا ہے۔ یہ یہاں بھی انور خاں کے قریبی ساتھی عبدالرحیم کی صورت میں موجود تھا۔ اب اس میں شک کی گنجائش نہیں تھی کہ انور خاں کا یہی ساتھی تھا جس نے جیل پر کیے جانے والے زوردار حملے کو ناکام بنایا تھا۔ یقیناً اینڈرسن یا منیارڈ جیسے کسی شاطر گورے نے اسے ''چمک'' دکھا کر اپنے جال میں پھنسایا تھا اور بازی پلٹی تھی۔

میں نے عبدالرحیم کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ بھی پوری ڈھٹائی سے میری طرف دیکھ رہا تھا... دو دن پہلے یہ شخص میرے گلے لگ کر رویا تھا اور سلطانہ کی موت پر آنسو بہائے تھے۔ آج یہ بڑے طمطراق سے مجھ پر رائفل تانے کھڑا تھا۔ اپنے آقاؤں کے ایک اشارے پر یہ میرے جسم میں ایک درجن سوراخ کر سکتا تھا۔ اب یہ بات بھی ثابت تھی کہ گیتا مکھی کی موت کا ذمے دار بھی یہی عبدالرحیم ہے۔ جب گیتا مکھی، عمران سے ملاقات کے لیے کمرے میں داخل ہوئی تھی... یہ کمرے سے باہر پہرے والوں کے ساتھ موجود تھا۔

پانڈے نے سگریٹ سلگایا اور بڑے اطمینان سے بولا۔ ''پپو! میرا خیال ہے کام کی بات کر لیوں۔ ہمارے پاس جیادہ سے نا ہیں ہے۔ ویسے بھی تم سب کو بڑے جور کی لگ رہی ہووے گی۔ جتنی جلدی فارغ ہو جاؤ، اتنا ہی اچھا ہے۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا اسٹیل کا کڑا ہمیں دکھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ اسٹیل کا کڑا ہے اور مجے کی بات یہ ہے کہ اسٹیل صاحب کا ہی بنایا ہوا ہے۔ مرنے سے پہلے یہ آخری تحفہ وہ تم دونوں کے لیے چھوڑ گئے ہیں۔ مجھے پوری آشا ہے کہ جب یہ تحفہ تم دونوں کی دم میں خمدہ فٹ کرے گا تو اسٹیل صاحب کی آتما کو جرور شانتی ملے گی۔''

''جو بکواس کرنی ہے صاف صاف کرو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

وہ بولا۔ ''یہ کڑا عجت مآب جناب خان صاحب کی گردن میں فٹ ہو چکا ہے۔ اس میں جبردست قسم کا دھماکا خیج مواد ہے۔ یہ پھٹے گا تو خان صاحب کے چیتھڑے اڑ جاویں گے۔ ان کے شریر (جسم) کے سارے ظاہری اور پوشیدہ ٹکڑے اڑ اڑ کر اس کمرے کی دیواروں سے چپکیں گے۔ یہ دیکھ لو، اس کے اوپر میٹر چل رہا ہے۔ الٹی گنتی ہو رہی ہے۔ صرف اور صرف تیس منٹ ہیں تم لوگن کے پاس... بلکہ اب تیس بھی کیا صرف ستائیس رہ گئے ہیں۔ اب تم دونوں کے ذلیل دماغوں میں جرور آئے گا کہ اپنے خان صاحب کی جان اس کڑے سے کیونکر چھڑوائی جاوے... تم سوچو گے کہ کس طرح ہمیں ''ناک آؤٹ'' کر دو اور پھر یہ کڑا خان صاحب کی گردن شریف سے اتار پھینکو... لیکن ایک بات میں تم کو بالکل صاف صاف بتا دیوت ہوں۔ یہ کڑا کسی بھی طرح خان صاحب کی گردن سے اتارنے کی کوشش کی گئی تو یہ بلاسٹ ہو جاوے گا... اس کو کھولنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے۔ بس ایک ہی.....''

ہم خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنی حرکات و سکنات اور اپنے لب و لہجے سے واقعی بے حد خطرناک دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ہمارے چہرے دیکھے پھر اپنے سوال کا جواب خود ہی دیتے ہوئے بولا۔ ''اس کی کوئی چابی وابی نا ہیں ہے۔ اس کی چابی اس کا کوڈ ہے۔ بارہ ہندسوں کا کوڈ... اور وہ کوڈ صرف میں جانت ہوں۔ اور میں بہت بڑا کمینہ ہوں۔'' اس نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ اس کی آنکھیں نشے میں سرخ تھیں... ''اور یہ کمینہ پن میں نے اپنے تئیں نا ہیں رکھا۔ آگے بھی چلایا ہے۔ بھگوان کی کرپا سے زرگاں کے آدھے سے جیادہ کمینے بچے میرے ہی چھوڑے ہوئے ہیں۔ اس شہر میں بہت سے غیر قانونی سالے ہیں میرے۔ یہ عجت مآب خان صاحب بھی ان میں سے ایک ہو سکتے ہیں.....'' اس کے لہجے میں زہر تھا اور آگ تھی۔

انور خاں سے یہ ریمارکس برداشت نہیں ہوئے۔ سخت زخمی ہونے کے باوجود اس نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی۔ پانڈے نے بے دریغ گولی چلا دی۔ ''ٹھک'' کی آواز کے ساتھ گولی انور خاں کی ناک کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔

''حرامجادے! اگلی گولی سے تیرا نار یل پھوڑ دوں گا۔''

انور خاں کا چہرہ سرخ... انگارہ ہو گیا لیکن یہ بات وہ بھی جانتا تھا کہ ان لمحوں میں دلیری دکھانا، ہوش و حواس کے زمرے میں نہیں آئے گا۔

رنجیت پانڈے کا پارا چڑھتا جا رہا تھا۔ وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ ''اس کڑے کو کھولنے کا کوڈ صرف میں جانت ہوں۔ اور وہ کہیں لکھا ہوا نا ہیں ہے۔ بس یہاں ہے یہاں... میرے کھوپڑے میں۔'' اس نے انگلی سے اپنی کنپٹی کو ٹھونکا۔ ''اگر تمہارے گندے دماغوں میں مجھے مارنے کا کیڑا رینگ رہا ہے تو اس کیڑے کو پکل دو کیونکہ اگر کسی وجہ

سے میں مرگیا تو تمہارے اس خان صاحب کو دو ڈھائی ہجار ٹکڑوں میں بٹنے سے کوئی نا ہیں بچا سکے گا۔''

''تم چاہتے کیا ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بھی بتا دیوت ہوں پپو۔ پہلے تم دونوں کے کھوپڑوں میں گھسے ہوئے شک کا کچومر تو نکال دوں۔ مجھے پتا ہے تم دونوں بُوگیر کتوں جیسے ہو — بڑی دور دور کی بُو سونگھنے کی کوشش کرت ہو۔ جو کچھ میں نے تمہیں بتایا ہے، اس کے ثبوت کے لیے یہ دوسرا ''اسٹیل رنگ'' حاضرِ خدمت ہے۔''

اس نے وہ دوسرا کڑا ہماری آنکھوں کے سامنے لہرایا جو ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کڑے پر بھی بالکل دوسرے کڑے کی طرح ڈیجیٹل میٹر لگا ہوا تھا۔ اس نے اس کڑے کو لاک کیا۔ اس پر سرخ بلب روشن ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی میٹر پر الٹی گنتی شروع ہوگئی۔ پچیس... چوبیس... تیئس.....

رنجیت بولا۔ ''تم دونوں کے والد سورگ باشی اسٹیل صاحب نے یہ بڑے کمال کی چیز بنائی ہے۔ یہ دیکھو اس ''رنگ'' پر پچیس سیکنڈ کا ٹائم فکس تھا۔ پندرہ سیکنڈ گزر چکے، دس سیکنڈ باقی ہیں۔ لو اس کی کارکردگی ملاحیہ کرو۔'' اس نے احاطے کی طرف والی کھلی کھڑکی میں سے اسٹیل رنگ باہر پھینک دیا۔ احاطے میں یقیناً یہ اسٹیل رنگ لوگوں کے درمیان ہی گرا ہوگا۔ کچھ کرنے یا کہنے سننے کا وقت ہی نہیں تھا۔ پانچ چھ سیکنڈ بعد ایک زبردست دھماکا ہوا۔ دھماکے کے ساتھ تیز چمک بھی تھی۔ بچوں اور عورتوں کے چلّانے کی کرب ناک آوازیں بلند ہوئیں۔ احاطے کے اس حصے میں بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ میں نے وحشت زدہ نظروں سے دیکھا۔ انسانی گوشت کا ایک ٹکڑا کھڑکی کے پٹ سے آچپکا تھا۔ اس چھوٹے سے ٹکڑے کے ساتھ کپڑے کی ایک دھجی بھی تھی۔ یہ شاید کسی بچی کا پھول دار فراک تھا۔

پانڈے کے چہرے پر درندگی ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ وہ کتنا بھیانک شخص ہے۔ تل پانی میں میرے ساتھ لڑتے ہوئے وہ کسی وجہ سے پسپا تو ضرور ہوا تھا مگر پسپا ہوتے ہوتے بھی ایک خوف ناک بم بلاسٹ کر گیا تھا جس میں درجنوں افراد کی جان گئی تھی۔ وہ ہماری طرف دیکھ کر بولا۔ ''میرا وچار ہے کہ اب تمہیں وشواس ہو گیا ہوگا کہ یہ کوئی ناٹک نہیں ہے۔ خان صاحب کی گردن شریف میں جو پٹا ڈالا گیا ہے، وہ جرور ان کے جسم کے پوشیدہ ٹکڑوں کو اس کمرے کی دیواروں اور چھت سے چپکائے گا۔'' پھر اس نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی اور بولا۔ ''اور اب ہمارے پاس بچا ہے فقط بیس منٹ کا سے۔ ان بیس منٹوں کے اندر اندر تمہیں اس قلعے کا بڑا دروازا کھلوانا ہے اور اس سارے معاملے کو بغیر لڑائی مار کٹائی اور جیادہ خون خرابے کے حل کرنا ہے۔ اور میں جانت ہوں کہ یہ کام عجت مآب جناب خان صاحب کر سکت ہیں یا تم کر سکت ہو۔'' اس نے اپنی بھدّی کالی انگلی میری طرف سیدھی کی۔

میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ اس کی پیشانی کی رگ ابھری ہوئی تھی۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔

''تم چاہتے ہو ہم اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا کاٹ لیں؟'' عمران نے کہا۔

''یہ گلا کاٹنا ناہیں ہووے گا۔ یہ جندہ رہنے کا اور امن شانتی کا معاہدہ ہووے گا۔ اینڈرسن صاحب بہادر کی طرف سے یہ وچن ہے کہ دروازا کھول دیا جاوے تو کسی عورت، مرد، بچے سے کوئی جیادتی ناہیں ہووے گی۔ عام معافی کا اعلان کیا جاوے گا۔''

انور خاں پھنکارا۔ ''حکم جیسے دغاباز اور اینڈرسن جیسے عیار لومڑ کی باتوں پر یقین کرنے والا کوئی دیوانہ ہی ہوگا۔ اینڈرسن اپنی گندی زبان سے پہلے بھی ایسے بہت سے وعدے کرتا رہا ہے... اور یہی کام جارج گورا کا ہوا کرتا تھا.....''

''دیکھو خان صاحب! یہاں لمبا بھاشن ناہیں چلے گا۔ سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ اور میں تم کو صاف صاف بتا دیوت ہوں۔ ہمارے فوجی دستوں نے اندر تو آنا ہی آنا ہے۔ یہ دروازا کھلے گا ناہیں تو پھر ٹوٹ جاوے گا۔ اور اگر یہ ٹوٹے گا تو پھر بہت بُرا ہووے گا۔ یہاں کیچڑ ہو جاوے گا تم لوگن کے خون سے۔ اور اس کیچڑ پر تمہاری روتی چلّاتی عورتوں سے بُرا بھلا بھی کریں گے ہمارے سینک۔ خود پر اور اپنے بال بچوں پر کرپا فرماؤ۔ دروازا کھلوا دو۔''

''یہ نہیں ہوسکتا۔ کسی صورت نہیں۔'' انور خاں کراہتے ہوئے بولا۔ ''یہ بم پھٹتا ہے تو پھٹنے دو۔ مجھے اپنی جان کی پروا نہیں۔''

پانڈے مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تم کیا کہتے ہو پپو؟ تمہیں بھی جناب خان صاحب کے جیون کی کوئی پروا نہیں؟ یہ محترم خان صاحب ہی ہیں جن کی لعنتی شخصیت کی وجہ سے زرگاں کے یہ مسلے یک جان ہیں، ورنہ یہ گندی نالے کے کیڑے ایک جگہ جمع ہونے کے بجائے زرگاں کی ایک سو دس نالیوں میں علیٰحدہ علیٰحدہ بہہ رہے ہوتے۔''

انور خاں کی گردن میں ''اسٹیل رنگ'' تھا اور اس ''رنگ'' کا ڈیجیٹل میٹر بڑی تیزی سے چل رہا تھا۔ یہ وحشت ناک صورتِ حال تھی۔ مجھے لگا کہ میری پیشانی پر پسینا چمکنے لگا ہے۔ پانڈے نے دونوں راستے ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیے تھے۔ ہمیں قلعے کا بڑا دروازہ کھلوانا تھا یا پھر اپنی اور انور خاں کی موت کو قبول کرنا تھا۔ ہمارے یعنی میرے، عمران اور بھرت وغیرہ کے لیے تو پھر بھی چانس موجود تھا۔ ہم پانڈے اور اس کے دونوں ساتھیوں پر غلبہ پانے کی کوشش کر سکتے تھے مگر انور خاں کی زندگی تو سو فیصد نشانے پر تھی۔ ہم کسی طرح پانڈے، عبدالرحیم اور تیسرے شخص کو بے بس کر بھی لیتے تو انور خاں کا کیا کرتے... پانڈے بتا چکا تھا کہ اس بلاسٹ ڈیوائس کی الٹی گنتی کو بس کوڈ لگا کر ہی بند کیا جا سکتا ہے اور کوڈ بس پانڈے کو معلوم تھا۔ ہم پانڈے کو جان سے مار کر بھی انور خاں کو نہیں بچا سکتے تھے۔

''اب صرف پندرہ منٹ باقی ہیں۔'' پانڈے نے ہراساتی آواز میں کہا۔ ''چابیاں نکالو اور دروازا کھلواؤ۔ ورنہ کچھ باقی ناہیں بچے گا اور خان صاحب کی موت کی تو پوری گارنٹی ہے۔''

عبدالرحیم رائفل تھامے، کمرے کے کونے میں بالکل چوکس کھڑا تھا۔ وہ بکا ہوا شخص تھا اور اس کی آنکھوں میں بے نیازی ناچ رہی تھی۔ وہ ایک عام سا شخص تھا لیکن اپنے ہم وطنوں سے بے وفائی کا تمغہ سینے پر سجا کر وہ عام نہیں رہا تھا۔ گھر کا بھیدی ہونے کی حیثیت سے وہ انور خاں کو اور ہم سب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا چکا تھا۔

کمرے سے باہر لوگوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اندر کی صورتِ حال جاننے کے لیے بے قرار تھے۔ انہوں نے جان لیا تھا کہ کچھ دیر پہلے کمرے کی کھڑکی سے احاطے میں کوئی مہلک چیز پھینکی گئی ہے جس سے زبردست بلاسٹ ہوا ہے اور لوگوں کی جانیں گئی ہیں۔ یقیناً ہماری سلامتی کے حوالے سے بھی باہر کے لوگوں کے خدشات بڑھتے جا رہے تھے۔

ہمارے اور پانڈے کے درمیان اعصاب شکن مکالمہ ہوا۔ انور خاں کے گلے میں آویزاں ''اسٹیل رنگ'' کو ''ڈی ایکٹی ویٹ'' کرنے کے لیے پانڈے کی بس ایک ہی شرط تھی۔ قلعے کا دروازہ کھلوا دیا جائے اور اینڈرسن کے دستوں کو پُرامن طریقے سے اندر آنے کی اجازت دی جائے... یہ شرط ہمارے لیے اور خاص طور سے انور خاں کے لیے کسی صورت قابلِ قبول نہیں تھی۔ وہ ایک حوصلہ مند حریت پسند تھا۔ زرگاں میں اس کی جدوجہد کی داستان طویل تھی۔ وہ اس سے پہلے بھی درجنوں بار اپنی جان ہتھیلی پر رکھ چکا تھا۔ اس نے آج بھی جان ہتھیلی پر رکھ دی تھی... اور ڈیجیٹل میٹر تیزی سے پیچھے کو جا رہا تھا۔ اب صرف آٹھ منٹ کا وقت باقی تھا۔ پانڈے نے پھنکارا۔ ''صرف آٹھ منٹ... اس کے بعد خاں صاحب کی رخصتی تو یقینی ہے... پھر تم تینوں کو بھی باری باری جانا پڑے گا۔''

''لیکن تم.....''

''لیکن... کچھ ناہیں۔'' پانڈے نے تیزی سے میری بات کاٹی۔ ''اب ساڑھے سات منٹ ہیں۔ اس میں تم بڑی مشکل سے دروازے تک پہنچ سکو گے اور اسے کھلوا سکو گے... جونہی دروازا کھلے گا، میں کوڈ لگا کر گنتی اسٹاپ کر دوں گا۔ جلدی کرو۔ اب اٹھ جاؤ۔''

وہ خبیث اپنے موقف سے ایک ملی میٹر پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا اور وقت واقعی نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھا۔ وہ بھی صورتِ حال کے بے پناہ دباؤ کو محسوس کر رہا تھا۔ اب یہ بات یقینی ہو چکی تھی کہ اگر ہم دروازہ نہیں کھلوائیں گے تو کم از کم انور خاں تو فوری طور پر موت کے منہ میں چلا جائے گا۔

''ٹھیک ہے۔'' عمران نے طویل سانس لے کر کہا۔ ''پانڈے! تم تھوڑی دیر کے لیے اسے اسٹاپ کر دو تاکہ ہمیں دروازے تک پہنچنے اور اسے کھلوانے کے لیے مناسب وقت مل سکے۔''

''یہی تو پرابلم ہے پپو کے یار! اس ڈیوائس کو بس ایک ہی دفعہ آن اور ایک ہی دفعہ آف کیا جا سکت ہے۔ اگر میں نے اسے ایک بار آف کر دیا تو پھر یہ میرے لیے اتنا ہی بیکار ہو جاوے گا جتنا کسی ہیجڑے کے لیے منگل سوتر ہوتا ہے۔ میں تم سے پھر کہوت ہوں۔ اب بھاگو یہاں سے، وقت نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔''

''اوکے... اوکے۔'' عمران نے کہا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''آؤ تانی!''

ہم مڑ کر دروازے کی طرف بڑھے اور یہی وقت تھا جب میری آنکھوں کے سامنے بجلی سی چمک گئی۔ میری چھٹی حس مجھے پہلے سے خبردار کر رہی تھی کہ عمران کچھ کرنے والا ہے اور اس نے کر دیا تھا۔ میں نے اس کا وہی خطرناک روپ دیکھا جو دیکھنے والوں کو مبہوت کر دیتا تھا۔ عبدالرحیم کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے تڑپ کر اس کی رائفل پر

ہاتھ ڈالا۔ یہ ایسی برق رفتار حرکت تھی جس کی تیزی کو شاید الفاظ میں بیان نہ کیا جاسکے۔ عمران نے بیرل کو تھاما۔ یہی وقت تھا جب عبدالرحیم کی انگلی بے ساختہ ٹریگر پر دب گئی۔ عمران شاید جانتا تھا کہ یہ ہوگا۔ اس نے بیرل کا رخ اپنی مرضی کے رخ پر رکھنے کی کوشش کی تھی۔ یہ کوشش کامیاب رہی۔ رائفل سے چھ گولی کا برسٹ چلا اور پانڈے کے تجیم شحیم ساتھی کو چھلنی کر گیا۔ چند گولیاں کھڑکی کے تختوں سے پار ہوگئیں۔ میں پانڈے سے قریب تھا۔ پوری طاقت اور تیزی سے اس پر جا پڑا۔ اس کی چلائی ہوئی گولی میرے کندھے کے اوپر سے گزری۔ میں نے اسے دوسری بار ٹریگر دبانے کا موقع نہیں دیا۔ پانڈے کی اپنی ہی رائفل کا آہنی بیرل، وزنی سائیلنسر سمیت اس کے چہرے پر لگا۔ یہ اتنی بھرپور ضرب تھی کہ میں نے پانڈے کی ناک کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز سنی۔ وہ پشت کے بل پتھریلی دیوار سے ٹکرایا۔ میرے گھٹنے کی طوفانی ضرب اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان لگی۔ یہ بھی ایک بے مثال ضرب تھی۔ زرگاں میں ان گنت ناجائز بچوں کا مبینہ باپ گھٹنوں کے بل گرا لیکن... اس نے ابھی تک اپنی رائفل نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے ایک بار پھر رائفل میری طرف سیدھی کرنے کی کوشش کی مگر تب تک عمران... طوفان کی طرح اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے عبدالرحیم سے چھینی ہوئی رائفل کا دستہ گھما کر پانڈے کی کھوپڑی پر مارا۔ وہ اچھل کر اپنے مردہ ساتھی کے پہلو میں گرا۔ اس مرتبہ رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ تاہم گرتے ساتھ ہی وہ یوں اٹھا جیسے اس کے پورے جسم میں اسپرنگ لگے ہوں۔ وہ بلاخیز رفتار سے عمران کی طرف آیا۔ عمران نے اس پر لاٹھی کی طرح رائفل چلائی مگر وہ جھک کر بچ گیا۔ اس کے کندھے کی ٹکر عمران کے سینے پر لگی۔ دونوں اوپر تلے فرش پر گرے۔ چند سیکنڈ کے لیے ان دونوں کے درمیان زبردست کشمکش نظر آئی۔ دونوں لڑائی بھڑائی کے فن میں طاق تھے مگر پھر عمران کا داؤ چل گیا۔ وہ پلٹ کر پانڈے کو اپنے نیچے لے آیا۔ اور یہی وقت تھا جب وہ کچھ ہوا جس کی توقع مجھے یا عمران کو نہیں تھی۔ پانڈے نے اپنا ہاتھ لمبا کیا اور اپنے مردہ ساتھی کے ہولسٹر میں سے اچانک پستول کھینچ لیا۔ بس ایک سیکنڈ کی بات تھی، وہ گولی عمران کے سر پر ٹھونک سکتا تھا۔ پانڈے کی رائفل اب میرے ہاتھ میں تھی۔ میں... جان گیا کہ اگر ایک سیکنڈ کے اندر میں نے یہ رائفل استعمال نہیں کی... اور بالکل درست استعمال نہیں کی تو میں عمران کو کھو دوں گا۔ میں نے ٹریگر دبایا۔ سائیلنسر لگی رائفل سے ایک بار پھر ''ٹھک'' کی ہلاکت خیز آواز بلند ہوئی۔ گولی کھا کر پانڈے کا سر ایک جھٹکے سے پیچھے کو گیا۔ اس کی کنپٹی میں موت کا روشن دان کھل گیا تھا۔ اس کا پستول والا ہاتھ... مردہ چھپکلی کی طرح واپس، پٹ سے فرش پر گرا۔ اس کی کنپٹی بڑی سرعت سے سرخ ہوتی چلی گئی۔ زرگاں میں ہمارا خطرناک اور مکارترین دشمن موت کے گھاٹ اتر چکا تھا اور یہ سب کچھ حیران کن سرعت سے ہوا تھا۔

اور یہی وقت تھا جب مجھے اور عمران کو ایک ساتھ صورتِ حال کی بدترین سنگینی کا احساس ہوا۔ انور خاں کی زندگی خطرے میں تھی۔ انور خاں کے گلے میں مقفل ہو جانے والے ''اسٹیل رِنگ'' کا میٹر چل رہا تھا اور سرخ بلب روشن تھا۔ اب صرف چھ منٹ باقی تھے۔ پانڈے نے کہا تھا کہ اس میٹر کی الٹی گنتی کو روکنے کا کوڈ صرف وہ جانتا ہے اور اگر اس ''اسٹیل رِنگ'' کو کسی بھی طرح انور خاں کی گردن سے نکالنے کی کوشش کی گئی تو یہ بلاسٹ ہو جائے گا۔ اور قرائن سے لگتا تھا کہ پانڈے کی دونوں باتیں درست تھیں۔ عمران نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ حسنات اور مبارک علی سمیت کئی افراد اندر آ گئے۔ اندر پڑی ہوئی خونچکاں لاشوں نے ان سب کو ششدر کر دیا۔ ان میں سے صرف عبدالرحیم کے جسم میں زندگی کی کچھ رمق باقی تھی... باقی پانڈے سمیت داعیِ اجل کو لبیک کہہ چکے تھے۔ عبدالرحیم کا سر بھی عمران کی ایک سخت ضرب کی وجہ سے پھٹ چکا تھا۔ عمران نے تیزی سے پانڈے کے لباس کی تلاشی لی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ پانڈے نے بارہ ہندسوں والے جس کوڈ کی بات کی تھی، وہ کسی کاغذ پر لکھا ہوا ہو اور پانڈے کی جیبوں میں موجود ہو۔ لیکن یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ ہم کوئی ایسا نمبر نہیں ڈھونڈ سکے۔ اسی دوران میں حسنات اور مبارک وغیرہ بھی ساری صورتِ حال سے آگاہ ہو چکے تھے۔ میں نے حسنات کو تیزی سے باہر نکلتے اور ایک جانب اوجھل ہوتے دیکھا۔ شاید اس کے ذہن میں کوئی خاص بات آئی تھی۔

حسنات جس تیزی سے گیا تھا، اسی تیزی سے واپس آ گیا۔ وہ کسی قریبی کمرے سے چند انگریز قیدیوں کو ہانک کر لایا تھا۔ ان میں دو لڑکیاں اور تین مرد تھے۔ ان کے چہروں پر چوٹوں کے نشان تھے۔

حسنات نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''یہ سرجن اسٹیل کے ساتھی ہیں جی۔ اس کے ساتھ لیبارٹری میں کام کرتے رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے ان میں سے کوئی نہ کوئی اس رِنگ کے کوڈ کے بارے میں جانتا ہووے گا۔''

میں نے بغور ان پانچوں افراد کو دیکھا۔ ان میں سے دو نوجوان تھے، باقی ادھیڑ عمر تھے۔ ایک بھوری داڑھی والے کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ یہ گرفتار شدگان تھے۔ اب بھی ان کی طرف تین رائفلیں اٹھی ہوئی تھیں۔ بظاہر ان کی تن فن ختم ہو چکی تھی مگر اندرونی اکڑ باقی تھی۔ شاید یہ اکڑ مغربی ممالک کے باشندوں کا خاصہ ہوتی ہے۔ وہ نفسیاتی طور پر خود کو دوسرے لوگوں سے برتر سمجھتے ہیں۔ ہزیمت اٹھا کر بھی وہ اپنی گردن کا تناؤ برقرار رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جلد ہی ان کی شکست جیت میں بدل جائے گی۔ اس کمرے میں داخل ہونے کے چند سیکنڈ بعد ہی یہ پانچوں افراد یہاں کی سنگین ترین صورتِ حال کو بھانپ چکے تھے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ بستر پر نیم دراز انور خاں کی گردن میں موت کا پھندا موجود ہے اور ہندسے تیزی سے پیچھے کی طرف حرکت کر رہے ہیں۔ سرجن اسٹیل اس قسم کے جتنے بھی منحوس آلات تخلیق کرتا تھا، وہ انہی لوگوں کے ہاتھوں سے ہو کر گزرتے تھے۔ یہ عین ممکن تھا کہ اسٹیل کے اس مہلک رِنگ کو ڈی ایکٹی ویٹ کرنے کا کوڈ ان میں سے کسی کو معلوم ہو۔

میں نے اور عمران نے ان پانچوں سے بڑی تیزی کے ساتھ اس بارے میں سوالات کیے۔ ان سب کو معلوم تھا کہ اس الیکٹرانک رِنگ کو کوڈ کے ذریعے پھٹنے سے روکا جا سکتا ہے لیکن کوڈ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ یا معلوم تھا اور وہ بتا نہیں رہے تھے۔ یہ بڑے دردناک لمحات تھے۔ ہماری پیشانیاں پسینے سے تر ہو گئی تھیں۔ میں نے بھوری داڑھی والے کے سر پر رائفل کی نال رکھ دی اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''تمہارے بچنے کی بس ایک ہی صورت ہے۔ کوڈ بتا دو۔''

''میں نہیں جانتا۔ میں یسوع مسیح کی قسم کھاتا ہوں، مجھے نہیں معلوم۔''

''کیا یہ ڈیوائس تم لوگوں نے نہیں بنایا؟ اس کے کل پرزے تم نے نہیں جوڑے؟''

''میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں اس کام کی دوسری اسٹیج میں شریک رہا ہوں مگر کوڈ کی تفصیل مجھے پتا نہیں۔ اگر تم مجھے اس کوڈ کی وجہ سے مارو گے تو یہ غلط وجہ ہوگی۔''

میں نے کھچڑی بالوں والی ادھیڑ عمر عورت کے بال پکڑے۔ وہ انگریزی میں بولی۔ ''مجھے نہیں معلوم... مجھے تو یہ بھی پتا نہیں کہ اس میں کوئی کوڈ لگتا ہے... اگر... اگر مجھے پتا ہوتا تو میں اس شخص کی جان بچانے کے لیے بتا دیتی۔''

وہ سارے کوڈ کی جانکاری سے انکاری تھے۔ اور وہ سب قریبی ماتحتوں کی حیثیت سے سرجن اسٹیل کی شعبدہ ساز لیبارٹری میں کام بھی کرتے رہے تھے۔ یہ بات کچھ ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

اب تین ساڑھے تین منٹ کا وقت باقی رہ گیا تھا۔ انور خاں نے کراہتے ہوئے کہا۔

''اب تم لوگ کمرے سے باہر چلے جاؤ۔ میرے ساتھ وہی ہوگا جو اللہ کو منظور ہے۔''

اس نے اصرار کے ساتھ ہم سب کو کمرے سے باہر بھیج دیا۔ وہ قیامت کی ساعتیں تھیں۔ وہ بے بسی کا عروج تھا۔ زرگاں کا ہر دل عزیز حریت پسند، جبر کی آنکھوں میں ہر پل آنکھیں ڈال کر رکھنے والا انور خاں موت کے منہ میں تھا اور ہم اس کے لیے کچھ کر نہیں سکتے تھے۔

اچانک کرشمہ ساز عمران کے ذہن میں ایک انوکھا خیال آیا۔ اس نے رائفل کا دستہ ایک انگریز قیدی کی پیٹھ پر رسید کیا اور اسے واپس انور خاں کے کمرے میں دھکیل دیا۔ اس ہٹے کٹے شخص کو پانڈے کی لاش سے ٹھوکر لگی اور وہ انور خاں کے بستر کے قریب گرا۔ پھر عمران نے ایک دوسرے قیدی کی پیٹھ پر لات رسید کی اور اسے بھی کمرے میں پھینک دیا۔

وہ گرجا۔ ''ان سارے حرامزادوں کو کمرے میں پھینکو۔ اگر انور خاں جائے گا تو پھر یہ بھی ساتھ جائیں گے۔''

یہ ایک اچھی پیش رفت تھی۔ ڈیجیٹل میٹر کی الٹی گنتی اب دو منٹ تک پہنچ چکی تھی۔ ہم نے پانچوں انگلش ٹیکنیشنز کو دھکیل کر انور خاں والے کمرے میں پہنچا دیا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ قیدی ٹیکنیشنز کے رنگ برف کی طرح سفید ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ انور خاں کے ساتھ ہی وہ بھی ''اڑنے'' والے تھے۔ موت کو عین سامنے دیکھ کر ان کا صبر و تحمل اور ٹھہراؤ جواب دے گیا۔ وہ دہائی دینے لگے۔ اندر سے دروازہ پیٹنے لگے۔ شارٹ اسکرٹ والی نوجوان انگریز لڑکی گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور زندگی کی بھیک مانگنے لگی۔ یہ سارے مناظر ہم کمرے کی سلاخ دار کھڑکی میں سے دیکھ رہے تھے۔

''اسٹیل رِنگ'' کا میٹر پیچھے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ ایک منٹ تیس سیکنڈ... ایک منٹ پچیس سیکنڈ... ایک منٹ بیس.....

موت آتی ہوئی نظر نہیں آتی... لیکن یہاں اس کمرے میں وہ نظر آ رہی تھی۔ انگریز قیدیوں کے چہروں پر، ان کی آنکھوں میں۔ انور خاں نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں

اور یہی وقت تھا جب کھچڑی بالوں والی ادھیڑ عمر عورت تیزی سے مڑی اور لڑکھڑاتی ہوئی انور خاں کے پاس پہنچ گئی۔ اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ اس نے اسٹیل کے ''رِنگ'' کا ایک ٹکڑا کھولا۔ نیچے سیاہ رنگ کا چھوٹا سا ''کی پیڈ'' تھا۔ اس نے جلدی جلدی اپنی کانپتی انگلیاں چلائیں۔ وہ کوڈ پریس کر رہی تھی... اور وہ زندگی کا کوڈ تھا۔ بارہ ہندسوں کا کوڈ... جو موت کے میسج کو ''ڈیلیٹ'' کر کے زندگی کو جاری رکھنے کی انسٹرکشنز دے سکتا تھا۔ اور پھر الٹی گنتی رک گئی۔ آخری ریڈنگ بیس سیکنڈ تھی۔ بیس سیکنڈ کے فرق سے موت کا فرشتہ راستہ بدل گیا تھا۔ عمران کی آنکھوں میں وہی مسکراہٹ تھی جو اس کے اندر کے اطمینان کو ظاہر کیا کرتی تھی۔

ہم سب اندر داخل ہوئے۔ کھچڑی بالوں والی عورت کانپتے ہاتھوں سے انور خاں کی گردن سے مہلک ڈیوائس اتار رہی تھی۔ پیشتر قیدی سر تھامے بیٹھے تھے۔ نوجوان لڑکی زار زار رو رہی تھی۔ یقیناً اس کے رونے کی وجہ فوری موت سے بچ جانے کا احساس تھا... اور وہ خوش تھی جو کسی ریلے کی طرح اس پر حملہ آور ہوئی تھی۔

انور خاں سے بغل گیر ہونے کے بعد، میں اور عمران زیریں منزل کی طرف لپکے۔ ہمیں ایک فیصد امید بھی نہیں تھی کہ ڈاکٹر چوہان زندہ ہوگا... لیکن اس ''آس امید'' کا کیا کیا جائے۔ یہ آخر تک انسان کا دامن نہیں چھوڑتی۔ ہمارے دلوں میں بھی یہ جلتی بجھتی سی کرن موجود تھی کہ شاید چوہان کی زندگی کی راکھ میں کوئی چنگاری موجود ہو۔

ہم نیچے پہنچے۔ ہجوم کو چیرتے ہوئے اسپیشل وارڈ میں داخل ہوئے۔ چوہان ایک بستر پر تھا۔ اس کی لاش پر ایک سفید چادر کھینچ دی گئی تھی۔ یہ چادر گواہی دے رہی تھی کہ راکھ ہی راکھ ہے۔ چنگاری کہیں نہیں۔ میں نے اس کے پاؤں کو چھوا۔ اس کے چہرے سے چادر ہٹائی۔ وہ ''سو رہا تھا۔'' پچھلے چوبیس گھنٹوں سے مسلسل کام کر رہا تھا۔ بہت تھکا ہوا تھا۔ بھوکا بھی تھا... ہلکا سا بخار بھی محسوس کر رہا تھا اور اسی طرح ''روانہ'' ہو گیا تھا۔ یہ سفر ہی ایسا ہوتا ہے۔ کسی بھی وقت شروع ہو جاتا ہے، کسی بھی حالت میں۔ میں نے اس کا ماتھا چوما اور میرے دو آنسو اس کے خون آلود رخساروں پر گرے پھر اس کی بڑھی ہوئی شیو کے بالوں میں رینگ گئے۔

قلعے سے باہر ہونے والے زوردار دھماکوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اینڈرسن نے حملہ شروع کروا دیا ہے۔ چوہان کے چہرے پر چادر ڈال کر میں اور عمران واپس مڑے۔ اس اسپیشل وارڈ کے بستروں پر مریض نہیں تھے، خونچکاں لاشیں تھیں۔ چوہان کی لاش کی طرح ان لاشوں پر بھی چادریں ڈال دی گئی تھیں۔ یہ وہی لوگ تھے جنہیں تقریباً ایک گھنٹا پہلے پانڈے نے بیدردی سے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اب وہ خود بھی اپنے مقتولوں کے پاس پہنچ چکا تھا۔ میں اور عمران سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے واپس بالائی منزل پر پہنچے۔

عبدالرحیم کو گہری بے ہوشی کی حالت میں وہاں سے اٹھایا جا چکا تھا۔ پانچوں انگریز قیدیوں کو واپس ان کے ٹھکانے پر پہنچا دیا گیا تھا۔ باقی لاشیں ابھی تک وہیں پڑی تھیں۔ ان میں خونچکاں کھوپڑی اور ٹوٹی ہوئی ناک والا رنجیت پانڈے بھی تھا۔ وہ پستول ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا جس سے اس نے عمران کو شوٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔ مرنے کے بعد بھی وہ جیسے اسی پستول کے ذریعے اپنی مزاحمت جاری رکھنا چاہتا تھا... عمران نے پستول پانڈے کے مردہ ہاتھ سے چھڑایا اور اس کی لاش کو گھسیٹ کر ایک کونے میں کر دیا۔

انور خاں نے کہا۔ ''اینڈرسن نے حملہ شروع کرا دیا ہے۔ اگر ان لوگوں کے پاس مزید راکٹ ہیں تو وہ ''مین'' دروازے پر استعمال کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس کوشش کو ناکام بنانا ہوگا۔''

''کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''کوشش کی جائے کہ یہ راکٹ دروازے کے قریب پہنچنے ہی نہ پائیں۔ فصیل کے اوپر سے لمبی رینج کی رائفلوں کے ساتھ راکٹ لانچروں کو نشانہ بنایا جائے۔ ویسے مجھے امید ہے کہ ان لوگوں کے پاس اب زیادہ راکٹ نہیں ہوں گے۔''

میں نے کہا۔ ''عمران! میرا خیال ہے کہ ہمیں لڑائی والی جگہ پر پہنچنا چاہیے۔'' عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے مبارک اور بھرت کو ہدایت کی کہ وہ انور خاں کے قریب رہیں اور اس کی سیکیورٹی کی ذمے داری اٹھائیں... اس کے علاوہ انور خاں کے پیغامات کو کمان داروں تک پہنچانے کا انتظام بھی کریں۔ میں، عمران اور حسنات احمد قلعے کے اس حصے کی طرف روانہ ہوئے جہاں زوردار لڑائی ہونے لگی تھی۔ رات کی سیاہی میں ہر طرف شعلہ فشاں دھماکے ہو رہے تھے اور پگھلا ہوا سیسہ آتشیں بارش کی طرح برس رہا تھا۔

ایسی لڑائیوں کے بارے میں پڑھا اور سنا تھا لیکن

آج ہم خود اس قدیم طرز کی لڑائی کا حصہ تھے۔ اور تب مجھے یہ احساس ہوا کہ ایسی لڑائیوں کا تناؤ اور خوف لڑائی سے قبل زیادہ ہوتا ہے۔ جب لڑائی شروع ہو جاتی ہے، جب نعرے بلند ہوتے ہیں اور خون اچھلتا ہے تو پھر صورتِ حال کا ڈر بتدریج دل سے نکلتا چلا جاتا ہے۔ ہمارے دلوں سے ''ڈر'' یوں بھی بہت دور تھا کہ اس کی جگہ ایک بھڑکتے ہوئے طیش نے لی ہوئی تھی۔ ہم نے تھوڑی ہی دیر پہلے گیتا کھی اور ڈاکٹر چوہان کی لاشیں اٹھائی تھیں اور اس سے بھی بہت بڑی بات یہ تھی کہ ہم نے معصوم بالو کی ماں کی لاش اٹھائی تھی... سلطانہ کی لاش اٹھائی تھی۔ وہ لاش جیسے ابھی تک میرے ہاتھوں پر دھری تھی۔ اتنے دن گزرنے کے باوجود میرے بازوؤں پر نہ اس کی گرمی کم ہوئی تھی، نہ اس کا لمس مدھم پڑا تھا۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی... مجھے بھولنا نہیں... میں چاندنی راتوں کی ٹھنڈک میں آپ سے ملوں گی اور صبح دم چلنے والی ہواؤں میں اور ....

میری آنکھیں جلنے لگیں۔ اعصاب تن گئے۔ جسم میں پاؤں کے ناخنوں سے لے کر سر کے بالوں تک اِک آگ سی پھیل گئی۔ جلد ہی ہم موقع پر پہنچ گئے۔ یہ قلعے کی فصیل کا وہ حصہ تھا جو مین دروازے کے عین اوپر تھا۔ قریباً بارہ فٹ چوڑی اس فصیل پر حسنات اور اس کے قریبی ساتھیوں نے زبردست مورچہ بندی کر رکھی تھی۔ وہ فصیل کے رخنوں میں سے نیچے، اینڈرسن کے گورے اور مقامی فوجیوں پر زبردست فائرنگ کر رہے تھے۔ گاہے بگاہے دستی بم بھی نیچے پھینکے جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ پیٹرول اور ڈیزل بم تھے۔ مٹی کے ہنڈولوں اور شیشے کی بوتلوں میں تیل بھر کر اور ان میں آگ کی بتی رکھ کر نیچے پھینکا جاتا تھا اور آگ بھڑک اٹھتی تھی۔ کچھ بڑے سائز کی تھری جی ٹائپ گنز بھی یہاں موجود تھیں۔ ان کے عقب میں زرگاں کے ماہر نشانے باز بیٹھے تھے اور ان کے چلائے ہوئے برسٹ حملہ آور فوجیوں کے لیے زبردست مشکلات پیدا کر رہے تھے۔ میں نے یہاں عورتوں اور نوعمر لڑکوں کو بھی دیکھا۔ وہ لڑنے والے سپاہیوں کی اعانت کر رہے تھے۔ ایمونیشن کی نقل و حرکت میں مصروف تھے۔ رائفلوں، میگزینز میں گولیاں بھر رہے تھے۔ زخمیوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ حسنات کے مشورے سے عمران اور میں نے بھی ایک جگہ پوزیشن سنبھال لی۔ حملہ آوروں کا اجتماع بہت بڑا تھا۔ وہ قلعے کے چاروں طرف چیونٹیوں کی طرح موجود تھے۔ وہ اپنے راکٹ لانچرز کو بار بار قلعے کے دروازے کے سامنے لانے کی کوشش کر رہے تھے اور فصیل پر سے ہونے والی زوردار فائرنگ انہیں اس عمل سے روک رہی تھی۔ اس لڑائی میں جانی نقصان بھی ہو رہا تھا اور زیادہ نقصان حملہ آوروں کا ہی تھا۔ قلعے کے دروازے سے قریباً سو قدم کے فاصلے پر مجھے کئی لاشیں نظر آئیں۔ شعلوں کی سرخ روشنی میں یہ خون آلود لاشیں سنسنی خیز منظر پیش کر رہی تھیں۔ بارود کا زہریلا دھواں، شعلے... دھماکے اور للکارے۔ ایک داستانی سا منظر تھا۔

دروازے کے عین سامنے سے قریباً سوڈیڑھ سو قدم کی دوری پر ایک گاڑی نمودار ہوئی۔ یہ بکتر بند ٹائپ گاڑی تھی۔ اندازہ ہوا کہ اس گاڑی کے پیچھے ایک ٹریکٹر ٹرالی باندھی گئی ہے اور اس ٹرالی پر دو تین راکٹ لانچر رکھ کر دروازے کی طرف لائے جا رہے ہیں تاکہ مناسب فاصلے اور زاویے سے دروازے کو نشانہ بنایا جا سکے۔ ایک بار پھر فصیل پر موجود نشانے بازوں نے زبردست نشانے لگائے اور گاڑی کے ٹائر برسٹ کر دیے... تب یکا یک گاڑی میں آگ بھڑک اٹھی۔ ٹرالی اور راکٹس کو بچانے کے لیے گورے سپاہیوں نے ٹرالی کو پھرتی سے جلتی ہوئی گاڑی سے علیٰحدہ کیا اور پیچھے لے گئے۔ اس کوشش میں کئی افراد کو گولیاں لگیں اور ان میں سے تین چار میدان میں ہی کھیت رہے۔ مگر اس ناکام کوشش کے فوراً ہی بعد ایک اور گاڑی حرکت کرتی نظر آنے لگی۔

عمران نے کہا۔ ''یہ لوگ حوصلے میں تو کم ہو سکتے ہیں لیکن تعداد میں بہت زیادہ ہیں اور باقاعدہ تربیت یافتہ بھی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم زیادہ دیر اس دروازے کو بچا نہیں سکیں گے۔''

عمران کا فقرہ ختم ہوا ہی تھا کہ رائفل کا ایک برسٹ ہمارے بالکل قریب فصیل کے پتھروں سے ٹکرایا۔ بہت سی دھول اور سنگریزے ہمارے اردگرد بکھر گئے۔ حملہ آوروں کی طرف سے فائرنگ کی شدت بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ہر طرح کے چھوٹے بڑے ہتھیاروں سے فائر کر رہے تھے۔

حسنات احمد ہم سے کچھ فاصلے پر سپاہیوں کو ضروری ہدایات دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ وہ دوڑتا ہوا ہماری طرف آ رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی، وہ جھک کر دوڑ رہا تھا۔ مبادا کوئی آوارہ گولی اس کے مزاج نہ پوچھ جائے۔ اس کے عقب میں ایک اور سپاہی بھی تھا۔ وہ وردی میں تھا۔ یہ وہ مسلمان سپاہی تھے جو حکم کی فوج میں شامل تھے مگر بغاوت ہونے کے بعد مزاحمت کاروں کے ساتھ مل گئے تھے۔ ایسے کم و بیش پانچ سو سپاہی اس وقت

قلعے کے اندر موجود تھے اور حکم کے خلاف لڑائی میں حصہ لے رہے تھے۔

حسنات نے آکر مجھے بتایا۔ ''جناب! انگریزوں کی طرف سے ایک ایلچی آیا ہے۔ آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ اگر اجازت ہو تو اسے لایا جائے؟''

میں نے عمران کی طرف دیکھ کر اس کے تاثرات سے اس کا عندیہ لیا اور حسنات احمد سے کہا کہ اسے لایا جائے۔

دو منٹ بعد ایک انگریز کی صورت نظر آئی۔ وہ لڑائی کے لباس میں تھا لیکن فی الوقت غیر مسلح نظر آرہا تھا۔ اس لمبے تڑنگے انگریز کے ساتھ ایک درمیانے قد کا انڈین بھی تھا۔ یہ بھی فوجی لباس میں تھا۔ حسنات احمد اور اس کے دو ساتھی بھی ہمراہ تھے۔ یہ سب افراد گولیوں کی زد سے بچنے کے لیے جھک کر چل رہے تھے۔ ہم دونوں ایلچیوں سمیت ایک محفوظ برج میں آکر کھڑے ہو گئے۔

انگریز اور انڈین فوجی نے مجھے باقاعدہ سیلیوٹ کیا۔ انگریز فوجی کا عہدہ کیپٹن کا جبکہ انڈین کا سیکنڈ لیفٹیننٹ کا تھا۔ انگریز کیپٹن نے انگلش میں کہا۔ ''میرا خیال ہے جناب کہ میں اس وقت قلعے کے کمانڈر سے بات کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔''

''کمانڈر انور خاں ہے۔ میں اس کی جگہ ڈیوٹی دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تم کام کی بات کرو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''آپ کی انگریزی بہت اچھی ہے۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ جناب اینڈرسن نے آپ کے لیے ایک نامہ ارسال کیا ہے۔ اسے پڑھ لیجیے۔''

اس نے اپنی وردی کے اندر سے خاکی لفافہ نکال کر مجھے تھما دیا۔ میں نے لفافہ چاک کیا، اس میں ایک خط تھا۔ تاہم خط کے علاوہ بھی ایک چیز تھی۔ اس چیز نے مجھے تھوڑا سا چونکایا مگر میں نے اپنے تاثرات سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔

میں نے خط نکالا اور عمران سے کہا کہ وہ اسے پڑھے۔ عمران نے حسنات احمد اور دیگر ساتھیوں کے سامنے خط پڑھنا شروع کیا۔ یہ اینڈرسن کی طرف سے تھا اور اردو میں تھا۔ نیچے اینڈرسن کے دستخط تھے اور کمانڈر کی حیثیت سے اس کی مہر بھی لگی تھی۔ اینڈرسن نے لکھا تھا۔

''دوستو! تم نے ہماری طاقت دیکھ لی ہو گی اور یہ بھی جان لیا ہو گا کہ ہمیں ہر صورت قلعے کے اندر داخل ہونا ہے۔ یہ کام ایک دو گھنٹے کے اندر اندر ہو جانا ہے۔ بہر حال، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک خوں ریز لڑائی ہو گی اور اس میں دونوں طرف سے جانی نقصان ہو گا۔ ہم اس دو طرفہ جانی نقصان سے بچنا چاہتے ہیں، کیونکہ اگلے ایک دو گھنٹوں میں یہاں جو بھی مرے گا، وہ بھانڈیل کا باشندہ ہو گا۔ وہ ہندو ہو، مسلمان ہو، سکھ ہو یا برٹش، وہ اس دھرتی کا بیٹا ہو گا۔ دھرتی ماں پچھلے چند دنوں میں اپنے بہت بیٹے کھو چکی ہے۔ ہم اسے مزید دکھ سے بچانا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایک معاہدے کے تحت تم لوگ قلعے کے دروازے کھول دو اور عالی جناب حکم جی کے دستوں کو قلعے میں داخل ہونے دو۔ ایسی صورت میں ہماری طرف سے ہر بچے، بوڑھے اور عورت کو جان کی امان دی جائے گی۔ لڑنے والے لوگوں میں سے بھی جنہوں نے کوئی جنگی جرم نہیں کیا، ان کے لیے عام معافی کا اعلان ہو گا۔ کسی بھی مجرم کے خلاف فوجی عدالت میں مقدمہ نہیں چلایا جائے گا اور اسے عام عدالت میں صفائی کا پورا پورا موقع دیا جائے گا۔ اس معاہدے کی دیگر شرائط ہم ابھی مل بیٹھ کر طے کر سکتے ہیں۔ اگر آپ ہمارے اس خط کا جواب ہمارے ہی ایلچی کے ذریعے دینا چاہتے ہیں تو ہمارا ایلچی انتظار کر لیتا ہے۔''

عمران نے خط ختم کیا تو ہم سب خاموش تھے۔ میں عمران کو لے کر سیڑھیاں اترا اور نیچے ایک خالی کمرے میں آگیا۔ یہ جگہ زخمیوں کی آمد کے پیشِ نظر خالی کرائی گئی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

میں نے اسے وہ خاکی لفافہ دکھایا جس میں سے خط برآمد ہوا تھا۔ لفافے کے کاغذ پر اندر کی طرف بھی باریک قلم سے کچھ لکھا ہوا تھا۔ ایک موٹے سرخ مارکر سے لکھا گیا یہ فقرہ فوراً پڑھا جا سکتا تھا۔ ''یہ صرف تابش اور عمران صاحب کے لیے۔''

''یہ کیا ہے بھئی؟'' عمران نے حیران ہو کر پوچھا۔

''یہ خط کے اندر خط ہے جو لفافے کے اندرونی حصے پر لکھا گیا ہے۔''

ہم نے لفافے کو احتیاط سے چاک کیا۔ لفافے نے خط کی شکل اختیار کر لی۔ اس اندرونی خط کو لکھنے والا بھی انگریز کمانڈر مسٹر اینڈرسن ہی تھا۔ اس خط کی انگریزی تحریر کچھ یوں تھی۔

''ہو سکتا ہے کہ تم دونوں کے اردگرد کچھ ایسے لوگ موجود ہوں جن کے سامنے مجھے پوری بات نہیں لکھنی چاہیے۔ اس لیے اس دوسرے خط کا سہارا لے رہا ہوں۔ ہمارے درمیان پہلے بھی دوستی کا رشتہ رہا ہے۔ یہ دوستی یقیناً ہم سب

کے لیے فائدہ مند ثابت ہوتی مگر ایک اچانک حادثے کی وجہ سے یہ سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔ ہمیں محترمہ ماریا سے اور تمہیں سلطانہ بی بی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ بہر حال، اب ہمیں ماضی کو بھول کر آگے دیکھنا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم دونوں، قاسمیہ کے اہم کمان داروں کو اپنا ہم خیال بنانے اور قلعے کے دروازے کھلوا کر خون خرابے کو روکنے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہو۔ اور تم دونوں کو یہ کردار ادا کرنا بھی چاہیے۔

میں کرنل اینڈرسن... عالی جناب محترم ''وشوانا تھ حکم جی'' کی طرف سے تم دونوں کو تحفظ کی ضمانت دیتا ہوں اور یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم اپنا کردار ادا کرو تو تمہارے اس عمل کی ''قدر'' تمہاری توقع سے بڑھ کر کی جائے گی۔ تم بھانڈیل اسٹیٹ میں رہنا چاہو یا بھانڈیل اسٹیٹ سے جانا چاہو، دونوں صورتوں میں تمہیں مہولت دی جائے گی۔ ہماری کوشش ہو گی کہ ہمارے دوست تاحیات ہماری دوستی پر ناز کر سکیں۔۔۔۔

جواب کا منتظر۔

خیر اندیش اینڈرسن۔''

خط پڑھنے کے بعد عمران نے دانت پیسے۔ ''سن آف اے بچ۔''

میں نے گہری سانس لے کر لفافہ تہ کیا اور اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ عمران کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ میں اس کی اندرونی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ خود میرے اندر بھی نفرت کی نئی لہر ابھر آئی تھی۔ عمران پھنکارا۔ ''یہ سفید کتا! ہمیں بکاؤ مال سمجھتا ہے... ڈھکے چھپے لفظوں میں اس نے ہمیں بے غیرتی کے بازار میں، ہوس کے سکوں کے عوض بکنے کی پیشکش کی ہے اور... میرا خیال ہے کہ یہ آج کی بات نہیں، ہمیشہ سے ایسا ہوتا آیا ہے۔ ان سفید بندروں نے ہمارے خطے پر دو سو سال حکومت کی ہے تو اسی مکاری کے زور پر کی ہے۔ انہوں نے ہمیں تقسیم کیا ہے۔ ہمارے اندر سے غدار ڈھونڈے ہیں اور پھر ہمارے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گئے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''سچ کہتے ہیں۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ آج اس کے ذریعے تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا ہے۔ میرے خیال میں تو یہ خط میوزیم میں رکھے جانے کے قابل ہے۔''

''اس سفید بندر نے ہمارے سامنے ہڈی پھینکنے کی جو ناکام کوشش کی ہے، اس کا مطلب سمجھ رہے ہو نا تم... تمہیں مہولت دی جائے گی۔ یعنی اگر ہم اسٹیٹ میں رہنا چاہیں تو ہمیں ہز ہائی نس کی طرف سے کوئی جاگیر شاگیر عطا فرمائی جائے گی اور اگر ہم اپنے ملک واپس جانا چاہیں تو شاید ہمیں زر و جواہر میں تول کر سب کچھ ہمارے حوالے فرما دیا جائے۔ لعنت... ایک لاکھ ایک ہزار ایک سو ایک دفعہ لعنت۔'' اس نے خستہ دیوار پر تھوکا۔

''تمہارے خیال میں اس تاریخی خط کا جواب کیا ہونا چاہیے؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

''تم بتاؤ۔''

''چلو، میں ہی بتا دیتا ہوں... بلکہ لکھ دیتا ہوں۔'' میں نے کہا اور عمران کی جیب میں سے قلم نکال لیا۔

باہر جنگی نعروں کی گونج تھی۔ دھماکوں کا شور تھا اور گولیوں کی تڑتڑاہٹ۔ شاید یہ 1857ء کی ہی ایک جھلک تھی۔ انگریزوں اور سکھوں کی فوجیں دہلی کے لال قلعے کو گھیرے ہوئے تھیں۔ ایک آخری ضرب لگانے کے لیے صفیں باندھ رہی تھیں اور ہتھیار تول رہی تھیں۔ میں نے تہ شدہ خط جیب سے نکالا۔ اسے کھولا اور اس کی پشت پر لکھ دیا۔ ''تم پر لعنت... یہ انیسویں نہیں، اکیسویں صدی ہے۔ اس دفعہ نہیں اینڈرسن... اس دفعہ نہیں۔'' یہ فقرہ لکھنے میں مجھے اتنا حزہ آیا جو شاید ہزار ہا الفاظ پر مشتمل ایک ضخیم کتاب لکھنے میں بھی نہ آتا۔ میں سر تا پا ایک عجیب سے اطمینان اور ولولے سے بھر گیا۔ مجھے لگا اب جیت یا ہار... زندگی یا موت کوئی معنی نہیں رکھتی، اصل فتح یہی ہے کہ اکڑی ہوئی گردنوں والے ان شیطانوں سے پوری توانائی کے ساتھ لڑا جائے اور آخری سانس تک لڑا جائے۔

عمران نے بھی میرے فقرے کو سراہا۔ ہم نے یہ جواب انگریز ایلچی اور اس کے ہندو ساتھی کے حوالے کیا اور انہیں بحفاظت واپس بھیج دیا۔

ہم دوبارہ فصیل پر پہنچے۔ لڑائی کی شدت میں اضافہ ہو چکا تھا۔ ایلچی کے واپس جانے کے دس پندرہ منٹ بعد ہی انگریز اور مقامی حملہ آوروں نے قلعے پر ایک اور زوردار حملہ کر دیا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ یہ حملہ اس جواب کا نتیجہ ہے جو ہم نے بھینسے کے چہرے والے غصیلے اینڈرسن کو دیا ہے۔ اس کی غرور سے تنی ہوئی گردن، اس کی نیلی آنکھوں میں چھپی حقارت، اس کا طنزیہ لہجہ، سب کچھ میرے ذہن میں آیا۔ مجھے وہ جارج گوراہی کی طرح قابلِ نفرت محسوس ہوا۔ جی چاہا وہ میرے سامنے ہو، میں اسے مار ڈالوں یا وہ مجھے مار ڈالے۔ سلطانہ کا اصل قاتل تو وہی تھا۔

اسی دوران میں ہمیں یہ پریشان کن اطلاع ملی کہ مشرقی جانب سے مدِ مقابل سپاہیوں کے دو دستے فصیل پر چڑھ آئے ہیں... اور وہاں زوردار لڑائی ہو رہی ہے۔

ہمارے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ فوری طور پر اپنی جگہ چھوڑ کر اس جگہ تک پہنچ سکتے۔ مبارک علی اپنے بہترین ساتھیوں کے ساتھ وہاں موجود تھا اور حسنات کو یقین تھا کہ وہ آسانی سے اینڈرسن کے ہرکاروں کو آگے نہیں آنے دے گا۔

فصیل پر ایک بڑی ٹیلی اسکوپ بھی موجود تھی۔ یہ گوروں سے چھینی ہوئی وہی ٹیلی اسکوپ تھی جس میں سے ہم نے کل مالا کی دادی ساس یعنی بڑی ماتا کو دھرم شالا کے منارے پر پوجا کرتے دیکھا تھا۔ عمران نے ٹیلی اسکوپ سے آنکھیں لگا رکھی تھیں اور اسے اسٹینڈ پر اِدھر اُدھر حرکت دے رہا تھا۔ چند لمحے بعد اس نے ٹیلی اسکوپ کو ایک جگہ فوکس کیا اور پھر مجھے اس میں دیکھنے کی دعوت دی۔ میں نے ٹیلی اسکوپ سے آنکھیں لگائیں۔ مجھے فصیل کے اس حصے کا منظر دکھائی دیا جہاں سے ہمارے ''مدِمقابل'' اوپر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ یہاں واقعی زوردار لڑائی ہو رہی تھی۔ گولیاں مینہ کی طرح برس رہی تھیں۔ لاتعداد مشعلوں اور گیس کے ہنڈولوں کی روشنی میں مناظر واضح دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے علاوہ فصیل پر دو جگہ بھڑکتی ہوئی آگ نے بھی اردگرد کے منظر کو روشنی فراہم کر رکھی تھی۔

''کچھ نظر آیا؟'' عمران نے پوچھا۔

''کیا؟''

''چوکور برجی پر سے جو دو بندے فائرنگ کر رہے ہیں، ان میں سے ایک بھرت ہے۔''

میں نے دھیان سے دیکھا۔ وہ بھرت ہی تھا۔ اس کا گلابی دھاری دار سویٹر اتنی دوری سے بھی پہچانا جاتا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان گورے سپاہیوں کا بھرپور مقابلہ کر رہا تھا جو فصیل پر چڑھ آئے تھے اور اپنی پوزیشن پکی کر رہے تھے۔

میں نے کہا۔ ''یہ بڑی خطرناک جگہ پر ہے۔ یہاں کسی بھی وقت.....'' ابھی میرا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ میں نے بھرت کو گولی کھا کر گرتے دیکھا۔ دھاری دار سویٹر برجی کی آٹھ دس سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا فصیل پر گرا۔ ''اوہ گاڈ!'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''کیا ہوا؟'' عمران نے پوچھا۔

''اسے گولی لگ گئی۔'' میں نے کہا اور عمران کو دیکھنے کی دعوت دی۔

عمران نے اپنی آنکھیں ٹیلی اسکوپ کے عدسوں سے لگائیں اور وہ بھی سکتے زدہ رہ گیا۔ کیا گیتا کھمی اور ڈاکٹر چوہان کی طرح بھرت کمار بھی اس لڑائی کا ایندھن بن چکا تھا؟

عمران نے ٹیلی اسکوپ سے آنکھیں لگائے لگائے کہا۔ ''ہو سکتا ہے، یہ زخمی ہو لیکن بڑی خطرناک جگہ پر گرا پڑا ہے۔ یہاں کسی بھی وقت مزید گولیاں اسے لگ سکتی ہیں۔''

میں نے عمران کو پیچھے ہٹا کر ایک بار پھر ٹیلی اسکوپ سے آنکھیں لگائیں۔ عمران ٹھیک کہہ رہا تھا۔ بھرت کھلی جگہ پر پڑا تھا، یہاں اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا... سچویشن ایسی تھی کہ کوئی اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

اور پھر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک طرف سے ایک لڑکی جھک کر بھاگتی ہوئی آئی اور بھرت کے جسم کو ڈھال فراہم کرنے کے لیے اس کے اوپر جا گری۔ میں اس کی شکل نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن شکل دیکھے بغیر ہی میں سمجھ گیا کہ وہ کون ہے... یقیناً وہ چھپی تھی۔ وہ جو محبت کرتی تھی... اور جو پوجا کرتی تھی۔ وہ اپنے محبوب کی طرف آنے والی موت اپنے جسم پر سہنے کے لیے اس کے اوپر گری ہوئی تھی۔ اسے اپنے جسم سے ڈھانپے ہوئے تھی۔ یہ وہ نیچ ذات کی ادنیٰ خادمہ تھی جس کا سایہ بھی اعلیٰ ذات کے لوگوں کو بھرشٹ کرتا تھا۔ لیکن یہ نیچ ذات، کی کمین لڑکی اپنی نقد جان لے کر اپنے محبوب کی موت کے سامنے ڈھال بن گئی تھی۔

میں نے عمران کو یہ منظر دکھایا۔ وہ بھی مبہوت رہ گیا۔ اس جگہ اردگرد یقیناً ہمارے سپاہی موجود تھے لیکن وہ لڑائی میں اس بُری طرح انگیج تھے کہ چند لمحوں کے لیے بھی اپنی جگہ نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ اور بھرت اور چھپی موت کی زد میں تھے۔ یا یوں کہہ لیں کہ ایک اور ''پیار کہانی'' فرشتۂ اجل کے نشانے پر تھی۔ ہم بے چین ہونے کے سوا اور کیا کر سکتے تھے۔

تب عمران چونکا ہوا نظر آیا۔ اس نے کچھ دیر تک نگاہیں ٹیلی اسکوپ کے عدسوں سے چپکائے رکھیں۔ پھر مجھے دیکھنے کی دعوت دی۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ دیکھا... منظر کچھ بدلا ہوا تھا۔ چھپی کے ساتھ ایک اور لڑکی آ گئی تھی۔ وہ دونوں بھرت کمار کے مُردہ یا بے ہوش جسم کو گھسیٹ کر دو طرفہ فائرنگ کی زد سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ جھکی ہوئی تھیں اور بھرت کو بازوؤں سے گھسیٹ رہی تھیں۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ دوسری لڑکی ''بڑی ماتا'' کی پوتی بہو مالا تھی۔ میں نے اسے اس کے لباس اور بالوں سے پہچانا۔ وہی روشن دماغ لڑکی جو ایک کٹر برہمن گھرانے کی بہو ہونے کے باوجود اپنے سینے میں ایک گداز اور انسان دوست دل رکھتی تھی۔ کڑے پہرے بھی جس کی سوچوں کو زنجیریں نہیں پہنا سکے تھے۔ اب وہ اپنے شوہر سمیت اس تہلکہ خیز

مزاحمت کا حصہ تھی جو حکم اور اینڈرسن کے خلاف کی جا رہی تھی۔ دونوں لڑکیاں دیوانہ وار لگی رہیں اور بھرت کو گھسیٹ کر ایک محفوظ آڑ میں لے گئیں۔

''کیا بنا؟'' عمران نے اپنی ''ایم 16'' رائفل سے نیچے فائر کرتے ہوئے کہا۔

''وہ اسے لے گئیں۔'' میں نے جوشیلے لہجے میں جواب دیا۔

''زبردست... کاش میرے پاس کیمرا ہوتا۔''

ایک گولی عمران کے سر کے عین اوپر سے سیٹی بجاتی گزر گئی اور اس کا فقرہ ادھورا رہ گیا۔ ہمیں کچھ اور نیچے جھکنا پڑا۔ اب فصیل کے اوپر سے بھی فائر آ رہا تھا... اور یہ فائر یقیناً اینڈرسن کے ان دستوں کی طرف سے تھا جو شرقی جانب فصیل کے اوپر جگہ بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ہماری ٹیلی اسکوپ کے عین اوپر سے بھی مختلف ''کیلیبر'' کی گولیاں سرلائے مارتی گزر رہی تھیں۔ موت سامنے تھی اور اس کی حقیقت اور دہشت اپنی اہمیت کھوتی جا رہی تھی۔

میں نے دوربینی جائزہ جاری رکھا۔ بھرت کا جسم خطرناک رینج سے ہٹایا جا چکا تھا۔ وہاں اب بارش کی طرح گولیاں برس رہی تھیں۔ اینڈرسن کے باوردی سپاہی اب کچھ اور آگے آ گئے تھے... اس جگہ فصیل پر ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ دفعتاً میں نے دفاع کرنے والوں کی مزاحمت میں شدت محسوس کی۔ میں نے ایک بار پھر نوعمر طلال کو دیکھا۔ وہ اسی لباس میں تھا جس میں ہم نے دو روز پہلے اسے پھانسی گھاٹ پر دیکھا تھا۔ جب بھرت اور انور خاں سمیت کم و بیش پندرہ افراد کو دردناک طریقے سے سولی چڑھایا جانے والا تھا۔ طلال اور اس کے نڈر دوست، عقابوں کی طرح حکم کے سپاہیوں پر جھپٹے تھے اور ان کی اس خوں ریز جھپٹ نے ہزاروں افراد کے مُردہ ہجوم کو زندہ کر دیا تھا۔

سلطانہ کا یہ چہیتا راجپوت بھانجا آج پھر اسی دلیری اور ولولے کے ساتھ نمودار ہوا تھا۔ اس کے دائیں بائیں یقیناً اس کی برادری ہی کے جاں نثار ساتھی تھے۔ ان کی رائفلوں پر سنگینیں چڑھی ہوئی تھیں۔ میں صرف دیکھ سکتا تھا، مجھے سنائی کچھ نہیں دے رہا تھا... وہ لوگ اپنی جگہ سے نکلے اور نعرے بلند کرتے ہوئے مخالف پوزیشنوں کی طرف دوڑے۔ گھمسان کی لڑائی میں یہ بڑا جارحانہ انداز سمجھا جاتا ہے۔ عسکری زبان میں اسے ''چارج کرنا'' کہتے ہیں۔ اس میں حملہ آوروں کی CASUALTIES تو ہوتی ہیں لیکن دشمن پر دھاک بیٹھ جاتی ہے۔ یہاں بھی حملہ آوروں کو گولیاں لگیں اور وہ گرے بھی مگر وہ آناً فاناً گوروں اور ان کے ساتھیوں کی پوزیشنوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہاں دست بدست لڑائی شروع ہوئی۔ دستی بموں کے دھماکوں سے ہر طرف دھواں پھیل گیا۔ میری نظر کا راستہ مسدود ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ''عمران! وہاں بہت سخت جھڑپ ہو رہی ہے۔ ہمیں وہاں مدد پہنچانی چاہیے۔''

عمران نے میرا سر پکڑ کر نیچے جھکا دیا۔ میں بے دھیانی میں تقریباً سیدھا کھڑا ہو گیا تھا... وہ بولا۔ ''کہیں انہیں مدد پہنچانے سے پہلے خود اللہ میاں کے پاس حاضر نہ ہو جانا۔ فائر بہت بُرے اینگل سے آ رہا ہے۔''

تقریباً تین چار منٹ بعد ہم نے دوبارہ ٹیلی اسکوپ میں سے دیکھا۔ اب فصیل کے اس حصے سے گہرا دھواں چھٹ گیا تھا اور صورتِ حال کی تھوڑی بہت جھلک نظر آ رہی تھی۔ یوں لگا کہ طلال اور اس کے ساتھی اوپر چڑھ آنے والے دستوں کو کافی حد تک پیچھے دھکیلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ یقیناً پیچھے ہٹنے اور پسپا ہونے والوں میں سے بہت سے نیچے بھی گرے ہوں گے۔ زوردار فائرنگ اب بھی جاری تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ طلال اور اس کے ساتھیوں نے اب کافی آگے جا کر پوزیشنیں لے لی ہیں۔۔۔۔

اسے اطمینان بخش صورتِ حال کہا جا سکتا تھا، تاہم یہ اطمینان تادیر برقرار نہیں رہا۔ بہت جلد پھر سے فصیل کے اس حصے پر گورے اور مقامی سپاہیوں کا اجتماع ہو گیا۔ دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

عمران نے حسنات سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں وہاں پہنچنا ہوگا۔ وہاں اپنی تعداد میں بھی اضافہ کرنا ہوگا۔''

''وہاں پہنچنا ہی تو مشکل ہے جی۔ مجھے اس کے لیے پہلے راستہ بنانا پڑے گا۔''

''تو پھر بناؤ راستہ... یہ ضروری ہے۔'' میں نے کہا۔

حسنات احمد نے اثبات میں سر ہلایا اور میری ہدایت پر عمل کرنے کے لیے فصیل کے اس حصے کی طرف چلا گیا جہاں ایمونیشن میں آگ لگنے کی وجہ سے مسلسل شعلے بھڑک رہے تھے اور راستہ مسدود ہو کر رہ گیا تھا۔

دل میں بار بار خیال آ رہا تھا کہ کہیں ہم نے غلط فیصلہ تو نہیں کر لیا؟ کیا ہمیں اینڈرسن کی پیشکش پر مزید غور کر لینا چاہیے تھا؟ قلعے کی حفاظت کب تک کی جا سکے گی اور اگر اینڈرسن اور حکم کے دستے قلعے میں گھسنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر کیا صورتِ حال ہوگی؟ یہاں قاسمیہ کی بے شمار عورتیں

اور بچے موجود تھے۔ فتح اور شراب کے نشے میں چُور سپاہی، خاص طور سے ہندو سپاہی کچھ بھی کر سکتے تھے۔ یہی وقت تھا جب میں نے بلند فصیل کے کنگروں کے اوپر سے دور تاریکی میں نظر دوڑائی۔ ایک دم یوں لگا میرے جسم کا سارا لہو میری بصارت میں سمٹ آیا ہے۔ بدن پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ زرگاں کی ٹمٹماتی روشنیوں سے بہت آگے گہری تیرگی میں مجھے ایک روشن لکیر سی نظر آئی۔ یہ لکیر یہاں پہلے نہیں تھی... یہ کیا تھا؟

میں نے لرزتے ہاتھوں سے آہنی اسٹینڈ پر وزنی ٹیلی اسکوپ کو گھمایا اور اسے اس روشن لکیر پر فوکس کرنے کی کوشش کی جو شمالی افق پر نمودار ہوئی تھی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں کامیاب ہو گیا... میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ ہزاروں مشعلیں تھیں جو تیز رفتاری سے زرگاں کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ یہ وہ ''کمک'' تھی جس کا انتظار کرتے کرتے زرگاں کے باسیوں نے کئی برس گزار دیے تھے... یہ تل پائی کی سرکش فوج تھی اور اس کی قیادت یقیناً مراد شاہ اور چھوٹے سرکار کر رہے تھے۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ جب مصیبت میں گھرے ہوئے شخص کو اپنے دوستوں کی پکار سنائی دیتی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ''ہمت نہ ہارو'' ہم آ رہے ہیں، تو اس شخص کے اندر سے ہی اتنی توانائی پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کی ''مصیبت'' کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ میں نے اس کیفیت کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا اور یہ ایک یادگار کیفیت تھی۔ میں نے لرزاں آواز میں عمران سے کہا۔ ''عمران! وہ آ گئے ہیں۔''

''کون؟'' اس نے فائر کرتے ہوئے کہا۔

''خود دیکھو۔'' میں نے اسے ٹیلی اسکوپ کی طرف بلایا۔

اس نے میگزین کے آخری دو فائر کیے اور جھک کر ٹیلی اسکوپ کی طرف آیا۔ اس نے دیکھا اور وہ بھی مبہوت رہ گیا۔

''زبردست۔'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا...

میں نے کہا۔ ''یہ بہت بڑی تعداد میں ہیں... اور ابھی کچھ فاصلے پر ہیں۔ ہم بلندی پر ہونے کی وجہ سے انہیں دیکھ پا رہے ہیں۔''

کچھ دیر بعد عمران نے ٹیلی اسکوپ سے نگاہ ہٹائی اور جذباتی لہجے میں بولا۔ ''میں نے کہا تھا نا تابی! وہ ضرور آئیں گے۔ انہیں حرکت میں لانے کے لیے جس ڈنکے کی ضرورت تھی، وہ ڈنکا ہم نے یہاں بجا دیا تھا... ڈنکے کے بغیر کچھ نہیں ہوتا تابی...''

☆☆☆

اس سے آگے کا احوال تفصیلات سے لکھا جائے تو اس کے لیے بہت سے صفحات درکار ہوں گے۔ وہ ایک خوں ریز لڑائی تھی۔ غالباً اینڈرسن کے دستوں کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ جب فتح کے قریب پہنچ چکے ہوں گے، اچانک ان پر عقب سے یلغار ہو جائے گی۔ درحقیقت چھوٹے سرکار اجیت رائے اور مراد شاہ بالکل درست وقت پر پہنچے تھے۔ وہ کم و بیش چار ہزار سپاہیوں کے ساتھ ایک سیلاب کی طرح زرگاں میں داخل ہوئے اور بلاتوقف اینڈرسن کے دستوں پر جا پڑے۔ گھمسان کا رن پڑا۔ قلعے کے اندر سے ہمارے جنگجوؤں نے بھی زوردار حملہ کیا۔ انور خاں بالائی منزل کی کھڑکی سے یہ سارا نقشہ دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے رائے دی کہ اب قلعے کے دروازے کھول دیے جائیں اور باہر نکل کر گوروں پر ہلّا بولا جائے۔

انور خاں کا یہ پیغام میرے ذریعے حسنات اور مبارک علی وغیرہ تک پہنچا۔ پھر چار پانچ منٹ کے اندر قلعے میں موجود ہزاروں پُرجوش سپاہیوں تک پہنچ گیا۔ قلعے کے دو دروازے کھول دیے گئے۔ حسنات، مبارک اور دوسرے کمان داروں کی قیادت میں مسلمان سپاہی اور جنگجو بلائے ناگہانی کی طرح اینڈرسن کے دستوں پر جا پڑے۔ اینڈرسن کی فوج بلاشبہ زبردست تربیت یافتہ تھی۔ ان کے پاس بہترین اسلحہ بھی موجود تھا، مگر جب وہ دوطرفہ حملے کی زد میں آئی تو اس گندم کی طرح پس گئی جو چکی کے پاٹوں کے درمیان آتی ہے۔ اس لڑائی میں ہم نے زیادہ حصہ نہیں لیا۔ ہمیں ضرورت ہی نہیں تھی۔ درحقیقت ہم اپنے کرنے والا کام کر چکے تھے۔ ہم نے حسنات، مبارک علی اور طلال جیسے جاں نثاروں کے ساتھ مل کر وہ طبل بجا دیا تھا جس کی گونج پورے بھانڈیل اسٹیٹ میں پھیلی تھی۔ مُردہ سماعتیں زندہ ہوئی تھیں اور لوگوں نے بدمست فرماں رواؤں کے لیے اس یوم کو یومِ حساب بنا دیا تھا۔

اصل اور فیصلہ کن لڑائی قریباً ایک گھنٹا ہی جاری رہ سکی۔ اس میں خاصا جانی نقصان بھی ہوا۔ ظاہر ہے زیادہ نقصان اینڈرسن اور حکم کے وفاداروں کا تھا۔ قلعے کے سامنے اور قاسمیہ کے گلی کوچوں میں ہر طرف گورے اور مقامی سپاہیوں کی لاشیں بکھری نظر آ رہی تھیں۔ گورے سپاہیوں اور افسروں کی لاشیں نفرت اور انتقام کا نشانہ بنیں۔ انہیں تاراج کیا گیا اور گھسیٹا گیا۔ سیکڑوں زخمی ہوئے اور لاتعداد افراد

کو گرفتار کیا گیا۔ اب مسلح سپاہیوں اور عام لوگوں نے خود کو دو حصوں میں تقسیم کرلیا۔ ایک حصہ مرادشاہ اور حسنات وغیرہ کی قیادت میں بھگوڑے فوجیوں کے تعاقب میں روانہ ہوا، دوسرا زرگاں کے عظیم الشان راج بھون کی طرف بڑھنے لگا۔ وہی راج بھون جو دورِ قدیم کے شاہی محلات سے کہیں زیادہ شان وشوکت، دبدبہ اور رنگینی اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔ یہاں شراب پانی کی طرح بہائی جاتی تھی۔ یہاں پریوں کے جمگھٹے تھے اور رائے وشوانا تھ عرف حکم جی، راجا اِندر کی طرح یہاں دادِ عیش دیتا تھا۔ اس ''راجا اِندر'' کے حواری وہی جارج گورا، سرجن اسٹیل، اینڈرسن اور منیارڈ جیسے لوگ تھے۔

میں اور عمران بھی اس نعرہ زن ہجوم کا حصہ تھے جو راج بھون کی طرف بڑھ رہا تھا۔ راج بھون کے سامنے پہنچ کر مسلح دستے اور عام لوگ چاروں طرف پھیل گئے۔ انہوں نے راج بھون کو گھیر لیا تھا۔ یہاں بمشکل ڈیڑھ دو سو گارڈز ہوں گے یا پھر حکم کا خاص محافظ دستہ تھا جس کی تعداد سو سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ لوگ کتنی بھی جاں نثاری دکھاتے، ان کے لیے ممکن نہیں تھا کہ حکم کا دفاع کرسکتے۔ اچانک کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ یہ مبارک علی تھا۔ اس نے کہا۔ ''جناب! آپ کو چھوٹے سرکار یاد فرما رہے ہیں۔''

''کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہاں جیپ میں بیٹھے ہیں۔'' مبارک علی نے بتایا۔

میں اور عمران لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے اس گرد آلود لینڈ روور جیپ تک پہنچے جس پر ایک بڑا جھنڈا لہرا رہا تھا اور مسلح گارڈز نے جسے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ میں اور عمران موقع پر پہنچے تو چھوٹے سرکار جیپ سے اتر آئے۔ وہ شاندار شخصیت کے مالک تھے۔ نل پانی میں ان سے کئی بار ملاقات ہوچکی تھی لیکن آج وہ پہلی بار فوجی وردی میں تھے اور ان کے جسم پر اسلحہ سجا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھ سے معانقہ کیا پھر عمران سے ہاتھ ملایا۔ میں نے عمران کا تعارف کرایا تو پھر اس سے بھی ''شاہی معانقہ'' ہوا۔ چھوٹے سرکار کے ذاتی گارڈز نے مجھے باقاعدہ سیلوٹ کیا۔ اس سیلوٹ کو دیکھ کر عمران نے بہت بُرا سا منہ بنایا اور مجھے سرگوشی میں مخاطب کر کے بولا۔ ''زیادہ بانس پر چڑھنے کی ضرورت نہیں۔ جس طرح جہانگیر کی کامیابیوں کے پیچھے نور جہاں کا ہاتھ تھا، تمہارے پیچھے میرا ہاتھ ہے۔''

ہمیں بڑے احترام کے ساتھ اس شاہی جیپ میں سوار کیا گیا۔ چھوٹے سرکار نے سب سے پہلے مجھ سے انور خاں کے بارے میں پوچھا۔ میں نے کہا۔ ''انور خاں زخمی ہے جناب... لیکن خطرے سے باہر ہے۔ وہ اس وقت قلعے میں ہے۔''

''بھگوان کا شکر ہے۔'' چھوٹے سرکار نے کہا۔ ان کی اونچی ناک کا بانسہ کامیابی کی خوشی میں ہمیشہ سے زیادہ چمک رہا تھا۔ انہوں نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور بولے۔ ''ہم جانت ہیں، اس سے یہاں تمہاری حیثیت ایک کمان دار کی ہے۔ لوگن تمہارے اشاروں پر چل رہے ہیں... بلکہ شاید تم دونوں کے اشاروں پر چل رہے ہیں۔'' چھوٹے سرکار نے آخری الفاظ عمران کی طرف دیکھ کر کہے۔

''جی ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''یہاں جو کچھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے اس میں عمران نے بھرپور کردار ادا کیا ہے۔''

''ہاں، ہمیں بہت سی جانکاریاں ملی ہیں۔ بہرحال، ان تفصیلی باتوں کے لیے سمے چاہیے۔ اب ہم نے تمہیں ایک خاص بات کہنے کے لیے بلایا ہے۔''

''جی فرمایئے۔''

''لوگن راج بھون میں داخل ہونے والے ہیں۔ ہم چاہت ہیں کہ صرف خاص لوگن ہی اندر داخل ہوں اور اگر بھائی صاحب واقعی اندر موجود ہیں تو ان کو زندہ گرفتار کیا جاوے... اور ان کے ساتھ کوئی بُرا برتاؤ نہ ہو۔''

میں نے چونک کر چھوٹے سرکار اجیت رائے کی طرف دیکھا۔ بڑے بھائی حکم کی طرف سے چھوٹے بھائی پر کیا ظلم روا نہیں رکھا گیا تھا۔ ناانصافی اور نفرت کی حد کردی گئی تھی لیکن اس کے دل میں پھر بھی کسی نہ کسی درجے میں بھائی کا احترام موجود تھا۔ یہ اس چھوٹے بھائی کے بڑے پن کی نشانی تھی۔

میں نے کہا۔ ''آپ جو حکم کریں گے ویسا ہی ہوگا چھوٹے سرکار! اب آپ آگئے... ہیں جناب! اب میں، عمران یا انور خاں کچھ نہیں ہیں۔ اب جو کچھ ہیں آپ ہیں۔''

چھوٹے سرکار نے میرا کندھا تھپکا۔

... کچھ دیر بعد میں راج بھون کے عظیم الشان محرابی دروازے کے سامنے ایک جیپ کی چھت پر موجود تھا۔ میرے ہاتھ میں ایک لاؤڈ اسپیکر تھا۔ میں نے بہ آوازِ بلند اعلان کیا کہ چھوٹے سرکار کے حکم کے مطابق سب لوگ راج بھون کے سامنے سے ہٹ کر کم از کم دو سو گز پیچھے چلے جائیں... راج بھون کا صرف ایک دروازہ کھولا جائے گا اور اس دروازے میں سے بھی صرف ایک فوجی دستہ اندر داخل ہوگا جس کی کمان میں خود کروں گا۔

میں نے یہ اعلان دو تین بار دہرایا۔ لوگ پیچھے ہٹنے لگے اور پھر معقول حد تک پیچھے چلے گئے۔ میں، عمران اور مبارک علی کمانڈوز کی تین ٹولیوں کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ ہم نے میگافونز پر بار بار وارننگ دی کہ راج بھون کو چاروں طرف سے گھیرا جاچکا ہے اور کسی طرح کی مزاحمت بیکار ہے۔ لہٰذا اندر موجود گارڈز فائرنہ کریں اور خود کو حوالے کردیں۔ حکم سے بھی کہا گیا کہ وہ باہر نکل آئے اور اپنی گرفتاری پیش کردے۔

دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آرہا تھا۔ ہم راج بھون کے وسیع وعریض احاطے سے گزر کر اس شاندار شاہی بالکونی کے سامنے پہنچے جہاں چند ہفتے پہلے حکم کی چہیتی بیوی رتنا دیوی کے ہاں بچے کی ولادت کی خوشی منائی گئی تھی اور حکم نے مٹھیاں بھر بھر کے نیچے کھڑے لوگوں پر سونا چاندی نچھاور کیا تھا۔ آج یہ بالکونی سنسان پڑی تھی مگر بالکل سنسان بھی نہیں تھی۔ یہاں شاہی گارڈز کی پوزیشنیں موجود تھیں۔ انہوں نے فائرنگ شروع کردی۔ ہماری طرف سے بھی بھرپور جواب دیا گیا۔ دو تین منٹ کے اندر بالکونی خاموش ہوگئی اور وہاں آگ بھڑک اٹھی۔

ہم راج بھون کے اندرونی حصے میں داخل ہوگئے۔ مزاحم گارڈز کو شوٹ کردیا گیا اور باقی کی پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی۔ درجنوں ملازماؤں، خواجہ سراؤں اور خوب صورت لڑکیوں نے محل کے اندرونی حصوں سے نکل کر خود کو ہماری حفاظت میں دیا۔ مرد خادموں کی تعداد بھی ڈیڑھ سو کے لگ بھگ تھی۔ حکم اور اس کی بیوی رتنا کا کہیں پتا نہیں چل رہا تھا۔ ایک بڑے کمرے میں پہنچ کر ہم سکتہ زدہ رہ گئے۔ قالین پر خواتین اور بچوں کی کم وبیش بیس لاشیں پڑی تھیں۔ ان لوگوں پر اندھا دھند مشین گن کے برسٹ چلائے گئے تھے۔ کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور تھے۔ دیواروں اور فرنیچر وغیرہ پر گولیوں کے اَن گنت نشان دکھائی دے رہے تھے۔ مرنے والے بچوں کی عمریں تقریباً پندرہ اور دو تین سال کے درمیان تھیں۔

مبارک علی نے کہا۔ ''یہ حکم کے اہلِ خانہ ہیں جی۔ یہ اس کی تینوں رانیاں ہیں۔ یہ بچے ہیں۔ یہ بچوں کی بڑی پھوپی ہے... یہ شاید چھوٹی ہے.....'' مبارک بتا رہا تھا اور ہم حیران کھڑے تھے۔ رعایا کی عزت آبرو کو کھلونا سمجھنے والے لوگ اپنی آن عزت کے حوالے سے کتنے حساس ہوتے ہیں۔ جب یوم حساب آتا ہے اور انہیں اندیشہ محسوس ہوتا ہے کہ مکافاتِ عمل کی وجہ سے ان کی اپنی عزت پر حرف آئے گا تو وہ خود سے وابستہ خواتین اور دیگر لوگوں کو بیدردی سے موت کے منہ میں دھکیل دیتے ہیں۔

مبارک علی اور دو دیگر افسر الٹ پلٹ کر خونچکاں لاشوں کو دیکھ رہے تھے۔ مبارک علی نے ایک کونے میں پڑی اکٹھی چار لاشوں کو دیکھ کر بتایا۔ ''یہ اس آخری جشن والی پریاں ہیں۔ لگتا ہے کہ حکم جی نے ان کو اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔''

خوب صورت لڑکیاں، نودمیدہ کلیوں جیسے چہرے، خوش گلو، خوش اندام وخوش اطوار۔ انہیں حکم اور اس کے حواریوں کی راتوں کو رنگین کرنے کے لیے سخت ترین تربیت اور آزمائشوں سے گزارا گیا تھا۔ نہ جانے یہ کن کن آنکھوں سے یہاں لائی گئی تھیں؟ کن کن آنکھوں کا نور تھیں؟ ان کی عمر مرنے کی نہیں تھی لیکن وہ مری پڑی تھیں... فراعینِ مصر کی طرح حکم نے اپنی ان جواں سال کنیزوں کو اپنے انجام کے مقبرے میں زندہ دفن کرنے کی رسم نبھائی تھی۔

''ان میں رتنا دیوی بھی ہے؟'' میں نے مبارک سے پوچھا۔

''نا ہیں جی۔ وہ کہیں نظر نا ہیں آرہیں۔''

عمران نے کہا۔ ''میرا اندازہ ہے کہ ان لوگوں کو آدھ پون گھنٹے پہلے مارا گیا ہے۔'' مبارک کے ساتھی افسروں نے اس کی تائید کی۔

ہم دیگر کمروں کی طرف بڑھے۔ دروازے توڑ کر حکم کے پُرشکوہ بیڈ روم میں داخل ہوئے۔ یہ بیڈ روم جدید اور قدیم طرزِ آرائش کا شاندار نمونہ تھا۔ جدید ترین بستر، قیمتی شرابوں سے بھرا ہوا اور خودکار طور پر گھومنے والا ''بار''... آڈیو اور ویڈیو سسٹم، گھوڑا گاڑیوں اور لالٹینوں والے اس شہر میں جو کچھ بھی تھا مگر اس بیڈ روم میں ہر جدید سہولت موجود تھی۔ اس بیڈ روم میں پہنچ کر ہمیں پہلی بار یہ اندازہ ہوا کہ شاید حکم یہاں سے فرار ہوگیا ہے۔ ہماری نگاہیں ایک بھاری بھرکم خفیہ سیف کے ادھ کھلے دروازے پر پڑیں۔ وہاں اب بھی دو چار مرصع طلائی زیور اور قیمتی پتھر موجود تھے۔ پتا چل رہا تھا کہ حکم نے اس سیف کا قیمتی ساز وسامان افراتفری میں نکالا ہے اور اپنے ساتھ لے گیا ہے۔

ہمارے ساتھ آنے والے قریباً ڈیڑھ سو مسلح کمانڈوز راج بھون میں چاروں طرف پھیل گئے اور اہم افراد کی تلاش شروع ہوئی۔ میں اور عمران کچھ ساتھیوں کے ہمراہ اس وسیع وعریض عشرت کدے میں پہنچے جہاں ساتویں کا جشن اپنے کلائمیکس پر پہنچا تھا... وہی آبشار جو ایک بلوری تالاب

میں گرتا تھا۔ جس کی چاروں جانب شاندار نشستیں تھیں اور دن میں بھی رات کا سماں نظر آتا تھا۔ عشرت کدے کی گنبد نما چھت تاریک آسمان کی شکل اختیار کر لیتی تھی اور اس پر چاند تارے چمکتے دکھائی دیتے تھے۔ بہرحال، فی الوقت یہ سب کچھ نہیں تھا۔ ایک عجیب سی اداسی اور خاموشی نے درودیوار کو گھیرا ہوا تھا۔ آبشار بند تھی، وہ تالاب جس میں سنہری شراب چمکتی تھی، خالی پڑا تھا... پگھلے ہوئے سونے میں ڈوبنے ابھرنے والی عریاں مورتی بھی بے حرکت تھی۔

''یہ دیکھو تابی!'' عمران نے میری توجہ ایک گوشے کی طرف دلائی۔

ہم دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ یہ دو خوبرو لڑکیاں تھیں۔ ان کے جسم نیلے پڑ کر اکڑ گئے تھے۔ ان کے منہ کھلے ہوئے تھے اور آنکھیں پتھرا چکی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بے پناہ اذیت جھیل کر مری ہیں۔

ان لڑکیوں کو دیکھتے ہی مبارک بولا۔ ''ان بے چاریوں کو یقیناً درد کا ٹیکا لگایا گیا ہے جی۔ یہ ڈبل ٹیکا بندے کی جان لے لیوت ہے۔''

پھر اس نے ایک لڑکی کے عریاں بازو پر ٹیکے کے دو تازہ نشان دریافت کر لیے... لڑکیوں کی حالت دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ تڑپ تڑپ کر مری تھیں۔ ان کی ایڑیوں سے خون رس رہا تھا۔ جان کنی کی بے پناہ اذیت ان کے خوبرو چہروں پر یوں نقش ہو گئی تھی کہ دیکھنے والی نگاہ کانپ جاتی تھی۔

مبارک نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ دو تین گھنٹے پہلے ان لڑکیوں کو کسی جرم کی سزا دی گئی ہے۔ شاید ان پر مخبری وغیرہ کا شبہ ہو۔''

اچانک ایک دروازہ کھلا اور میں میڈم صفورا کو اپنے سامنے دیکھ کر دنگ رہ گیا... اس نے خود کو ''ہینڈز اَپ'' کر رکھا تھا۔ اس کے عقب میں آٹھ دس سہمی ہوئی لڑکیاں تھیں۔ ان کے رنگ زرد تھے۔ انہوں نے میڈم کے پیچھے خود کو یوں سمیٹ رکھا تھا جیسے وہ ان کے لیے ایک ڈھال کی حیثیت رکھتی ہو۔

مجھے اور عمران کو پہچاننے کے بعد میڈم نے ہاتھ نیچے گرا دیے اور آگے بڑھ آئی۔ وہ ہم سے گلے ملی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں پہلی بار ہلکی سی نمی دیکھی۔ اس نے کہا۔ ''ہم نے اپنی لائف بڑی مشکل سے بچائی ہے۔ حکم نے اپنے بہت سے گھر والوں اور خدمت کرنے والی لڑکیوں کو مار دیا ہے۔ میں ان لڑکیوں کو لے کر یہاں اس اسٹور میں چھپ گئی تھی۔ حکم اور کرنل اینڈرسن کے ذاتی گارڈز یہیں آس پاس سرچ کرتے رہے۔ پھر چلے گئے۔''

''کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ پتا نہیں۔ لگتا ہے کہ وہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹا پہلے کسی طرح یہاں سے نکل گئے ہیں۔''

''اینڈرسن بھی ساتھ تھا؟'' عمران نے پوچھا۔

''اندازہ تو یہی ہوتا ہے۔ جب حکم نے اپنے فیملی ممبرز کو گولیاں ماریں تو اینڈرسن بھی اس کے ساتھ تھا۔ ہم نے اسٹور روم کے پاس بھی اس کے گرجنے برسنے کی آوازیں سنیں۔''

میں نے کہا۔ ''میڈم! آپ کے خیال میں راج بھون میں کوئی ایسی جگہ جہاں وہ چھپ سکتا ہو؟''

''آپ لوگوں نے لیبارٹری کا ایریا دیکھ لیا ہے؟'' میڈم نے پوچھا۔

میں نے نفی میں جواب دیا۔ میڈم نے ہمیں اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ ہم نے خوف زدہ لڑکیوں کو مبارک علی کی حفاظت میں دیا اور خود میڈم کے ساتھ لیبارٹری کی طرف بڑھے۔ ایک کوریڈور میں ہمیں ایک اور لڑکی کی نیلگوں لاش نظر آئی۔ شدید اذیت کے سبب اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور آنکھیں حلقوں سے باہر ابلی پڑ رہی تھیں۔ مرنے سے پہلے وہ اس بری طرح تڑپی پھڑکی تھی کہ اس کے ہاتھ پاؤں کی جلد جگہ جگہ سے چھل گئی تھی۔

میڈم نے کہا۔ ''حکم نے اپنے پانچ ملازموں کو زہر والا ٹیکا لگوایا ہے۔ یہ گرین رنگ کا وہی PAIN GIVING INJECTION ہے جو جسم میں شدید ترین تکلیف پیدا کرتا ہے۔ ان پانچ ملازموں میں سے چار لڑکیاں تھیں اور ایک خواجہ سرا۔ ان کے بارے میں حکم کو شک تھا کہ انہوں نے باغیوں سے رابطہ رکھا ہوا ہے اور راج بھون کی نیوز باہر دے رہے ہیں۔''

ایک سپاہی نے لڑکی کی اکڑی ہوئی لاش پر ایک کپڑا ڈال دیا۔ ہم ایک سلائڈنگ دروازے کو کھول کر سرجن اسٹیل کی وسیع لیبارٹری میں داخل ہوئے۔ اس لیبارٹری کے تین چار پورشن تھے۔ یہاں جدید ساز و سامان موجود تھا۔ وہ تمام ''شعبدے'' یہیں پر تخلیق پاتے تھے جو بھانڈیل اسٹیٹ کے سادہ لوح لوگوں کو بے وقوف بناتے تھے۔

ہم نے چار درجن مسلح کمانڈوز کے ساتھ مل کر اس لیبارٹری کا چپا چپا چھان مارا مگر حکم، رتنا دیوی یا اینڈرسن کا کہیں سراغ نہ ملا۔ اس لیبارٹری کو کھنگالنے کے دوران میں ہم نے کئی اہم چیزیں دیکھیں۔ ہمیں وہ خاص الیکٹرانک چپس اور ان کے سگنلز وصول کرنے والے انٹینا‌ز بھی نظر آئے۔ اس سبز رنگ کی دوا کے درجنوں وائلز بھی جن سے درد کا انجکشن تیار ہوتا تھا۔ زہریلی گیس، اعصاب شل کرنے والی گیس، طاقت بخش ادویات اور اس طرح کی نہ جانے کتنی اشیا یہاں موجود تھیں۔

میڈم صفورا مجھے اور عمران کو ایک طرف لے گئی۔ وہ رازداری کے انداز میں بولی۔ ''حکم اور اینڈرسن یہاں سے فرار ہو چکے ہیں۔ لیکن وہ ہم سے بچ کر نہیں نکل سکتے۔ وہ کہیں بھی چلے جائیں، ہم انہیں ڈھونڈ لیں گے۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''جیسے وہ اپنے قیدیوں کو ڈھونڈ لیتے تھے۔''

''آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟''

''میں نے حکم کا طریقہ اسی پر الٹ دیا ہے۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''حکم جہاں بھی ہے، اپنے ساتھ ایک الیکٹرانک چپ لے کر گھوم رہا ہے۔ ہم انٹینا‌ز کے ذریعے اس کا سگنل وصول کر سکتے ہیں۔''

یہ واقعی حیران کن اطلاع تھی... ''چپ کیسے رکھی آپ نے؟'' عمران نے پوچھا۔

''آخری وقت میں مجھے شک ہو گیا تھا کہ حکم اپنی وائف کے ساتھ یہاں سے بھاگنا چاہ رہا ہے۔ یہاں ہر طرف افراتفری مچی ہوئی تھی۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ میں یہاں لیبارٹری میں آئی اور یہاں سے دو الیکٹرانک چپس نکال لیں۔ ان کے نمبرز میرے پاس نوٹ ہیں۔ ان میں سے ایک چپ میں نے اس سفری بیگ میں ڈال دی جو حکم کے کمرے میں تیار رکھا تھا.....''

اگر واقعی ایسا ہو چکا تھا تو یہ زبردست بات تھی۔ میڈم صفورا کی فہم و فراست اور معاملہ فہمی پر ہمیں کبھی شبہ نہیں رہا تھا۔ وہ ایک ایسی عورت تھی جو ہر طرح کے ماحول میں جینے کی راہیں نکال سکتی تھی اور پیچیدہ گرہیں اپنے ناخنِ تدبیر سے کھول لیتی تھی۔

عمران نے پوچھا۔ ''ہمیں کیسے پتا چلے گا کہ وہ چپ ہماری مدد کر سکتی ہے؟''

میڈم نے ہم سے صرف پانچ منٹ مانگے۔ وہ جن لڑکیوں کے ساتھ چیمبر کے اسٹور روم میں چھپی ہوئی تھی، ان میں سے ایک کو اپنے ساتھ لے آئی۔ پتا چلا کہ یہ لڑکی سرجن اسٹیل کی اسسٹنٹس میں سے ایک ہے۔ میڈم صفورا نے چند منٹ کے اندر ایسے دو انٹینا‌ز ڈھونڈ لیے جو اس خاص چپ کو

ٹریپ کر سکتے تھے جو حکم کے سفری بیگ میں موجود تھی۔ ان دونوں انٹینا‌ز کی بیٹریاں پہلے سے چارج تھیں۔

☆☆☆

...... اور اب ہم ایک بند جیپ پر سوار شہر کے نواح کی طرف جا رہے تھے۔ ہمارے ساتھ مسلح کمانڈوز والی پانچ چھ گاڑیاں اور کوئی دو درجن گھڑسوار تھے۔ انٹینا سگنل وصول کر رہا تھا۔ ان سگنلز سے اندازہ ہوتا تھا کہ حکم یہاں سے قریباً پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر جنگل میں موجود ہے اور شمال کی طرف حرکت کر رہا ہے۔

ہم شہر کی مختلف سڑکوں پر سے گزرے۔ یہاں جشن کا سماں تھا۔ ہزاروں شہری ہتھیار لہرا رہے تھے اور نعرہ زنی کر رہے تھے۔ حکم اور اس کے انگریز حواریوں سے ہمدردی رکھنے والے لوگ کونوں کھدروں میں چھپ گئے تھے۔ ان میں سے جنہوں نے زیادہ وفاداری دکھانے کی کوشش کی تھی، انہیں بُرے نتائج بھگتنا پڑے تھے۔

ایک جگہ ہمیں بڑا ہجوم نظر آیا۔ راستہ مسدود ہو چکا تھا۔ ہماری گاڑیاں رک گئیں۔ یہاں ہمیں تین لاشیں الٹی لٹکی ہوئی نظر آئیں۔ ان میں سے ایک لاش ہم نے دور ہی سے پہچان لی۔ یہ اس اسٹیٹ کے سب سے سفاک پولیس آفیسر رنجیت پانڈے کی تھی۔ اس کا چہرہ مسخ ہو چکا تھا۔ ایک شخص لپک کر ہمارے پاس آیا۔ یہ کانسٹیبل امرناتھ تھا... وہی سانولا سلونا غریب صورت شخص جس نے ایک رات اپنے چہرے پر پانڈے کا نفرت بھرا تھپڑ وصول کیا تھا... اور پھر اس تھپڑ کی بازگشت بڑی دور تک گئی تھی۔ قاسمیہ کے ''قاسمیہ چوک'' میں میری کلائیوں کے گرد لپٹی ہوئی رسیاں اس تھپڑ کی بازگشت سے ہی ٹوٹی تھیں۔ ایسے نفرت بھرے تھپڑوں کے اثرات بڑی دور تک جاتے ہیں... ہر دور کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے۔

امرناتھ ہماری جیپ کی کھڑکی سے آلگا۔ اس نے ہمیں بتایا۔ ''جناب! لوگن نے پانڈے کی لاش کو گلیوں میں گھسیٹا ہے اور یہاں الٹا لٹکا دیا ہے۔ یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ قلعے میں گیتا مکھی کے شریر کو سگریٹوں سے جلانے والا اور اس کی ہتھیا کرنے والا یہی پانڈے صاحب ہے۔''

''اس بات کا کیسے پتا چلا؟'' میں نے پوچھا۔

''قلعے کی نچلی منجل (منزل) پر کام کرنے والے دو چاکروں نے سب کچھ بتایا ہے جی۔ انہوں نے اپنی انکھیوں سے یہ جلم ہوتے دیکھا تھا۔'' امرناتھ کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں تھیں اور سیاہ چہرے پر انتقام کا جوش تھا۔

سپاہیوں نے ہجوم میں سے راستہ بنایا اور ہمارا قافلہ آگے بڑھ گیا۔ جلد ہی ہم زرگاں کے نواحی علاقے سے گزرے اور پھر جنگل میں پہنچ گئے۔ جس جیپ میں، میں اور عمران تھے، مبارک علی بھی اسی پر سوار تھا۔ شہر میں سگنل مدھم تھے مگر جونہی ہم کھلے علاقے میں پہنچے، یہ واضح ہوتے چلے گئے۔ حکم اور اینڈرسن غالباً کسی جیپ پر سوار تھے اور یہ ایک دشوار گزار علاقے میں سفر کر رہی تھی۔ یہاں ٹیلے تھے اور ان کے درمیان راستے بھول بھلیوں کی طرح تھے۔ اگر ہمیں سگنلز کی راہنمائی نہ ہوتی تو ہم شاید حکم کی گرد بھی نہ پا سکتے۔

کہیں کہیں سگنلز مدھم بھی ہو جاتے اور ہمیں پریشانی ہوتی لیکن جلد ہی ان کی کوالٹی پھر سے لوٹ آتی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم سگنلز کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ اب ہمیں اندازہ ہو رہا تھا کہ حکم جس چیز پر سواری کر رہا تھا، وہ ٹھہر چکی ہے۔ یہ اونچے نیچے ٹیلوں سے اٹا ہوا گھنا جنگل تھا۔ جلد ہی ہمیں ایک گاڑی کے ٹائروں کے نشانات بھی مل گئے۔ ہم ان نشانات کا تعاقب کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ سگنلز اب بالکل صاف ہوتے چلے جا رہے تھے۔ ایک جگہ رک کر ہم نے دوربینوں سے جگہ کا معائنہ کیا۔ قریباً دو کلومیٹر کی دوری پر ایک ٹیلے کے دامن میں ہمیں کسی رہائشی مکان کی جھلک نظر آئی۔ لکڑی کا بنا ہوا یہ چھوٹا سا بوسیدہ گھر اس ویرانے میں پتا نہیں کیوں موجود تھا۔ یقیناً وہ جیپ بھی اس گھر کے آس پاس ہی موجود تھی جس پر حکم اور غالباً گورا اینڈرسن یہاں پہنچے تھے۔ درختوں کی وجہ سے وہ جیپ ہمیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں اب گاڑیوں سے اتر جانا چاہیے۔'' عمران نے تجویز پیش کی۔

میرے ذہن میں بھی یہی خیال آ رہا تھا۔ میری ہدایت پر مبارک علی نے کمانڈوز کو اترنے کا حکم دیا۔

ہم بڑی احتیاط سے آگے بڑھنے لگے۔ آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ہم پھیلتے بھی جا رہے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ ایریا کور کیا جا سکے۔ جلد ہی ہم نے اس بوسیدہ گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ہمیں وہ شاندار لینڈ کروزر بھی نظر آ گئی جس پر شاہی جوڑا یہاں پہنچا تھا... میں نے کہا۔ ''مبارک علی! چھوٹے سرکار کی طرف سے سخت ہدایات ہیں کہ حکم کو زندہ گرفتار ہونا چاہیے۔''

''آپ بے فکر رہیں۔ ایسا ہی ہوئے گا جناب... اور اب مجھے یقین ہو گیا ہے جناب کہ حکم کا کمانڈر اینڈرسن صاحب بھی اندر ہے۔'' مبارک دبے دبے جوش سے بولا۔

مبارک علی نے مجھے لینڈ کروزر کے قریب ہی کچی مٹی پر بڑے سائز کے فوجی بوٹوں کے نشانات دکھائے اور کہا۔ ''مجھے ننانوے فیصد یقین ہے کہ یہ اینڈرسن صاحب کے بوٹوں کا نشان ہی ہے... اور یہ دیکھیں جی، یہ دوسرے جوتے کا نشان۔ یہ بھی فوجی بوٹ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ان لوگن کے ساتھ ایک یا دو فوجی بھی ہیں۔''

ہم ایک کٹے ہوئے ٹیلے کی اوٹ میں کھڑے تھے۔ ہمارے کمانڈوز چاروں طرف پوزیشنیں لے چکے تھے۔ میں نے میگافون کے ذریعے بلند آواز میں کہا۔ ''رائے وشوا ناتھ اور اینڈرسن صاحب! آپ چاروں طرف سے گھیرے میں آ چکے ہیں۔ بھاگنے یا چھپنے کی کوشش بیکار ہے۔ بہتر ہے کہ آپ خود کو ہمارے حوالے کر دیں۔''

دوسری طرف مکمل خاموشی رہی۔ عمران کے مشورے سے میں نے یہ اعلان دوبار مزید کیا۔ آخری اعلان میں، میں نے کہا۔ ''ہم آپ کو فیصلہ کرنے کے لیے پانچ منٹ کا وقت دیتے ہیں۔ اگر آپ باہر نہیں آئے تو ہمیں اندر گھسنا پڑے گا اور اس صورت میں اپنے نقصان کی ساری ذمے داری آپ پر ہو گی۔''

اعلان کے بعد ہم نے گھڑی دیکھی اور انتظار کرنے لگے۔ میں نے مبارک علی سے پوچھا۔ ''یہ کون سی جگہ ہے؟''

''یہ کچے کے ساتھ والا علاقہ ہے۔ آپ نے جلا ہوا جنگل دیکھا ہے نا... وہ یہاں سے بس سات آٹھ میل کی دوری پر ہے... اور... آپ کو پتا ہے، یہ گھر کس کا ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے پُرتجسس انداز میں کہا۔

''یہ ایک اچھوت بلورام کا گھر ہے جی۔ چار پانچ سال پہلے تک یہ بندہ راج بھون کے بھنگی خانے میں کام کرتا تھا۔ بھون کا خاندانی چاکر تھا۔ پھر اس بے چارے کو کوڑھ ہو گیا۔ اس کو راج بھون کی نوکری سے نکال دیا گیا بلکہ شہر سے ہی نکلنے کا حکم دیا گیا۔ کافی سے تنگ تو بلورام کا کچھ پتا نا ہیں چلا۔ پھر زرگاں کے دو شکاریوں نے بتایا کہ بلورام اپنی پتنی اور دو بچوں کے ساتھ ''کچے'' کے قریب جنگل میں کٹیا بنا کر رہت ہے۔ یہ اسی بلورام کا گھر ہے جی۔'' مبارک کے لہجے میں طنز تھا۔

میں اور عمران حیران رہ گئے۔ جان بچانے کی خاطر انسان کیا کچھ کرتا ہے... اور کبھی کبھی کس درجے تک گر جاتا ہے۔ زرگاں کے اونچی شان والے راجا وشوا ناتھ عرف حکم کو پناہ ملی بھی تھی تو کہاں؟

مبارک علی نے کہا۔ ''اگر ہمیں ان سگنلز کی مدد حاصل

نا ہیں ہوتی تو ہم کبھی یہاں تک نہ پہنچتے۔ اور اگر پہنچ بھی جاتے تو شاید یہ نہ سوچتے کہ حکم جی اور اینڈرسن صاحب بہادر نے اس کی کمین کوڑھی کے گھر کو اپنی پناہ گاہ بنایا ہوئے گا۔''

..... پانچ منٹ گزر گئے۔ چھٹا اور ساتواں منٹ بھی گزر گیا۔ اب حرکت میں آنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مبارک علی کے اشارے پر کمانڈوز نے گھر کی کھڑکیوں اور دروازے پر چند راؤنڈ فائر کیے۔ جواب میں اندر سے تابڑ توڑ گولیاں چلیں... اور ہمارا ایک کمانڈو کندھے پر گولی لگنے سے شدید زخمی ہو گیا۔

اندازہ ہو رہا تھا کہ اندر والے بھرپور مزاحمت کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہمیں اب اپنا لائحہ عمل سوچنا تھا۔ سورج ڈھل گیا تھا اور اب جلد ہی شام کے سائے تاریکی میں بدلنے والے تھے۔ تاریکی کے بعد گھر کے اندر گھسنے کی کامیاب کوشش کی جا سکتی تھی۔ ہم نے اس کے لیے صلاح مشورہ شروع کر دیا۔

جونہی تاریکی گہری ہوئی، ہم نے اپنی کارروائی کا آغاز کر دیا۔ اس کام کے لیے عمران نے سب سے پہلے خود کو پیش کیا۔ مبارک علی بھی اندر جانے پر آمادہ تھا مگر پھر اسے باہر کی ذمے داری سونپ دی گئی۔ اس کی جگہ میں کارروائی میں شامل ہوا۔ میرے اندر اینڈرسن اور اس کے ساتھیوں کے لیے بے پناہ آگ تھی۔ سلطانہ کا اصل قاتل تو یہی نیلی آنکھوں اور بھینسے کے جسم والا انگلش کمانڈر تھا۔ ہمارے ساتھ چھ اور منتخب جوان اندر جانے کے لیے تیار تھے۔

پروگرام کے مطابق، مبارک علی اور اس کے ساتھیوں نے گھر میں موجود افراد کو سامنے کی طرف سے فائرنگ میں انگیج کیا۔ یہ بڑی زوردار فائرنگ تھی۔ ہم بغلی طرف سے گھر کی بیرونی چاردیواری کی طرف بڑھے۔ یہاں درخت زیادہ تھے جو ہمیں کیموفلاج کر رہے تھے۔ سب سے پہلے عمران گھر کے اندر کودا۔ وہ اس نے ایک کھڑکی نما دروازہ کھول دیا۔ ہم بھرا مار کر اندر گھس گئے۔ شدید فائرنگ کی زد میں آ کر دو بکریاں زمین پر پڑی تڑپ رہی تھیں۔ تیسری شاید ہلاک ہو چکی تھی۔ عمران نے ایک کھڑکی کو زوردار لات رسید کی۔ وہ کھل گئی۔ ایک رائفل بردار گورا عمران کے سامنے آیا مگر اس کی تیزی عمران کی تیزی کا مقابلہ نہیں کر سکی۔ عمران کا چلایا ہوا پانچ گولی کا برسٹ اس گورے کو چھلنی کر گیا۔ ہم کمرے میں کود گئے۔

یہی وقت تھا جب ہم پر بائیں جانب سے فائرنگ ہوئی۔ ایک گولی میرے سامنے کھڑے کمانڈو اشرف کے سر میں لگی اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گرا۔ ایک دوسرے کمانڈو کو بھی میں نے اوندھے منہ گرتے دیکھا۔ میں نے رائفل کے شعلے سے حملہ آور کی پوزیشن کا اندازہ لگا لیا تھا۔ میں نے اس پر گولی چلائی اور ساتھ ہی اس پر جست کی۔ میری چلائی ہوئی گولی تو اسے نہیں لگی لیکن میری رائفل کی سنگین اس کے سینے میں اندر تک دھنس گئی۔ میں نے لات رسید کر کے اسے اپنی رائفل سے علیحدہ کیا۔ اس کی اپنی رائفل اس کے ہاتھ سے گر چکی تھی۔

اسی دوران میں ایک کمانڈو مجھ سے مخاطب ہو کر چلایا۔ ''یہ دیکھیں جی۔''

ہم ساتھ والے کمرے میں پہنچے۔ منظر لرزہ خیز تھا۔ گولیوں کے بہت سے خولوں اور ایک ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے ٹکڑوں کے درمیان کچے فرش پر رتنا دیوی اور اس کے بچے کی لاش پڑی تھی۔ رتنا دیوی اس حال میں بھی گہنوں سے لدی ہوئی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اسے اندھا دھند ہونے والی ''کراس فائرنگ'' میں گولی لگی ہے۔ یہ ایک ہی گولی تھی جو پہلے اس کے بچے کو لگی پھر اس کے اپنے سینے سے پار ہو گئی۔ اس کے علاوہ اس کا ایک پاؤں بھی اس کی شاہی جوتی سمیت خون سے رنگین نظر آ رہا تھا۔

''حکم اور اینڈرسن آس پاس ہی ہوں گے۔'' عمران نے عقابی نظروں سے ارد گرد دیکھ کر کہا۔

یہی وقت تھا جب دو کمانڈوز حکم کو پکڑ کر لے آئے۔ یہ نظارہ بھی عبرت ناک تھا۔ زرگاں کا تاجدار جو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا، مٹی میں لت پت نظر آتا تھا۔ اس کی کام دار سنہری پگڑی اس کے گلے میں جھول رہی تھی۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔

''یہ بھوسے والے کمرے میں چھپے ہوئے تھے جی۔'' کمانڈو نے اطلاع دی۔

''یہ پستول ان کے لباس سے نکلا ہے۔'' دوسرے کمانڈو نے بھرا ہوا قیمتی بریٹا پسٹل میری طرف بڑھایا۔

لگتا تھا کہ گرفتاری کے وقت وشوا ناتھ عرف حکم جی نے تھوڑی بہت مزاحمت بھی کی ہے۔ اس کا چغا نما لباس ایک طرف سے پھٹا ہوا تھا اور انگلیاں بھی زخمی تھیں۔

''تلاشی لے لی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نا ہیں جناب۔'' کمانڈو آفیسر نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''تلاشی لو۔'' میں نے کہا۔

حکم گرجا۔ ''اپنے گندے ہاتھ ہم سے دور رکھو۔ ہمارے پاس کچھ نا ہیں۔''

میں نے رائفل کی نال حکم کے سینے کی طرف کی اور انگلی

ٹریگر پر رکھتے ہوئے کہا۔ ’’ان کے ہاتھ کتنے بھی گندے ہوں گے مگر اس شخص کے ہاتھوں سے گندے نہیں جسے تم اچھوت اور کوڑھی کہتے ہو۔۔۔ اور جس کے گھر میں پناہ لیے ہوئے ہو۔‘‘

میرے اشارے پر کمانڈو آگے بڑھا اور اس نے حکم کی مزاحمت کی پروا کیے بغیر اس کی تلاشی لی۔ حکم کی آنکھوں میں ہر وقت جلتی ہوئی آگ کی جگہ اب راکھ نظر آرہی تھی۔ اس کا چہرہ کسی نہایت قیمتی لیکن ٹوٹے ہوئے فانوس کی طرح تھا۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر اس کی چہیتی پتنی اور بچے کی لاشیں پڑی تھیں۔ غالباً اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ایک نظر انہیں دیکھ ہی سکے۔ کمانڈوز اسے گن پوائنٹ پر باہر لے گئے۔

مبارک علی ایک کمرے سے یہاں کے مکینوں کو نکال کر لے آیا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر عورت اور اس کے دو لڑکے تھے۔ لڑکوں کی عمریں اٹھارہ بیس سال رہی ہوں گی۔ میں یہ دیکھ کر چونکا کہ عورت کے ہاتھ کوڑھ زدہ ہیں۔ یہ غریب صورت عورت صورتِ حال کی سنگینی کے سبب تھر تھر کانپ رہی تھی۔

’’ان کو بھی باہر لے جاؤ۔‘‘ میں نے مبارک علی سے کہا۔

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ عمران نے ایک چھوٹے سے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’وہاں سے بھی گولی چل رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ صاحب بہادر اینڈرسن صاحب وہیں پر چھپے ہوئے ہیں۔‘‘

اگلے دو تین منٹ میں یہ بات ثابت ہو گئی۔ اینڈرسن وہیں موجود تھا۔ اس کے پاس ایک ’’ایل ایم جی‘‘ تھی اور یقیناً کافی تعداد میں راؤنڈز بھی تھے۔ مگر جو کچھ بھی تھا، اپنی تمام تر ہوشیاری اور دیدہ دلیری کے باوجود وہ اس چھوٹی سی کوٹھڑی میں ایک چوہے کی طرح ٹریپ ہو چکا تھا۔ ایک گوشت خور سفید چوہا جو ذہانت اور دلیری میں خود کو حرفِ آخر سمجھتا تھا اور بات بات پر تاریخی حوالے بھی دیتا تھا۔ وہ یہاں زرگاں میں کمانڈر انچیف کی حیثیت رکھتا تھا مگر اب ہمارے اور اس کے درمیان ایک بوسیدہ چوبی دروازے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

میں نے بہ آوازِ بلند کہا۔ ’’اینڈرسن صاحب! باہر آجاؤ۔ اس کے سوا تمہارے پاس اب کوئی راستہ نہیں ہے۔‘‘

چند سیکنڈ بعد یہی بات عمران نے بھی دہرائی۔

کچھ دیر تک اندر خاموشی طاری رہی۔ پھر اینڈرسن کی بھاری بھرکم آواز ابھری۔ وہ برنش لب و لہجے میں بولا۔ ’’کیا تم ضمانت دیتے ہو کہ میں گرفتاری دے دوں تو تم گولی نہیں چلاؤ گے؟‘‘

میں نے کہا۔ ’’اینڈرسن صاحب! تم کوئی بھی شرط منوانے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ تم ہاتھ اٹھا کر باہر آجاؤ۔ ہم تمہیں زندہ گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔‘‘

ہمارے درمیان مختصر مکالمہ ہوا۔ پھر ہماری ہدایت کے مطابق اینڈرسن نے اپنی خطرناک ’’ایل ایم جی‘‘ کھڑکی سے باہر پھینکی۔ تب اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ وہ فوجی وردی میں تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ سر سے بلند کر رکھے تھے۔ اسے تین اطراف سے مسلح کمانڈوز نے نشانے پر لیا ہوا تھا۔ اس کی ذرا سی غلط حرکت اس کے لیے موت کا پیغام بن سکتی تھی۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کا ایک کندھا خون آلود ہے۔

’’گھٹنوں کے بل بیٹھ جاؤ۔‘‘ میں نے گرج کر کہا۔

وہ ذرا سا جھجکا۔ پھر اس نے اپنے گھٹنے زمین پر ٹیک دیے۔ فوری موت سے بچنے کے لیے اس نے اپنے ہاتھ بالکل سیدھے کھڑے کر رکھے تھے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس کی توقع اینڈرسن کو نہیں تھی۔ میری چلائی ہوئی گولی اینڈرسن کے سینے پر لگی۔ اس کا منہ بے ساختہ کھل گیا اور آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ گولی کے جھٹکے سے اس کی کیپ اچھل کر دور جا گری۔

میں نے کہا۔ ’’اینڈرسن صاحب! یاد کرو۔ اس طرح کا سین پہلے بھی دہرایا جا چکا ہے۔ اٹھرا گاؤں میں سلطانہ راجپوت نے بھی اسی طرح ہتھیار پھینکے تھے اور خود کو تمہارے حوالے کرنا چاہا تھا لیکن تم نے اس کی حوالگی قبول نہیں کی تھی۔ تم نے اسے مار ڈالا تھا۔‘‘

اینڈرسن کی حالت ایک زخمی درندے کی سی تھی مگر اس کی بے پناہ تکلیف کے سامنے اس کی درندگی بے بس تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ تھام لیا اور دو زانو بیٹھ گیا۔ میں نے دوسری گولی اس کے سر پر ماری۔ وہ اس کا رخسار توڑ کر سر میں گھس گئی۔ وہ اوندھے منہ گرا اور اس کا لہو ایک ریلے کی طرح دروازے کی طرف بہتا چلا گیا۔

میری آنکھوں میں آتشیں سی نمی تھی۔ جی تو چاہتا تھا کہ اس کی لاش پر بھی گولیاں برسائی جائیں لیکن پھر خود پر ضبط کیا۔ عمران کا چہرہ بتا رہا تھا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے، وہ اس کی بھرپور تائید کرتا ہے۔

’’یہ بھی مر گیا ہے جی۔‘‘ مبارک علی نے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔

یہاں ایک اور مقامی کی لاش پڑی تھی۔ کالے رنگ کا یہ دبلا پتلا شخص اس گھر کا سربراہ بلورام تھا۔ اس کے جسم پر بھی کوڑھ تھا اور یہ کافی بڑھ چکا تھا۔ حکم نے اپنے اس حقیر ملازم کے ساتھ جو کچھ بھی کیا تھا لیکن اس شخص نے حقِ نمک ادا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے پاس ہی ایک رائفل بھی پڑی تھی جس سے پتا چلتا تھا کہ آخری لمحوں میں حکم اور اینڈرسن وغیرہ کے ساتھ مل کر وہ بھی ہم پر گولی چلاتا رہا ہے۔ میں نے دیکھا۔ کمرے میں رتنا دیوی کی لاش سے نکلنے والا خون اور اس کوڑھی اچھوت کا خون گھل مل گئے ہیں۔۔۔ سچ کہتے ہیں، موت ہر اعلیٰ و ادنیٰ کو برابر کر دیتی ہے۔ ساری اونچ نیچ ختم ہو جاتی ہے۔

یہ بڑی عبرت ناک صورتِ حال تھی۔ زرگاں کے فرماں روا اور اس کے سپہ سالار نے جان بچانے کے لیے ایک ایسے شخص کے گھر میں پناہ لی، عام حالات میں جس کا سایہ بھی وہ خود پر پڑنے نہ دیتے۔ گھر کی اچھی طرح تلاشی لی گئی۔ وہاں کوئی اور شخص موجود نہیں تھا۔ ہاں، گندم رکھنے والے ایک بڑے مٹکے کے اندر سے ایک گٹھڑی دستیاب ہوئی۔ ایسی ہی ایک گٹھڑی ایک چارپائی کے نیچے سے ملی۔ یہ گٹھڑیاں زیورات اور جواہرات سے بھری ہوئی تھیں۔ ان کی مالیت لاکھوں میں نہیں، کروڑوں میں تھی۔ یہ اس ہانڈیل اسٹیٹ کے لوگوں کا خون پسینا تھا۔

’’یہ دیکھو، ہمارا دوست اور راہنما۔‘‘ عمران نے اس لیدری بیگ کی طرف اشارہ کیا جو ایک جستی ٹرنک پر رکھا ہوا تھا۔ یہی بیگ تھا جس میں حاضر دماغ میڈم صفورا نے الیکٹرانک چپ ڈالی تھی۔ مبارک علی اور عمران نے تین چار منٹ کی کوشش سے وہ چپ ڈھونڈ نکالی۔

ہم باہر پہنچے تو وشواناتھ عرف حکم جی کو بند جیپ میں اٹھایا جا چکا تھا۔ وہ گھٹنوں میں سر دیے ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ عمران نے کہا۔ ’’کتنا ہمدرد راجا ہے، زرگاں میں ہونے والے جانی نقصان پر پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے۔‘‘

’’زرگاں میں ہونے والے جانی نقصان پر نہیں، اپنی ذاتی پتنی اور بچے کی موت پر۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’زرگاں میں تو اس سے دس گنا نقصان بھی ہو جاتا تو اس کے کان پر جوں نہ رینگتی۔‘‘

وہ بولا۔ ’’دیکھو، تم کہتے ہو کہ ہم ٹی وی چینلز والے ہر واقعے کا منفی پہلو دیکھتے ہیں۔ اب تم خود منفی پہلو دیکھ رہے ہو۔ میرے خیال میں تو راجا صاحب کے رونے کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ وہ اپنے بعد زرگاں کے انجام کا غم کر رہے ہیں۔ اب شراب خانوں میں دھڑا دھڑ شراب بنانے والے مزدوروں کے گھروں کے چولہے کیسے جلیں گے؟ اب کون خیال رکھے گا غریبوں کا اور ان کی خوب صورت بیٹیوں کا؟ اب مسکین انگریز پردیسیوں کی مہمان نوازیاں کس کے ذمے ہوں گی؟ اب یہاں ناچ گھروں میں رات دن خون پسینا ایک کرنے والی شریف عورتیں اور نیک خواجہ سرا زندگی کی گاڑی کیسے کھینچیں گے؟ اُف۔۔۔ ایسی پتا نہیں کتنی سوچیں چکرا رہی ہیں حکم صاحب کے دماغ میں۔‘‘

ہماری آواز حکم تک نہیں پہنچ رہی تھی لیکن کمانڈوز اس کے لیے جو توہین آمیز نعرے لگا رہے تھے، وہ ضرور اس کے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔ یہ انجام تھا اس آرام طلب و عیش پرست شخص کا جس نے دنیاوی لذتوں کے بدلے ڈھیرے ڈھیرے اپنے سارے اختیار عیار گوروں کے حوالے کر دیے تھے۔۔۔ اور یوں اپنے عوام کی بربادی کا سبب بنا تھا۔

عمران نے کہا۔ ’’مجھے حکم کو دیکھ کر برادر محترم شہنشاہ جہانگیر صاحب یاد آرہے ہیں۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘

’’سنا ہے کہ بھائی جہانگیر صاحب نے بھی آخری دنوں میں اپنے سارے اختیارات میڈم نور جہاں۔۔۔ مم۔۔۔ میرا مطلب ہے ملکہ نور جہاں کے حوالے کر دیے تھے۔ لگتا ہے کہ یہاں زرگاں میں حکم نے بھی انگریزوں کے ساتھ کچھ اسی طرح کا پیکیج کیا ہوا تھا۔ کچھ نرم ملائم ’’کچا گوشت‘‘۔۔۔ دو تین کلو بھنا ہوا گوشت اور انگریزی شراب کی دو چار بوتلیں باقی سب کچھ انگریزوں کے پاس۔‘‘

☆☆☆

یہ اگلے روز دوپہر کی بات ہے۔ چوہان کو اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچا دیا گیا۔ اپنے اس دیرینہ دوست اور ساتھی کو الوداع کرتے ہوئے میں کرب کے کئی جانکاہ مرحلوں سے گزرا۔۔۔ راج بھون میں اب جشن کا سماں تھا۔ راج بھون کے عظیم الشان دروازے عام لوگوں کے لیے کھول دیے گئے تھے۔ بھون کے اندرونی حصوں کے سوا وہ ہر جگہ دندنا رہے تھے۔ ناچ رہے تھے، گا رہے تھے۔ نعرہ زنی کی گونج سے کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ خاص و عام ہمیں مبارک بادیں دے رہے تھے۔۔۔ ہماری تعریف کے پل باندھ رہے تھے اور میں اس ہجوم میں اس چہرے کو ڈھونڈ رہا تھا جو عام لوگوں کے لیے اجنبی تھا لیکن زرگاں کی خون ریز لڑائی میں جس کا کردار اہم ترین تھا۔ میں طلال کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اور میری ہدایت پر اور بھی بہت سے

افراد اس کی تلاش میں تھے۔ وہ پتا نہیں کہاں کھو گیا تھا۔

چھوٹے سرکار کو راج بھون کے شاندار تخت پر بٹھا دیا گیا تھا۔ ان کے دائیں بائیں درجنوں مصاحب اور خواص کی کرسیاں تھیں۔ مجھے اور عمران کو بھی وہیں چھوٹے سرکار اور مراد شاہ کے قریب نشستیں دی گئی تھیں۔ لیکن میں پچھلے ایک گھنٹے سے اپنی نشست پر موجود نہیں تھا۔ میں طلال کی تلاش میں سرگرداں تھا۔

آخر طلال کا کھوج قبرستان میں ملا۔ ایک ہرکارے نے آکر بتایا کہ طلال کے حلیے سے ملتا جلتا ایک لڑکا قبرستان میں موجود ہے اور ایک قبر سے لپٹا رو رہا ہے۔ میں دو محافظوں اور اس ہرکارے کے ساتھ قبرستان میں پہنچا۔ میں نے طلال کو دور ہی سے پہچان لیا۔ وہ سلطانہ کی قبر پر موجود تھا۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دیا ہوا تھا اور ہچکیوں سے رو رہا تھا۔

باقی لوگ فاصلے پر ہی کھڑے رہے۔ میں آگے گیا اور طلال کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے اپنا تربتر چہرہ اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر مجھ سے لپٹ گیا۔ وہ بلند آواز سے رونے لگا۔ وہ بس ایک ہی فقرہ کہے جا رہا تھا۔ ''خالو جان... وہ چلی گئیں۔''

اس نے میری آنکھیں بھی ایک بار پھر نم کر دیں۔ ہم کافی دیر تک اس کی قبر پر موجود رہے اور اسے اپنے آنسوؤں کا خراجِ عقیدت پیش کرتے رہے۔

راج بھون میں واپس آکر میں نے طلال کو چھوٹے سرکار اور مراد شاہ صاحب کے سامنے پیش کیا۔ میں نے کہا۔ ''جناب! زرگاں کی جنگ میں طلال کا کردار بڑا اہم رہا ہے۔''

چھوٹے سرکار نے طلال کو سرتاپا دیکھا۔ پھر اسے اپنے قریب بلایا اور کندھا تھپکا۔ مراد شاہ صاحب بولے۔ ''ہم نے سنا تھا کہ جب قاسمیہ چوک میں انور خاں اور کچھ دوسرے قیدیوں کو سولی چڑھایا جا رہا تھا تو چند راجپوت لڑکوں نے ہجوم سے نکل کر اچانک ہلّا بول دیا تھا۔ کیا یہ ان میں شامل تھا؟''

میں نے کہا۔ ''جناب! یہ نہ صرف ان میں شامل تھا بلکہ ان کا لیڈر بھی تھا۔ یہ ان میں سب سے آگے تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں جناب کہ اس ساری لڑائی کا نقشہ بدلنے میں وہ واقعہ سب سے اہم تھا۔ یہ وہی موڑ تھا جہاں سے لوگوں میں ہلچل پیدا ہوئی اور انہوں نے گارڈز پر حملہ کرنے کا حوصلہ کیا۔''

چھوٹے سرکار نے طلال کو بے حد تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔ دوبارہ شاباش دی اور اس بار شاباش کے ساتھ ہی اپنے گلے سے سچے موتیوں کا ایک ہار نکالا اور طلال کو دیا۔ بہت جھجکتے ہوئے اس نے یہ ہار لے لیا۔ طلال کو اگلی نشستوں پر جگہ دی گئی۔ مراد شاہ صاحب نے اسی وقت طلال کے زندہ رہ جانے والے اور جان دینے والے ساتھیوں کے لیے مختلف انعامات اور مراعات کا اعلان کیا۔

ہمارا مقامی دوست گھنشتری بھرت کمار زخمی ہوا تھا اور سیکڑوں دوسرے زخمیوں کی طرح اس کا علاج بھی راج بھون کے ساتھ واقع شفا خانے میں ہو رہا تھا۔ میں اور عمران بھرت کو دیکھنے پہنچے۔ وہ اسی دھاری دار سویٹر میں تھا جس میں اسے گولی لگی تھی اور وہ چوکور برجی کی سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے گرا تھا۔ گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی۔ اسے نکال دیا گیا تھا مگر اس کی حالت ابھی مکمل طور پر خطرے سے باہر نہیں تھی۔ گندمی رنگت والی خوش شکل چمپی اب بھی سائے کی طرح اس کے ساتھ تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے ہولے ہولے اس کے پاؤں دبا رہی تھی اور ساتھ ہی ان پاؤں پر اپنے آنسو بھی گرا رہی تھی۔ مالا بھی وہیں موجود تھی اور تیمارداری میں اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ درحقیقت یہ دونوں لڑکیاں ہی تھیں جو بھرت کو یقینی موت کے منہ سے کھینچ کر لائی تھیں۔ میں نے چمپی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے دلاسا دیا۔ ''گھبراؤ نہیں، چمپی! یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہاری محبت نے اسے بچایا ہے اور تمہاری محبت ہی اسے زندہ بھی رکھے گی۔''

چمپی کے آنسو اور تیزی سے گرنے لگے۔ وہ یوں سکڑی سمٹی بیٹھی تھی جیسے بہت بڑی مجرم ہو اور یہاں جو کچھ بھی ہوا ہے، بس اسی کی بدقسمتی کا نتیجہ ہے۔ ہم بڑے ڈاکٹر سے ملے اور اسے بھرت کمار کے علاج اور نگہداشت کے سلسلے میں خصوصی ہدایات دیں۔

جب ہم واپس جانے والے تھے، اچانک چونک گئے۔ ہم نے بھرت کے والد کو دیکھا۔ وہ سفید براق دھوتی کرتے میں ملبوس تھا۔ اپنے فربہ جسم کے ساتھ ڈگمگاتا اور مسلسل کھانستا ہوا بھرت کی طرف آ رہا تھا۔ چمپی نے اسے نہیں دیکھا کیونکہ وہ اس کے عقب میں تھا۔ کھانسی کی آواز سن کر چمپی پلٹی اور ایک دم کھڑی ہو گئی۔ اس کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔

بھرت کے والد نے دیکھ لیا تھا کہ چمپی بھرت کے پاؤں دبا رہی تھی۔ وہ تڑخ کر بولا۔ ''تو یہاں کیا کر رہی ہے؟ تو نے چھوٹے مالک کو ہاتھ کیوں لگائے؟ تجھے دیا ناہیں آئی؟ کیا کام تھا تیرا یہاں؟ کیا کام تھا؟'' اس نے ہاتھ میں پکڑی

چھڑی سے چمپی کو ٹھوکے دیے۔

مالا جھپٹ کر آگے بڑھی۔ اس نے بھرت کے پتا کو روکا اور کہا۔ ''چاچا جی! یہ لڑکی آپ کے بیٹے کو ہاتھ نہ لگاتی تو یہ اس وقت زندہ بھی نہ ہوتا۔ یہی ہے جو اسے برستی گولیوں سے نکال کر لائی ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

عمران نے کہا۔ ''مطلب تمہیں میں بتاتا ہوں۔ یہاں شور شرابا کرو گے تو اسپتال والے چپت مار مار کر تمہارا گنج لال کر دیں گے۔''

بھرت کا پتا ہکا بکا رہ گیا۔ اسے ایسے جواب کی توقع نہیں تھی۔ میری طرح عمران نے بھی چمپی کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے کہا کہ وہ بھرت کے پاس بیٹھ کر اس کی تیمارداری جاری رکھے۔ مسلح گارڈز بھرت کے پریشان حال پتا کو لے کر باہر آ گئے۔ میں نے انچارج گارڈ کو سمجھایا کہ وہ بھرت کے اس خردماغ باپ کو ساری بات بتائے اور اسے وارننگ دے کہ اگر اس نے چمپی یا اس کی والدہ کی طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھا تو اس کا خانہ خراب ہو جائے گا۔ ایک گارڈ نے بھرت کے والد کو بتا دیا تھا کہ اس سے مخاطب ہونے والے کون ہیں۔ میرا اور عمران کا تعارف بھرت کے والد کو ہکا بکا کرنے اور لرزا دینے کے لیے کافی تھا۔

زرگاں کی لڑائی کا ایک اہم غدار... ہمارا سابقہ ساتھی عبدالرحیم بھی اسی اسپتال میں زیرِ علاج تھا۔ عمران نے اس کے سر پر رائفل کے دستے سے ایک تباہ کن ضرب لگائی تھی... جس کی وجہ سے وہ چار پانچ گھنٹے بے ہوش رہا تھا۔ اب وہ ہوش میں آ چکا تھا۔ اس کی مرہم پٹی بھی ہو چکی تھی۔ اسپتال کے ہی ایک کمرے میں اس سے پوچھ گچھ جاری تھی۔ ہمیں یقین تھا کہ اس کے دو چار مزید ساتھی بھی اس مخبری والے ''کارِ خیر'' میں اس کے ساتھ شریک ہوں گے۔ تاہم ابھی تک عبدالرحیم نے اس بارے میں کچھ بتایا نہیں تھا۔ وہ کافی ڈھیٹ ثابت ہو رہا تھا۔

ہم عبدالرحیم کے کمرے میں پہنچے۔ اسے ہتھکڑی لگائی گئی تھی۔ زنجیر کا سرا بیڈ کے ساتھ منسلک تھا۔ عبدالرحیم کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور شکل ڈراؤنی ہو گئی تھی۔ عبدالرحیم سے پوچھ گچھ کی ساری ذمے داری حنات احمد پر تھی۔ وہی پچھلے بارہ گھنٹے سے اس کے ساتھ سر کھپا رہا تھا۔ ہم پہنچے تو عبدالرحیم کا سر جھک گیا۔ وہ ہم سے نظریں ملانے کے قابل نہیں تھا...

حنات احمد مجھے اور عمران کو ایک طرف لے گیا۔ اس نے رازداری سے کہا۔ ''بڑا سخت جان ہے۔ ابھی تک کوئی جانکاری نا ہیں دی اس نے... لیکن جانکاری بہت ضروری ہے۔ ورنہ اس کی وجہ سے ہمیں مزید نقصان پہنچ سکتا ہے۔ بہرحال، آپ بڑے اچھے سمے پر آئے ہیں۔ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے ٹیکا لگوایا ہے۔ اس پر اثر ہونا شروع ہو گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کی زبان کا تالا کھل جاوے گا۔'' میں چونک گیا۔ ٹیکے سے حنات کی مراد وہی درد والا ٹیکا تھا۔

دوسرے کمرے میں عبدالرحیم کے کراہنے کی آوازیں آنے لگی تھیں... یہ آوازیں بہ تدریج بلند ہو رہی تھیں۔ آج ہم پہلی بار اس سبز رنگ کے مہلک انجکشن کے اثرات ملاحظہ کر رہے تھے جو زرگاں میں دہشت کی علامت تھا۔ اس مہلک انجکشن کی ڈبل ڈوز کا مطلب ایک دردناک موت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ ہمیں تین خوبرو لڑکیوں کی وہ اکڑی ہوئی لاشیں یاد آئیں جو ہم نے ایک دن پہلے راج بھون کے عشرت کدے میں دیکھی تھیں۔

اور اب یہ سنگل ڈوز والا انجکشن عبدالرحیم کو اپنے شکنجے میں جکڑ رہا تھا... حنات احمد نے اس کمرے کی کھڑکیاں دروازے اچھی طرح بند کروا دیے تھے تاکہ عبدالرحیم کی آہ و بکا باہر نہ جا سکے۔ عبدالرحیم کے چہرے پر دھیرے دھیرے اذیت کے آثار نمایاں ہوتے چلے گئے۔ پھر وہ تڑپنے لگا۔ ''میں مر گیا... مجھے بچاؤ... میں مر گیا۔'' وہ بار بار یہی الفاظ کہہ رہا تھا۔

وہ کبھی اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھتا تھا۔ کبھی سینے پر... اسے جیسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تکلیف ہو کہاں رہی ہے۔ پھر وہ اپنے ہاتھ کی زنجیر کو دیوانہ وار جھٹکے دینے لگا۔ وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن یہ لاحاصل کوشش تھی۔ دو تین منٹ کے اندر اندر اس کی یہ کیفیت ہو گئی کہ وہ بیڈ پر سے ایک ایک بالشت اچھلنے لگا۔ وہ کند چھری سے ذبح ہونے والے جانور کی طرح چلا رہا تھا۔ اس کی حالت ناقابلِ بیان تھی۔ پھر وہ چلاتے چلاتے بستر سے گر گیا۔ تڑپ تڑپ کر اس نے اپنے پاؤں زخمی کر لیے۔ جب تکلیف انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو انسان کا دماغ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ بالکل جیسے سرکٹ بریکر کی وجہ سے مشین بند ہو جاتی ہے۔ لیکن سرجن اسٹیل کے بنائے ہوئے اس انجکشن کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہ بندے کو حتی الامکان حد تک ہوش میں بھی رکھتا تھا۔ یہاں بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔

''خدا کے لیے... خدا کے لیے۔'' عبدالرحیم ہولناک آواز میں پکارا۔

حسنات احمد کے اشارے پر ایک کمپاؤنڈر نے تین ایم ایل کا ایک انجکشن بھرا... حسنات نے عبدالرحیم سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''تمہیں درد کا انجکشن لگایا گیا ہے۔ اس دوسرے انجکشن سے پہلے انجکشن کا اثر ختم ہو جائے گا۔ صرف ایک منٹ لگے گا۔ لیکن پہلے تمہیں ہمارے سوالوں کے جواب دینا ہوں گے۔''

''میں بتاتا ہوں۔ خدا کے لیے... خدا کے لیے۔''

اس کا زیریں لباس گیلا ہو چکا تھا۔ جسم کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی۔

حسنات احمد نے جو جو کچھ پوچھا، عبدالرحیم بتاتا چلا گیا۔ ساتھ ساتھ وہ رحم کی بھیک بھی مانگتا جا رہا تھا... اس کی آواز کرب کی شدت سے پھٹ رہی تھی اور اس کے الفاظ سمجھنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ حسنات کے اشارے پر فربہ اندام کمپاؤنڈر نے مخصوص قسم کی پین کلر دوا عبدالرحیم کے مسل میں انجیکٹ کی۔ اس کام کے لیے تین افراد کو بڑی مضبوطی سے عبدالرحیم کو دبوچنا پڑا۔ ایک دو منٹ بعد عبدالرحیم کی غیر معمولی اذیت کم ہونا شروع ہو گئی۔ تاہم وہ حسنات کے سوالوں کے جواب روانی سے دے رہا تھا۔

میں اور عمران اسپتال کی عمارت سے باہر نکل آئے۔

عمران نے کہا۔ ''کاش میرے پاس کیمرا ہوتا، میں عبدالرحیم کے تڑپنے پھڑکنے کی فلم بنا سکتا۔ کتنا مزہ آتا اگر یہاں بھانڈیل اسٹیٹ میں بھی پندرہ بیس چینل کام کر رہے ہوتے۔ عبدالرحیم کی فلم بننے کے فوراً بعد میں اپنے ''فساد چینل'' پر پٹی چلانا شروع کر دیتا۔ ناظرین ہمیں مظلوم عبدالرحیم پر بدترین تشدد کی فوٹیج موصول ہو گئی ہے۔ جلد ہی آپ دیکھ سکیں گے۔ اس کے بعد ڈیڑھ دو گھنٹے تک تو ناظرین کو یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کہ ''کہیں جایئے گا مت۔'' ڈیڑھ دو گھنٹے میں کم از کم پندرہ سو اشتہارات دکھانے کے بعد ہم یہ فوٹیج چلاتے اور ساتھ میں بتاتے کہ 18 بچوں کے باپ عبدالرحیم نے چونکہ مبینہ طور پر اعلیٰ افسروں کو رشوت نہیں دی تھی اس لیے اس پر ظلم کی انتہا کر دی گئی ہے۔ ہم فوٹیج پر سرخ دائرے لگا لگا کر بتاتے کہ یہ عبدالرحیم کو ٹیکا لگایا جا رہا ہے... یہ تکلیف اور خوف کی وجہ سے اس کا پاجامہ گیلا ہوتا جا رہا ہے... یہ دیکھیے... یہ دیکھیے... یہ مزید گیلا ہو گیا ہے۔ اور یہ دیکھیے، اس تیسرے سرخ دائرے کے اندر یہ بندہ مسکرا رہا ہے۔ اسی نے رشوت طلب کی تھی۔ رات کے ٹاک شو میں ہم چار دانشوروں سے اس فوٹیج پر تبصرہ کراتے اور وہ بڑی آسانی سے درد کے اس انجکشن کے ڈانڈے امریکا کی اندرونی بے چینی اور ورلڈ آرڈر سے جوڑ دیتے۔ عبدالرحیم کسی بڑے ایرانی سائنس داں کا اسسٹنٹ قرار پاتا۔''

''لیکن دو روز بعد یہ سب کچھ غلط ثابت ہو جاتا۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر کیا ہوتا۔ یہ ایک اور بریکنگ نیوز بن جاتی... عبدالرحیم مظلوم کے بجائے ظالم نکلا۔ اس سے کسی نے رشوت طلب نہیں کی تھی... اس کی بے وفائی اور غداری کے ٹھوس ثبوت منظرِ عام پر آ گئے... وغیرہ وغیرہ۔''

''چلو، تمہارا یہ چینل چینل کھیلنے والا شوق بھی جلد پورا ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ اب بھانڈیل اسٹیٹ سے ہماری واپسی کا وقت قریب آ گیا ہے۔''

''ہائے۔'' عمران نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ''کیا تیر مارا ہے تم نے دل پر۔ ایک دم ریما جی کی یاد آ گئی... وہ لاہور کی سڑکیں، وہ سردیوں کی سنہری دھوپ، وہ نہر کا کنارہ۔ وہ مزے مزے کے ریستوران....''

پھر وہ ایک دم چپ ہو گیا۔ مجھے بھی خاموشی نے گھیر لیا۔ سامنے ہی زرگاں کا قبرستان نظر آیا تھا۔ وہ قبرستان جہاں سلطانہ دفن تھی۔ اپنی تمام تر سادگی، دلیری اور محبت کے ساتھ۔ مجھے پتا تھا کہ جب میں یہاں سے چلا جاؤں گا، مجھے یہ جگہ بہت یاد آئے گی۔ شیشم اور بیری کے پیڑوں کے نیچے وہ کچی قبر جس میں میری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی سو رہی تھی۔ قریباً تین برس تک وہ شب و روز سائے کی طرح میرے ساتھ رہی تھی۔ اس کی قربانیوں نے مجھے زندہ رکھا اور اس کی بے لوث محبتوں نے میرے دل و دماغ میں انمٹ رستے بنائے۔ لیکن اب مجھے ہمیشہ کے لیے اسے یہاں چھوڑ کر جانا تھا۔ خوش آئند بات بس ایک ہی تھی۔ اس کی ایک نشانی میرے پاس موجود تھی۔

اچانک مجھے اور عمران کو چونکنا پڑا۔ اسپتال کی طرف سے دو گھڑ سوار گھوڑے بھگاتے چلے آ رہے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا، ان کے عقب میں کھوسٹ بڑھیا کی پوتی بہو مالا بھی دوڑی چلی آ رہی تھی۔ یہ تینوں ہماری ہی طرف بڑھ رہے تھے۔ یقیناً کوئی بہت خاص بات تھی۔ ہم ٹھٹک کر رک گئے۔

''یا اللہ خیر۔'' عمران نے کہا۔ ''کیا ابھی کچھ ہونا باقی ہے؟''

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

میں اپنی بیوی اور سوتیلے بیٹے کے ساتھ پکنک منانے نکلا تھا۔ انجلینا سے میری شادی دو برس پہلے ہوئی تھی۔ اس کا سابق شوہر ایک کاؤبوائے تھا اور ایک لڑائی میں مارا گیا تھا۔ انجلینا نے بیوگی کے چند برس بہت مشکل میں گزارے تھے۔ اب وہ میرے ساتھ خوش تھی۔ اس کا بیٹا میک بھی مجھ سے خوش تھا کیونکہ میرا رویہ دوستانہ تھا۔ میک فطرتاً بھی اچھا تھا۔ اس وقت وہ صرف سترہ برس کا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ میری طرح پولیس مین بنے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ جب وہ اٹھارہ برس کا ہو جائے گا تو میں اسے اپنی فورس میں شامل کر لوں گا۔

انجلینا نے ایک جگہ منتخب کر کے زمین پر کپڑا بچھایا اور میک نے اس پر ٹوکری رکھ دی۔ اس میں کھانے پینے کا سامان تھا۔ انجلینا نے سب سے پہلے میرا پسندیدہ ناریل کا کیک نکالا۔ اس نے ایک پیس کاٹ کر میری طرف بڑھایا۔

نسل پرستی میں مبتلا قانون کے رکھوالے... جو نفرت میں بہت دُور نکل گئے تھے

تین نسل بعد

مریم کے خان

کولمبس نے نئی دنیا تلاش کی جو امریکا کے نام سے پہچانی گئی۔ اسی سرزمین سے وابستہ اُن سرخ فاموں کا ذکر... جنہیں سفید چمڑی والوں نے اُجڈ، گنوار اور وحشی کے روپ میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔ سادہ لوح سُرخ فام ریڈ انڈینز بیک وقت نفرت اور تھوڑی سی محبت کے درمیان جھولتے رہے۔ اتفاقات، حیرت اور پُراسراریت سے پہچانی جانے والی سرخ فام نسل کا ایک قصہ۔ اس ماحول اور علاقے میں جو کچھ ہو رہا تھا... وہ سب کیا دھرا اُن کا نہیں تھا... رگوں میں خون جما دینے والا پُرتجسس ایڈونچر...

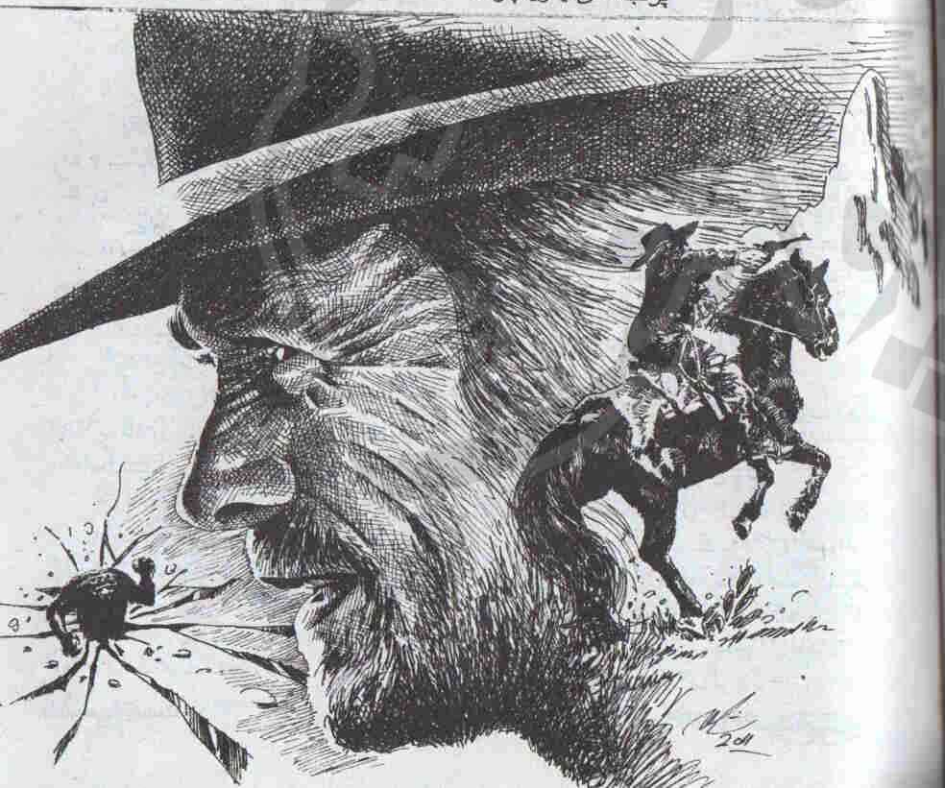

میں ابھی اسے کھانے جا رہا تھا کہ میک نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ''کوئی ہماری طرف آ رہا ہے۔''

ایریزونا کا یہ علاقہ کیوٹش میکسیکو اور یوٹھا کی سرحد کے پاس ہے۔ 1872ء میں یہاں سفید فام آبادی بہت کم تھی اور کہیں کہیں ریڈ انڈین بھی پائے جاتے تھے۔ صحرا، پہاڑ اور کہیں کہیں جنگل اس علاقے کی خصوصیت تھے۔ ذرائع آمدنی بہت کم تھے اس وجہ سے جرائم کی شرح خاصی زیادہ تھی۔ ایک شیرف کی حیثیت سے مجھے بہت مصروف رہنا پڑتا تھا۔ اس سوار کو آتے دیکھ کر میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔

''انجلینا... میک اتم دونوں گھر کی طرف جاؤ۔''

''لیکن...'' انجلینا نے کہنا چاہا۔

''جلدی۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر سخت لہجے میں کہا تو وہ خاموشی سے میک کا ہاتھ تھام کر مکان کی طرف بڑھ گئی۔ اس دوران میں میں نے محسوس کیا کہ آنے والے کے عزائم جارحانہ نہیں ہیں۔ قریب آنے پر میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ برابر والی کاؤنٹی کا ایک پولیس مین چارلی کورل تھا اور ایک بار میرے ساتھ کام کر چکا تھا۔ وہ نزدیک آ کر گھوڑے سے اترا اور ہیٹ اتار کر مجھے تعظیم دی۔

''شیرف! میں ایک خبر لایا ہوں۔''

''میں سن رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''یوٹھا کی سرحد کے پاس ایک خاندان غائب ہے۔ امکان ہے کہ ریڈ انڈینز نے حملہ کیا ہے اور ان کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔''

''کتنے لوگ ہیں؟''

''کم سے کم آٹھ۔'' اس نے بتایا۔ ''لیکن ان میں سے صرف تین کی لاشیں ملی ہیں۔ غائب ہونے والوں میں ایک لڑکی اور دو بچے بھی ہیں۔''

''خاندان کا سربراہ؟''

''والسن اور اس کی بیوی مارے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک ملازم کی لاش بھی ملی ہے۔ شیرف ولیم نے تم سے مدد طلب کی ہے۔''

میں جانتا تھا کہ ولیم کا علاقہ یوٹھا کی سرحد تک تھا لیکن اس کے پاس نفری کم تھی اور یہ جگہ میرے علاقے کے پاس تھی اس لیے وہ میری مدد طلب کرنے پر مجبور ہوا۔ ولیم ایک زمانے میں میرے ساتھ کام کر چکا تھا، ہم دونوں ڈپٹی شیرف تھے۔ ہمارے درمیان دوستی تو نہیں البتہ احترام کا رشتہ ضرور تھا۔ اگر اس نے مجھ سے مدد کی درخواست کی تھی تو مجھے لازمی کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔

میں اس کے ساتھ اپنے مکان تک آیا۔ میرا گھر آبادی سے کافی دور ویرانے میں تھا۔ یہاں سے نزدیک ترین گھر بھی کوئی تین میل کے فاصلے پر تھا۔ میں نے انجلینا کو صورت حال بتائی۔ میک یہ سن کر پُرجوش ہو گیا کہ میں ایک مہم پر جا رہا ہوں اور اس نے اپنی ماں کی نظر بچا کر مجھ سے ساتھ چلنے کی التجا کی۔ میں نے انکار کیا۔ ''نہیں برخوردار... اگر تم بھی چلے گئے تو انجلینا اکیلی رہ جائے گی۔''

ماں کی وجہ سے اس نے اصرار نہیں کیا۔ میں تیار ہو کر باہر آیا، میرے پاس سفر کے لحاظ سے سامان موجود تھا۔ اس دوران میں میک نے میرا گھوڑا تیار کر دیا۔ میں نے سامان بار کیا اور چارلی کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ ہماری منزل اس جگہ سے کوئی تیس میل دور تھی۔ راستے میں چارلی نے مجھے ممکنہ حد تک اس بارے میں بتایا۔ گم شدہ خاندان میں اس کی منگیتر میریا بھی تھی اس لیے وہ زیادہ بے تاب تھا۔ اگر ریڈ انڈینز نے حملہ کیا تھا اور وہی غائب ہونے والے افراد کو لے گئے تھے تو اب تک لڑکی کی عزت کی سلامتی مشکوک تھی۔ ریڈ انڈینز کسی اجنبی عورت کو نہیں رکھتے، وہ اس سے فوراً شادی کر لیتے ہیں۔

مناسب رفتار سے گھوڑے دوڑاتے ہم تین گھنٹے میں اس جگہ تک پہنچ گئے۔ پہاڑوں سے ذرا فاصلے پر ایک احاطے میں تین چھوٹی عمارتیں تھیں جن میں دو رہائشی تھیں اور ایک جانوروں کے لیے مخصوص تھی۔ تینوں عمارتوں کی حالت سے لگ رہا تھا کہ یہاں باقاعدہ جنگ ہوئی تھی۔ گولیاں چلی تھیں اور لوگ مارے گئے تھے۔ تینوں عمارتوں میں گولیوں کے سوراخ نظر آ رہے تھے۔ حملہ آور یقیناً پہاڑوں سے آئے تھے۔ شیرف ولیم وہیں موجود تھا اور ایک درخت کے نیچے آرام کر رہا تھا۔ میں اس کے پاس جا کر رکا۔

''یہ کب کی بات ہے؟''

''تم سے کم تین دن گزر چکے ہیں۔'' اس نے اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ''ان کی لاشیں آج صبح ملی ہیں۔''

''لاشیں کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

ولیم نے ایک عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ احاطے میں اس کے ساتھ دو افراد اور تھے۔ اگر ہمیں گم شدہ افراد کی تلاش میں پہاڑوں پر جانا تھا تو یہ تعداد بہت کم تھی۔ میں عمارت میں آیا۔ عمارت کے ایک کمرے میں..... تین عدد لاشیں موجود تھیں۔ ان میں سے ایک اس خاندان کے مالک والسن کی تھی، دوسری اس کی بیوی اور تیسرا ان کا

ملازم تھا۔ والسن اور اس کی بیوی درمیانی عمر کے تھے جبکہ ملازم بوڑھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ گولیوں کا نشانہ بنے ہوں گے لیکن ان کے جسموں پر گولیوں کے نشان نہیں تھے۔ اس کے بجائے ان کے گلے کسی تیز دھار چیز سے کٹے ہوئے تھے۔ مجھے علم تھا کہ ریڈ انڈینز چاقو استعمال نہیں کرتے۔ دھار والی چیزوں میں ان کا پسندیدہ ہتھیار کلہاڑی ہوتا ہے اور کلہاڑی سے اس قسم کے زخم نہیں لگائے جا سکتے۔ تینوں لاشوں پر ایک سے ہی زخم تھے اور اہم بات یہ تھی کہ ان زخموں سے زیادہ خون نہیں نکلا تھا۔ والسن فیملی پوری طرح مسلح تھی اور یقینی بات تھی کہ ان کی عورتوں اور بچوں کو بھی ہتھیار چلانا آتے ہوں گے۔ اس کے باوجود حملہ آور ان پر اتنی آسانی سے غالب آ گئے، یہ بات میری سمجھ سے باہر تھی۔ میں اپنا کام مکمل کر کے باہر آیا تو سورج غروب ہونے کے قریب تھا اور شیرف ولیم کے ساتھی الاؤ جلانے کی تیاری کر رہے تھے۔

''تم کسی نتیجے پر پہنچے؟''

''نہیں... لیکن یہ قتل عام نہیں ہیں۔ تینوں کو کسی نکیلی چیز سے مارا گیا ہے اور اس طرح قتل کرنا آسان کام نہیں ہوتا... خاص طور سے تین مسلح افراد کو۔''

ولیم نے سر ہلایا۔ ''صرف تین نہیں بلکہ آٹھوں افراد مسلح تھے۔ ان کے پاس نصف درجن رائفلیں اور اتنے ہی پستول تھے۔''

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، یہ ریڈ انڈینز کی کارروائی ہے؟''

ولیم نے اپنی ہلکی سی داڑھی میں انگلیاں پھیریں۔ ''میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا ہے۔ لیکن ہمارا پہلا ٹاسک... لاپتہ افراد کو تلاش کرنا ہے۔''

''ان لاشوں کو دیکھ کر مجھے ان کی سلامتی مشکوک لگ رہی ہے۔''

''تم نے درست کہا لیکن ہمیں تلاش تو کرنا ہے۔'' ولیم نے کہا اور اسی لمحے اس کے سیاہ فام ساتھی نے پکار کر کہا۔

''شیرف! ایک فوجی دستہ اس طرف آ رہا ہے۔''

''لعنت ہو۔'' ولیم نے زیرِلب کہا۔ ''یہ کیوں آ رہے ہیں؟''

''مجھے اطلاع ملی ہے کہ یہاں ریڈ انڈینز سرگرم ہو گئے ہیں اور انہوں نے ایک سفید فام خاندان کو قتل کر دیا ہے۔''

''ابھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ کس کا کام ہے۔'' ولیم نے سرد لہجے میں کہا۔ ''لیکن یہاں تین لاشیں ہیں اور پانچ افراد غائب ہیں۔''

''ریڈ انڈینز کے علاوہ اور کس کا کام ہو سکتا ہے۔'' مائر بولا اور گھوڑے سے اتر کر اندر چلا گیا، وہ لاشوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ چند منٹ بعد وہ واپس آیا اور اس نے ایک کاغذ ہماری طرف بڑھا دیا۔ ''یہ معاملہ اب میرے سپرد کر دیا گیا ہے اور میں اس کیس کا کمانڈر ہوں۔''

''چلو ٹھیک ہے، تم یہ کام زیادہ اچھے طریقے سے کر لو گے۔'' میں نے کہا۔ ''اب ہماری ذمے داری نہیں ہے۔''

''نہیں، مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔'' وہ بولا۔

''میرے پاس بھی آدمی کم ہیں۔''

''ایک درجن آدمی اس کام کے لیے کافی ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''نہیں، ممکن ہے ہمیں ٹیمیں بنا کر تلاش کا کام کرنا پڑے۔ اس صورت میں زیادہ افراد کی ضرورت ہو گی۔'' مائر نے کہا اور اپنے آدمیوں کی طرف چلا گیا۔ وہ ان کو کیمپ لگانے کی ہدایت کر رہا تھا۔ میں نے ولیم کی طرف دیکھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟''

اس نے شانے اچکائے۔ ''کام تو کرنا ہے اور یہ ہماری ذمے داری بھی ہے۔''

میرا بھی یہی خیال تھا۔ اس علاقے میں امن و امان قائم کرنا بنیادی طور پر پولیس کی ذمے داری تھی لیکن اگر معاملہ ایسا ہوتا جس میں انتظامیہ محسوس کرتی کہ فوج کی مدد کی ضرورت ہے تو وہ فوجی دستہ بھی روانہ کر دیتی تھی۔ ہم صرف پانچ افراد تھے اور ہمیں واقعی مدد کی ضرورت تھی۔ مائر کے آدمی خیمے لگا رہے تھے۔ ان کے پاس سارا سامان تھا اور وہ پوری طرح مسلح بھی تھے۔ رات کے کھانے کے بعد ہم الاؤ کے پاس بیٹھ کر برانڈی پیتے ہوئے کیس پر بات کرتے رہے پھر میں سونے کے لیے اٹھ گیا۔ صبح میری آنکھ کھلی تو لاشوں کی تدفین کی جا رہی تھی۔ ولیم دعا کرا رہا تھا۔ میں بھی اس میں شامل ہو گیا۔ تدفین کا کام مائر کے آدمیوں نے انجام دیا۔ دعا کے بعد انہوں نے قبریں بند کیں اور ہم نے سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ سورج نکلنے تک ہم روانگی کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ ہماری منزل ان پہاڑوں میں بکھری ریڈ انڈینز کی بستیاں تھیں۔ ممکنہ طور پر غائب ہونے والے افراد وہیں کہیں تھے۔

''اس شخص کے آنے سے معاملات بگڑنے کا خدشہ

ہے۔'' ولیم نے راستے میں مجھ سے کہا۔

''مجھے بھی یہی خطرہ ہے۔ مائر ریڈ انڈینز سے شدید نفرت کرتا ہے اور اس کے نزدیک کسی ریڈ انڈین کو سزا دینے کے لیے اس پر شک ہونا بھی کافی ہے۔''

''اس وقت بھی اس کا سارا زور ریڈ انڈینز پر ہے۔'' ولیم بولا۔ چارلی ہمارے قریب تھا جبکہ سیاہ فام کلائیو مونڈ اور اس کا ساتھی بلیک ذرا دور سفر کر رہے تھے۔

چارلی نے کہا۔ ''کیا میریا کے گھر پر حملے میں ریڈ انڈینز ملوث نہیں ہیں؟''

''اس بارے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔'' ولیم نے کہا۔ ''یہ انداز ریڈ انڈینز والا نہیں ہے۔ انہوں نے نہ تو گھوڑے چرائے اور نہ ہی کسی کو گولی ماری۔ اب ان کے پاس بھی آتشیں ہتھیار موجود ہیں۔''

''لیکن ان کے گلے تو کاٹے گئے ہیں۔''

''ہاں لیکن اس میں جو آلہ استعمال ہوا ہے، وہ ریڈ انڈینز استعمال نہیں کرتے۔'' میں نے جواب دیا۔

''زمین پر کسی قسم کے نشانات نہیں ملے ہیں۔'' ولیم بولا۔

''پھر ان کے ساتھ کیا ہوا ہے؟'' چارلی نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہم اس کا پتا چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

ذرا دیر بعد ہم پہاڑوں میں داخل ہو گئے۔ یہ بہت اونچے تو نہیں تھے لیکن بہت بڑے علاقے پر پھیلے اور نہایت ناہموار پہاڑ تھے۔ پتھریلی ساخت کی وجہ سے یہاں سبزہ کم تھا۔ ہم سارا دن ان پہاڑوں میں سفر کرتے رہے اور شام کو ایک جگہ پڑاؤ ڈال لیا۔ ہم نے اپنا سامان اتارا اور مائر کے آدمی کیمپ لگانے لگے۔

چارلی ایک طرف چلا گیا۔ بلیک بھی اس کے ساتھ تھا۔ اچانک ان کی طرف سے آواز آئی۔ میں قریب تھا اس لیے تیزی سے ان کے پاس پہنچا۔ چارلی اور بلیک خوف زدہ سے کھڑے تھے۔ ''کیا ہوا ہے؟''

''یہ دیکھیں جناب۔'' چارلی نے مجھے بالوں کی ایک سنہری لمبی لٹ دکھائی۔ ''یہ اس جگہ سے...''

اس کے بتانے سے پہلے میں نے زمین سے جھانکتی والی لٹ دیکھ لی تھی۔ میں نے بیٹھ کر احتیاط سے اس جگہ سے مٹی ہٹانا شروع کی اور اچانک ہی میرے سامنے ایک انسانی چہرہ آ گیا۔ میں ذرا پیچھے ہوا لیکن پھر ہمت کر کے میں نے پوری مٹی ہٹا دی۔ مٹی ہٹانے سے بچی کا مکمل چہرہ نظر آنے لگا۔ وہ یقیناً مر چکی تھی۔ چارلی نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

''میرے خدا...''

''تم اسے جانتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے سر ہلایا۔ ''یہ میریا کی چھوٹی بہن ہے۔''

اس دوران میں دوسرے لوگ بھی آ گئے اور انہوں نے زمین سے مٹی ہٹا کر میریا کی بہن کی لاش نکال لی۔ اسے دفن نہیں کیا گیا تھا بلکہ صرف مٹی میں دبا دیا گیا تھا۔ اس کے گلے پر بھی ویسا ہی نشان تھا۔ اس لاش کے بعد باقی افراد کی تلاش میں وہاں زمین کا معائنہ کیا گیا لیکن کسی اور جگہ کسی کو دبانے کے آثار نظر نہیں آئے۔ کیپٹن مائر غصے میں تھا۔ اس نے مجھ سے اور ولیم سے کہا۔ ''یہ یقیناً ریڈ انڈینز کا کام ہے۔''

''ریڈ انڈینز لاشیں دفناتے نہیں ہیں۔'' ولیم نے کہا۔

اس نے تیز نظروں سے ولیم کی طرف دیکھا۔ ''تم دیکھ لینا یہ انہی کا کام ہوگا۔''

بچی کی لاش کو ایک طرف ڈال دیا گیا اور طے پایا کہ صبح دو افراد لے جا کر میریا کے مکان کے احاطے میں دوسری قبروں کے ساتھ اسے دفنا دیں گے۔ اس لاش کی دریافت نے سب کو افسردہ کر دیا تھا اس لیے کھانے کے بعد جب الاؤ کے پاس محفل جمی تو زیادہ تر لوگ خاموش تھے۔ صرف کیپٹن مائر پینے کے دوران میں بول رہا تھا۔ وہ ریڈ انڈینز کے خلاف اپنی جنگی مہمات کے قصے سنا رہا تھا کہ اس نے کس طرح... دو بدو جنگ میں ان کے چھکے چھڑا دیے تھے۔ میں سونے کے لیے ایک طرف چلا آیا۔ آج زیادہ سردی نہیں تھی اس لیے الاؤ کے پاس سونا ضروری نہیں تھا۔ میرے پاس ہی بچی کی لاش پڑی تھی۔

رات کسی وقت مجھے لگا جیسے پاس ہی کوئی موجود ہے۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میں کچھ دیر تو ساکت لیٹا رہا پھر میری نظر اس طرف گئی جہاں بچی کی لاش تھی۔ میں اچھل پڑا۔ لاش اپنی جگہ سے غائب تھی۔ میں نے چارلی کو آواز دی۔ وہ پاس سو رہا تھا، وہ بھی بیدار ہو گیا۔ ''کیا ہوا شیرف؟''

''لاش غائب ہے۔'' میں نے اسے اطلاع دی تو اس کی نیند بھی اڑ گئی۔ میں نے اپنی رائفل اٹھائی اور آگے آیا۔ چارلی الاؤ سے ایک لکڑی اٹھا لایا تھا۔ اس کی روشنی میں زمین پر کھینچے جانے کے نشانات صاف نظر آ رہے تھے۔ میں اور چارلی ان نشانات کا تعاقب کرنے لگے۔ کچھ آگے جا کر یہ نشانات پہاڑیوں میں داخل ہو گئے۔ ہم نے جہاں پڑاؤ ڈالا تھا، وہ ایک چھوٹی سی وادی تھی۔ مائر کے پہرا دینے

والے سپاہی بھی آ گئے تھے لیکن میں نے ان کو دور اور خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ پیچھے رک گئے۔ نشانات ایک چٹان کے پیچھے غائب ہو رہے تھے اور جب ہم نے اس کے پیچھے دیکھا تو ایک سوراخ نظر آیا۔ بچی کی لاش اس میں لے جائی گئی تھی۔

''یہ کوئی جانور ہے؟'' چارلی نے آہستہ سے پوچھا۔

اس علاقے میں کوئی اتنا بڑا جانور نہیں پایا جاتا تھا جو لاش کھینچ کر لے جاتا۔ فطری حیات کے لحاظ سے یہ علاقہ خالی ہیں۔ ''یہاں ایسا کوئی جانور نہیں پایا جاتا۔'' میں نے کہا۔

''تب لاش کون اندر لے گیا ہے؟''

''اس کے لیے اندر جانا ہوگا۔ تم جا کر چار افراد اور مزید مشعلیں لے آؤ۔'' میں نے اس سے مشعل لیتے ہوئے کہا۔ وہ واپس چلا گیا۔ میں نے دہانے میں جھانکا لیکن اندر جانے سے گریز کیا۔ کچھ دیر میں ولیم اور مائر سمیت کئی افراد آ گئے۔ انہوں نے مشعلیں جلا لی تھیں۔ میں نے ان کو بتایا کہ بچی کی لاش یہاں تک آنے کے نشانات ملے ہیں۔ ''میں اندر جاؤں گا... میرے ساتھ تین افراد اور آ جائیں۔''

چارلی اور کلائیو کے ساتھ بلیک بھی جانے کو تیار ہو گیا۔ مائر نے اپنے آدمیوں کو جانے کے لیے نہیں کہا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''میرا خیال ہے بے کار ہے، یہ شاید کوئی جانور ہے۔''

''اس علاقے میں ایسا کوئی جانور نہیں پایا جاتا۔'' ولیم نے کہا۔

''ریڈ انڈینز کو لاش لے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' مائر بولا۔ اس پر میں نے طنزاً کہا۔

''اچھا... ویسے یہ تمہارا ہی خیال ہے کہ قتل اور اغوا کی وارداتیں ریڈ انڈینز نے کی ہے۔''

''مجھے ابھی بھی پورا یقین ہے۔ انہوں نے اس بچی کو بھی مار کر اس جگہ دفن کر دیا۔''

میں اس کی بات پر توجہ دیے بغیر اندر اتر گیا۔ چارلی اور باقی دو افراد میرے پیچھے آئے۔ مشعلوں کی وجہ سے اندر اچھی خاصی روشنی ہو گئی تھی۔ باہر سے چھوٹا سا نظر آنے والا غار اندر سے بہت بڑا ثابت ہوا۔ ہم ایک ہال میں اترے جس میں کئی سرنگیں نکل رہی تھیں۔ چارلی نے کہا۔ ''یہ تو بہت بڑا ہے شیرف۔''

''بکواس...'' میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''بلاوجہ بولنے سے گریز کرو۔''

ہال کے ساتھ سرنگیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ہم باری باری تمام سرنگوں میں گئے لیکن ان کی طوالت کی وجہ سے ہمیں واپس آنا پڑا کیونکہ زیادہ آگے جا کر یہ مزید سرنگوں میں تقسیم ہو رہی تھیں اور ہمارے بھٹک جانے کا خطرہ تھا۔ ہمیں نہ تو بچی کی لاش ملی اور نہ ہی کوئی انسان یا جانور نظر آیا، البتہ وہاں شدید قسم کی بو صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ ہم باہر آئے تو مایوس تھے۔ دیم دہانے پر موجود تھا۔ اس نے میرے چہرے سے اندازہ کر لیا۔

''نہیں ملا کچھ؟''

''نہیں... اندر غار بہت بڑا ہے اور اسے پورا دیکھنا ممکن نہیں ہے۔''

ولیم نے سر ہلایا۔ ''میں نے بعض لوگوں سے سنا ہے کہ ان پہاڑوں میں غاروں کا بہت بڑا سلسلہ ہے جو کئی میل تک پھیلا ہوا ہے لیکن کوئی اس میں اترا نہیں ہے۔''

''مجھے شبہ ہے کہ بچی کی لاش لے جانے والا کوئی جانور ہے۔''

ولیم سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔ ''تمہارے اندر جانے کے بعد میں نے نشانات کا جائزہ لیا ہے، اس میں زمین پر کسی جانور کے پیروں کے نشانات نہیں ہیں۔''

ہم کیمپ واپس آئے تو وہاں ایک مسئلہ اور کھڑا ہوا تھا۔ مائر کے دو افراد غائب تھے۔ رات کو انہیں پہرے پر لگایا گیا تھا۔ جب بچی کی لاش غائب ہوئی تو وہ موجود تھے لیکن جب مائر اس معاملے کو دیکھ کر واپس اپنے کیمپ گیا تو اس کے آدمی غائب تھے اور وہ غیظ و غضب کے عالم میں ریڈ انڈینز کو گالیاں دے رہا تھا۔ ''میں ان بدمعاشوں کو چھوڑوں گا نہیں۔''

دونوں پہرے دار مخالف سمت میں پہرا دے رہے تھے۔ اس لیے کسی کو ان کے بارے میں بالکل پتا نہیں چلا کہ وہ کیسے غائب ہو گئے۔ نہ کسی نے کسی کو آتے دیکھا۔ میں اور ولیم وہاں پہنچے تو ان کے ساتھی، ان کی رائفلیں اور ٹوپیاں اٹھا رہے تھے۔ حملہ آور یہ چیزیں چھوڑ گئے تھے۔ ولیم نے مائر سے کہا۔ ''ریڈ انڈینز کبھی بھی اسلحہ نہیں چھوڑتے۔''

''بکومت۔'' مائر غرایا۔ ''تم ان حرامزادوں کی زیادہ ہی طرف داری کر رہے ہو۔''

ولیم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم مجھ سے اس طرح بات نہیں کر سکتے۔''

''میں کر سکتا ہوں، میں اس مہم کا کمانڈر ہوں۔''

''اگر تم اس مہم کے کمانڈر ہو تو میں واپس جانے کو ترجیح

دوں گا۔'' ولیم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''تم شوق سے جا سکتے ہو۔'' مائر نے بے پروائی سے کہا۔

''اس صورت میں، میں ولیم کا ساتھ دوں گا۔'' میں نے اسے آگاہ کیا اور ہم واپس اپنی جگہ آ گئے۔

''یہاں کچھ ہو رہا ہے۔'' میں نے ولیم سے کہا۔

''کیا ہو رہا ہے؟''

''میں نہیں جانتا لیکن کچھ ہے جو معمول سے ہٹ کر ہے۔ میں بیس سال سے پولیس میں کام کر رہا ہوں۔ میں ریڈ انڈینز اور دوسرے جرائم پیشہ افراد کا ایک ایک انداز پہچانتا ہوں لیکن یہاں جو ہو رہا ہے، وہ سب سے جدا ہے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں لیکن یہ بات اس پاگل کو کون سمجھائے۔'' ولیم نے مائر کی طرف دیکھا جو چیخ چیخ کر اپنے آدمیوں کو چاروں طرف پھیل کر غائب ہونے والوں کو تلاش کرنے کا حکم دے رہا تھا۔ چونکہ اس نے ہم سے اس سلسلے میں بات نہیں کی تھی اس لیے ہم آرام سے لیٹ گئے۔ صبح کے قریب ایک بار پھر شور بلند ہوا اور میں اٹھ بیٹھا۔ میں نے وہاں موجود چارلی سے پوچھا۔

''اب کیا ہوا ہے؟''

چارلی کھڑا ہو گیا۔ ''میرا خیال ہے کہ یہ کسی کو پکڑ لائے ہیں اور شاید کوئی ریڈ انڈین ہے۔''

صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ میں بھی کھڑا ہو گیا۔ مائر کے آدمی ایک لمبے تڑنگے ریڈ انڈین کو پکڑ لائے تھے۔ اس کے ساتھ اس کا سفید رنگ کا گھوڑا بھی تھا۔ ریڈ انڈین کبھی گھوڑے پر زین نہیں ڈالتے وہ ہمیشہ ننگی پیٹھ پر سواری کرتے ہیں۔ مائر کے آدمیوں نے اس پر تشدد بھی کیا تھا کیونکہ اس کے منہ، ناک سے خون جاری تھا۔ میں اور ولیم اس کے پاس پہنچے، وہ گھبرایا ہوا تھا کیونکہ مائر اس سے انگریزی میں اپنے آدمیوں کا پتا پوچھ رہا تھا جبکہ وہ انگریزی نہیں سمجھتا تھا۔ مجھے ریڈ انڈینز کی زبان آتی تھی۔ میں نے مائر سے کہا۔

''ایک منٹ... مجھے اس سے بات کرنے دو۔''

''ضرور کرو، ورنہ میں اس سے اس زبان میں بات کروں گا جو یہ ضرور سمجھ جائے گا۔'' مائر سرد لہجے میں بولا۔ وہ اس پر تشدد کی دھمکی دے رہا تھا، وہ اسی فطرت کا آدمی تھا۔ مجھے تو حیرت تھی کہ اس نے اسے زندہ کیسے گرفتار کر لیا۔ شاید اس لیے کہ اسے اپنے آدمیوں کی فکر تھی۔ انہوں نے اسے سامان والی گھوڑا گاڑی کے پہیے سے باندھ دیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ بندھے تھے اور پاؤں میں رسی تھی۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''ہمارے دو سپاہی غائب ہیں۔'' میں نے اس سے کہا۔ ''تم ان کے بارے میں جانتے ہو؟''

''نہیں، میں اس طرف سے آ رہا ہوں۔'' اس نے پہاڑوں میں مخالف سمت کی طرف دیکھا۔ ''میں ان کے بارے میں نہیں جانتا۔''

''سنو... اگر تم اس طرح نہیں بتاؤ گے تو یہ شخص تمہیں تکلیف دے گا۔'' میں نے مائر کی طرف دیکھا۔

''یہ پہلے ہی مجھے تکلیف دے چکا ہے۔''

''صرف دو سپاہی نہیں بلکہ ان پہاڑوں کے ساتھ رہنے والی ایک فیملی کے چار افراد بھی غائب ہیں۔ ان میں سے چار مارے جا چکے ہیں۔''

اس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ ''میں ان کے بارے میں نہیں جانتا۔''

''یہ اس طرح نہیں مانے گا۔'' مائر غرایا اور اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔ ''اس کا دماغ درست کرو۔''

سپاہی آگے بڑھے تو میں پیچھے ہٹ گیا۔ اس وقت مائر اور اس کے آدمیوں کے سر پر خون سوار تھا اس لیے وہ میری بات نہیں سنتے۔ میں ولیم کے پاس آیا جو ایک طرف بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ چارلی اور بلیک کھانا بنا رہے تھے۔ ولیم نے مگ میں چائے انڈیل کر میری طرف بڑھائی۔ ''یہ نہیں سنے گا۔''

''مجھے یہ شخص بے گناہ لگ رہا ہے۔'' میں نے مگ لے لیا۔ ''اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

''میں اس کے ساتھ نہیں رہوں گا لیکن گم شدہ خاندان کو تلاش کرنا میری ذمے داری ہے اس لیے میں انہیں اپنے طور پر تلاش کروں گا۔'' اس نے اپنا ارادہ بتایا۔ ''تم میرا ساتھ دو گے؟''

میں نے سوچا اور سر ہلایا۔ ''ہاں، میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

''شکریہ ورنہ میرے پاس ویسے بھی آدمی نہیں ہیں۔''

اس دوران میں ریڈ انڈین یوں چلانے لگا جیسے اس کی کھال اتاری جا رہی ہو اور ممکن ہے ایسا ہی ہو رہا ہو کیونکہ وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ولیم نے غصے سے مگ پٹخ دیا۔ ''اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔''

''وہ یہ کام فائدے کے لیے نہیں اپنی تسکین کے لیے کر رہا ہے۔'' میں نے گاڑی کی طرف دیکھا جہاں ریڈ انڈین بندھا تھا۔ مائر اور اس کے آدمی کئی گھنٹے تک اس پر تشدد کرتے

رہے تھے۔ وہ چلاتا رہا لیکن اس نے ان کو کچھ نہیں بتایا۔ اگر وہ ان کو بتانے کی کوشش کرتا تو وہ لازمی ترجمے کے لیے مجھے بلاتے۔ دوپہر تک ہم سامان باندھ کر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس وقت مائر اور اس کے سپاہی کھانا کھا رہے تھے۔ ریڈ انڈین کو صرف مار کھانے کو ملی تھی۔ اتنا تشدد برداشت کرنے کے بعد بھی وہ ہوش میں تھا اور اس وقت آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک تھالی میں تھوڑی سا دلیا ڈالا اور اس کے پاس آیا۔ میں نے اس کا ایک ہاتھ کھول دیا اور آہستہ سے بولا۔ ''جلدی سے کھا لو، یہ تمہیں کھانے کو نہیں دیں گے۔''

''انہوں نے مجھے کیوں پکڑا ہے؟'' اس نے جلدی جلدی کھانا شروع کر دیا۔ مجھے ریڈ انڈینز کے بارے میں اچھی خاصی معلومات تھیں۔ یہ دشمن ہوں یا دوست، دونوں معاملوں میں دھوکا نہیں کرتے اور نہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اگر یہ دشمن ہوتا اور سپاہیوں کی گم شدگی میں شامل ہوتا تو اب تک اقرار کر چکا ہوتا۔ میں نے سوچا اور اسے مختصراً بتایا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ جب میں نے اسے گم شدہ بچی کی مٹی میں دبی لاش کے بارے میں بتایا تو وہ بولا۔

''کارا جا۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔ ''وہ پھر آ گئے ہیں؟''

میں سمجھا نہیں۔ ''کارا جا کون ہیں اور یہ کہاں سے آئے ہیں؟''

''وہ زمین سے آتے ہیں۔ وہ ہر تین نسل بعد سو کر اٹھتے ہیں اور اپنی بھوک مٹانے باہر آتے ہیں۔''

''زمین سے آتے ہیں؟'' میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ جلدی سے کہنے لگا۔ ''وہ زمین میں رہتے ہیں۔ تین نسل تک سوتے ہیں اور پھر باہر آ کر کھانا تلاش کرتے ہیں۔ پہلے وہ یہاں پائے جانے والے جنگلی بھینسے کھاتے تھے۔ وہ ان کو مار کر زمین میں دبا دیتے ہیں اور جب وہ گل کر نرم پڑ جاتے ہیں تو انہیں نکال کر کھاتے ہیں۔ تم لوگوں نے ان کا کھانا ختم کر دیا۔''

ریڈ انڈین بتا رہا تھا کہ زمین میں کوئی جانور رہتا ہے جو تین نسل تک سوتا ہے اور پھر اٹھ کر خوراک تلاش کرتا ہے۔ اس کی خوراک یہاں پائے جانے والے جنگلی بھینسے تھے جو مفید فاموں نے بے دریغ شکار کر کے ختم کر دیے۔ اب وہ جاگے تو ان کو خوراک نہیں ملی اور انہوں نے انسانوں کو شکار

اوئے
بیڑا غرق ہو گیا

دھدر سنگھ کو اپنے ''تاؤ'' سے ملنے امریکا جانا تھا۔ بڑی مشکل سے ویزا لیا، ٹکٹ کٹایا اور امریکا جانے والی پرواز میں سوار ہو گیا۔ جہاز ائرپورٹ سے اڑا، دس منٹ کی پرواز کے بعد جب جہاز پینتیس چالیس ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچا تو جہاز کا کپتان مسافروں سے کچھ یوں مخاطب ہوا۔ ''خواتین و حضرات... امریکا جانے والی پرواز پر آپ کا کپتان آپ کو خوش آمدید کہتا ہے، ہم اس وقت چالیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہے ہیں، امریکا جاتے ہوئے ہم رستے میں فرانس بھی رکیں گے۔ رستے کا موسم بالکل صاف ہے، مجھے امید ہے آپ کو سفر خوش گوار...''

اتنا کہہ کر کپتان چپ ہوا ہی تھا کہ اسپیکر پر کپتان کی آواز آئی:

''اوئے بیڑا ہو گیا!''

کپتان کی گھبرائی ہوئی اواز میں یہ جملہ سن کر دھدر سنگھ سمیت تمام مسافروں کو گویا سانپ سونگھ گیا، سب مارے خوف کے چپ ہو گئے، اتنے میں اسپیکر پر پھر جہاز کا کپتان مخاطب ہوا۔

''خواتین و حضرات... میں آپ سے معافی چاہتا ہوں... اسپیکر پر میرے منہ سے غلط جملہ نکل گیا، دراصل ایک ائرہوسٹس میرے لیے کافی کا کپ لے کر آئی تھی، جھٹکا لگنے سے کافی میری پتلون پر گر گئی، گھبراہٹ میں میرے منہ سے بیڑا غرق نکل گیا۔

''خطرے کی کوئی بات نہیں، صرف میری پتلون گیلی ہوئی ہے۔''

کپتان کا یہ خطاب سن کر دھدر سنگھ کھڑے ہو کر چلایا:

''اوئے... تیری پتلون تے خشک ہو جائے گی... جیہڑی میری... نکل گئی اے، اوہنوں کون دھوئے گا!''

ذیرہ اسماعیل خان سے، شاہ عبداللہ کا تعاون

کرنا شروع کر دیا۔ بہ ظاہر اس کی بات ناقابلِ یقین تھی۔

''کارا جا کیسا ہوتا ہے؟''

''وہ ہم جیسے ہوتے ہیں لیکن وہ صرف رات کو نکلتے ہیں جب شکار کرنا ہو۔ وہ پورے ایک چاند تک شکار کرتے ہیں اور اس کے بعد پھر تین نسلوں کے لیے سو جاتے ہیں۔''

''انسان یا جانور کو مارنے کے لیے وہ کون سا ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔''

''ان کے ہاتھوں میں ایک ایک ناخن ہوتا ہے اور وہ کسی بھی جانور کو کاٹ سکتا ہے۔''

مجھے لاشوں کے کٹے ہوئے گلے یاد آ گئے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''یہ کہاں سے آتے ہیں؟''

''یہاں سے ایک دن کی مسافت پر جنگل ہے، وہ وہاں رہتے ہیں لیکن وہ ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔'' ریڈ انڈین بتا رہا تھا تو اس کے چہرے پر انتہائی خوف نظر آ رہا تھا۔ اس نے سر کے اشارے سے سمت بھی بتائی۔ اسی لمحے اس کے تھالی والے ہاتھ پر ٹھوکر پڑی اور تھالی اڑ گئی۔ یہ مائر تھا۔ اس نے کہا۔

''تم نے میری اجازت کے بغیر میرے قیدی کو کھانا کیوں دیا؟''

''سوری... مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم نے اس کا کھانا بند کیا ہوا ہے۔'' میں نے بات بڑھانے سے گریز کیا۔

''اب اس سے دور رہنا، یہ میرا قیدی ہے۔'' مائر نے کہا اور پلٹ کر وہاں سے چلا گیا۔ میں بھی ولیم کی طرف آ گیا۔ میں نے اسے ریڈ انڈین سے ہونے والی گفتگو سنائی تو وہ بھی تشویش زدہ ہو گیا۔ اس نے کہا۔

''یہ لوگ جھوٹ نہیں بولتے۔''

چارلی ہماری بات سن رہا تھا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ یہ جانور موجود ہیں اور وہی میریا کی فیملی کو لے گئے ہیں۔''

''ہو سکتا ہے۔'' ولیم کھڑا ہو گیا۔ ''اب ہمیں چلنا چاہیے۔''

''کہاں شیرف؟'' چارلی نے پوچھا۔

''اس جنگل کی طرف جہاں ریڈ انڈین کے مطابق وہ جانور رہتے ہیں۔''

کچھ دیر بعد ہم گھوڑوں پر سوار آگے جا رہے تھے۔ ولیم نے کہا۔ ''ایسی جگہ کا خیال رکھ کر چلنا جہاں مٹی ہو۔''

میں اس کا مطلب سمجھ گیا لیکن اس پورے علاقے میں ریت ہی ریت تھی۔ ہم کہاں تک خیال رکھ سکتے تھے۔ دوپہر کو ہم کچھ دیر کے لیے رکے اور اس کے بعد دوبارہ سفر شروع کر دیا۔ رات کے قریب ہم پہاڑوں کے درمیان ایک سرسبز میدان میں داخل ہوئے جہاں اونچی گھاس اگی ہوئی تھی۔ یہ جگہ رات گزارنے کے لیے بہترین لگ رہی تھی۔ یہاں سے ہمیں جلانے کے لیے لکڑی اور خشک گھاس آسانی سے مل جاتی۔ باقی مقامات پر اس کے لیے خاصی کوشش کرنا پڑتی۔ بلیک اور کلائیو نے مل کر الاؤ جلایا اور چارلی رات کے کھانے کی تیاری کرنے لگا۔ میں اپنے ہتھیاروں کا جائزہ لے رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر ہمارا اس جانور سے سامنا ہو گیا تو اس کا مقابلہ کس طرح کریں گے۔

میں نے ولیم سے کہا۔ ''ہمیں رات بہت محتاط رہنا ہو گا۔ مائر کے آدمی بھی رات میں غائب ہوئے ہیں۔''

''ہمیں زیادہ الاؤ جلانے ہوں گے۔'' چارلی لکڑی کا ڈھیر لاتے ہوئے بولا۔

کلائیو بھی چارلی کی مدد کر رہا تھا اور انہوں نے میدان میں پڑاؤ والی جگہ چار الاؤ جلا دیے تھے۔ طے پایا کہ سب مسلح حالت میں سوئیں گے اور دو افراد جاگتے رہیں گے۔ پہلی باری میری اور کلائیو کی آئی۔ پانچ گھنٹے ہم جاگتے اور اس کے بعد ولیم اور چارلی جاگتے۔ بلیک کو اس ڈیوٹی سے مستثنیٰ قرار دیا گیا کیونکہ صبح ناشتا بنانے کی ذمے داری اس کی تھی۔ ولیم، بلیک اور چارلی سو گئے۔ میں اور کلائیو دو مختلف سمتوں میں منہ کیے پہرا دے رہے تھے اور وقت گزاری کے لیے آپس میں بات بھی کر رہے تھے۔ نصف رات کے بعد بلیک اٹھا اور اپنی پتلون سنبھالتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ اس کا رخ جھاڑیوں کی طرف تھا۔ کلائیو نے پکار کر کہا۔

''زیادہ دور مت جانا۔''

بلیک مسلح تھا اس لیے ہمیں زیادہ فکر نہیں تھی۔ لیکن جب خاصی دیر گزرنے کے بعد بھی وہ واپس نہیں آیا تو کلائیو نے کہا۔ ''وہ کہاں رہ گیا؟''

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں جا کر دیکھتا ہوں۔''

''نہیں، تم اکیلے نہیں جاؤ گے شیرف۔'' کلائیو نے کہا۔ اس نے ولیم اور چارلی کو اٹھا دیا اور ان کو بلیک کی... گمشدگی سے آگاہ کیا۔ حالات ایسے تھے کہ وہ تشویش زدہ ہو گئے۔ میں نے چارلی کے ساتھ اس جھاڑی کی جانب دیکھا جس میں بلیک گیا تھا۔ چارلی نے مشعل اٹھا رکھی تھی۔ اس کی روشنی میں بلیک کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ چارلی نے اسے آواز دی تو اچانک ایک طرف گھاس میں ہلکی سی ہلچل مچی۔ میں تیزی سے اس طرف بڑھا۔ چارلی میرے پیچھے

آیا لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو وہاں کچھ نہیں تھا۔ البتہ گھاس کے قریب ایسے آثار تھے جیسے اس پر کوئی بھاری چیز گھسیٹ کر لے جائی گئی ہو۔ ہم اس نشان کے ساتھ آگے بڑھے۔ ہم نے رائفلیں تان رکھی تھیں۔ یہ نشان ایک گڑھے تک تھا اور اس کے کنارے مٹی ابھری ہوئی تھی جیسے گڑھا ابھی کھودا گیا ہو۔ چارلی نے اس میں جھانکا تو اندر سے خوف ناک غراہٹ سنائی دی۔ چارلی نے فوراً فائر کیا۔ اس بار غراہٹ نہیں سنائی دی۔ چارلی بدحواس ہو کر فائر پر فائر کیے جا رہا تھا۔ میں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اسے جھنجوڑا۔

''بس کرو... وہ جا چکے ہیں۔''

چارلی رک گیا لیکن اس کا خوف کم نہیں ہوا۔ اس دوران میں ولیم اور کلائیو بھی آ گئے۔ ولیم نے تیز لہجے میں پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''کوئی چیز بلیک کو اس میں لے گئی ہے۔'' میں نے سوراخ کی طرف اشارہ کیا۔

''بلیک یا کوئی اور نظر آیا؟''

''نہیں لیکن اندر سے کسی جانور کی آواز آئی تھی۔ اس پر چارلی نے بے ساختہ فائرنگ کر دی۔'' میں نے کہا اور واپس پڑاؤ کی طرف آ گیا۔ وہ لوگ بھی پلٹ آئے۔ ''اب کوئی بھی اکیلا کہیں نہیں جائے گا۔''

بلیک کی گمشدگی نے سب کو ہراساں کر دیا تھا۔ مسلح ہونے کے باوجود لے جانے والے اسے کتنی آسانی سے لے گئے کہ وہ آواز بھی نہیں نکال سکا۔ ولیم کچھ سوچ رہا تھا، اس نے کہا۔ ''ہمیں یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔''

یہ بات میرے ذہن میں بھی تھی۔ ہم خطرے میں تھے اور یہاں رکنا مزید خطرے کو دعوت دینے والی بات تھی۔ میں نے اس کی تائید کی اور روانگی کی تیاری کرنے لگے۔ چند منٹ میں سارا سامان گھوڑوں پر بار کر کے ہم روانہ ہو گئے۔ بلیک کا گھوڑا ہم نے ساتھ لے لیا۔ وادی سے نکلنے کے بعد ہم ایک ڈھلان پر چڑھے اور جب اس کے اوپری حصے پر پہنچے تو دور کہیں آگ دکھائی دی۔ ہم ڈھلان سے اترنے لگے۔ سب نے اپنے ہتھیار سنبھال لیے تھے کیونکہ ضروری نہیں تھا کہ الاؤ جلانے والا دوست ہی ہوتا۔ لیکن جب ہم الاؤ کے پاس پہنچے تو وہاں صرف ایک لڑکی بیٹھی دکھائی دی اور یہ ریڈ انڈین تھی۔ اس نے ہمیں دیکھ کر بھڑکنے یا بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے اس کی زبان میں پوچھا۔

''تم کون ہو؟''

''میں کاموچی قبیلے کی عورت ہوں۔'' وہ بولی۔ ''کارا جا نے میرے گھر پر حملہ کر کے سب کو مار دیا ہے۔ بس میں بچی ہوں۔''

میں نے ولیم کی طرف دیکھا۔ ''یہ بھی اسی جانور کی ستم رسیدہ ہے۔ اس کا سارا خاندان مارا گیا ہے۔''

ہم گھوڑوں سے اتر کر الاؤ کے پاس آ گئے لیکن اپنے ہتھیار اپنے پاس ہی رکھے۔ ہمارے ذہنوں میں یہ خوف تھا کہ کہیں یہ ٹریپ نہ ہو اور آس پاس گھات لگائے ریڈ انڈینز موجود ہوں۔ لڑکی کا نام بیجی آکا تھا اور وہ شادی شدہ اور دو بچوں کی ماں تھی۔ اس کے بچے بھی کارا جا کا شکار ہو گئے۔ اس لڑکی نے بھی تصدیق کر دی تھی کہ... کوئی غیر انسانی مخلوق اس علاقے میں سرگرم عمل تھی۔ اگر پہلے ریڈ انڈین نے جھوٹ بولا تھا تو اس کی خبر بھلا اس لڑکی کو کہاں سے ہوتی۔ ریڈ انڈین ہونے کے باوجود وہ بہت خوب صورت اور نوجوان تھی۔ ریڈ انڈینز میں لڑکی جوان ہوتے ہی اس کی شادی کر دیتے ہیں اور بیس سال تک وہ تین چار بچوں کی ماں بن جاتی ہے۔ اس کی عمر بیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے مطابق اس کا خاندان یہاں سے ایک دن کی مسافت پر پہاڑوں کے درمیان رہتا تھا۔ رات کے وقت اچانک ہی کارا جا نے حملہ کیا اور صرف اسے بچ کر نکلنے کا موقع ملا۔ وہ ان کے گھوڑے پہلے ہی ہلاک کر چکے تھے۔ بیجی نے بھی یہی بتایا کہ وہ دیکھنے میں انسانوں سے ملتے جلتے ہوتے ہیں اور ان کے دونوں ہاتھوں میں بس ایک ایک بہت تیز ناخن ہوتا ہے۔ اس کی باتیں سن کر میرے اندر خوف کی لہری دوڑ گئی اور میرا بے اختیار دل چاہا کہ میں واپس چلا جاؤں۔ انجلینا میرے بچے کی ماں بننے والی تھی اور میں اپنے بچے کو یتیم نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن یہ بس لمحاتی کیفیت تھی۔

''تم لوگ کارا جا کے مسکن کی طرف کیوں جا رہے ہو؟'' بیجی نے پوچھا۔ ''وہاں صرف موت ہے۔''

میں نے اسے بتایا کہ ہم پولیس والے ہیں اور ایک سفید فام خاندان کی تلاش میں وہاں جا رہے ہیں۔ اس نے نفی میں سر جھٹکا۔ ''یہ بے کار ہے، وہ سب مر چکے ہوں گے۔''

میں نے اسے سمجھایا کہ اگر وہ مر چکے تھے تب بھی ہمیں جانا تھا۔ ہمیں اس مخلوق کا خاتمہ کرنا تھا جو انسانوں کو ہلاک کر رہی تھی۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی کہ ہم چند لوگ اس مخلوق کا کس طرح خاتمہ کر سکتے تھے... کیونکہ اب اس کا کوئی نہیں تھا، اس لیے وہ ہمارے ساتھ جانے کے لیے راضی ہو گئی۔ میں نے ولیم سے کہا تو اس نے بیجی کے بارے میں

فیصلہ سنایا۔

''جہاں کہیں ہمیں اس قبیلے کا کوئی فرد نظر آیا، ہم اسے ان کے حوالے کر دیں گے۔''

اب صبح ہونے والی تھی... ہم نے ناشتا کیا اور ایک بار پھر سفر کے لیے تیار ہو گئے۔ ریڈ انڈین نے مجھے جس سبز جنگل کے بارے میں... بتایا تھا، اب ہم اس سے ایک دن کی مسافت پر تھے۔ بلیک کا گھوڑا بیجی کو دے دیا گیا۔ اس نے روایتی ریڈ انڈین لباس پہن رکھا تھا۔ یعنی چمڑے کی پتلون اور اونی قمیص۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور وہ یقیناً مضبوط اعصاب کی مالک تھی جو اپنے سارے خاندان اور بچوں کے مرنے پر بھی خود کو سنبھالے ہوئے تھی۔ میں نے ریڈ انڈینز کو اس معاملے میں صابر پایا ہے۔ یہ موت اور آفات پر واویلا نہیں کرتے۔

اس وقت ہم پہاڑوں کے درمیان گھومتی ایک طویل اور پتلی سی وادی میں سفر کر رہے تھے۔ میں بیجی کے ساتھ تھا۔ میں نے اس سے کاراجا کے بارے میں پوچھا۔ ''تم لوگ ان کے بارے میں کب سے جانتے ہو؟''

''جب سے ہم اس زمین پر آئے ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''بہت نسلوں پہلے سے جانتے ہیں۔ یہ تین نسل سوتے ہیں اور اس کے بعد اٹھ کر کھاتے ہیں۔ ایک پورے چاند تک کھانے کے بعد یہ دوبارہ سو جاتے ہیں پھر تین نسل بعد جاگتے ہیں۔''

''کیا یہ ہمیشہ انسانوں کو اپنا شکار بناتے ہیں؟''

''نہیں، انسانوں پر اس وقت حملہ کرتے ہیں جب ان کی خوراک کم ہو جائے۔ ہم ریڈ انڈین ان کی خوراک کا خیال رکھتے تھے اور جب ان کے جاگنے کا وقت آتا تو ان کے لیے بھینسے چھوڑ دیتے تھے۔ پھر یہ باہر نکل کر راتوں کو ان بھینسوں کا شکار کرتے اور ان کو کھاتے تھے لیکن تم لوگوں نے بھینسے ختم کر دیے۔''

''یہ رات کو کیوں شکار کرتے ہیں؟''

''کیونکہ دن میں باہر نہیں آتے۔'' اس نے جواب دیا۔ دن میں کیوں باہر نہیں آتے تھے، اس کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ بہ ظاہر یہ ایک ناقابلِ یقین داستان لگتی اور ہم میں سے کسی نے ابھی تک اس انوکھی مخلوق کو نہیں دیکھا تھا جو تین نسل تک یعنی کم سے کم پچاس ساٹھ سال سوتی تھی اور اس کے بعد صرف ایک مہینے کے لیے بیدار ہو کر کھا پی کر پھر تین نسلوں تک کے لیے سو جاتی تھی۔ وہ اتنی طاقت ور اور ماہر شکاری تھی کہ محض ایک ناخن سے بھینسے جیسے جانور کا شکار کر لیتی تھی اور مسلح انسانوں کو یوں اچک کر لے جاتی تھی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی۔ اگر میں خود ان حالات سے دوچار نہ ہوتا اور کسی کی زبانی سنتا تو کبھی اس پر یقین نہ کرتا۔ صرف والٹن فیملی نہیں بلکہ کیپٹن مائر کے دو آدمی اور ایک پولیس والا بھی غائب ہو چکا تھا۔ یہ تینوں عام لوگ نہیں تھے بلکہ تربیت یافتہ سپاہی تھے۔ اس کے باوجود وہ اس جانور کے خلاف کچھ نہیں کر سکے اور وہ مخلوق انہیں آرام سے لے گئی۔

شام کے وقت ہم اس وادی سے نکلنے میں کامیاب ہوئے تو ایک ہموار میدان نظر آیا۔ خاص بات یہ تھی کہ اس میدان کے پار ایک بہت بڑا اور گھنا سبز جنگل نظر آ رہا تھا جو اس علاقے میں ایک عجوبہ ہی ہو سکتا ہے کیونکہ یہ خشک اور ریتلا علاقہ ہے۔ میں پہلی بار اس جگہ آیا تھا۔ میرے ساتھیوں میں سے بھی کوئی پہلے یہاں نہیں آیا تھا۔ جنگل نشیب میں نظر آ رہا تھا اور شاید یہی اس کی سرسبزی کی وجہ تھی۔ بارش کا پانی چاروں طرف سے اس جگہ جمع ہو جاتا ہو گا اور جنگل کو پانی ملتا رہتا ہو گا۔ بیجی خوف زدہ نظر آ رہی تھی، شاید اسے بھی علم تھا کہ یہ جنگل کاراجا کا مسکن ہے۔

''ادھر مت جاؤ۔'' اس نے مجھ سے کہا۔ ''وہاں موت ہے۔''

''ہمیں اپنے ساتھیوں کی تلاش میں وہاں جانا ہو گا۔'' میں نے اسے اپنی مجبوری بتائی۔

''میں نہیں جاؤں گی۔'' اس نے انکار کر دیا۔

میں نے ولیم کو بتایا۔ ''یہ اس جنگل میں جانے کے لیے تیار نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے، ہم اسے باہر چھوڑ جائیں گے اور اس کی حفاظت کے لیے کوئی ایک فرد یہاں رک جائے گا۔''

طے ہوا کہ کلائیو اس کے پاس رکے گا اور باقی تین اندر جائیں گے۔ بہ ظاہر تو جنگل پاس لگ رہا تھا لیکن یہ نظر کا دھوکا تھا۔ ہمیں وہاں تک پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ جنگل میں درخت بہت اونچے اور گھنے تھے۔ باہر سے دیکھنے میں یہ دن میں بھی تاریک لگ رہا تھا۔ ولیم نے مجھ سے کہا۔ ''مجھے یہ جنگل خطرناک لگ رہا ہے۔''

''یہ اس خوف ناک مخلوق کا مسکن جو ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے، ہمیں کل صبح اندر جانا چاہیے۔''

''اس کے برعکس میرا خیال ہے کہ ہمیں ابھی جانا چاہیے۔'' ولیم بولا۔ ''جتنی دیر کریں گے، ہمارے ساتھیوں کے بچنے کا امکان کم ہوتا جائے گا۔''

''بیجی کا کہنا ہے کہ ان میں سے کسی کے بچنے کی امید نہیں ہے۔ کاراجا اپنے شکار کو فوراً مار کر زمین میں دفن کر دیتے ہیں۔''

''پھر بھی ممکن ہے ان میں سے کوئی بچ گیا ہو۔'' چارلی بولا۔ وہ ابھی تک میریا کی زندگی کے لیے پُرامید تھا۔ ان دونوں نے کہا تو میں بھی مان گیا۔ ابھی سورج ڈوبنے میں کوئی ایک گھنٹا تھا لیکن ہم نے اندر جانے سے پہلے مشعلیں جلا لی تھیں۔ سامان ہم نے باہر چھوڑ دیا اور گھوڑے ساتھ رکھے تاکہ اگر فرار کا موقع ہو تو ہم جلد جنگل سے باہر آ سکیں۔ بیجی اور کلائیو کو سامان سمیت باہر چھوڑ دیا گیا۔ ہم جنگل میں داخل ہوئے۔ یہاں زمین بہت نرم تھی اور زمین پر پتوں کے ڈھیر موجود تھے..... ولیم سب سے آگے تھا، اچانک وہ رک گیا اور اس نے ہاتھ اٹھا کر سب کو رکنے کا اشارہ کیا۔ ہم نے اپنی رائفلیں سنبھال لیں۔

''کیا ہوا؟'' میں نے آہستہ سے پوچھا۔

''شش... یہاں ریڈ انڈینز ہیں۔'' وہ بولا اور بے آواز گھوڑے سے اتر آیا۔ ''تمہیں پرندوں کی آوازیں نہیں آ رہیں؟''

''جنگل میں پرندوں کی آوازیں تو آتی ہیں۔''

''تمہیں اس جنگل میں ابھی تک کوئی پرندہ نظر آیا؟''

میں چونکا... واقعی اب تک یہاں کوئی بڑا جانور یا کوئی پرندہ نظر نہیں آیا تھا۔ کچھ دیر بعد کسی پرندے کی آواز گونجی۔ ولیم درست کہہ رہا تھا۔ ہم دونوں بھی پھرتی سے نیچے اتر آئے۔ ہم گھوڑوں کے درمیان میں تھے اور رائفلیں لیے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ اچانک مجھے درختوں کے درمیان کوئی چیز تیزی سے حرکت کرتی نظر آئی۔ میں نہیں دیکھ سکا کہ وہ کوئی انسان تھا یا کوئی اور جاندار۔ میں نے آواز لگائے بغیر ولیم کو بتایا کہ اس طرف کوئی ہے۔ ولیم نے سر ہلایا اور اشارے سے فائر کرنے سے منع کیا۔ خود میں بھی فائر کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ اگلے نصف گھنٹے میں پرندوں کی مختلف آوازوں سے واضح ہو گیا کہ یہاں چاروں طرف ریڈ انڈینز موجود ہیں اور وہ مخصوص آوازیں نکال کر ایک دوسرے کو خبردار کر رہے ہیں لیکن سوال یہ تھا کہ وہ یہاں کیا کر رہے تھے اور ہمیں کیوں گھیر رہے تھے؟

''یہ ہمیں دشمن سمجھ رہے ہیں۔'' ولیم نے آہستہ سے کہا۔

''کیا ہم ان کی غلط فہمی دور نہیں کر سکتے؟''

''نہیں، ہمیں رات ہونے کا انتظار کرنا ہو گا۔ اس وقت یہ حملہ نہیں کرتے۔''

یہ کہنا مشکل تھا کہ اس جنگل میں ریڈ انڈینز کیا کر رہے تھے اور یہ کہ وہ رات کے وقت حملے سے گریز کرتے۔ اس دوران میں ہمارے چاروں طرف نقل و حرکت جاری تھی۔ یہ ریڈ انڈینز کا دشمن کو خوف زدہ کرنے کا مخصوص انداز تھا۔ اس طرح وہ دشمن کو کھل کر سامنے آنے پر بھی مجبور کرتے تھے۔ وہ ہمیں صرف سفید فام ہونے کی وجہ سے دشمن سمجھ رہے تھے یا کوئی اور چکر بھی تھا۔ چارلی ذرا گھبرایا ہوا تھا۔ وہ بار بار رائفل اوپر کر لیتا تھا۔ میں اور ولیم مطمئن تھے کہ وہ حکم کی خلاف ورزی نہیں کرے گا اس لیے جب اس نے اچانک فائر کیا تو ہم دونوں ہی اچھل پڑے۔ ولیم پلٹ کر چلایا۔

''یہ کیا کیا تم نے؟''

''ادھر کوئی ہے۔'' چارلی گھبرائے ہوئے انداز میں بولا۔

''احمق... تم نے سب کو مروانے کا بندوبست کر دیا ہے۔'' ولیم نے اسے گھونسا مارا تو وہ نیچے گر گیا اور اسی وجہ سے اس کی جان بچ گئی۔ گولی اس کے اوپر سے گزر کر اس کے گھوڑے کی گردن میں لگی اور وہ بھیانک آوازیں نکالتا ہوا زمین پر گر گیا۔ ہم بھی زمین پر گر گئے۔ اس کے ساتھ ہی کئی فائر ہوئے اور ہمارے باقی دو گھوڑے بھڑک کر بھاگے۔ گولیوں سے بچنے کے لیے ہم گولی کھا کر گرنے والے

مرد بے چارہ

☆ میں دہری مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ بیوی میک اپ کرے تو خرچہ ناقابلِ برداشت..... نہ کرے تو بیوی ناقابلِ برداشت۔

☆ بابا جی! میں ہنسنا چاہوں تو بھی ہنس نہیں پاتا، کیونکہ؟ بیٹا تم شادی شدہ ہو۔

☆ مرد کو محبت بھرے خطوط لکھنے کا یہ صلہ ملا کہ وہ ڈاکیے کے ساتھ بھاگ گئی۔

☆ بیوٹی پارلر میں مردوں سے میک اپ کروانے والیاں، بس میں کسی مرد کا کندھا بھی برداشت نہیں کرتیں۔

☆ وہ مرد ہی ہے جو عورت کے لیے اپنی جان لڑا دیتا ہے اور صلہ ملتا ہے..... زن مرید کا۔

☆ یونیورسٹی میں ٹاپ کرنے والا، بیگم کی مکاری کے آگے ہار گیا۔

☆ مرد چاہے آسمان سے تارے بھی توڑ کر لے آئے۔ عورت منہ بنا کر کہے گی..... ''یہ کلر مجھے پسند نہیں۔''

کراچی سے شہناز اختر کی بھیجی باتیں

گھوڑے کی آڑ میں ہو گئے۔ وہ ابھی تک تڑپ رہا تھا اور خطرہ تھا کہ ہم پر نہ الٹ جائے۔ ولیم نے اس کے سر میں گولی مار کر اس خطرے سے نجات حاصل کر لی۔ سامنے تین عدد چوڑے تنے والے درخت تھے اس لیے اس طرف سے ہم محفوظ تھے۔ زیادہ خطرہ عقب اور دائیں طرف سے تھا۔ یہ جگہیں کھلی ہوئی تھیں۔ عقب سے مُردہ گھوڑے نے ہمیں محفوظ کر دیا تھا اور دائیں طرف ایک درخت کا گرا ہوا تنا تھا۔

فائرنگ سے ایک بات ثابت ہو گئی تھی کہ حرکت کرنے والے ریڈ انڈینز اور دشمن تھے۔ چارلی کے ایک اضطراری فائر پر انہوں نے ہمیں نشانہ بنانے کی پوری کوشش کی تھی۔ ہم اپنے اسلحے اور ایمونیشن کا جائزہ لے رہے تھے۔ اسلحہ خاصا تھا، ہم خاصی دیر تک مقابلہ کر سکتے تھے لیکن دشمن چھپا ہوا اور شاید تعداد میں زیادہ تھا۔ ہم اس جگہ محاصرے والی پوزیشن میں آ گئے تھے۔ ولیم بولا۔ ”ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا، رات ہونے سے پہلے۔“

سورج ڈوب رہا تھا اور جنگل کے اندر اچھی خاصی تاریکی چھا گئی تھی۔ گرنے سے ہماری مشعلیں بجھ گئی تھیں۔ ان کا بجھ جانا بہتر تھا لیکن تاریکی کے بعد کاراجا کی آمد کا خطرہ تھا اور ولیم ٹھیک کہہ رہا تھا، ہمیں اس سے پہلے یہاں سے نکلنا تھا کیونکہ اب ہمارے پاس فرار کے لیے گھوڑے بھی نہیں تھے۔ میں دائیں طرف دیکھ رہا تھا کہ مجھے کسی حرکت کا احساس ہوا اور میں نے نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ ایک چیخ سنائی دی اور کوئی انسان اچھل کر گرا۔ ”ایک مارا گیا۔“ چارلی بولا۔

اسی لمحے ولیم نے غلطی کی، اس نے اس طرف دیکھنے کے لیے سر اٹھایا کہ ایک گولی اس کی گردن میں لگی اور وہ کراہ کر نیچے گرا۔ ”میرے خدا...“ میں نے کہا اور رینگ کر اس کے پاس آیا۔ وہ اپنی گردن سے ابلنے والے خون کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کا زخم دیکھا اور اسی وقت سمجھ گیا کہ وہ بچے گا نہیں۔ گولی نے اس کی شہ رگ کو مکمل طور پر نقصان پہنچایا تھا۔ میں نے پھر بھی اس کا خون روکنے کی کوشش کی لیکن اس نے مشکل سے دو منٹ میں دم توڑ دیا۔ میں دکھی ہو گیا۔ چارلی پھٹی پھٹی نظروں سے اپنے باس کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

”ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔“

لیکن نکلنا مشکل تھا۔ ریڈ انڈینز تعداد میں زیادہ اور پوری طرح مسلح لگ رہے تھے۔ انہوں نے ہمارے فرار کے تمام راستے مسدود کر دیے تھے۔ ولیم نے صرف سر اٹھایا تھا اور اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہم پوری طرح ریڈ انڈینز کی نظر میں تھے۔ میں نے چارلی سے کہا۔ ”اپنے حواس قابو میں رکھو۔ یہ سب تمہاری حماقت کی وجہ سے شروع ہوا ہے۔“

”یہ ریڈ انڈینز یہاں ہماری دعوت کے لیے نہیں آئے ہیں۔“ چارلی کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔

”پھر بھی تم نے ان کو موقع دیا۔ اب ہمیں یہاں سے نکلنے کے لیے تاریکی چھانے کا انتظار کرنا پڑے گا۔“

سورج غروب ہو گیا تھا اور جنگل تیزی سے اندھیرے میں ڈوبتا جا رہا تھا لیکن ریڈ انڈینز بھی بھانپ گئے تھے کہ ہم کس فکر میں ہیں۔ اچانک ایک طرف سے تیز آگ نمودار ہوئی۔ ایسا لگا جیسے ریڈ انڈینز نے الاؤ جلا دیا ہے۔ چارلی غرایا۔

”لعنت ہو... یہ روشنی کر رہے ہیں تاکہ ہم فرار نہ ہو سکیں۔“

”یہاں سے نکلو۔“ میں نے آگے کی طرف کھسکنا شروع کر دیا۔ میں دائیں طرف جا رہا تھا اور چارلی نے سامنے کا رخ کیا۔ میں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ ”اس طرف کہاں جا رہے ہو؟“

چارلی نے میری بات سن لی تھی لیکن اَن سنی کر کے اس نے آگے کی طرف سفر جاری رکھا۔ اس دوران میں ہمارے دائیں اور پھر بائیں بھی الاؤ جل اٹھے۔ ریڈ انڈینز نہایت چالاکی سے ہمارے فرار کی راہیں مسدود کر رہے تھے۔ جب بائیں طرف کا الاؤ روشن ہوا تو چارلی براہِ راست اس کی روشنی میں آ رہا تھا۔ اس وقت اس نے حماقت کی اور بجائے واپس آنے کے اس نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی اور فوراً ہی ایک گولی نے اس کے سینے میں سوراخ کر دیا۔ وہ پلٹ کر گرا اور ساکت ہو گیا۔ میں نے اس طرف دیکھا جہاں سے چارلی پر گولی چلائی گئی تھی۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ ریڈ انڈینز حملہ کر کے جگہ تبدیل کر رہے تھے۔ میں ساکت رہا، اس وقت کسی بھی حرکت کا مطلب فوری موت بھی ہو سکتا تھا۔ ریڈ انڈینز کو معلوم تھا کہ اب ایک دشمن باقی رہ گیا ہے اس لیے وہ میرے سامنے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں آہستہ آہستہ رینگ کر ایک درخت کے گرے ہوئے تنے کی آڑ میں ہو گیا، یہاں میں کسی قدر محفوظ تھا۔

میرے سامنے مارے جانے والے ریڈ انڈینز کی لاش پڑی تھی۔ اس کے سرخ لباس کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے صرف سامنے کی طرف الاؤ جلائے تھے اور عقب میں

بدستور تاریکی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ عقب میں کوئی راستہ نہیں ہے ورنہ وہ اس طرف بھی الاؤ جلا دیتے۔ میرے پاس سوائے خاموشی سے دبکے رہنے کے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ رات مکمل طور پر چھا چکی تھی اور وقت بہت سست روی سے گزر رہا تھا۔ جنگل میں سکوت تھا اور ہلکی سی آواز بھی صاف سنائی دیتی تھی۔ اچانک ایسا لگا جیسے کوئی دبے قدموں حرکت کر رہا ہے۔ آواز اس طرف سے آئی تھی جہاں مارے جانے والے ریڈ انڈین کی لاش پڑی تھی۔ میں نے رائفل کا رخ اس طرف کر دیا۔ پھر ایک سایہ نمودار ہوا اور وہ ریڈ انڈین کی لاش کے پاس آیا۔ اس نے لاش کو اٹھانے کی کوشش کی تو میں نے اس پر گولی چلا دی۔ وہ اچھل کر بھاگا لیکن چند قدم جانے کے بعد زمین پر گر گیا۔ میں نے گولی چلا کر اپنی جگہ بدل لی تھی۔ جب کسی طرف سے مزید فائر نہیں ہوا تو میں آگے کی طرف رینگنے لگا۔ کچھ دیر بعد میں ریڈ انڈین کی لاش کے پاس تھا۔ لیکن جب میں اس کے قریب ہوا تو پتا چلا کہ وہ زندہ ہے۔ اس کے سینے میں گولی لگی تھی اور وہ سانس لے رہا تھا۔ البتہ اس کی مدد کو آنے والا یقیناً مارا جا چکا تھا۔ اس کی پشت میں عین دل والی جگہ سوراخ تھا۔ جنگل میں شاید یہی دونوں ریڈ انڈین تھے۔ میں زخمی ریڈ انڈین کے پاس آیا۔ وہ کسی قدر ہوش میں تھا۔ میں نے اسے رائفل کی نال سے ہلایا تو وہ چونکا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے پوچھا۔

”تمہارے اور کتنے ساتھی ہیں؟“

”ہم دو ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں اور میرا بھائی۔“ اس نے پیچھے دیکھا۔ ”وہ مر گیا ہے؟“

میں نے اسے سچ بتا دیا۔ ”ہاں، وہ مر گیا ہے۔“

ریڈ انڈین نے کوئی تاثر نہیں دیا۔ ”اب میں بھی مر جاؤں گا۔“

گولی اس کے سینے میں دل سے ذرا ہٹ کر لگی تھی اور شاید پھیپھڑے بھی بچ گئے تھے اس لیے اس کے فوری مرنے کا امکان نہیں تھا۔ ”تم لوگ یہاں کیا کر رہے تھے؟“

”ہم کاراجا کو دیکھنے آئے تھے۔“ اس نے سادہ سا جواب دیا۔

”کیوں؟“

”انہوں نے ہمارے قبیلے پر حملہ کر کے تمام افراد کو مار دیا اور ان کی لاشیں لے گئے۔“

میں نے سوچا اور اسے بیجی کے بارے میں بتایا۔ اس نے بنا کسی تاثر کے کہا۔ ”وہ میرے ایک بھائی کی بیوی ہے۔ بھائی بھی مارا گیا ہے۔“

بیوی کا مشورہ

کاشف کا انگوٹھا زخمی ہو گیا۔ وہ اپنے ڈاکٹر کے پاس گیا تو ڈاکٹر نے انگوٹھے کو دیکھ کر کہا۔

”گھر جاؤ اور انگوٹھے کو دو تین گھنٹے تک ٹھنڈے پانی میں ڈبوئے رکھو۔“

گھر جا کر کاشف نے ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کیا۔ اسی اثنا میں اس کی بیوی آ گئی اور پوچھا۔ ”کیا کر رہے ہو؟“ شوہر نے کہا۔

”میرے انگوٹھے میں تھوڑی سی چوٹ آ گئی ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے اگر میں دو تین گھنٹے تک اسے ٹھنڈے پانی میں رکھوں گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔“

”کیسا بے وقوف ڈاکٹر ہے۔“ بیوی نے کہا۔ ”زخمی انگوٹھے کو ٹھیک کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ اسے گرم پانی میں ڈبویا جائے۔“

بیوی کے کہنے پر کاشف نے دو تین گھنٹے تک انگوٹھے کو گرم پانی میں رکھا اور انگوٹھا واقعی ٹھیک ہو گیا۔

کچھ دنوں بعد اس کی ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا۔

”میں نے تمہارے کہنے پر عمل نہیں کیا تھا بلکہ بیوی کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے انگوٹھے کو گرم پانی میں ڈبویا تھا جس کی وجہ سے انگوٹھا ٹھیک ہو گیا۔“

”عجیب بات ہے۔“ ڈاکٹر نے حیرت سے کہا۔ ”میری بیوی تو ایسی حالت میں ہمیشہ انگوٹھا ٹھنڈے پانی میں ڈبونے کو کہتی ہے۔“

جمیلہ خاتون، راولپنڈی سے

شادی کا کھانا

ایک آدمی اپنے گدھے کو نہلا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر دوست نے پوچھا۔

”کیا ہو رہا ہے؟“

آدمی: ”آج میرے گدھے کی شادی ہے اس لیے نہلا رہا ہوں۔“

دوست: ”تو اس خوشی میں ہمیں کیا کھلاؤ گے؟“

آدمی: ”جو دولہا کھائے گا، تم بھی کھا لینا۔“

لنڈی کوتل سے نورالعین کی شگفتگی

"یہی ہمارے پاس ہے۔" میں نے اسے آگاہ کیا۔

"وہ اس جنگل سے باہر موجود ہے۔"

"تم یہاں سے چلے جاؤ۔ کچھ دیر میں کارا جا یہاں آجائیں گے۔ وہ اپنی خوراک کھانے آئیں گے۔"

میں نے لاشوں کی طرف دیکھا۔ "ان کو کھانے آئیں گے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں، یہاں اور لاشیں ہیں۔"

یہاں مجھے ابھی تک سوائے مارے جانے والوں کے اور کسی کی لاش نظر نہیں آئی تھی اس لیے میں ریڈ انڈین کی بات نہیں سمجھ سکا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے باہر جا کر کلائیو کو لانا چاہیے تاکہ ہم لاشیں باہر لے جاسکیں۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے کوئی پتوں میں چل رہا ہو لیکن یہ آواز زمین کے اوپر نہیں بلکہ اس کے اندر سے آرہی تھی۔ ریڈ انڈین کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس نے کہا۔

"کارا جا۔"

میں نے بھاگ کر الاؤ سے دو مشعلیں نکالیں۔ ہم جہاں تھے، وہاں کسی قدر اندھیرا تھا۔ اب آوازیں واضح اور مسلسل آرہی تھیں۔ پھر ہمارے سامنے ایک جگہ سے زمین کھل گئی اور اس میں سے ایک ہاتھ باہر آیا جس پر ایک ہی لمبا اور درانتی کی طرح مڑا ہوا ناخن تھا۔ پھر ہاتھ والا باہر آیا۔ وہ ایک لمبی اور پتلی سی چیز تھی جیسے کوئی بڑے ہاتھ پیر والی چھپکلی ہو اس کا سر انسان نما تھا لیکن اس پر سوائے ایک منہ کے اور کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ سیاہی مائل رنگت کے ساتھ یہ مخلوق بڑی خوف ناک لگ رہی تھی۔ مجھے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ باہر آنے کے بعد وہ کچھ دیر زمین پر جھک کر اسے سونگھتی رہی پھر اس نے اپنے ناخن سے زمین کھودنا شروع کی۔ اس دوران میں زمین سے اس جیسی اور چیزیں بھی برآمد ہو رہی تھیں اور انہوں نے اسی طرح زمین کھودنا... شروع کر دی۔ پہلے والے نے زمین سے ایک پرانی گل سڑھ جانے والی لاش برآمد کی اور اسے کھانے لگا۔ یہ لاش انہوں نے نہ جانے کب لا کر یہاں دبائی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کوئی درجن بھر کارا جا آگئے اور وہ زمین میں دبائی گئی لاشیں کھود کھود کر نکال رہے تھے اور انہیں کھا رہے تھے۔ تو یہ جنگل اس وجہ سے ان کا مسکن تھا۔ وہ جانوروں اور انسانوں کو مار کر یہاں دبا دیتے تھے اور جب ان کی لاشیں گل جاتی تھیں تو یہ انہیں نکال کر کھاتے تھے۔ یہ بات میری سمجھ سے بالاتر تھی کہ وہ انہیں یہاں تک لاتے کیسے تھے؟ واٹسن کا فارم یہاں سے کوئی اسی نوے میل دور تھا اور اتنی دور تک لاشیں لانا ناممکن حد تک مشکل تھا۔ لیکن ہو سکتا تھا کہ انہوں نے اس جنگل کے علاوہ بھی لاشیں ٹھکانے لگانے کے لیے کوئی جگہ مخصوص کر رکھی ہو۔ اس جنگل میں یہ آسانی تھی کہ یہاں سبزے اور نمی کی بہتات تھی اور اس وجہ سے لاشیں جلدی گل جاتی ہوں گی۔ ریڈ انڈین بالکل خاموش تھا اور اس نے مجھے بھی ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ شاید یہ جانور دیکھ نہیں سکتا تھا۔

میں بھی ساکت اور خاموش تھا لیکن میں نے رائفل تیار کر لی تھی اور اگر مجھے خطرہ ہوتا تو میں گولی چلانے سے گریز نہیں کرتا۔ یہ جانور جتنی تیزی سے حرکت کر رہا تھا، انسان اتنی تیزی سے حرکت نہیں کر پاتا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے جہاں بھی انسانوں پر حملہ کیا، یہ کامیاب رہے اور انسان اپنا دفاع نہیں کر سکے۔ وہ جس طرح انسانی لاشوں کو اُدھیڑ اُدھیڑ کر کھا رہے تھے، یہ دیکھنے والا منظر نہیں تھا۔ اس لیے میں نے نظریں پھیر لیں، اس کے باوجود ان پر نظر رکھنے کے لیے ان کو دیکھنا تو پڑتا تھا۔

اچانک ایک کراہ سنائی دی اور یہ ہلکی سی کراہ جنگل کے ساکت ماحول میں کسی گولی کے دھماکے کی طرح گونجی۔ جانور جو ابھی تک خاموشی سے کھانے میں مصروف تھے، اس کراہ پر چونکے اور پھر جنگل ان کی بھیانک آوازوں سے گونجنے لگا۔ وہ چاروں طرف سونگھنے کے انداز میں دیکھ رہے تھے۔ میں نے بوکھلا کر ریڈ انڈین کی طرف دیکھا لیکن وہ خاموش تھا تو پھر کراہ کس کی تھی؟ اسی اثنا میں کراہنے کی آواز دوبارہ آئی اور میرے ساتھ جانوروں نے بھی آواز کا تعین کر لیا۔ آواز چارلی کی تھی اور وہ ابھی زندہ تھا۔ چند جانور بے حد پھرتی سے اس تک پہنچ گئے اور ان میں سے ایک چارلی کو ٹانگ سے پکڑ کر کھینچنے لگا۔ ان کے ناخن تلے ایک گرفت کرنے والی انگلی بھی تھی۔ میں نے بے ساختہ رائفل اس کی طرف کی۔ وہ چارلی کو ٹٹول رہا تھا اور پھر اس نے چارلی کا سر پکڑا تو میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کرے گا۔ جیسے ہی اس کا ناخن چارلی کے گلے کی طرف بڑھا، میں نے اس پر گولی چلا دی۔ گولی اس کے سر پر لگی اور وہ چارلی کو چھوڑ کر اپنا سر تھامے زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا اور جنگل اس کی بھیانک چیخوں سے گونج اٹھا۔

"نہیں۔" ریڈ انڈین کراہا اور اس کی آواز نے ان جانوروں کو مزید بھڑکا دیا۔ کچھ ریڈ انڈین کی طرف اور کچھ میری طرف لپکے۔ میں نے ان میں سے دو کو اور سروں میں گولیاں ماریں اور پھر رائفل لوڈ کرنے لگا لیکن اس کا وقت

نہیں تھا اس لیے میں نے رائفل پھینک کر پستول نکال لیا اور قریب آنے والوں میں سے تین کو شوٹ کر دیا۔ ان کی آوازیں سن کر باقی رکے اور پھر پیچھے ہو کر تیزی سے زمین میں غائب ہونے لگے۔ میں نے موقع غنیمت جان کر رائفل اٹھا کر لوڈ کی اور ایک اور نظر آنے والے جانور کو شوٹ کر دیا۔ اب وہاں سوائے کارا جا اور انسانی لاشوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں ریڈ انڈین کے پاس آیا اور اسے سہارا دے کر اٹھایا اور اس سے کہا۔

"ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

"مشکل ہے، یہ نہیں جانے دیں گے۔" اس نے جواب دیا۔ "یہ صرف چھپے ہیں، ابھی یہ دوبارہ باہر آئیں گے۔"

"جب آئیں گے، تب دیکھا جائے گا۔ ابھی تو چلو یہاں سے۔"

میں نے احتیاطاً مرنے والے ریڈ انڈین کی رائفل اور کارتوس کی پیٹی بھی لے لی۔ میں ریڈ انڈین کو سہارا دے کر آگے بڑھنے لگا۔ کچھ دیر بعد عقب میں آہٹیں سنائی دینے لگیں۔ وہ ہمارے تعاقب میں آرہے تھے۔ ان کی رفتار کہیں تیز تھی۔ اب وہ آس پاس درختوں میں تھے۔ ان کے چلنے اور غرانے کی آوازیں آرہی تھیں لیکن وہ نظر نہیں آرہے تھے۔ الاؤ سے دور نکلنے کے بعد جنگل اب تاریک تھا اور بس کہیں کہیں پورے چاند کی روشنی جھلک رہی تھی۔ اس وقت میں انتہائی حد تک خوف زدہ تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ جب میری جان کے لالے پڑے ہوئے تھے تو میں اس نیم مُردہ ریڈ انڈین کا بوجھ کیوں اٹھائے ہوئے تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے چھوڑ دو ورنہ تم بھی مارے جاؤ گے۔"

"نہیں... میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔" میں نے اس سے بھی زیادہ ہانپتے ہوئے کہا اور اسی لمحے ایک جانور نے ہم پر چھلانگ لگائی اور ہمیں لیتا ہوا زمین پر جا گرا۔ میں الگ ہو گیا تھا اور جانور ریڈ انڈین سے لپٹا ہوا تھا۔ وہ اپنے ناخن سے اس کی گردن کاٹنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ کامیاب ہوتا، میں نے اس پر گولی چلا دی۔ وہ غرایا اور ریڈ انڈین کو چھوڑ کر تاریکی میں غائب ہو گیا۔ اس دوران میں ایک اور جانور نے عقب سے مجھ پر حملہ کیا اور اس کا سیاہ بازو مجھ سے لپٹ گیا۔ اس کے تیز ناخن نے میری پسلیوں کو کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ میں نے تڑپ کر رائفل پیچھے کی اور اسے گولی مار دی۔ وہ غراہٹ کے ساتھ دور ہو گیا۔ میں نے زخم پر ہاتھ رکھا تو وہ خون سے بھر گیا۔ میں بے ساختہ اٹھ کر بھاگا اور ریڈ انڈین کو بھی بھول گیا۔ چند جانور اس سے لپٹے ہوئے تھے اور اسے نوچ کر لے جا رہے تھے۔ میں درختوں کے درمیان بھاگا جا رہا تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کس طرف جا رہا ہوں۔ میرے ذہن میں بس ایک ہی بات تھی کہ مجھے کسی طرح اس جنگل سے نکلنا ہے جس میں یہ خوف ناک مخلوق موجود ہے۔

بھاگتے بھاگتے میں کسی جسم سے ٹکرایا تو میری چیخ نکل گئی۔ ایک لمحے کو مجھے لگا جیسے یہ وہی جانور ہے لیکن پھر میرے ہاتھوں نے بتایا کہ یہ گھوڑا ہے۔ میں نے ٹٹول کر اس کی لگام پکڑی تو وہ مانوس انداز میں مسکرایا، تب پتا چلا کہ یہ میرا ہی گھوڑا ہے۔ میں پھرتی سے اس پر سوار ہوا۔ عقب سے حیوانی آوازیں بدستور آرہی تھیں۔ میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور وہ تیزی سے بھاگا۔ مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا لیکن مجھے امید تھی کہ گھوڑے کو نظر آرہا ہوگا اور وہ مجھے اس منحوس جنگل سے نکال کر لے جائے گا۔ درختوں کی شاخیں مجھ سے ٹکرا رہی تھیں اور میرے جسم پر خراشیں آرہی تھیں مگر اس وقت مجھے کسی زخم کی پروا نہیں تھی۔ میں ہر قیمت پر یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ کسی بڑی شاخ کے تصادم سے بچنے کے لیے میں جھک کر گھوڑے کی پشت سے چپک گیا۔ پیچھے سے حیوانی غراہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ جانوروں نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اس وقت مجھے لگ رہا تھا کہ میں اس جنگل سے نہیں نکل سکوں گا اور بالآخر جانور مجھے بھی پکڑ کر مار دیں گے۔ جیسے انہوں نے ریڈ انڈین کو مار دیا تھا۔

لیکن میرا وقت پورا نہیں ہوا تھا اس لیے میں نہ جانے کب اور کیسے اس جنگل سے نکلنے میں کامیاب رہا... بلکہ میں نہیں میرا گھوڑا کامیاب رہا۔ وہی مجھے موت کے منہ سے بچا کر لایا۔ میں اپنے ذہن پر چھانے والی غشی سے لڑ رہا تھا لیکن جب میں نے محسوس کیا کہ میں جنگل سے باہر آگیا ہوں تو میں نے مزاحمت ترک کر دی اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔

جب مجھے ہوش آیا تو گھوڑا ایک ندی کے کنارے کھڑا سرسبز گھاس کھا رہا تھا۔ اس وفادار جانور نے میری بے بسی محسوس کر لی تھی اور تھکن کے باوجود بیٹھا نہیں تھا۔ پانی دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ میں اتر کر پانی کی طرف لپکا اور اس میں براہِ راست منہ ڈال دیا۔ سرد اور میٹھے پانی نے تیزی سے میرے حواس بحال کیے۔ صبح نمودار ہو رہی تھی۔ میں نے پیاس بجھا کر اپنی پسلی کا زخم دیکھا۔ خوش قسمتی سے جانور کا وار کاری نہیں تھا اور صرف اوپر کی کھال کٹی تھی۔ میں نے قمیص کا ایک ٹکڑا پھاڑ کر اسے زخم پر باندھ لیا۔ فی الحال میں اتنا ہی کر سکتا تھا۔ پانی

پی کر میں نے گھوڑے سے بندھی ایک تھیلی سے کچھ چنے نکال کر کھائے۔ اس دوران میں سورج کی روشنی پھیل گئی اور میں نے اس جگہ کو پہچان لیا۔ ہم اسی جگہ سے گزر کر جنگل کی طرف گئے تھے لیکن گھوڑا یقیناً مجھے کسی اور راستے سے لایا تھا ورنہ کلائیو اور بیجی مجھے ضرور دیکھ لیتے۔ اب مجھے واپس جانا تھا۔

جب روشنی اچھی طرح پھیل گئی اور گھوڑے نے آرام بھی کر لیا تو میں دوبارہ جنگل کی طرف روانہ ہوا۔

میں نے گھوڑے کو تیز دوڑانے سے گریز کیا کیونکہ میرے پاس بہت وقت تھا۔ میں کلائیو اور بیجی کو لے کر رات ہونے پر وہاں سے روانہ ہو سکتا تھا۔ جب تک کارا جا یہاں سرگرم عمل تھے، رات کے وقت کہیں رکنا ٹھیک نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد جنگل کے آثار نظر آنے لگے لیکن وہاں تک میں سہ پہر کو پہنچ پایا اور جب میں اس جگہ کے پاس پہنچا جہاں بیجی اور کلائیو کو چھوڑ کر گیا تھا تو مجھے وہاں باقاعدہ فوجی کیمپ نظر آیا اور جب مزید قریب پہنچا تو مجھے کیپٹن مائر کے ساتھی بھی نظر آ گئے۔ اسے میری آمد کی اطلاع پہلے ہی دے دی گئی تھی اس لیے جب میں کیمپ میں داخل ہوا تو وہ میرے استقبال کے لیے اپنے خیمے کے باہر موجود تھا۔ اس نے مجھے خوش آمدید کہا اور اپنے خیمے میں لے گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''تم کب آئے کیپٹن؟''

''ہم کل رات یہاں پہنچے ہیں۔'' وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ ''اور بروقت پہنچ گئے۔''

میں چونکا۔ ''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ ایک ریڈ انڈین لڑکی تمہارے کالے ساتھی کلائیو کا گلا کاٹ کر یہاں سے فرار ہونے والی تھی۔''

''بیجی؟'' میں نے بے یقینی سے کہا۔ ''وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔''

''اسے ہم نے کلائیو کی لاش کے پاس پکڑا تھا۔'' مائر نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ ''اگر اب بھی تمہیں یقین نہیں ہے تو میں تمہیں کلائیو کی لاش دکھا سکتا ہوں۔''

وہ مجھے ایک خیمے میں لایا۔ وہاں کلائیو کی لاش کمبل سے ڈھکی رکھی تھی۔ میں نے اس کا کٹا ہوا گلا دیکھا اور سمجھ گیا کہ یہ بھی کارا جا کے تیز ناخن کا کام ہے۔ میں نے مائر سے کہا۔ ''اسے ریڈ انڈین لڑکی نے قتل نہیں کیا ہے۔ وہ ہمارے ساتھ تھی اور تمہیں نہیں معلوم کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔''

بیجی کی صفائی پیش کرنے پر مائر کا موڈ خراب ہو گیا اور اس نے غرا کر کہا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ ان ریڈ انڈینز کے دماغ خراب ہو گئے ہیں اور مجھے ان کے دماغ ٹھیک کرنا آتا ہے۔''

''لڑکی کہاں ہے؟'' میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''لڑکی... اوہ ہاں، آؤ میں تمہیں اس سے ملواؤں۔''

مائر کا لہجہ مزید مسخرانہ ہو گیا اور وہ مجھے جنگل کے کنارے تک لے گیا۔ وہاں درختوں سے بیجی اور مائر کے قیدی ریڈ انڈین کی لاشیں جھول رہی تھیں۔ مائر نے ان کو پھانسی دے دی تھی۔ میں ان دونوں کو دیکھتا رہ گیا جو بے گناہ پھانسی چڑھ گئے تھے۔ میری آنکھیں جلنے لگیں اور میرا دل چاہا کہ پستول نکال کر مائر کا بھیجا اڑا دوں اور شاید میں ایسا ہی کرتا لیکن میرے ذہن میں ایک بہتر خیال آ گیا۔ مائر نے شاید دوسری بار پوچھا۔

''تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟''

''ساتھی۔'' میں نے چونک کر کہا اور پھر مائر کی طرف دیکھا۔ ''ان کی تلاش کے لیے تمہیں جنگل میں جانا ہوگا۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب تمہیں جنگل میں جا کر پتا چلے گا۔ وہ جنگل میں گئے تھے اور پھر واپس نہیں آئے۔''

''ہو سکتا ہے ریڈ انڈینز نے جنگل میں بھی کوئی شرارت کر رکھی ہو۔ خیر، میرے آدمی سب کو دیکھ لیں گے۔ اب تم کیا کرو گے؟''

''مجھے واپس جا کر انتظامیہ کو رپورٹ دینی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے بھی میں زخمی ہوں۔''

وہ خود بھی یہی چاہتا تھا کہ میں یہاں سے چلا جاؤں تاکہ وہ کھل کر اپنی من مانی کر سکے۔ میں نے آخری بار بیجی کی لاش دیکھی اور واپس آ گیا۔ جب میں گھوڑے پر سوار ہو کر کیمپ سے رخصت ہو رہا تھا تو سورج غروب ہونے کے قریب تھا اور جب مائر اور اس کے آدمی جنگل میں داخل ہوتے، حقیقت خود ان کے سامنے آ جاتی اور تب ان کے پاس فرار کا کوئی راستہ باقی نہ رہتا۔ ہاں قسمت کسی کا میری طرح ساتھ دیتی تو الگ بات تھی لیکن مجھے امید تھی کہ مائر کو اس کے ظلم کا بدلہ ضرور ملے گا۔ میں نے ایک فیصلہ اور کیا تھا کہ کارا جا کے بارے میں اپنی زبان بند رکھوں گا کیونکہ اگر میں نے مقامی انتظامیہ کو اس بارے میں بتایا تو اول تو کوئی یقین نہیں کرے گا اور اگر کر لیا تو میری شامت آئے گی اور اب میں کسی صورت یہاں دوبارہ نہیں آنا چاہتا تھا۔ پھر ایک مہینے کی بات تھی، کارا جا اپنی بھوک مٹا کر تین نسلوں کے لیے سو جاتے اور کم سے کم میری زندگی میں یہ قصہ دوبارہ نہیں اٹھتا۔

برف کی چوری

نجمہ مودی

چوری اور وہ بھی برف کی... ہاتھ نہ آئے تو اپنی جگہ پر پتھر، ہاتھ آجائے تو پگھل کر پانی... اور اسے چرانے والا پانی پانی... مگر یہ ذکر ہے نک ویلوٹ کا... جو ایسی بُری بے وقعت اور انہونی چوریاں کرتا ہے... اس بار اسے برف چرانے کی ذمے داری ملی ہے... وہ جس کام کا نمہ لیتا ہے اسے پورا ضرور کرتا ہے... لیکن کیسے... کہانی کی ساری جان یہی ہوتی ہے۔

نک ویلوٹ کا جنوری کی سردی میں سرمائی کارنامہ

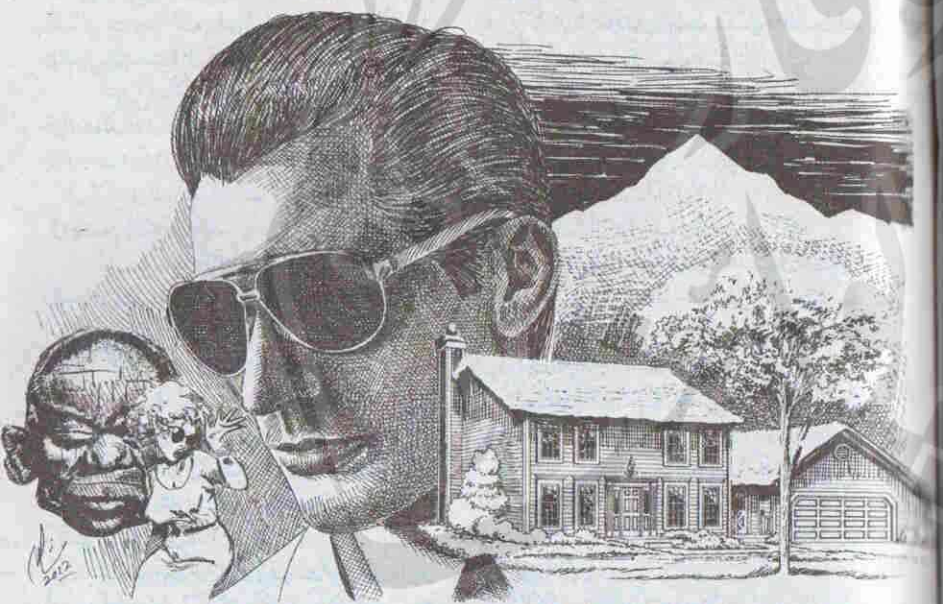

پتا نہیں کیسے گلوریا کو یہ شک ہو گیا کہ نک ویلوٹ دراصل امریکی حکومت کا خفیہ ایجنٹ ہے اور اپنی اس حیثیت کو چھپانے کے لیے کچھ غیر واضح سرگرمیوں میں مصروف رہتا ہے۔ یہ یقین ہوتے ہی گلوریا نے اس سے پوچھ گچھ کا سلسلہ بالکل ختم کر دیا بلکہ جب بھی نک کو کہیں جانا ہوتا، وہ بڑے شوق سے اس کا سوٹ کیس پیک کر دیتی۔

''کینیڈا میں تمہیں گرم کپڑوں کی ضرورت پڑے گی نک۔'' گلوریا نے ایک موٹا سا سویٹر سوٹ کیس میں رکھتے ہوئے کہا۔

''ارے! یہ کیا رکھ رہی ہو، آدھا سوٹ کیس تو اسی سے بھر گیا۔'' نک نے احتجاج کیا۔

''تو وہاں سردی میں ٹھٹھرنے کا ارادہ ہے کیا؟''

''سردی تو یہاں بھی ہے۔'' نک نے کھڑکی سے باہر برف سے ڈھکے ہوئے میدان کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''نکی! تم کتنے دن کے لیے جا رہے ہو؟''

اس نے شانے اچکائے اور بولا۔ ''زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کے لیے۔'' اس نے سوٹ کیس بند کر کے تالا لگا دیا اور گلوریا کو الوداعی پیار کرتے ہوئے کہنے ہی والا تھا کہ یوں سمجھ لو کہ ایک پہاڑی سے برف چرانے میں جتنے دن لگیں گے، بس اتنے دن میں وہاں رہوں گا پھر چلا آؤں گا مگر پھر اس نے خود کو روک لیا۔ یقیناً گلوریا بے چاری اس کی بات خاک بھی نہ سمجھ پاتی۔

☆☆☆

پال گیسپر... جس نے نک ویلوٹ کو مانٹریال کے شمالی علاقے میں آنے کی دعوت دی تھی، خاصا وجیہہ نوجوان تھا۔ پہاڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نک سے کہہ رہا تھا۔ ''یہ ہے میرا مسئلہ، برف کی کمی۔'' سامنے لارینشین کی پہاڑیوں پر برائے نام برف جمی نظر آ رہی تھی۔

گیسپر ایک خوش اطوار اور دلچسپ نوجوان معلوم ہوتا تھا اور وہ نک کو اس کا معاوضہ اسی وقت دینے کو تیار تھا۔ وہ فوراً ہی دوست بن گیا۔ ''تمہیں اپنے اسکائی (برف میں پھسلنے کا کھیل) کے میدان کے لیے برف چاہیے نا؟'' نک نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، اس بار یہاں سردی کا موسم بڑا واہیات رہا ہے۔ اتنی کم برف باری میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ اب سیزن کے صرف تین ہفتے رہ گئے ہیں، اگر یہ میرے ہاتھ سے نکل گئے تو میرے کاروبار کا بیڑا غرق ہو جائے گا۔''

''تمہارے پاس برف تیار کرنے کے آلات نہیں ہیں؟''

''مجھے کبھی ان کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ ہاں اگر اس سال میرا کاروبار تباہ ہونے سے بچ گیا تو میں اگلے سال یہ آلات ضرور خرید لوں گا۔''

نک نے ایک نظر سامنے برف سے محروم پہاڑیوں کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''تو تمہیں اتنی برف کی ضرورت ہے جو ان تمام ڈھلانوں کو ڈھانک دے... مگر اتنی برف ملے گی کہاں سے؟''

''ایڈمرل لیگ کے گھر سے۔ وہ یہاں سے دو میل دور رہتا ہے۔ اس کے مکان سے ملحقہ پہاڑی پر برف ہی برف ہے۔ وہ حصہ سورج کی تمازت سے محفوظ رہتا ہے اس لیے وہاں برف دیر تک جمی رہتی ہے۔''

''عجیب و غریب کام ہے۔'' نک بڑبڑایا۔ ''یہ تو صحیح ہے کہ ایڈمرل لیگ کے لیے یہ برف بیکار ہے مگر تمہارے لیے قیمتی ہے۔''

''اگر مجھے برف نہیں ملی تو میں بالکل دِوالیا ہو جاؤں گا۔ اسی لیے میں نے چالیس ہزار ڈالرز داؤ پر لگا دیے ہیں۔''

''بلاشبہ یہ میرے لیے ایک چیلنج ہے۔'' نک نے اعتراف کیا۔

''یہ خیال مجھے اخبار میں ایک خبر... پڑھ کر آیا تھا۔ سوئٹزرلینڈ میں چند میرے جیسے اسکائی میدان کے سرپھرے مالک ایک دوسرے کی برف چراتے ہیں۔ چنانچہ جن کے پاس برف ہوتی ہے، وہ رات کو چوکیدار مقرر کر لیتے ہیں۔ جب میں نے یہ خبر پڑھی تو تمہارا خیال ذہن میں آیا کہ تم ایسی چیزیں چراتے ہو جن کی کوئی قیمت نہیں ہوتی تو میں نے تمہیں فون کر دیا۔''

''مگر ان ڈھلانوں پر بچھانے کے لیے تو سو ٹرک برف درکار ہوگی تاکہ اس پر اسکائنگ کی جا سکے۔''

''سو نہیں دو سو ٹرک کہو۔'' گیسپر نے تصحیح کی۔ ''پہاڑی کے دوسری طرف ایک ڈھلان ہے جس کے نیچے ایک سڑک ہے، اگر تم برف وہاں تک پہنچا دو تو میں اسے اپنے بلڈوزر سے یہاں تک لے آؤں گا۔''

''یہ برف تو ایڈمرل لیگ کی ملکیت ہوگی؟''

''ہاں، اس کے علاوہ برف کہیں اور ہے بھی نہیں۔''

''اچھا میری بات سنو۔'' نک نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ برف ایڈمرل کے لیے بیکار ہے مگر تمہارے لیے اس کی بہت اہمیت ہے تو تم جا کر ایڈمرل سے سودا کیوں نہیں کر لیتے... مجھے یقین ہے کہ چالیس ہزار ڈالرز سے کہیں کم میں سودا ہو جائے گا۔''

گیسپر نے مایوسی سے سر ہلا دیا۔ ''تم ایڈمرل سے واقف نہیں ہو ابھی۔ میں کہہ تو رہا ہوں کہ تمہیں اس کے لیے اتنی محنت کرنا پڑے گی کہ تم چالیس ہزار ڈالرز کے جائز حق دار ثابت ہو جاؤ گے۔''

''کیا بڈھا کچھ نک چڑھا ہے؟''

''نہیں تو... مگر ریٹائرمنٹ سے پہلے کافی عرصہ اس نے مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ بعید میں گزارا ہے۔ اس کے پاس حنوط شدہ سروں کا خاصا ذخیرہ ہے اور لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ ان سے باتیں کرتا رہتا ہے۔''

''ہوں! اب سمجھا مگر سچ سچ بتاؤ کہ تم وہاں کیوں نہیں جانا چاہتے؟''

پال گیسپر مسکرا دیا۔ ''تو تم انسانی نفسیات کے بھی ماہر ہو نک۔ بہت خوب۔ بات دراصل یہ ہے کہ ایڈمرل کی بیٹی میری دوست ہے۔''

''یہ تو مجھے خود ہی اندازہ لگا لینا چاہیے تھا۔ خیر... تو مجھے جن کے قبضے سے اس پری کو بھی آزاد کرانا ہے کیا؟''

''نہیں بھئی۔'' اس کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ ''تم مجھے برف لا دو، لڑکی کو تو میں خود لے آؤں گا۔''

☆☆☆

پہلی دوپہر نک ویلوٹ نے ایڈمرل کے گھر اور اس کے آس پاس کے علاقے کا جائزہ لیتے ہوئے گزار دی۔ یہ سوئس طرز کا تین منزلہ مکان تھا۔ نک کا جی چاہ رہا تھا کہ اسے اندر سے بھی دیکھے۔

مکان کے سامنے ایک لمبا سا احاطہ تھا جو سڑک سے مل گیا تھا۔ یہ احاطہ کوئی دو سو فٹ لمبا تھا۔ احاطے کے درمیان، مکان سے نزدیک ایک توپ لگی ہوئی تھی جو یقیناً کسی جہاز سے لا کر لگائی گئی ہوگی۔ توپ کے قریب ایک اسٹول لگا ہوا تھا جس پر چھوٹے چھوٹے نیوی کے بے شمار جھنڈے لگے ہوئے تھے۔ ان جھنڈوں سے نک نے یہ اندازہ لگایا کہ لیگ نے جنگ کے دوران میں برطانوی بحریہ کے لیے خدمات انجام دی ہوں گی۔

سڑک کے پار مکان کے بالکل مقابل ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی جو برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ نک نے کچھ دیر اس پہاڑی کا جائزہ لیا اور پھر مانٹریال چلا گیا۔ جب وہ اگلے روز دوپہر کو واپس آیا تو اس کی مطلوبہ شے اس کے پاس تھی۔

کار سے اتر کر وہ احاطے میں چلا آیا اور برج پر لگی توپ کے چاروں طرف گھوم پھر کر اسے دیکھنے لگا۔ اسی لمحے ایک عورت مکان کے اندر سے نکلی۔ اس کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ ٹینس کا لباس پہنے ہوئے تھی جس سے اس کے متناسب جسمانی خطوط صاف دکھائی دے رہے تھے۔

''کہیے کیا بات ہے؟'' اس نے قریب آ کر پوچھا۔ وہ برطانوی انداز کی انگریزی بول رہی تھی مگر نک نے محسوس کیا کہ اس کے لہجے میں بے حد ہلکا سا فرانسیسی رنگ بھی جھلکتا ہے۔

''کچھ نہیں، ذرا سیر کر رہا ہوں۔ اس علاقے میں اتنی برف کہیں اور نظر نہیں آتی۔''

وہ بڑے خوب صورت انداز میں مسکرائی۔ ''اس بار سردی کچھ کم پڑی ہے مگر میں یہ بتا دوں کہ یہ پرائیویٹ پراپرٹی ہے۔''

''اوہ! آپ کا مکان تو بہت شاندار ہے۔''

''یہ میرے ڈیڈی کا بنوایا ہوا ہے۔''

نک نے ایک نظر اس کی برہنہ پنڈلیوں پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اتنی سردی میں آپ ٹینس کھیلیں گی؟''

''ٹینس کورٹ چاروں طرف سے بند ہے... لیکن آپ ابھی تک یہاں کھڑے ہیں۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ یہ پبلک سیر گاہ نہیں ہے۔''

ایک فربہ شخص سوئٹر اور ٹینس کا مخصوص لباس پہنے اندر سے نکلا۔ وہ اپنے ہاتھ میں ریکٹ گھماتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا۔ اس کی پنڈلیاں اور بازو بالوں سے بھرے ہوئے تھے۔

''کیا یہ شخص تمہیں پریشان کر رہا ہے مارشا؟''

''نہیں تو...'' مارشا نے بدستور نک پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔ ''یہ تو برف دیکھ کر خوش ہو رہا ہے بے چارہ۔''

''بات صرف اتنی نہیں ہے۔'' نک نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے آپ کے ڈیڈی سے بزنس کی بات کرنی ہے، ذرا مجھے ان کے پاس لے چلیے۔''

مارشا لیگ اور اس کے ٹینس کے ساتھی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ''ڈیڈی کسی سے ملنا پسند نہیں کرتے۔'' مارشا نے سرد لہجے میں کہا۔

''تو ذرا میرا پیغام ان تک پہنچا دیجیے۔''

''کیسا پیغام؟'' مرد نے پوچھا۔

''ان سے کہیے گا کہ میں ایک چینی سر کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

مارشا کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ ''جاؤ کہہ دو۔'' مارشا نے مرد سے کہا اور وہ بغیر ایک لفظ کہے واپس چلا گیا۔

''یہ آپ کا ملازم ہے؟'' نک نے پوچھا۔

''کون؟ ہیری پائن... یہ ڈیڈی کا سیکریٹری ہے اور میرا ٹینس کا پارٹنر۔ مگر ہاں یہ چینی... سر کا کیا قصہ ہے؟''

''یہ تو اورات میں سے ہے۔ مانٹریال کے ایک ڈیلر نے مجھے بتایا تھا کہ ایڈمرل لیگ کو ایسی اشیا کا بے حد شوق ہے۔''

یہ سنتے ہی مارشا نے اسے اشارہ کیا۔ ''میرے ساتھ آ جائیے۔'' وہ مکان کی طرف چل دی۔ شاید اسے باپ کی منظوری کے انتظار کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

وہ دونوں ٹینس کورٹ سے گزرتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھے۔ ہال کے پاس دو گیندیں پڑی تھیں جو اس

امر کا ثبوت تھیں کہ کچھ دیر پہلے یہاں کھیل ہو رہا تھا۔ باہر سے مکان جتنا شاندار نظر آتا تھا، اندر سے اسے دیکھ کر اتنی ہی مایوسی ہوتی تھی۔ مکان میں قیمتی نوادرات اور آرائشی اشیا بھری پڑی تھیں مگر انہیں اس طرح رکھا گیا تھا جیسے یہ کوئی نیلام گھر ہو۔ اس سے مکینوں کی بدذوقی کا اظہار ہوتا تھا۔

''ڈیڈی نے اپنی ملازمت کے دوران میں قسم قسم کی اشیا اکٹھی کی ہیں۔'' مارشا نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''یقیناً۔ یقیناً۔''

''مگر انہیں کسی چینی آدمی کے سر کی ضرورت نہیں پڑی اور نہ آئندہ پڑے گی۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔ شاید اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کے باپ کے کانوں تک یہ آواز نہ پہنچ جائے۔

لیکن اس نے شاید سن ہی لیا، ایک دروازہ کھلا اور ایک دبلا پتلا بوڑھا شخص نیوی کے یونیفارم کی جیکٹ پہنے باہر نکلا۔ ہیری پائین بھی اس کے پیچھے تھا۔ اب اس کے ہاتھ میں ریکٹ نہیں تھا۔

''خوب...خوب! میں ہی ایڈمرل لیگ ہوں۔ آپ مجھ سے ملنا چاہتے تھے؟''

''جی ہاں، نک ویلوٹ میرا نام ہے۔'' نک نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا جسے ایڈمرل نے فوراً اپنے سرد ہاتھ میں دبا لیا۔ ''آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔''

''یہ میری بیٹی مارشا ہے اور یہ میرے سیکریٹری اور ساتھی ہیں ہیری پائین۔''

''جی ہاں، میں ان دونوں سے مل چکا ہوں۔''

ایڈمرل لیگ ایک سبز رنگ کی پرانی سی کرسی پر بیٹھ گیا جو یقیناً اس کی محبوب کرسی معلوم ہوتی تھی۔ ہیری پائین ایک اسٹول پر ٹک گیا اور بوڑھا ایڈمرل بولا۔ ''ہاں جناب! اب بتائیے کون سا سر ہے آپ کے پاس؟''

مارشا اور پائین کے پریشان چہروں کو نظر انداز کرتے ہوئے ویلوٹ نے کہا۔ ''چند سال پہلے میں مشرق کی طرف گیا تھا۔ وہاں سے مجھے چین کے ایک دانشور کا حنوط شدہ سر ملا جسے بغاوت کے زمانے میں قتل کر دیا گیا تھا۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ یہ سر کبھی کبھار پیش گوئیاں بھی کرتا ہے۔ گو مجھے اس پر یقین نہیں ہے۔''

ایڈمرل لیگ نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''اس امکان کو یکدم مسترد نہ کریں جناب۔ کئی قدیم روایتوں میں سروں کے بولنے کا ذکر موجود ہے۔ لیباس کے بارے میں جو پیش گوئی کی گئی تھی، وہ بھی کسی حنوط شدہ سر کی تھی اور اس مشہور طبیب دیلبان کا سر بھی موت کے بعد کافی عرصے تک زندہ رہا تھا۔ انقلاب فرانس سے ذرا پہلے ایک فرانسیسی شخص مائیکل نے بولتے ہوئے سروں کا مجموعہ فرنچ اکیڈمی برائے سائنس کو پیش کیا تھا۔''

''ان سروں میں تو میکانی آلات لگا دیے جاتے ہیں۔'' نک نے منہ چڑھا کر کہا۔

''ہاں، مگر آپ کے پاس تو کسی چینی کا سر ہے۔ وہ تو سنا ہے واقعی حنوط شدہ سر ہوتے ہیں۔''

''جی ہاں۔''

''تو ذرا مجھے دکھایئے۔ آپ کے پاس اس وقت وہ سر ہے نا؟''

''ضرور دکھاؤں گا مگر اس کے بدلے آپ مجھے کیا دکھائیں گے؟''

''کیا مجھے بھی کچھ دکھانا پڑے گا؟''

''کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ بولتے ہوئے سر جہاں بھی پیش کیے جاتے ہیں، وہاں اپنے اپنے ذخیرے کا مظاہرہ دونوں جانب سے ہوتا ہے۔ یہ بہت قدیم روایت ہے۔''

''آپ خاصے پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہیں جناب۔''

نک تیار ہو کر آیا تھا اور یوں بھی اس کے ذہن میں اس قسم کی معلومات کا ایک خزانہ جمع تھا۔ ''پہلے مجھے اپنا ذخیرہ دکھایئے۔ یوں بھی مجھے آپ کا پتا ایک ڈیلر نے دیا تھا۔ میں اس کی بات پر کیسے اعتبار کر سکتا ہوں، جب تک اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لوں۔''

ایڈمرل اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''بہت اچھا جناب! آیئے میں آپ کو دکھاتا ہوں۔''

نک اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ''باہر ایک زبردست بحری توپ لگی ہوئی ہے، کیا وہ فائر بھی کرتی ہے؟''

''کیوں نہیں۔ یہ تین انچ دہانے کی توپ ہے۔ ایک تباہ کن جہاز پر لگی ہوئی تھی۔ اس سے بحری جہازوں پر بھی نشانہ لگایا جا سکتا تھا اور بطور اینٹی ائرکرافٹ بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ میرے پاس اس کے گولے بھی ہیں۔''

''اس توپ کی موجودگی سے خطرہ تو نہیں ہے؟''

''نہیں، کم از کم ہمارے گھر کو تو نہیں ہے کیونکہ اسے ہمارے گھر کی طرف نہیں گھمایا جا سکتا۔ یہ سڑک کے پار پہاڑی پر نشانہ لگا سکتی ہے۔ دو سال پہلے ایک رات میں نے

اسے چلایا تو قصبے کی پولیس مجھ پر چڑھ دوڑی لیکن ظاہر ہے یہ پہاڑی بھی میری ملکیت ہے لہٰذا انہوں نے بس قصبے کا سکون درہم برہم کرنے کے جرم میں جرمانہ عائد کر دیا۔''

''اچھا۔'' نک نے کہا۔

اسی لمحے ایک لڑکی بھاگتی ہوئی زینے سے نیچے اتری۔ وہ جینز اور ٹی شرٹ پہنے ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے باہر جا رہی تھی کہ مارشا نے اسے آواز دی۔ ''میر یلین! دیکھتی نہیں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ بھاگی چلی جا رہی ہو۔''

میر یلین نے رک کر پیشانی سے بالوں کو ہٹایا۔ نک کے اندازے کے مطابق اس کی عمر اٹھارہ سال رہی ہوگی۔ یقیناً وہ اپنی بڑی بہن کے لیے ان دنوں مسئلہ بنی ہوئی ہوگی۔

''میرا نام میر یلین ہے۔'' وہ بولی اور ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھا دیا۔

''میرا نام نک ہے۔ تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔''

''کہاں جا رہی ہو تم؟'' مارشا نے سختی سے سوال کیا۔

''یونہی ذرا باہر گھومنے۔ اتنا پیارا موسم ہے نا۔''

''بہت اچھا مگر زیادہ دور نہیں جانا۔ کھانے پر واپس آ جانا۔ کیا سمجھیں؟''

نک نے کم سن لڑکی کو دروازے کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا۔ ''تمہیں اپنی بہن کے لیے ماں کا کردار ادا کرنا پڑتا ہوگا۔'' نک نے مارشا سے کہا۔

''جی ہاں، کیا کروں...''

ایڈمرل لیگ نے جیسے خفگی سے کہا۔ ''میر یلین نے آنے میں بہت دیر کر دی۔ اس کی پیدائش کے دوران میری بیوی کا انتقال ہو گیا۔''

''اور تب ہی سے ڈیڈی نے ان بولتے ہوئے سروں کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔'' مارشا نے وضاحت کی۔

ایڈمرل اب زینے چڑھ رہا تھا۔ اس کے انداز میں بلا کی پھرتی تھی۔ تیسری منزل پر ایک مقفل کمرے کے سامنے پہنچ کر وہ یوں رک گیا جیسے کوئی سائنسداں، کائنات کے راز کو سب کے سامنے فاش کرنے والا ہو۔

''ہوشیار!'' اس نے دروازہ کھولتے ہوئے اعلان کیا۔ ''میرے بولتے ہوئے سر ظاہر ہوتے ہیں۔''

اس چھوٹے سے کمرے میں تین اطراف میں الماریاں بنی ہوئی تھیں جن میں بہت سارے حنوط شدہ سر رکھے ہوئے تھے۔ یہ سر مختلف سائز اور مختلف بناوٹ کے تھے۔ کچھ تو ایمیزون کے جنگلوں کے وحشی قبیلے کے مخصوص سکھائے ہوئے سر تھے جو سکھانے کے عمل کے دوران بے حد چھوٹے کر دیے جاتے ہیں اور کچھ عام سائز کے تھے۔ زیادہ تر چہرے مشرقی تھے۔ زیادہ سر مردانہ تھے۔ البتہ کچھ نسوانی بھی نظر آ رہے تھے۔

''کچھ سر تو میں نے جنگل سے اکٹھے کیے ہیں۔'' ایڈمرل نے وضاحت کی۔ ''لیکن زیادہ تر سر میں نے مشرقِ وسطیٰ میں اپنی ملازمت کے دوران حاصل کیے ہیں۔ عرب ممالک میں اب بھی زیادہ تر گردن زنی کا رواج ہے۔'' وہ ایک سر کے پاس رک گیا جس کی جلد کی رنگت اوروں کے مقابلے میں اجلی تھی۔

''یہ سر فرانس میں گلوٹین سے کاٹ دیا گیا تھا۔''

''بہت عمدہ۔'' نک نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''مجھے تو بڑی کراہیت آتی ہے۔'' مارشا نے دروازے سے کہا۔ ''اور پھر یہ سر باتیں بھی نہیں کرتے۔ ڈیڈی کو خیال میں ان کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔''

ایڈمرل نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے نک سے پوچھا۔ ''اچھا! اب اپنا سر لایئے جناب۔''

''وہ میری کار میں پڑا ہے، ابھی لاتا ہوں۔''

نک نیچے اتر کر باہر آ گیا۔ سورج اس کے سامنے چمک رہا تھا۔ میر یلین کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ نک حیران ہو کر سوچنے لگا کہ کیا اس کے پاس اپنی کار ہے جو وہ فوراً یہاں سے اوجھل ہو گئی۔

نک نے کرائے پر لی ہوئی گاڑی کی ڈکی سے چمڑے کا ایک ڈبا نکالا۔ نک نے یہ ڈبا مانٹریال سے لیا تھا۔

جب وہ واپس آیا تو ہیری پائین دروازے پر کھڑا تھا۔ ''مسٹر لیگ کو ہم نے بڑی مشکل سے کنٹرول کیا تھا اور اب تم یہ سر لے کر آ پہنچے۔''

''کیا مطلب؟'' نک مسکرا دیا۔ ''مجھے یہ سب کیا معلوم۔ میں تو آج پہلی بار یہاں آیا ہوں۔''

ایڈمرل لیگ نیچے نشست گاہ میں آ چکا تھا۔ مارشا چائے بنانے لگی اور ایڈمرل، نک کو ڈبا کھولتے ہوئے دیکھتا رہا۔ نک نے ڈبا کھول کر چینی سر نکالا جس میں چینیوں کی مخصوص چٹیا بھی لٹک رہی تھی۔ ایڈمرل یک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے چشمہ لگا کر سر کو غور سے دیکھا لیکن جب اس نے ہاتھ بڑھا کر سر کو چھونا چاہا تو نک نے فوراً اسے پیچھا ہٹا لیا۔

''نہیں پلیز، اسے ہاتھ نہ لگایئے۔ یہ بہت نازک ہے۔''

''کیا یہ واقعی کسی دانشور کا سر ہے؟'' ایڈمرل لیگ کی مارے اضطراب کے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ ''کیا یہ باتیں کرتا ہے؟''

نک کچھ ہچکچایا۔ ''ہاں، اس نے مجھ سے باتیں کی ہیں مگر ذرا معتدل موسم میں۔ غالباً یہ وانشور جنوبی چین کا باشندہ تھا، جہاں برف باری کبھی ہوئی بھی نہ ہوگی۔''

''برف باری؟'' بوڑھے ایڈمرل کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

''جی ہاں، کھڑکی سے باہر برف پوش پہاڑی نظر آرہی ہے نا۔ مجھے یقین ہے کہ جب تک یہ برف پگھل نہیں جائے گی، اس وقت تک یہ سرِ بات نہیں کرے گا۔''

''برف کے پگھلنے میں تو ایک مہینا لگ جائے گا۔ دراصل اس پہاڑی پر سورج کی تمازت پہنچ ہی نہیں پاتی۔''

نک نے مایوس ہوکر شانے ہلائے۔ ''تو پھر میں ایک ماہ بعد آپ کے پاس آؤں گا۔''

لیکن ایڈمرل لیگ تو انکار سننا جانتا ہی نہیں تھا۔ ''مجھے اس سے غرض نہیں کہ یہ بولتا ہے یا نہیں، میں تو اسے لے کر رہوں گا۔ آپ اسے فروخت کریں گے؟''

''اس کے لیے شرط یہ ہے کہ یہ سر مجھے خود اس امر کی اجازت دے۔''

''لیکن یہ سر تو موسم بہار تک خاموش رہے گا۔''

''جی ہاں۔'' نک نے اپنے لہجے میں اداسی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

''اچھا! تو پھر میں کوئی ترکیب سوچتا ہوں۔'' ایڈمرل نے کہا۔ ''آپ یہیں ٹھہریں، رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں، جب تک کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔''

نک نے مارشا اور ہیری پائین کی طرف دیکھا۔ ان کے چہروں پر پریشانی کے آثار تھے یا یہ خوف کا تاثر تھا۔ نک نے ٹھہرنے کا فیصلہ کرلیا۔

اس گھر میں جو کچھ ہو رہا تھا، وہ باہر پڑی برف سے زیادہ پراسرار تھا۔

☆☆☆

نک نے اندر آتے وقت باہر ٹیلی فون رکھا دیکھا تھا۔ اس نے پال گیسپر کو فون کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ممکن ہے کوئی ایکسٹینشن سے ان کی گفتگو سن لے... لیکن اس کا خیال تھا کہ اس وقت وہ سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

''پال! میں نک ویلوٹ بول رہا ہوں۔''

''تم کہاں ہو؟''

''اسی مکان میں... سب کچھ ٹھاک ٹھاک ہے۔''

''ڈیلیوری کب ہوگی؟''

''بہت جلد۔ میں لڑکی سے ملا تھا۔ اب مجھے تمہاری دلچسپی کی وجہ سمجھ میں آگئی۔''

''ویلوٹ میں...''

''میں بند کر رہا ہوں۔'' نک نے دروازہ کھلنے کی آواز سن کر جلدی سے فون رکھ دیا اور مڑ کر دیکھا تو ہیری پائین اس کی طرف آرہا تھا۔

''میں تمہیں تلاش کر رہا تھا ویلوٹ۔''

''میں تو یہیں ہوں۔'' نک نے مسکرا کر کہا۔

پائین نے جیب سے ہاتھ باہر نکال لیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ریوالور چمک رہا تھا جس کی نال نک کے پیٹ کی جانب تھی۔ ''مگر ہم تمہیں یہاں نہیں دیکھنا چاہتے۔ تم فوراً اپنا سر اٹھاؤ اور یہاں سے دفعان ہوجاؤ۔ سمجھ گئے؟''

''نہیں... میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔''

پائین نے ایک گہری سانس لے کر ریوالور ذرا سا اوپر اٹھایا۔ ''تم مجھے کوئی عیار آدمی معلوم ہوتے ہو۔ تم ایڈمرل کو لوٹنے کی نیت سے آئے ہوگے... مگر ہم خاموش نہیں بیٹھیں گے۔''

''یقین کرو میں...''

لیکن ہیری پائین اب زیادہ انتظار نہیں کرسکتا تھا، اس نے ریوالور کا دستہ گھما کر نک کے سر پر دے مارا۔ اگلے ہی لمحے وہ دونوں نیچے پڑے تھے۔ نک اس طاقتور شخص کی گرفت کے آگے خود کو لاچار محسوس کر رہا تھا مگر اب وہ پھنس چکا تھا۔ پائین اس کے اوپر سوار تھا اور ریوالور اٹھا کر اس کے سر پر مارنے والا تھا کہ بیرونی دروازے سے ایک آواز ابھری۔

''کیا ہو رہا ہے؟ میں بھی آجاؤں؟''

یہ میریلین لیگ تھی۔ وہ اب بھی جینز اور شرٹ پہنی ہوئی تھی مگر ایسا لگتا تھا جیسے وہ ہیری پائین سے نمٹنا جانتی ہے۔ پائین کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس نے ریوالور نیچے کرلیا اور بولا۔ ''بے بی! یہاں تمہارا کوئی کام نہیں ہے۔ اندر جاؤ۔''

''میں بچی نہیں ہوں۔ اترو اس کے اوپر سے۔'' اس نے دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے قریب رکھا ریکٹ اٹھالیا اور پائین کی طرف لپکی۔

وہ جلدی سے ہٹ گیا اور ریوالور جیب میں ڈال لیا۔

نک دھیرے دھیرے اٹھا اور کپڑے جھاڑنے لگا۔ پائین دوبارہ اندر چلا گیا۔ اس کے اندر جاتے ہی نک بولا۔ ''زندگی میں پہلی بار ایک اٹھارہ سالہ لڑکی کا شکریہ ادا کرنا پڑ رہا ہے کہ اس نے میری مدد کی۔''

''میں سترہ سال کی ہوں۔'' میریلین نے تصحیح کی۔

''مگر میں اپنی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔ آپ کو بھی یہاں ہوشیار رہنا چاہیے۔'' اس نے ریکٹ دوبارہ اچھال دیا۔ ''اس کے علاوہ پال نے بھی مجھے ہدایت کی تھی کہ تمہاری نگہبانی کروں۔''

''پال؟'' نک کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ''پال گیسپر نے؟''

''ہاں ہاں... میں اس کے میدان میں اسکائنگ کرنے جاتی ہوں مگر آج کل تو برف ہی نہیں ہے۔''

''مگر جب پال نے ذکر کیا تھا تو میں سمجھا تھا کہ...''

''آپ مارشا کو سمجھے ہوں گے۔ کتنی عجیب بات ہے۔ مارشا کو تو اسکائنگ سے چڑ ہے اور پال گیسپر انہیں پسند نہیں آسکتا۔''

''تو یہ ہیری پائین کیا شے ہے؟ وہ ریوالور کیوں لیے پھرتا ہے؟ وہ اور مارشا کس چکر میں ہیں؟''

''یہ تو میں نہیں جانتی... مگر ان کی نیت اچھی نہیں ہے۔ انہوں نے ڈیڈی کو بالکل قید کرکے رکھا ہوا ہے۔ کم از کم مجھے تو یا دنہیں کہ انہوں نے ڈیڈی کو کبھی باہر نکلنے کا موقع دیا ہو۔ پہلے تو میں بورڈنگ میں تھی مگر اب واپس آئی ہوں تو حالات اور خراب نظر آتے ہیں۔''

''یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہے۔ جادوگر کبھی مقید نہیں کیے جاسکتے مگر...''

''ڈیڈی بے چارے ایک بوڑھے اور بے ضرر آدمی ہیں۔ ان کے پاس بحری مہمات کی کہانیوں اور ان عجیب و غریب سروں کے سوا کچھ نہیں ہے۔''

''تمہیں معلوم ہے گیسپر نے مجھے کیوں یہاں بھیجا تھا؟''

''ہاں، شاید برف کا کچھ قصہ ہے۔''

''بالکل ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ڈیڈی کی کوئی قیمتی چیز چرانے نہیں آیا ہوں۔''

''تو پھر میری بہن اور ہیری آپ سے خوف زدہ کیوں ہیں؟''

''یہ تو مجھے خود بھی نہیں معلوم۔''

وہ دونوں اندر آگئے۔ ہال میں ایڈمرل لیگ سے ان کی مڈبھیڑ ہوگئی۔

''ہم خوامخواہ وقت ضائع کر رہے ہیں جناب! کچھ آپ ہی بتادیجیے کہ میں یہ سر کس طرح حاصل کرسکتا ہوں؟''

نک نے کھڑکی سے باہر برف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بس اس برف کو یہاں سے ہٹا دیجیے، بات ختم ہو جائے گی۔''

''مگر کیسے جناب! یہ برف ایک دم تو غائب نہیں ہو جائے گی؟''

''ہوبھی سکتی ہے۔'' نک نے کہا۔ ''میں آپ کو ترکیب بتاؤں۔''

بوڑھے آدمی نے سر ہلا دیا۔ اس کی انگلیاں جیکٹ پر لگے سنہری تمغے سے کھیل رہی تھیں۔ نک کو اس لمحے اس پر بڑا رحم آیا۔

''توپ کے ذریعے۔'' نک نے کہا۔ ''آپ کے احاطے میں جو تین انچ دہانے کی توپ نصب ہے، اس سے پہاڑی پر ایک گولا پھینکیے جیسے آپ نے دو سال پہلے پھینکا تھا، ساری برف اڑ جائے گی۔ جو ڈھلان پر رہ جائے گی، وہ فوراً پگھل جائے گی۔''

ایڈمرل نے الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا اور نک نے معصوم سی صورت بنا کر کہا۔ ''بس یہی ایک طریقہ ہے۔''

ایڈمرل نے بے یقینی سے الماری کی طرف دیکھا جہاں گولے رکھے تھے اور بولا۔ ''پتا نہیں لیکن مقامی پولیس پھر آدھمکے گی اور مجھ پر جرمانہ عائد کردے گی۔''

''تو کیا ہوا؟ آپ کو چینی سرتو مل جائے گا۔'' نک نے اسے یقین دلایا۔

میریلین نے بھی تائید میں سر ہلایا تو ایڈمرل نے کہا۔ ''بیٹی! جاؤ اوپر سے بھاگ کر الماری کی چابی لے آؤ۔ وہ اوپر میری میز کی دراز میں رکھی ہے۔''

چند منٹ بعد جب وہ الماری کھول رہا تھا تو مارشا لیگ آگئی۔

''میں اس برف کو ہٹا رہا ہوں تاکہ یہ سر مجھے مل جائے۔''

مارشا نے غضب ناک نظروں سے نک کی طرف دیکھا۔ ''کیوں؟ تم باز نہیں آئے اپنی حرکتوں سے؟''

''آپ گھبرائیں نہیں۔ اگر پولیس آئی تو میں اس سے نمٹ لوں گا۔''

بوڑھے ایڈمرل نے ایک کاغذ میں لپٹا ہوا گولا نک کی طرف بڑھایا۔ ''دو تین ہی گولے رہ گئے ہیں۔''

''بس ایک ہی کافی ہے۔''

''یہ نہیں ہوسکتا۔'' مارشا چیخی۔

مگر نک گولا لے کر باہر جاچکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایڈمرل اپنی توپ کی باقاعدہ صفائی وغیرہ کرواتا رہتا ہوگا۔

یہ خیال صحیح نکلا۔ اس نے گولا توپ کے اندر ڈال کر دہانے میں سے سامنے پہاڑی کا جائزہ لیا۔

پیچھے سے میریلین کے چلا کر خبردار کرنے کی آواز آئی۔ نک نے بروقت سر ہٹا کر پائین کا وار بچا لیا۔ اس نے ایک ہاتھ پائین کے ریوالور والے ہاتھ پر مارا اور دوسرے ہاتھ سے توپ چلا دی۔ ایک زوردار دھماکا ہوا، جس کی گونج کافی دور تک پہاڑی کے چاروں طرف سنائی دیتی رہی۔

نک نے دیکھا کہ گولہ جا کر پہاڑی کی چوٹی سے ٹکرایا اور پھر چاروں طرف سفید سفید برف پھیل گئی۔ پوری پہاڑی جیسے حرکت میں آ گئی تھی۔ برف کے تودے تیزی سے نیچے گر رہے تھے اور اپنے ساتھ درختوں کو جڑوں سے اکھاڑتے ہوئے لیے جا رہے تھے۔

''اوہ خدایا!'' مارشا چلائی۔ ''ساری برف سڑک پر جمع ہو رہی ہے۔''

واقعی برف سڑک پر گر رہی تھی۔ برف کی بڑی بڑی گیندیں ایڈمرل کے احاطے میں بھی گر رہی تھیں۔

''شکر کرو بچ گئے، ورنہ ابھی ہم سب مارے جاتے۔'' ہیری غرایا۔ ''تم بہت احمق ہو ویلوٹ۔''

''لو! اب سڑک بالکل بند ہو گئی۔'' مارشا نے کہا۔

ایڈمرل خود بھی خاصا ناخوش نظر آ رہا تھا۔ ''برف تو ہٹنے کے بجائے اور قریب آ گئی، اب تو وہ سر بالکل بات نہیں کرے گا۔''

لیکن نک ویلوٹ مسکرا رہا تھا۔ وہ اس طویل بازی میں جیت چکا تھا۔ برف وہیں آ کر جمع ہو رہی تھی جہاں وہ چاہتا تھا۔ بس اسے اب اس برف کو یہاں سے ہٹانا تھا۔

☆☆☆

شام کو جب سورج پہاڑیوں کے پیچھے غروب ہو رہا تھا، مقامی انتظامیہ کے ٹرک اور کدالیں آ گئیں۔ آگے آگے پولیس کی کار تھی۔ پولیس افسر نے نک سے درشت لہجے میں کہا۔ ''تمام سڑک بند ہو گئی ہے۔ اب میرے عملے کو رات بھر کام کرنا پڑے گا۔ یہ کس کی کارستانی ہے؟''

نک نے معصومیت سے کہا۔ ''میرے خیال میں برف پگھلنے کا موسم آ گیا ہے مگر اس بار کچھ جلدی آ گیا... ہے نا؟''

''ایڈمرل لیگ کہاں ہیں؟'' افسر نے مکان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ تو بیمار ہیں۔''

''اس بڈھے کا بھی دماغ خراب ہے۔ اکثر اپنی توپ سے فائر کرتا رہتا ہے۔''

''کیا واقعی؟''

افسر کی آنکھیں کچھ سوچنے لگیں۔ ''آج اس نے توپ تو نہیں چلائی؟''

''نہیں تو۔ میں تو سارا دن یہیں تھا۔ وہ تو توپ کے نزدیک بھی نہیں آئے۔'' نک نے جواب دیا۔

جب افسر چلا گیا تو میریلین نک کے پاس پہنچ گئی۔

''واہ واہ! خوب بھگایا... مگر اب کیا ہو گا؟''

''ہو گا کیا؟ ہم اس ساری برف کو گیسپر کے میدان تک پہنچا کیں گے۔''

''واقعی؟ مگر کیسے؟''

''تم دیکھتی جاؤ۔''

رات ہو چلی تھی۔ بلڈوزر نے پہلے ٹرک میں برف بھر دی تھی۔ نک سیدھا ٹرک ڈرائیور کے پاس پہنچا۔ ''دیکھو میرے پاس کیا ہے؟''

''کیا ہے؟''

''سو ڈالر کا نوٹ۔ ذرا مجھے اپنی جیکٹ اور ٹوپی دے دو۔ میں تمہارا ٹرک چلاؤں گا۔''

''مگر کیوں؟''

''مجھے ٹرک چلانے کا بڑا شوق ہے مگر لکھ پتی ہونے کی وجہ سے اس کا موقع ہی نہیں مل سکا۔''

ڈرائیور نے نوٹ لے لیا۔

''تم برف کہاں لے جا رہے تھے؟''

''دریا میں۔ ہم ہمیشہ یہی کرتے ہیں کچھ برف سڑک کے کنارے پڑی رہنے دیتے ہیں، وہ خود بخود پگھل جاتی ہے۔''

''اچھا دیکھو، میں تمہیں سو ڈالر کا نوٹ اور دیتا ہوں۔ تمام ڈرائیوروں سے کہہ دو کہ وہ میرے ساتھ ساتھ آئیں اور جہاں میں برف پھینکوں، وہ بھی پھینک دیں اور ان سے یہ بھی کہہ دینا کہ سڑک کے دونوں اطراف سے بھی برف صاف کر دیں۔''

''ہمارے پاس صرف دس ٹرک ہیں، اس طرح تو برف کبھی صاف نہیں ہو گی۔''

نک نے سو ڈالر کا دوسرا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''لو اسے ڈرائیوروں میں تقسیم کر دو۔''

جب پہلا ٹرک بھر گیا تو نک اسٹیئرنگ پر بیٹھ گیا اور ٹرک تھوڑا سا آگے لے جا کر روک دیا تا کہ دوسرا ٹرک بھر

جائے۔ جب دوسرا ٹرک بھی اسٹارٹ ہو گیا تو اس نے پال گیسپر کے میدان کی طرف دو میل لمبا سفر شروع کر دیا۔

☆☆☆

نک آدھی رات کے بعد ایڈمرل لیگ کے گھر واپس پہنچا۔ پہلی دو منزلوں میں بتیاں جل رہی تھیں۔ میریلین دروازے پر اس کی منتظر تھی۔ ''ہو گیا کام؟''

''بالکل۔ ہم نے بیس چکر لگائے۔ کُل دو سو ٹرک برف لے جائی گئی مگر کوئی بات نہیں، گیسپر کا کام تو ہو گیا۔ یہ برف پورا مہینا اس کا ساتھ دے گی۔''

''آپ تو جینئس معلوم ہوتے ہیں۔'' میریلین نے ہلکے سے اسے پیار کر لیا۔

''میں تو صرف ایک چور ہوں مگر ہاں، مجھے اس طرح کے انعامات بڑے اچھے لگتے ہیں۔ ہاں، تمہاری بہن کہاں ہے؟''

''سامنے کمرے میں۔ ہیری بھی وہیں ہے۔ ڈیڈی سونے جا چکے ہیں۔''

نک اندر داخل ہوا اور سیدھا ڈبے کی طرف بڑھا۔ ''میں صرف یہ ڈبا لینے آیا ہوں۔'' اس نے اعلان کیا اور ہیری پائین کا ہاتھ جیب کی طرف بڑھتے دیکھ کر فوراً اضافہ کیا۔ ''پلیز! اپنا ریوالور اندر ہی رہنے دیں۔ کم از کم اس وقت تو اسے باہر نہ نکالیں۔ میں چار گھنٹے تک ٹرک چلا کر تھک گیا ہوں۔''

مارشا نے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا اور اپنی ٹانگیں صوفے سے نیچے اتار کر بولی۔ ''یہ سر موم کا بنا ہوا ہے۔''

''تو اور کیا۔ اتنے کم وقت میں اصل سر کہاں سے مل سکتا تھا۔ میں نے یہ سر مانٹریال کے ایک عجائب گھر سے کرائے پر لیا تھا۔ اب وہ اسے واپس مانگ رہے ہیں۔''

''تم آخر کس قسم کے بدمعاش ہو؟''

''کسی قسم کا نہیں۔ میں جس کام کے لیے آیا تھا، وہ پورا ہو چکا ہے۔''

''ہم پولیس کو بھی بلا سکتے ہیں۔''

''ضرور بلائیے۔ میں بھی انہیں بتاؤں گا کہ آپ لوگوں نے اپنے باپ کو گھر میں قید کر رکھا ہے اور ان پر ایک مسلح پہرے دار مسلط کر دیا ہے کہ وہ بھاگنے نہ پائیں۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی نظریں نک پر جمی ہوئی تھیں۔

''تو تم اسی لیے واپس آئے ہو تا کہ یہ راز جان لو؟''

''ہاں، آپ یہی سمجھ لیں کہ میرا جذبۂ تجسس مجھے کھینچ لایا ہے۔''

مارشا نے اپنی بہن کی طرف دیکھا جو دروازے میں کھڑی تھی۔ ''میریلین! جاؤ جا کر سو جاؤ۔''

''میں اب بچی نہیں ہوں۔ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش نہ کیجیے۔''

''اس کا فیصلہ کرنے والی میں ہوں، تم نہیں۔''

''جب میں پال گیسپر کے ساتھ گھومنے پھرنے کی آزادی رکھتی ہوں تو مجھے سب کچھ سننے کی آزادی بھی حاصل ہے۔''

مارشا کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ نک نے فوراً کہا۔ ''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے مارشا۔''

''نہیں...''

''تم کب تک اسے بچی سمجھتی رہو گی؟''

مارشا نے بے بس ہو کر ہیری پائین کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔ ''تمہاری مرضی... چاہو تو بتا دو۔''

مارشا نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر لیں اور پھر آنکھیں کھول کر بولی۔ ''میریلین! ممی کا انتقال اس وقت نہیں ہوا تھا جب تم پیدا ہوئی تھیں۔ وہ تمہارے دو سال کی عمر کو پہنچنے تک زندہ تھیں... انہیں ڈیڈی نے قتل کیا تھا۔''

''قتل کیا تھا!''

''اب سمجھیں تم؟ اور مسٹر ویلوٹ! اب آپ بتائیے، کیا میں بیک وقت دونوں سے محروم ہو جاتی۔ ایک ہستی تو قتل ہو چکی تھی، دوسری جیل یا پاگل خانے بھیج دی جاتی۔ چنانچہ میں نے ڈیڈی کو یہاں لانے کا فیصلہ کر لیا تا کہ اس راز کو پوشیدہ رکھ سکوں۔ میں اور ہیری پندرہ سال سے ڈیڈی کی اور ڈیڈی سے دوسروں کی حفاظت کر رہے ہیں۔''

''اور وہ بولنے والا سر؟'' نک نے پوچھا۔ گو وہ اس سوال کا جواب پہلے ہی جانتا تھا مگر پھر بھی مارشا کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔

اور مارشا لیگ نے جواب دے بھی دیا۔ ''اس تمام ذخیرے میں صرف ایک سر ایسا ہے جو ڈیڈی سے باتیں کرتا ہے۔ باقی سب اس سر کو چھپانے کے لیے ہیں جیسے ایک پتی کو چھپانے کے لیے جنگل میں ڈال دیا جائے یا ایک سیپ کو چھپانے کے لیے سمندر میں پھینک دیا جائے۔ اور یہ سر میری ماں کا ہے۔ اس عورت کا جسے ڈیڈی نے قتل کیا تھا۔''

اسما قادری

قسط : 31

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور بااثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظامِ قانون کے بھی کئی رخ ہیں، بالاتر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے ... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے - پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو - محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے - دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے - زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں ... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے - بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے ... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے - جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل...... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پُرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرنگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیرآباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا ہے اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ پیرآباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو عرصے سے گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند ہوتا ہے، شہریار کا سہارا پا کر مکمل کر اپنے مشن پر کام کرنے لگتا ہے۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب سے خفیہ نکاح کر لیتی ہے۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیرآباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آ جاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ شہریار اپنے ڈرائیور مشابرم خان کے مشورے پر ماہ بانو کو کاندے منتقل کر دیتا ہے۔ کچھ لوگ ماہ بانو کو اغوا کر لیتے ہیں۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ چودھری کو ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ ماہ بانو عمران نامی لڑکے کے ساتھ دشمنوں کی قید سے بھاگ نکلتی ہے۔ ماہ بانو برف زار میں بھٹکتے بھٹکتے بے ہوش ہو جاتی ہے اور اس دوران اسے ایک مہربان شخص مل جاتا ہے جو کلائمبر ہوتا ہے، وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ شہریار ماسٹر آفتاب کو چھڑانے کے لیے جگو کا سہارا لیتا ہے اور جگو آفتاب کو چودھری کے چنگل سے نکال لاتا ہے۔ ماہ بانو آرمی کسٹڈی میں پہنچ جاتی ہے۔ شہریار ماہ بانو کو چھڑا کر کراچی منتقل کر دیتا ہے۔ ادھر چودھری کے کارندے بابر کو مار کر آفتاب اور کشور کا پتا لگا لیتے ہیں لیکن وہ وہاں سے نکل چکے ہوتے ہیں۔ لیاقت رانا پر قاتلانہ حملے کی خبر سن کر شہریار پریشان ہو جاتا ہے اور انھیں دیکھنے کے لیے لاہور جانے کا ارادہ کرتا ہے۔ راستے میں ڈاکٹر ماریا کی طبیعت کی خرابی کے باعث انہیں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں مختصر قیام کرنا پڑتا ہے اور اس قیام کے دوران وہ ماریا کے قریب ہو جاتا ہے۔ ماہ بانو ایک بار پھر چودھری کے ہتھے چڑھ جاتی ہے۔ شہریار ماریا سے شادی کر لیتا ہے۔ اشرف شاہ ماہ بانو کو چودھری کی قید سے نکال کر ڈاکوؤں کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ وہاں موجود ڈاکو اسلم ماہ بانو کو پسند کرنے لگتا ہے۔ آفتاب شہریار کو فون کر کے اسے را کے ایجنٹ کی اسلام آباد میں موجودگی کا بتاتا ہے۔ غلام محمد نامی ایجنٹ پکڑا جاتا ہے۔ شہریار، مشابرم خان اور فورس کی مدد سے اس پر قابو پاتا ہے۔ آفتاب اور کشور میرپور خاص آ جاتے ہیں۔ شہریار جگو کو فون کر کے چودھری کی مرمت کرانا چاہتا ہے۔ عبدالمنان شہریار کو بتاتا ہے کہ ماہ بانو ڈاکوؤں کے پاس ہے۔ شہریار، مختار مراد کو ٹیلی فون کر کے جنگل میں آپریشن پر زور دیتا ہے۔ آفتاب کے ہاں ایک لڑکی کی پیدائش ہوتی ہے۔ ماہ بانو کو اسلم کے ذریعے شہریار کی شادی کی اطلاع ملتی ہے تو وہ صدمے سے بے ہوش ہو جاتی ہے۔ ماہ بانو اسلم کو شادی کی آفر کرتی ہے مگر ساتھ میں شرط رکھتی ہے کہ وہ ڈاکوؤں کا ساتھ چھوڑ دے اور عزت کی زندگی گزارے، تب وہ اس سے شادی کرے گی۔ چودھری چراغ پا ہو جاتا ہے اور آفتاب اور کشور کا سراغ لگانے کا حکم دیتا ہے۔ ادھر اسلم اور ماہ بانو ڈاکوؤں کی پناہ گاہ سے بھاگنے کا پروگرام بنا رہے ہوتے ہیں، للی زبردستی ان کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے۔ چودھری کے گرگے آفتاب کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اسپتال پر دھاوا بول دیتے ہیں تاہم آفتاب اور کشور وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر اس افراتفری میں ان کی نوزائیدہ بچی وہیں رہ جاتی ہے۔ چودھری کے آدمی بچی کو اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں۔ تاہم جگو کے آدمی بچی کو چھڑا لیتے ہیں۔ ادھر ماہ بانو، اسلم اور للی ڈیرے سے بھاگ نکلتے ہیں۔ پولیس ڈیرے پر آپریشن کر کے تمام ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیتی ہے تاہم ماہ بانو کی بازیابی ممکن نہیں ہوتی۔ ڈیوڈ پیسوں کا لالچ دے کر چودھری کو اس کے جوتے کے کارخانے میں ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب قائم کرنے پر آمادہ کر لیتا ہے۔ اسلم، ماہ بانو اور للی سفر کے دوران ایک جگہ رکتے ہیں۔ وہاں جمرو پہنچ جاتا ہے اور اسلم اور جمرو کے درمیان خونی تصادم ہوتا ہے۔

لتی اس تصادم میں جمرو کی گولی کا شکار بنتی ہے۔ جمرو، اسلم کے چاقو کا شکار ہو کر اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ ادھر شبانہ آفتاب کی مدد کرنے کے چکر میں پولیس کے ہاتھوں دھرلی جاتی ہے اور اپنی آبرو کھو بیٹھتی ہے۔ وہ لوگ آفتاب کا فون نمبر ہتا کر کے اس کی قیام گاہ کا پتا لگا لیتے ہیں اور چودھری سے پیسوں کے عوض اس کا بتا دیتے ہیں۔ آفتاب کو شہریار کے ذریعے پتا چلتا ہے کہ اس کی بچی خیریت سے ہے۔ سفر کے دوران ماہ بانو اور اسلم کی ملاقات شفقت راؤ نامی شخص سے ہوتی ہے۔ وہ انہیں اپنے بہنوئی کا پتا سمجھا دیتا ہے اور ان کے لیے پناہ کا بندوبست کر دیتا ہے۔ ادھر چودھری افتخار لندن پہنچتا ہے اور ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب کے قیام والے معاملات طے کر لیتا ہے۔ ماہ بانو اور اسلم، شفقت راؤ کے بتائے ہوئے گاؤں تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہ ماہ بانو کو تھوڑا دور ایک مقام پر چھوڑ کر اس کے بہنوئی کے پاس پہنچتا ہے اور اسے شفقت کا حوالہ دے کر اس سے مدد کی درخواست کرتا ہے۔ وہ لوگ ماہ بانو کو لینے کے لیے اس مقام پر پہنچتے ہیں تو ماہ بانو کا نام و نشان نہیں ہوتا۔ تاہم ماہ بانو ایک چٹان کے پیچھے اسے سوتے ہوئے مل جاتی ہے۔ وہ لوگ حامد راؤ کے گھر آ جاتے ہیں۔ ادھر شہریار شہزادی نامی عورت سے مردہ بچے کی ہڈیاں وصول کرنے والے شخص سے تفتیش کرتا ہے اور کافی کچھ اگلوانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مراد شاہ کو ماں کے انتقال کی خبر ملتی ہے تو وہ چودھری سے اس بارے میں استفسار کرتا ہے مگر چودھری بڑی چالاکی سے اسے سمجھانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو دکھی ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسلم اور ماہ بانو ایک ہی کمرے میں رات گزارتے ہیں۔ صبح ان کی روانگی کا پروگرام ہوتا ہے تاہم اسلم کو ماہ بانو کی موجودگی میں کچھ بے چینی سی محسوس ہوتی ہے تو وہ رات کو اٹھ کر چھت پر چلا جاتا ہے۔ وہ باؤنڈری وال سے ہاتھ لگائے کھڑا ہوتا ہے کہ اچانک اسے کچھ انسانی سائے نظر آتے ہیں جو حامد راؤ کے مکان کو گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔ گھیرا ڈالنے والے لوگ حامد راؤ سے کہتے ہیں کہ شفقت راؤ کی بیوی اور بیٹی کو ان کے حوالے کر دیا جائے۔ یہ بات سن کر حامد راؤ گولی چلا دیتا ہے اور پھر وہاں دوبدو مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ تاہم وہ سب دشمنوں کا گھیرا توڑ کر فرار ہو جاتے ہیں اور حامد راؤ کے شہر میں واقع فلیٹ میں آ جاتے ہیں۔ حامد راؤ، اسلم کے بارے میں جان جاتا ہے تاہم وہ اس کی کہانی سن کر اسے اچھی زندگی گزارنے کے لیے نوکری کی پیشکش کرتا ہے۔ ادھر مشابرم خان شہریار کو خانقاہ کی رپورٹ دیتا ہے اور اس گاؤں میں ہونے والے مقابلے کی خبر دینے کے ساتھ وہاں اسلم اور ماہ بانو کی موجودگی اور پھر فرار کا بتاتا ہے۔ شہریار کی خبر سن کر چونک جاتا ہے۔ بہرحال وہ مشابرم خان کو دوبارہ نالی والا جا کر تحقیقات کرنے کا حکم دیتا ہے۔ مشابرم خان وہاں پہنچ کر ایک بوڑھے شخص سے معلومات حاصل کرتا ہے۔ بات چیت کے دوران اچانک اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبنے لگتا ہے۔ بے ہوشی طاری ہونے سے قبل اس کے کان جو آواز سنتے ہیں، وہ گولی چلنے کے دھماکے کی ہوتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

”ایک بار اور سوچ لو ماہ بانو! میرے خیال میں تو تمہارا اکیلے وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے نہ ہی میں اپنی بچت کے لیے تمہیں خطرے میں ڈالتے ہوئے خود کو مطمئن محسوس کر رہا ہوں۔ اگر تم اپنی ضد چھوڑ دو تو ہم دونوں ایک ساتھ ہی چلتے ہیں۔ وہاں جو بھی اور جیسے بھی حالات پیش آئیں گے، ہم مل کر ان کا سامنا کر لیں گے۔ کم از کم ایک دوسرے کے حالات کی طرف سے بے خبری تو نہیں ہوگی۔ ابھی تم اکیلی وہاں جاؤ گی تو میں یہاں بیٹھا پریشان ہی ہوتا رہوں گا کہ نہ جانے تمہارے ساتھ وہاں کیا پیش آ رہا ہوگا۔“

سر سے پیر تک چادر اوڑھے ماہ بانو باہر نکلنے کے لیے بالکل تیار تھی جب کمرے میں بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہلتا ہوا اسلم اس کے مقابل آ کھڑا ہوا اور لجاجت سے بولا۔ وہ دونوں حامد راؤ اور اس کے اہلِ خانہ سے رخصت ہو کر آج ہی جیکب آباد پہنچے تھے اور ایک چھوٹے سے ہوٹل میں کمرا کرائے پر لے لیا تھا۔ یہاں سے انہیں دوپہر کے کھانے کے بعد اسلم کے گاؤں روانہ ہونا تھا لیکن کھانے سے قبل ہی ماہ بانو نے تجویز پیش کی کہ وہ اکیلی اسلم کے گاؤں جا کر اس کی ماں کو منانے کا فریضہ انجام دینا چاہتی ہے۔ اس کا استدلال تھا کہ گاؤں میں اسلم کے لیے خطرات تھے اس لیے اس کا وہاں نہ جانا ہی مناسب تھا۔

اسلم نے اس کی یہ تجویز فوری طور پر مسترد کر دی لیکن ماہ بانو نے اسے اپنی قسم دے کر مجبور کر دیا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ ماہ بانو روانگی کے لیے تیار تھی اور اسلم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کرے۔ ایک طرف وہ اس کی دی ہوئی قسم نہیں توڑ سکتا تھا تو دوسری طرف اسے اکیلے بھیجنے پر بھی دل کو راضی نہیں کر پا رہا تھا۔ اپنی اس جذباتی کشمکش میں اس سے کھانا بھی ٹھیک طرح سے نہیں کھایا گیا۔ ماہ بانو اس کے اضطراب کو اچھی طرح محسوس کر رہی تھی لیکن بظاہر انجان بنی ہوئی تھی۔ اب اسلم نے بالکل نکلتے وقت گفتگو چھیڑ دی تو ماہ بانو کو بھی اپنی خاموشی کو توڑنا پڑا۔

”دیکھو اسلم! ضد میں نہیں تم کر رہے ہو۔ تمہیں یہ بات سمجھنی چاہیے کہ میری اکیلی ذات کے لیے تمہارے گاؤں میں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ میں خود کو دور دراز کی کوئی رشتے دار ظاہر کرتی ہوئی تمہاری ماں تک پہنچ جاؤں گی اور انہیں منانے کی کوشش کروں گی۔ مجھے یقین ہے کہ میرے منانے پر ماں جی اپنی ناراضی بھول جائیں گی۔ اس کے بعد یہ میری ذمے داری ہے کہ میں انہیں کیسے گاؤں سے لے کر یہاں تک آتی ہوں۔ تم یقین رکھو کہ یہ سب کرنے میں مجھے کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئے گی۔ اگر تم ساتھ چلے تو ہم وہاں قدم رکھتے ہی مشکلات میں گھر جائیں گے۔ تمہارے دشمن پہلے

مرحلے پر ہی تمہیں گھیرنے اور مارنے کی کوشش کریں گے اور میں تمہارے ساتھ ہونے کی وجہ سے خود بہ خود ہی ان کی زد میں آ جاؤں گی۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ اپنے اور میرے فائدے کے لیے تمہیں میرے ساتھ چلنے سے گریز کرنا چاہیے۔“

”کیا مطلب ہے تمہاری اس بات کا؟ کیا تمہارے خیال میں، میں تمہاری حفاظت کرنے کا اہل نہیں ہوں؟ کوئی آنکھ اٹھا کر دیکھے تو تمہاری طرف۔ اگر کسی نے تمہیں رتی برابر نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو میں اس کی لاش گرا دوں گا۔“ اسلم گویا بپھر سا گیا۔

”میں جانتی ہوں کہ تم ایسا کر سکتے ہو، تمہارے لیے کسی کی لاش گرانا کوئی مشکل کام نہیں ہے لیکن یہ سوچا ہے کہ ایسی کسی حرکت کا انجام کیا ہوگا؟ تم پہلے ہی پولیس کو مطلوب ہو، کوئی اور الٹا سیدھا واقعہ پیش آ گیا تو وہ لوگ ایک بار پھر تمہاری بُو پر لگ جائیں گے۔ اس کے بعد تمہارا ٹھکانا کہاں ہوگا؟ یا تو تم لوہے کی سلاخوں کے پیچھے کر دیے جاؤ گے یا پھر بھاگ کر ایک بار پھر ڈاکو لٹیروں کے کسی گروہ میں شامل ہو جاؤ گے۔ اور میں...... میں ایک بار پھر بے آسرا ہو جاؤں گی۔“ کاٹ دار لہجے میں تیز تیز یہ سب کہتے ہوئے ماہ بانو کا سانس پھول گیا تھا اور آنکھوں میں در آنے والی ہلکی سی نمی سے ظاہر تھا کہ وہ بیک وقت غم و غصے کا شکار ہو گئی ہے۔ اسلم نے اس کی یہ کیفیت دیکھی تو فوراً ہی پسپائی اختیار کر لی۔

”آئی ایم ویری سوری ماہ بانو! میں نے یہ سب نہیں سوچا تھا۔ میں تم سے جو بھی مطالبہ کر رہا تھا اپنے وسوسوں کی وجہ سے کر رہا تھا۔ میں تمہیں اکیلے گاؤں بھیجتے ہوئے ڈر رہا تھا لیکن تم واقعی درست کہہ رہی ہو۔ میرے ساتھ جانے سے واقعی خطرہ بہت زیادہ بڑھ جائے گا۔ لہٰذا بہتری اسی میں ہے کہ تم اپنے منصوبے پر عمل کرو۔“ مجبوراً ہی سہی، اسلم کو اسے اجازت دینی پڑی کہ مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔

”ٹھیک ہے تو پھر میں چلتی ہوں۔ تم یہاں سکون سے بیٹھ کر میرے کامیاب لوٹنے کی دعا کرنا۔“ اسلم کے پسپائی اختیار کرتے ہی اس نے اپنا لہجہ نرم کر لیا اور دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھی۔

”ماہ بانو......!“ ابھی وہ دروازے تک نہیں پہنچی تھی کہ اسلم کی پکار نے اسے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے پلٹتے ہی اسلم نے قدم بڑھا کر درمیانی فاصلہ طے کیا اور ایک دم ہی اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے کر سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ اس کی اس بے ساختہ حرکت پر ماہ بانو پوری جان سے لرز اٹھی۔ اسے اسلم کے قریب رہتے کافی عرصہ گزر چکا تھا لیکن ایسی جسارت اس نے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ وہ اتنی سختی سے اسے اپنے ساتھ بھینچ کر کھڑا تھا کہ وہ حرکت بھی کرنے سے قاصر تھی۔ لیکن اس کا کنوارا جسم ایک مرد کی اتنی قربت کی وجہ سے بید مجنوں کی طرح لرز رہا تھا اور کمال یہ تھا کہ وہ اسلم کو خود سے دور دھکیلنے کی بھی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔ ایسا شاید اس لیے تھا کہ وہ اس کے جذبات کی نوعیت کو صحیح طور پر سمجھ رہی تھی۔ وہ ایک محبت کرنے والے کا وہ بے ساختہ اظہار تھا جو اسے کسی مشکل میں پڑتے دیکھ کر ساری دنیا سے چھپا لینے کا خواہش مند تھا لیکن مجبوری یہ تھی کہ وہ اسے روک بھی نہیں سکتا تھا۔

اسلم کی قربت میں لرزتی کانپتی ماہ بانو اس وقت اسے یہ رعایت دینے پر مجبور پا رہی تھی اور شاید یہ اس کی خاموشی کا ہی نتیجہ تھا کہ اسلم نے ایک جسارت اور کر ڈالی۔ اس کے دہکتے ہونٹوں کا پُرجوش سا بوسہ ماہ بانو کے گلابی نرم رخسار پر ثبت ہوا تو اسے ایسا لگا کہ اس کا رخسار جل اٹھا ہو۔ وہ اسلم کے سینے پر دونوں ہاتھوں کا دباؤ ڈال کر اسے دھکیلتی ہوئی پیچھے ہٹی تو وہ بھی گویا ہوش میں آ گیا اور اپنی بے خودی پر شرمندگی سی محسوس کرنے لگا۔ لیکن ماہ بانو اس کا شرمندہ چہرہ دیکھنے کے لیے وہاں رکی نہیں بلکہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اسلم اسے گاڑی میں بٹھانے اس کے ساتھ جانا چاہ رہا تھا لیکن جو گستاخی کر چکا تھا، اس کے بعد اسے جرأت نہ ہو سکی کہ ماہ بانو کا سامنا کر سکے۔ وہ جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا جبکہ ماہ بانو بغیر رکے تیزی سے آگے بڑھتی چلی گئی۔

ٹکٹ اسلم اسے پہلے ہی لا کر دے چکا تھا۔ وہ بس اڈے پر پہنچی تو اپنی مطلوبہ بس کے بارے میں معلوم کر کے اس میں سوار ہو گئی۔ بس کی نشستیں ابھی پوری طرح پُر نہیں ہوئی تھیں۔ اسے کھڑکی کے ساتھ جو سیٹ ملی، اس کے برابر میں فی الحال کوئی دوسرا مسافر موجود نہیں تھا۔ وہ تقریباً گرنے والے انداز میں نشست پر ڈھیر ہو گئی اور آنکھیں بند کر کے دایاں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا۔ دل ابھی بھی اس شدت سے دھڑک رہا تھا جیسے وہ ابھی تک اسلم کی بانہوں میں جکڑی ہوئی ہو۔ اس نے وہاں بیٹھے بیٹھے اپنا دیانت دارانہ تجزیہ کیا۔ شرم و حیا کے تقاضے اپنی جگہ تھے لیکن یہ سچ تھا کہ اسے اسلم کی جسارت بہت زیادہ ناگوار نہیں گزری تھی۔ البتہ دل میں ایک خلش سی ضرور تھی اور اس خلش کو تو شاید زندگی بھر اس کے ساتھ ہی رہنا تھا۔ شہریار سے مایوس ہو کر اسلم کی محبت کی شدت کے سامنے سر جھکا دینے کے باوجود وہ اس حقیقت کو تو کبھی بھی نہیں جھٹلا سکتی تھی کہ اس کا دل شہریار کا اسیر ہے۔ دل میں گھر کرنے والی وہ پہلی پہلی محبت اتنی معمولی نہیں تھی کہ کسی

دوسری محبت کے مل جانے پر اس کے رنگ ماند پڑ جاتے۔ شہریار اب بھی پوری آب وتاب سے اس کے دل میں موجود تھا۔ ہاں البتہ اتنا ضرور ہوا تھا کہ وہ اسلم کے خلوص کے سامنے ہتھیار ڈال کر اسے بھی اپنی زندگی میں جگہ دینے پر راضی ہوگئی تھی۔ شاید اس رضامندی کے پیچھے کچھ ہاتھ اس کی مجبوریوں کا بھی تھا۔ وہ اپنے اس رشتے کو کھو چکی تھی جس سے اسے تحفظ ملنے کی امید ہوتی۔ ایک طرف اسے دل سے لگا کر پالنے پوسنے والے بے بے اور ابا دنیا سے چلے گئے تو دوسری طرف اسے دنیا میں لانے کے ذمے دار اس کے ماں باپ خود تباہ حال تھے۔ ماں اکلوتے بیٹے کی موت کے غم میں پاگل ہوگئی تھی تو باپ بھی بس زندگی کو گھسیٹنے پر مجبور تھا۔ وہ دو کمزور اور بوڑھے وجود جو اپنی زندگی کے دن پورے کرنے کے لیے دوسروں کی مدد کے محتاج تھے، بھلا اس کا سائبان کیسے بنتے؟ اور وہ لاکھ بہادر اور باہمت سہی، تھی تو بہرحال ایک لڑکی ہی جو کسی محفوظ چھت کے نیچے سکون سے زندگی گزارنے کی خواہش مند ہوتی ہے۔

اسلم کے سلسلے میں خود کو راضی کرنے کے لیے اس کے پاس ایک مضبوط دلیل یہ بھی تھی کہ اپنی قربانی کے ذریعے وہ اسلم جیسے انسان کو بُرائی کی دلدل سے نکال کر ایک بڑا کارنامہ انجام دے سکتی ہے۔ اسے یقین تھا کہ اگر ایک انسان کی زندگی کو بچانا بہت بڑی نیکی تھی تو انسان کی انسانیت کو بچالینا اس سے بھی بڑا کارِثواب تھا۔ اسلم کی محبت کو قبول کر کے اگر اس نے اپنے لیے ایک پناہ گاہ کا بندوبست کیا تھا تو اسے بھی اس کے اصل کی طرف لاکر نئی زندگی دے دی تھی۔ لین دین کے اس سودے میں اگرچہ دونوں ہی کو مکمل آسودگی ملنے کا امکان نہیں تھا...... ایک فریق جانتا تھا کہ وہ جسے قبول کر رہا ہے، اس سے محبت نہیں کرتا اور دوسرا واقف تھا کہ جو اسے قبول کر رہا ہے، اسے اپنی تمام تر محبت دینے کے باوجود پوری طرح پانے سے قاصر رہے گا۔ دونوں کے درمیان تلخ حقائق اپنی جگہ تھے لیکن یہ اطمینان بھی تھا کہ انہوں نے ایک دوسرے سے جھوٹ نہیں بولا ہے۔ ماہ بانو، شہریار کا نام لیے بغیر اسلم کو بتا چکی تھی کہ وہ کسی اور کی محبت کی اسیر ہے اور اسلم نے بڑی اعلیٰ ظرفی سے اس بات کو نظرانداز کر دیا تھا۔

''ادی ذرا ادھر ہو کر میرے کو جگہ تو دینا۔'' وہ اپنے خیالات میں نہ جانے کتنی دیر تک غلطاں و پیچاں رہتی کہ ایک زنانہ آواز نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ وہ پچیس چھبیس سال کی قدرے فربہ سانولی سی عورت تھی جس نے سندھی کڑھائی والا ڈھیلا ڈھالا شلوار قمیص پہن رکھا تھا اور سر پر بھی اسی طرح کی کڑھی ہوئی بڑی سی چادر موجود تھی۔ عورت کی گود میں تقریباً پانچ چھ ماہ کا ایک کمزور سا بچہ بھی موجود تھا۔ نشست پر کھسک کر اس کے لیے جگہ بناتے ہوئے ماہ بانو نے اپنا جائزہ مکمل کر ڈالا۔ عورت فوراً ہی خالی جگہ پر بیٹھ گئی اور بچے کو گھٹنوں پر بٹھانے کے بعد اپنے دوسرے ہاتھ میں موجود چھوٹی سی پوٹلی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''ادی! یہ تم پکڑ لو تو وڈی مہربانی ہوگی۔ اس میں روٹی ہے ورنہ میں نیچے پیروں کے پاس رکھ لیتی۔'' اس کی استدعا پر ماہ بانو نے خاموشی سے پوٹلی لے کر اپنی گود میں رکھ لی۔ خود اس کے اپنے پاس تو ایک شولڈر بیگ کے سوا کوئی سامان تھا بھی نہیں جو اسے پوٹلی تھامنے میں مشکل پیش آتی۔ قدرے میلے سے کپڑے کی اس پوٹلی میں سے آم کے اچار کی خوشبو آرہی تھی۔ پوٹلی گود میں رکھ کر وہ کھڑکی کی طرف متوجہ ہوگئی۔ باہر اجنبی چہرے والے لوگ بکھرے ہوئے تھے۔ بہت دور اسے ایک چہرہ ایسا نظر آیا جس پر اسلم کا گمان گزرا لیکن گمان یقین میں بدلتا، اس سے قبل ہی بس حرکت میں آگئی اور تیزی سے آگے بڑھتی چلی گئی۔ اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے رخ پھیر لیا۔ برابر میں بیٹھی عورت اپنے بچے میں مگن تھی اور پوری بس کے منظر میں اس کے لیے کہیں ایسی کوئی کشش نہیں تھی کہ وہ خود کو اس ماحول میں شامل کر سکے۔ چنانچہ پشت گاہ سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ نیند نہ بھی آتی تو وہ آنکھیں موند کر کچھ دیر سکون سے بیٹھ تو سکتی تھی۔

☆☆☆

بے ہوشی کا دورانیہ نہ جانے کتنا طویل تھا۔ اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک چار دیواری میں قید پایا۔ اونچی دیواروں والے اس کمرے میں آمدورفت کے لیے صرف ایک دروازہ موجود تھا جو یقینی طور پر باہر سے بند تھا۔ دروازے کے علاوہ کمرے میں کسی کھڑکی کا نام ونشان موجود نہیں تھا، البتہ عقبی دیوار پر کافی بلندی پر ایک ہوادان ضرور نظر آرہا تھا۔ لکڑی کے فریم والے اس ہوادان میں اتنی گنجائش موجود تھی کہ ایک آدمی آرام سے گزر سکتا تھا لیکن وہ جتنی بلندی پر تھا، وہاں تک کسی سیڑھی وغیرہ کی مدد کے بغیر رسائی ممکن نہیں تھی اور اس خالی کمرے میں ایسی کسی شے کا ہونا تو ایک طرف، استعمال کی معمولی سے معمولی شے بھی موجود نہیں تھی۔ یہاں تک کہ اسے بھی کسی جانور کی طرح کمرے کے ننگے فرش پر لا کر ڈال دیا گیا تھا۔ بے ہوشی کے دورانیے میں ٹھنڈے فرش پر پڑے رہنے کی وجہ سے اس کا جسم اکڑ سا گیا تھا لیکن ظاہر ہے اسے اس طرح یہاں لانے والے اس کے بہی خواہ تو

تھے نہیں کہ ان سے کوئی اچھی امید کی جاسکتی۔ انہوں نے تو اسے اتنی بیدردی سے یہاں قید کیا تھا کہ پانی کا کوئی برتن تک کمرے میں رکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔

وہ کچھ دیر تک فرش پر ہی بیٹھا اردگرد کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ حالات کا بھی تجزیہ کرتا رہا۔ غالب امکان یہی تھا کہ اس وقت وہ پیر سائیں کے مریدوں کی قید میں تھا جنہوں نے اسے حامد راؤ کے مزارع کے ساتھ گھلتے ملتے دیکھ کر بے ہوش کر کے اغوا کر لیا تھا۔ ہوسکتا تھا کہ انہوں نے اسے اور مزارع کے درمیان ہونے والی گفت وشنید کا کچھ حصہ بھی سن لیا ہو اور اسے اپنی سلامتی کے لیے خطرہ سمجھ کر یہاں اٹھا لائے ہوں۔ اس پر بہرحال عقب سے وار کیا گیا تھا اس لیے وہ کوئی بات یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔

خود پر گزرے حالات کا سوچتے سوچتے اسے یکدم ہی فائر کی وہ آواز یاد آئی جو اس نے بے ہوش ہونے سے پہلے سنی تھی۔ وہ بے ساختہ ہی مضطرب سا ہو کر اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا اور دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ حسبِ توقع دروازہ باہر سے بند تھا۔ عالمِ اضطراب میں اس نے دروازہ پیٹ ڈالا۔ اس کے لیے یہ احساس ہی سوہانِ روح تھا کہ اس کی وجہ سے وہ غریب مزارع کسی نقصان سے دوچار ہوگیا ہو۔

''کیا گل ہے؟ کیوں دروازہ توڑنے پر تلے ہوئے ہو؟'' اس کی مسلسل دستک کے جواب میں باہر سے کسی نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''دروازہ کھولو، مجھے تم لوگوں سے بات کرنی ہے۔'' اس نے جھنجلا کر جواب دیا۔

''صبر کرو، ابھی وڈا صاحب آئے گا تو خود تم سے گل کرے گا۔'' باہر سے اسی لہجے میں جواب دیا گیا۔

''تمہارا وڈا صاحب معلوم نہیں کب آئے گا۔ مجھے حاجت محسوس ہو رہی ہے، تم دروازہ کھولو۔'' اسے گمان ہوا کہ وہ جس جگہ موجود ہے، وہاں اس نگران کے سوا کوئی اور شخص موجود نہیں ہے اس لیے باہر نکلنے کے لیے بہانہ گھڑا۔ اسے امید تھی کہ اگر وہ باہر نکلنے میں کامیاب ہوگیا تو اکیلے آدمی کو آسانی سے قابو میں کر لے گا۔

''دروازہ کھولنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر تم سے برداشت نہیں ہو رہا تو کمرے کے کسی کونے میں فراغت حاصل کر لو۔ بعد میں ہم تم ہی سے صفائی کروا لیں گے۔'' باہر سے بڑی بے نیازی کے ساتھ مشورہ دیا گیا جسے سن کر اس کا پہاڑی خون جوش مارنے لگا اور غصے کے عالم میں اس نے اپنے مضبوط کندھوں سے دروازے پر ضربات لگانا شروع کر دیں۔

''آرام سے بیٹھو ورنہ تمہارا بُرا انجام ہوگا۔'' باہر موجود شخص غرایا لیکن اس نے اس کے حکم کی تعمیل ضروری نہیں سمجھی۔ ویسے ہی چند ضربات کے بعد اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ دروازہ بہت زیادہ مضبوط نہیں ہے اور تھوڑی سی محنت سے اسے توڑا جاسکتا ہے۔ پھر اسے باہر موجود نگران کے اکیلے ہونے کا بھی گمان تھا چنانچہ پیچھے ہٹ کر دوڑتا ہوا آیا اور پوری قوت سے دروازے کو ایک اور ٹکر ماری۔ اس کے حساب سے یہ ٹکر فیصلہ کن تھی لیکن جب ردِعمل میں اس کا جسم پوری قوت سے اڑتا ہوا واپس کمرے کے فرش پر گرا تو ہر اندازہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔ گرنے کے بعد وہ ابھی سنبھل کر اٹھ بھی نہیں پایا تھا کہ کئی مسلح افراد دندناتے ہوئے اندر گھس آئے اور اسے بُری طرح زدوکوب .....کرنے لگے۔ مارنے کے لیے وہ ہاتھوں پیروں کے ساتھ ساتھ اپنے ہتھیار کے بٹوں اور دستوں کا بھی استعمال کر رہے تھے اور جسم کے ہر حصے پر بلاتخصیص ضربات لگا رہے تھے۔ اسے اندازہ ہوگیا کہ جب اس نے دروازے پر فیصلہ کن ضرب لگانے کے خیال سے جست لگائی تھی عین اسی وقت ان لوگوں نے بھی کمرے میں داخل ہونے کے لیے دروازہ کھولا تھا، چنانچہ ردِعمل میں وہ دروازے کی ٹکر کھا کر پیچھے کی طرف الٹ گیا اور اب وہ لوگ اسے سنبھلنے کا ذرا بھی موقع نہیں دے رہے تھے۔

آخرکار جب وہ بالکل ادھ موا ہو کر فرش پر گر پڑا تو ان کے مشین کی طرح مسلسل چلتے ہاتھ بھی خودکار انداز میں رک گئے۔ وہ اسے اتنا مار چکے تھے کہ وہ فوری طور پر خود کو سیدھا کرنے کی سکت بھی اپنے اندر نہیں پا رہا تھا چنانچہ الٹا پڑا ہی ہانپتا رہا۔

''امید ہے کہ تمہارے سارے کل پرزے اپنی جگہ صحیح بیٹھ گئے ہوں گے اور اب تم کوئی الٹی سیدھی حرکت کیے بغیر آرام سے میرے سوالوں کے جواب دیتے جاؤ گے۔'' وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا کہ قدموں کی چاپ کے ساتھ ہی ایک کرخت آواز سنائی دی۔ اس نے اپنی گردن گھما کر بولنے والے کی طرف دیکھا۔ وہ پستہ قامت کا سانولی رنگت والا پکی عمر کا آدمی تھا جس نے اپنے موٹے ہونٹوں پر بڑی بڑی مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں۔ بوسکی کی قمیص پر چوخانے والے تہ بند میں ملبوس اس آدمی کو دیکھ کر دل میں کوئی اچھا تاثر نہیں ابھر رہا تھا۔ مشابرم خان اسے کوئی جواب دیے بغیر یک ٹک گھورتا رہا۔ اس کی یہ جسارت آنے والے کو اچھی نہیں لگی اور وہ اکڑ کر چلتا ہوا اس کے اتنے قریب آ کھڑا ہوا کہ اس کے

نوک دار کھسوں کی نوک مشابرم خان کی ناک کو چھونے لگی۔ اس سے قبل کہ مشابرم خان کچھ سمجھ پاتا، اس نے پوری قوت سے اس کی ناک پر ٹھوکر دے ماری۔ تکلیف کی شدت سے اس کی چیخ نکل گئی مگر پھر اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے پستہ قامت نووارد کی طرف دیکھا۔

"کون ہو تم اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" اپنی ناک سے نکلنے والے خون کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے نووارد سے پوچھا۔

"سوال تم نہیں، میں کروں گا۔ چلو شاباش اب سیدھی طرح بتاتے چلے جاؤ کہ تم کون ہو اور کس کے لیے کام کر رہے ہو؟ تمہارے یہاں آنے کا کیا مقصد ہے؟" اس نے پے در پے کئی سوالات کر ڈالے۔

"میرا نام مشابرم خان ہے، میں یہاں کسی بُری نیت سے نہیں آیا تھا۔ میرا ایک مسئلہ تھا جس کے حل کے لیے میں پیر سائیں کی شہرت سن کر یہاں آیا تھا۔ میرا یہاں کا دوسرا چکر ہے۔ پہلے خانقاہ میں آگ لگنے اور دوسرے مسائل میں گھرے ہونے کی وجہ سے میری پیر سائیں سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی اس لیے میں دوبارہ یہاں آیا ہوں۔ تم چاہو تو تمہارے گاؤں کا ہی ایک بندہ میری بات کی تصدیق کر سکتا ہے۔" وہ اپنی خالی جیبیں دیکھ چکا تھا اس لیے جانتا تھا کہ وہ لوگ اس کے بنیادی کوائف سے تو اچھی طرح واقف تھے چنانچہ نام وغیرہ کے سلسلے میں کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔

"پیر سائیں سے مسئلہ حل کروانے آئے تھے تو ادھر جلے ہوئے کھیت میں بیٹھ کر نور بخش سے انٹرویو کیوں کر رہے تھے؟" پستہ قامت نے کڑے لہجے میں اس سے پوچھا۔

"میں دوسری بار ہی یہاں آیا ہوں اس لیے راستہ ٹھیک سے یاد نہیں تھا اور میں بھٹک کر کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ وہاں ایک جلے ہوئے کھیت میں نور بخش اداس بیٹھا نظر آیا تو ہمدردی میں اس سے دو چار باتیں کرنے بیٹھ گیا۔" اس نے بڑی سادہ سی وضاحت پیش کی۔

"لگتا ہے تُو سیدھی طرح سے زبان نہیں کھولے گا۔ مجھے تجھے بتانا ہی پڑے گا کہ تو جب ہمارے پنڈ میں داخل ہوا تھا، تب سے ہی ہمارے آدمیوں کی نظر میں ہے۔ تو پیر سائیں سے ہی ملنا چاہتا تھا تو جب خانقاہ کی طرف گیا تھا، تب ہی وہاں سے کوئی بندہ پکڑ سکتا تھا کہ وہ تجھے پیر سائیں تک پہنچا دے لیکن تُو تو وہاں سے کنی کترا کر نکل گیا ہور سیدھے حامد راؤ کے گھر کا رخ کیا۔ وہاں سے تُو کھیتوں میں پہنچ کر نور بخش سے پوچھ تاچھ کرنے بیٹھ گیا ہور معصوم ایسا بن رہا ہے جیسے سچ مچ واا سیدھا سادہ بندہ ہو۔"

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم نے جن جن جگہوں کا ذکر کیا، میں وہاں گیا تھا لیکن اس میں اتفاقات کا بھی بہت ہاتھ ہے۔ خانقاہ تو میں صرف اس تجسس کی وجہ سے گیا تھا کہ دیکھوں کہ وہاں تعمیر کا کام کہاں تک پہنچا۔ میرا خیال تھا کہ میں وہاں سے سیدھا شریف صاحب کے گھر تک پہنچ جاؤں گا اس لیے کسی سے مدد لینے کی کوشش نہیں کی لیکن بدقسمتی سے میں راستہ بھٹک گیا اور راستے میں جلا ہوا مکان دیکھ کر ٹھٹکا تو تھوڑی دیر وہاں رک گیا۔ کھیتوں کی طرف بھی میں اتفاقاً ہی جا نکلا تھا ورنہ نہ تو میں حامد راؤ کو جانتا ہوں اور نہ ہی مجھے اس سے کوئی دلچسپی یا ہمدردی ہے۔"

پستہ قامت کی جارحانہ تقریر کے مقابلے میں اس نے مدافعانہ لہجہ اختیار کیا اور وضاحتیں پیش کرنے لگا۔

"تو تو وڈی ڈھیٹ شے ہے بھئی...... رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے فیر بھی جھٹلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرے خیال میں تیری چمڑی کو ابھی مزید دھنائی کی ضرورت ہے۔ چل ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔ میں تیری یہ خواہش بھی پوری کروا دیتا ہوں، کہیں بعد میں تُو شکوہ کرے۔" پستہ قامت نے اپنے الفاظ سے ظاہر کر دیا کہ وہ اس کے ایک لفظ پر بھی یقین نہیں رکھتا ہے۔ اپنی بات کے اختتام پر وہ اپنے مسلح غلاموں کی طرف مڑ گیا اور استہزائیہ لہجے میں بولا۔

"چلو بھئی میرے شیرو، اس پر ٹوٹ پڑو اور اس وقت تک مارتے رہو جب تک یہ سچ بولنے پر راضی نہ ہو۔" اس کی زبان سے الفاظ ادا ہوتے ہی مسلح افراد پُرجوش نظر آنے لگے اور ان میں سے ایک قدرے آگے بڑھ آیا اور ادب سے بولا۔

"اگر آپ کی اجازت ہو تو ہم اس پر ترکیب نمبر ایک یا دو میں سے کوئی ایک آزما کر دیکھیں؟ سالا دو منٹ میں سیدھا ہو جائے گا ہور فر فر سب بتا دے گا۔"

"نہ اتنی جلدی نہ کر...... ابھی اسے تھوڑا موقع دے۔ چنگا ہے کہ یہ دو چار ہڈیاں تڑوا کر ہی سب کچھ اگل دے۔ تیری ترکیبوں میں سے کوئی ایک بھی آزمائی گئی تو وچارا دنیا سے نہ بھی اٹھا تو جیتے جی مر جائے گا۔ تجھے معلوم ہے کہ میں اتنا بے رحم بندہ نہیں ہوں۔" پستہ قامت کے لفظ لفظ سے مکاری ٹپک رہی تھی۔ وہ کن انکھیوں سے مشابرم خان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ساتھی سے مخاطب تھا۔

"کوشش کر کہ یہ آسانی سے سب کچھ اگل دے۔ ہاں، میں ایسا کرتا ہوں کہ اسے تیری ترکیب نمبر ایک ہور دو کی

تفصیل بتا دیتا ہوں تاکہ یہ خود بھی سمجھ داری سے کام لے سکے۔" اپنے ساتھی سے بات کرتے کرتے وہ مشابرم خان کی طرف پلٹ گیا۔

"دیکھ بھئی خاناں! یہ جو آدمی ہے نا وڈا سخت ہے ہور اس کی ترکیبیں بھی نرالی ہیں۔ اگر اس نے ترکیب نمبر ایک آزمانے کا سوچا تو تیرے ہاتھوں کو رسّی سے باندھ کر چھت پر لگے کنڈے سے لٹکا دے گا ہور نیچے آگ جلا دے گا۔ آگ تیرے بدن کو چھوئے بغیر تیرے ماس ہور ہڈیوں کو ایسے گلائے گی جیسے پائے گلتے ہیں۔ تُو اذیت سے چیخے گا چلّائے گا لیکن موت بھی وڈی مشکل سے آئے گی۔" وہ گویا کسی غیر مرئی پردے پر سارا منظر دیکھتا ہوا اس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"اس کی ترکیب نمبر دو ہور بھی انوکھی ہے۔ سالا مٹی کے مٹکے میں چھوٹے سے چوہے کو گھسا کر مٹکے کا منہ بندے کے پیٹ پر الٹ دیتا ہے اور زمین میں میخیں گاڑ کر چاروں ہاتھ پیر ایسے باندھ دیتا ہے کہ آدمی حرکت بھی نہیں کر سکتا۔ اب تو سوچ کہ بند مٹکے میں قید چوہے کو جب باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملے گا تو وہ کدھر کا رخ کرے گا۔ مٹکے کی پکی دیواریں تو اس کے دانتوں سے ٹوٹنے سے رہیں۔ فیر لازمی ہے کہ وہ ادھر ہی زور آزمائی کرے جدھر آسانی لگے گی۔ اب یہ تو خود سوچ سکتا ہے کہ جب چوہا تیرے بدن میں سرنگ بنا کر دوسری طرف نکلنے کی کوشش کرے گا تو تیرا کیا حال ہوگا۔ اللہ میری توبہ...... میں تو خود پر ایسے ظلم کا سوچ بھی نہیں سکتا۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان پکڑ لیے اور پھر گال بھی پیٹنے لگا۔

صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مشابرم خان کو ہراساں کرنے کے لیے یہ اداکاری کر رہا تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ پہاڑوں کے اس بیٹے کا عزم و حوصلہ بھی پہاڑوں جیسا تھا۔ بلتستان کے پہاڑوں میں قائم دہشت گردوں کے تربیتی کیمپ کو تن تنہا تباہ کر ڈالنے والے مشابرم خان کو کسی دھمکی سے متاثر کر دینا اتنا آسان نہیں تھا۔ البتہ اس کے سامنے تشدد کے جن حربوں کا تذکرہ کیا گیا تھا، انہیں سن کر اسے اپنے دشمنوں کی سفاکی اور بربریت کا خوب اندازہ ہو گیا تھا اور ساتھ ہی وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ پیر سائیں کی شخصیت پر کیا جانے والا شک واقعی درست ہے، ورنہ کسی روحانی شخصیت کے پیروکاروں یا مریدوں سے تو اتنی سفاکیت کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ روحانی پیشواؤں کی تو اولین ترجیح ہی نرم خوئی و نرم دلی ہوتی ہے ورنہ وہ لوگوں کو اپنا گرویدہ کر ہی نہیں سکتے۔

"واجد بھائی! آپ کو پیر سائیں یاد کر رہے ہیں۔" پستہ قامت اسے مزید مرعوب کرنے یا دھمکیاں دینے میں کامیاب ہوتا، اس سے قبل ہی ایک آدمی عجلت میں وہاں آیا اور اسے پیغام دیا۔

"اوہ...... مجھے تو پیر سائیں کے وڈے ضروری کام سے جانا تھا۔" پیغام سن کر واجد کے نام سے مخاطب کیا جانے والا پستہ قامت چونکا پھر ترکیب نمبر ایک یا دو استعمال کرنے کا مشورہ دینے والے شخص کی طرف پلٹا۔

"ابھی اسے سوچنے کے لیے تھوڑا ٹیم دے دے۔ چنگا ہے کہ اس کے متھے میں گل آ جائے ورنہ فیر تجھے اجازت ہے کہ کوئی سی بھی ترکیب آزما ڈال۔" عجلت میں ہدایت دے کر وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔

"چل بھئی...... بھائی کی مہربانی سے تجھے تھوڑی مہلت مل گئی ہے۔ اگر عقل مند ہوا تو خود ہی اپنی آسانی کا فیصلہ کرے گا ورنہ ہم تو سچ اگلوانے کے لیے تیار ہی ہیں۔" درشت رو شخص نے واجد کی روانگی کے بعد اس سے کہا اور اپنے ساتھیوں کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ وہ سب اشارہ پاتے ہی ایک ایک کر کے باہر نکلنے لگے۔

"ہور سن......" اس نے باہر نکلنے سے قبل مشابرم خان کے پہلو میں ایک ٹھوکر ماری۔ "اب کوئی لفڑا کرنے کی کوشش نہ کرنا ہور سکون سے یہاں پڑے رہنا۔ اگر اب تو نے کوئی الٹی سیدھی حرکت کی تو میرے بندے تیری ہڈیوں کے اتنے ٹوٹے کریں گے کہ گنے بھی نہ جا سکیں گے۔" اس نے مشابرم خان کے دروازہ توڑنے کی کوشش یاد آنے پر یہ دھمکی دی تھی جس پر اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور خاموشی سے فرش پر پڑا اسے باہر جاتا دیکھتا رہا۔ دروازہ بند ہونے کے بعد اس نے اپنی نظروں کا زاویہ بدلا اور وہیں پڑے پڑے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے سامنے وہی خالی سپاٹ دیواروں والا کمرا تھا جس میں باہر کی روشنی اور ہوا اندر پہنچانے کے لیے صرف ایک ہوادان موجود تھا اور اس ہوادان کی بلندی اتنی زیادہ تھی کہ وہ کسی طور اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

احساسِ بےبسی سے اس نے اپنا دایاں ہاتھ زور سے زمین پر مارا اور پھر خود ہی بلبلا اٹھا۔ ظالموں نے اتنی...... بیدردی سے اس کی ٹھکائی کی تھی کہ چند منٹوں میں ہی سارا جسم دکھتا ہوا پھوڑا بن کر رہ گیا تھا اور آگے وہ اس پر جو طبع آزمائی کرنے والے تھے، اس کی تو سنی جانے والی تفصیل ہی لرزہ خیز تھی۔ عملاً اسے کسی تجربے سے گزرنے والا کس عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہوگا، اس کا تو کوئی حساب ہی نہیں تھا۔ وہ بہادر اور باہمت تھا اور یہ بھی یقین رکھتا تھا کہ ایذا رسانی کی کسی ترکیب

کے سامنے ہتھیار ڈال کر زبان نہیں کھولے گا لیکن بہر حال اس کے دل میں یہ ایک بڑی فطری سی خواہش موجود تھی کہ اسے ایسے کسی دردناک تجربے سے نہ گزرنا پڑے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ بچاؤ کی تدبیر کیا ہوگی؟ اگر اپنے سابقہ بیان پر ڈٹا رہتا تو وہ لوگ لازماً اسے تشدد کا نشانہ بناتے اور اگر کوئی نئی کہانی تراش لیتا تو اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ اس کی کہانی پر یقین کر لیا جاتا۔

وہ عجیب ہی شش و پنج کے عالم میں زمین پر پڑا رہا پھر خیال آیا کہ اس طرح پڑے پڑے تو چوٹ کھایا ہوا جسم بالکل ہی اکڑ جائے گا، چنانچہ ہمت کر کے اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے کے طول و عرض میں آہستہ آہستہ چہل قدمی کرنے لگا۔ ابتدا میں اسے اس عمل میں کافی تکلیف محسوس ہوئی لیکن پھر آخر کار ہاتھ پیر کھلنے لگے۔ ساتھ ہی یہ اطمینان بھی ہو گیا کہ ضربات شدید ہونے کے باوجود اس کی ہڈیاں سلامت ہیں۔

''شش.....'' چہل قدمی کا سلسلہ جاری تھا کہ اس نے کمرے کی فضا میں ہلکی سی ششکار سنی۔ اس نے بے ساختہ ہی نظریں گھما کر ادھر ادھر دیکھا۔ آخر کار اس کی نظر ہوا دان کے چوکھٹے میں جا ٹھہری۔ وہاں ایک پندرہ سولہ سال کے لڑکے کی شکل نظر آ رہی تھی۔ اس سے نظر ملتے ہی لڑکا خوش نظر آنے لگا پھر اس نے گچھے کی شکل میں لپٹی رسّی کو اس کی طرف پھینکا۔ رسّی تیزی سے کھلتی ہوئی نیچے پہنچ گئی۔ اس وقت مشابرم خان نے پہلی بار یہ دیکھا کہ رسّی کے ایک سرے پر آنکڑا موجود ہے جو ہوا دان میں پھنسا ہوا ہے جبکہ آزاد سرے کو لڑکے نے اس کی طرف پھینک دیا تھا۔ وہ خود بھی یقیناً اسی رسّی کی مدد سے وہاں تک پہنچا تھا۔ اسے حیرت ہونے لگی کہ بھلا ٹاہلی والا میں اس کا ایسا کون سا ہمدرد نکل آیا جو اسے اس قید خانے سے نجات دلانے کے لیے سرگرم ہو گیا ہے۔

''سوچ کیا رہے ہو، جلدی سے رسّی پکڑ کر اوپر آ جاؤ۔'' اسے مخمصے میں پڑے دیکھ کر لڑکے نے دھیمی آواز میں جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کیا جس پر وہ فوراً ہی حرکت میں آ گیا اور رسی کی مدد سے آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگا۔

''لاؤ یہ رسّی اب مجھے دے دو۔ پہلے میں نیچے جاؤں گا۔ فیر تم آجانا۔ نیچے پہنچ کر میں رسّی کو تین جھٹکے دوں گا۔ تم سمجھ لینا کہ اب تم رسی کھینچ سکتے ہو۔'' جونہی وہ اتنی بلندی پر پہنچا کہ اس کے ہاتھ ہوا دان کے فریم کو گرفت میں لے سکیں، لڑکے نے اسے ہدایات دینا شروع کر دیں۔ اس کی بات تھی بھی معقول۔ ہوا دان اتنا وسیع نہیں تھا کہ اس میں بیک وقت دو آدمی سما سکتے۔ لڑکا وہاں سے ہٹتا، تب ہی اس کے لیے جگہ بن سکتی تھی۔ اس نے فوراً ہی رسّی چھوڑ کر ہوا دان کا فریم گرفت میں لے لیا۔ دوسری طرف لڑکے نے اپنی کارروائی شروع کر دی اور رسّی کی مدد سے دیوار کی دوسری طرف اترنا شروع کر دیا۔ ہوا دان کے چوکھٹے میں چڑھ کر بیٹھ جانے پر مشابرم خان کو باہر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ لڑکا رسّی کی مدد سے جس جگہ اتر رہا تھا، وہاں ایک خشک نالہ تھا جس میں بہت سا گھاس پھوس اور جھاڑ جھنکاڑ جمع تھا۔ قریب ہی ایک گدھا گاڑی کھڑی تھی جس کا گدھا ہر طرف سے بے نیاز خودرو جھاڑیوں کے پتوں پر منہ مارنے میں مصروف تھا۔ اسے اچھی طرح جائزہ لینے پر بھی دور تک کوئی اور انسان نظر نہیں آیا۔

سارے منظر پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر وہ ایک بار پھر لڑکے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کے قدم زمین پر ٹک چکے تھے اور وہ رسّی کو جھٹکے دے رہا تھا۔ پھر اسے متوجہ دیکھ کر اس نے جھٹکے دینا چھوڑ دیا اور ہاتھ سے اسے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ مشابرم خان اپنے اس کم سن ہمدرد کی ہدایت پر فوراً ہی عمل پیرا ہو گیا۔ ہوا دان سے زمین کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا کہ اگر وہ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد چھلانگ لگا دیتا تو کوئی دشواری پیش آتی۔ اس نے رسّی چھوڑ کر چھلانگ لگانے کا ارادہ بھی کیا لیکن پھر اس خوف سے ملتوی کر دیا کہ کہیں نیچے موجود جھاڑ جھنکاڑ میں نکیلے کانٹے نہ ہوں اور اس کے پیروں کو زخمی کر دیں۔ اسے قیدی بنانے والوں نے اس کے جوتوں سمیت ہر شے اپنے قبضے میں کر لی تھی اور وہ تن کے کپڑوں کے سوا ہر شے سے محروم ہو چکا تھا۔ کچھ دیر قبل ہونے والی مار پیٹ نے ویسے ہی اس کا جوڑ جوڑ ہلا ڈالا تھا، چنانچہ وہ ذرا سی بداحتیاطی سے اپنے پیروں کو زخمی کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

''جلدی کرو بھائی! یہاں زیادہ دیر رکنے سے گڑبڑ بھی ہو سکتی ہے۔'' جیسے ہی اس کے قدم زمین سے لگے، لڑکے نے اس سے کہا۔

''تم کون ہو اور مجھے یہاں سے کیوں نکالا ہے؟'' مشابرم خان نے اپنے ذہن میں مسلسل اٹھنے والا سوال اس سے کر ڈالا۔

''یہ ساری تفصیل بھی ہوتی رہے گی لیکن پہلے یہاں سے نکلنے کی کرو۔ کسی نے دیکھ لیا تو تمہارے ساتھ ساتھ میں بھی مارا جاؤں گا۔'' لڑکے کے انداز میں واضح عجلت تھی۔ وہ تھوڑا سا خوف زدہ بھی نظر آ رہا تھا۔ یقینی سی بات تھی کہ پیر سائیں کے حواریوں کے قیدی کو فرار کروانا شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا..... اور وہ کم سن لڑکا اگر کسی بھی وجہ سے یہ جرأت کر بیٹھا تھا تو اسے بہر حال اپنی سلامتی کی فکر تو

دامن گیر ہونی ہی تھی۔

''میں تمہیں پنڈ سے باہر نکال دوں گا اس سے آگے کی ذمے داری تمہاری اپنی ہوگی۔'' خشک نالے سے نکل کر گدھا گاڑی کی طرف جاتے ہوئے لڑکے نے اسے بتایا۔

''تمہارا نام کیا ہے..... کم از کم اتنا ہی بتا دو کہ بات چیت کرنے میں آسانی رہے۔'' حالات کو سمجھتے ہوئے اس نے لڑکے کا تفصیلی حدود اربعہ معلوم کرنے کا ارادہ ملتوی کر کے اس سے اس کا نام دریافت کیا۔

''علی بخش۔'' لڑکے نے مختصر جواب دیا جسے سن کر وہ چونک پڑا۔ پیر سائیں اور حامد راؤ کی شخصیت کے بارے میں بہت سے اہم انکشافات کرنے والے مزارع کا نام نور بخش تھا اس لیے یہ گمان کیا جا سکتا تھا کہ لڑکے کی اس سے کوئی نسبت ہے۔ ویسے تو گاؤں دیہاتوں میں اس قسم کے نام رکھنا ایک عام سا رواج ہوتا ہے لیکن ٹاہلی والا اس کے لیے ایک بالکل اجنبی پنڈ تھا جہاں وہ یہی امید کر سکتا تھا کہ جلے ہوئے کھیتوں میں ملنے والے نور بخش کے دل میں اس کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہو گئے ہوں اور اس نے اپنے کسی رشتے دار کو اس کی مدد کے لیے بھیجا ہو۔ لڑکے کی عمر دیکھتے ہوئے وہ یہی اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ نور بخش کا بیٹا ہوگا کیونکہ اپنی گفتگو میں نور بخش نے اسے یہی بتایا تھا کہ اس کا بیٹا شفقت راؤ کے بیٹے کا ہم عمر اور ابتدائی درجوں کا ہم جماعت تھا۔ اس حساب سے علی بخش نامی وہ لڑکا نور بخش کا بیٹا ہی ہو سکتا تھا۔ حقیقت جو بھی تھی، فی الحال وہ صرف قیاس آرائی ہی کر سکتا تھا۔ تصدیق یا تردید اسی وقت ہوتی جب لڑکا اس سے گفتگو پر آمادہ ہوتا۔

''تم اس گدھا گاڑی پر لیٹ جاؤ۔ میں تمہارے اوپر گھاس وغیرہ پھیلا دوں گا۔ اس طرح کوئی تمہیں دیکھ نہیں سکے گا۔'' گدھا گاڑی کے قریب پہنچ کر علی بخش نام بتانے والے لڑکے نے اسے ہدایت دی جس پر اس نے فوراً عمل درآمد کر ڈالا۔ لڑکا پھرتی سے اس کے اوپر گھاس کے گٹھر پھیلانے لگا۔ یہ گٹھر یقینی طور پر اس کے منصوبے کا ایک لازمی حصہ تھے جن کا اس نے پختگی انتظام کر رکھا تھا۔ گٹھر پوری طرح اس پر جمانے کے بعد علی بخش اچک کر گدھا گاڑی پر سوار ہو گیا اور گدھے کو چابک رسید کر کے چلنے کا اشارہ دیا۔ اس آخری منظر کو مشابرم خان نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا بلکہ محض آوازوں اور حرکت سے تصور میں لایا تھا کیونکہ گھاس کے گٹھروں کے نیچے دبے ہونے کی وجہ سے نہ صرف وہ خود دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا بلکہ خود بھی کسی کو دیکھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

ہچکولے کھاتی گدھا گاڑی پر شروع ہونے والا سفر اتنا خوش گوار نہیں تھا جسے خاص طور پر اس لیے بھی کہ اس کے نتھنوں میں گھاس کی خوشبو گھسی جا رہی تھی اور سانس لینے کے لیے ہوا کی خاصی قلت تھی۔ اس پر سے متضاد اسے اپنے وجود پر گھاس کے گٹھروں کا بوجھ بھی برداشت کرنا پڑ رہا تھا لیکن پھر بھی اس کے لیے یہ صورتِ حال قابل قبول تھی کیونکہ یہی اس کی آزادی کی راہ تھی۔ ایک ایسی جگہ پر جہاں اس کا کوئی آشنا یا دوست موجود نہیں تھا اور وہ اپنے موبائل سمیت ہر شے سے محروم کر دیے جانے کے بعد بالکل بے دست و پا ہو کر رہ گیا تھا..... آزادی کی اس صورت کا نکل آنا غیبی امداد ہی محسوس ہو رہی تھی اور وہ اس غیبی امداد پر کسی قسم کا اعتراض کر کے کفرانِ نعمت کا مرتکب نہیں ہو سکتا تھا۔

گدھا گاڑی کا جھٹکوں اور ہچکولوں سے بھرپور وہ سفر جانے کتنی دیر جاری رہا۔ پھوڑے کی طرح دکھتے جسم کے ساتھ اسے تو یہ سفر خاصا طویل ہی لگا تھا چنانچہ جب گدھا گاڑی رکی تو اس نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا اور خود اپنے ہاتھوں سے گٹھر ہٹا کر اٹھ بیٹھنے کی شدید خواہش پر قابو پاتے ہوئے علی بخش کی طرف سے اشارہ ملنے کا انتظار کرنے لگا..... کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ان مخدوش حالات میں اس کی ذرا سی بھی بداحتیاطی کسی بڑی مصیبت کو دعوت دے سکتی ہے۔

''میں گٹھر ہٹا رہا ہوں۔'' اسے زیادہ دیر انتظار کی زحمت سے نہیں گزرنا پڑا اور کان میں علی بخش کی مدھم سی سرگوشی سنائی دی۔ سرگوشی کے فوراً بعد ہی اس نے اپنے اوپر سے گٹھر ہٹتے ہوئے محسوس کیے اور بالآخر کھلا آسمان بھی دکھائی دے ہی گیا۔

''بہت بہت شکریہ علی بخش! آج تم نے مجھ پر جو احسان کیا ہے، وہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ تم جو بھی ہو اور تم نے جس بھی وجہ سے میری مدد کی ہے، میں اس احسان کے بدلے میں تمہارا دل سے شکر گزار ہوں۔'' اس نے گدھا گاڑی پر سیدھے بیٹھتے ہوئے دل کی گہرائیوں سے یہ الفاظ ادا کیے۔

''تمہارا شکریہ میں بعد میں وصول کرتا رہوں گا لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟'' اچانک ہی علی بخش نے بالکل بدلے ہوئے تیوروں کے ساتھ اس سے یہ سوال کیا تو وہ چونک پڑا اور بہت تیزی سے یہ خیال ذہن میں آیا کہ کہیں یہ لڑکا بھی پیر سائیں کے ہرکاروں میں سے ایک نہ ہو جسے اس سے سچ اگلوانے کے لیے اس طریقے سے استعمال کیا گیا ہو۔ لیکن لڑکے کے چہرے پر پھیلی معصومیت اور سادگی ذہن میں پیدا ہونے والے اس اندیشے کی تردید کر رہی تھی۔ وہ دبلا پتلا لڑکا

جس کی ابھی صرف مسیں بھیگی تھیں، کسی طرح ان کرخت صورت اور مکار لوگوں میں سے محسوس نہیں ہو رہا تھا جنہیں پیر سائیں کے مرید ہونے کا دعویٰ تھا۔

''میں تمہارے انداز کی تبدیلی کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔ کچھ دیر پہلے تم مجھے اپنے ہمدرد محسوس ہو رہے تھے اور اب مجھ پر یہ کلہاڑی تانے کھڑے ہو۔'' اس نے دزدیدہ نظروں سے علی بخش کے ہاتھ میں موجود چمک دار پھل والی کلہاڑی کو دیکھا۔ یہ کلہاڑی اس نے گدھا گاڑی میں سوار ہوتے وقت بھی ایک جانب پڑی دیکھی تھی لیکن یہ گمان نہیں ہوا تھا کہ وہ اسے خود اسی کی ذات پر آزمانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

''فی الحال میں تمہارا دوست ہوں اور نہ دشمن۔ دوستی اور دشمنی کا فیصلہ اسی وقت ہوگا جب میں یہ جان لوں گا کہ میرے باپ کی موت سے تمہارا کیا تعلق ہے؟ ابھی تم یہ جان لو کہ ہم جس جگہ موجود ہیں یہاں عام طور پر کوئی نہیں آتا اس لیے اگر میں تمہیں قتل بھی کر ڈالوں تو کوئی دیکھنے والا نہیں ہوگا۔ ویسے بھی میں تمہارا قتل کر کے کسی مشکل میں نہیں پھنسوں گا بلکہ میرے اس کارنامے کے بدلے پیر سائیں کے چاہنے والے میری پیٹھ ہی تھپکیں گے۔ ہاں اگر تم بے گناہ ہو تو یہ بھی بتا دوں کہ اس جگہ سے تمہیں پنڈ کے باہر کسی محفوظ مقام تک پہنچانا میرے لیے زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔'' اپنے باپ کی موت کا ذکر کرتے ہوئے پل بھر کے لیے اس کی آواز بھرائی تھی اور آنکھوں میں نمی سی ظاہر ہوئی تھی لیکن پھر اس نے فوراً ہی خود پر قابو پا لیا اور دوٹوک انداز میں اس پر اس کی پوزیشن واضح کرنے لگا۔

''دیکھو بچے! تم مجھ سے کھل کر بات کرو۔ تم مجھ سے بہت چھوٹے ہو اور میں تمہیں اپنے چھوٹے بھائی کی طرح محسوس کر رہا ہوں۔ لیکن تمہارا سوال مجھ پر واضح نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا کہ تمہارا باپ کون ہے تو پھر اس کی موت کے بارے میں کیسے بتا سکتا ہوں؟'' اس نے نرمی اور تحمل سے کام لیتے ہوئے علی بخش کو جواب دیا۔

''تم میرے باپ کو نہیں جانتے تو پھر اس کے ساتھ اتنی دیر تک کھیتوں میں بیٹھے باتیں کیوں کر رہے تھے؟'' اس نے چبھتا ہوا سوال کیا۔

''اوہ۔۔۔ تو تم نور بخش کے بیٹے ہو۔'' اندازہ تو وہ پہلے ہی لگا چکا تھا، اب تصدیق ہونے پر دانستہ لہجے میں تحیر پیدا کرتے ہوئے بولا۔

''ہاں، میں اسی نور بخش کا بیٹا ہوں جسے تمہاری موجودگی میں گولی ماری گئی تھی اور میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ میرے باپ کا آخر قصور کیا تھا؟'' اس بار اس کی آواز کی بھراہٹ اتنی نمایاں تھی کہ مشاہرم خان کو لگا کہ وہ اگلے ہی پل پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے گا۔ ساتھ ہی اسے گولی چلنے کی وہ آواز بھی یاد آئی جو اس نے بے ہوشی میں جاتے ہوئے سنی تھی۔ وہ حقیقتاً مضطرب ہوا تھا۔

''تو کیا نور بخش کو قتل کر دیا گیا؟''

''ہاں۔۔۔ میں نے اپنی نظروں کے سامنے اپنے باپ کو مرتے ہوئے دیکھا لیکن کچھ نہیں کر سکا۔ وہ لوگ اسے قتل کرنے کے بعد تمہیں اٹھا کر دیدہ دلیری کے ساتھ فرار ہو گئے۔ اب تم بتاؤ کہ تمہارا میرے باپ کے قتل سے کیا تعلق ہے؟ ان لوگوں نے تمہیں اس کے ساتھ دیکھ کر اسے کیوں مار ڈالا؟'' علی بخش کے لہجے میں بڑا کرب تھا۔ خود مشاہرم خان کو نور بخش کے قتل کا سن کر شدید افسوس ہوا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس غریب مزارع کو صرف اس جرم میں کہ وہ اسے چند حقائق سے آگاہ کر بیٹھا تھا، جان سے مار دیا گیا تھا۔

''مجھے نور بخش کی موت پر شدید افسوس ہے۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اگر تم چاہو تو مجھے اپنے باپ کے قتل کا ذمے دار سمجھ کر مجھ سے بدلہ لے سکتے ہو۔'' وہ بلا کم و کاست علی بخش کو اپنی ٹاہلی والا میں آمد سے لے کر نور بخش سے ملاقات کی تفصیل تک سب سناتا چلا گیا۔ البتہ اس نے اتنی احتیاط ضرور کی تھی کہ اس معاملے میں شہریار کا نام استعمال کرنے کے بجائے خود کو کسی خفیہ ادارے کا ملازم ظاہر کیا تھا۔ اتنا کچھ بھی وہ اسے اس لیے بتا گیا تھا کہ اسے یہ چھوٹا سا لڑکا بہت اچھا اور قابلِ اعتماد لگا تھا۔ پھر نور بخش نے صداقت والے معاملے میں اس کا جس طرح سے ذکر کیا تھا، اس سے بھی ظاہر تھا کہ وہ خاصی فہم و فراست کا مالک ہے اور اسے کچھ بتا دینا نقصان دہ نہیں ہو سکتا تھا۔

''مجھے یقین تھا کہ بات جو بھی ہوگی، اس میں اصل قصور پیر سائیں کے غنڈوں کا ہی ہوگا۔ مجھے معاف کرنا بھرا۔۔۔ اپنے غم میں، میں تمہارے ساتھ تھوڑی بدتمیزی کر گیا۔'' تفصیلات سن کر اس نے فوراً ہی معافی مانگ لی۔

''نہیں میرے بھائی! تم نے کوئی بدتمیزی نہیں کی۔ تم نے جو کچھ کیا، اپنی جگہ صحیح کیا بلکہ میں تمہاری جرأت اور ہوشیاری پر حیران ہوں۔ تم اتنے چھوٹے ہو کر جس طرح ان غنڈوں کے خلاف عمل میں آئے، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔'' مشاہرم خان نے دل کی گہرائیوں سے اسے سراہا جس پر علی بخش کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر وہ اداس سے لہجے میں بولا۔

"سچ بات یہ ہے بھائی کہ جب انسان کے دل میں آگ لگی ہو تو جرأت اور ہوشیاری خود بہ خود ہی آجاتی ہے۔ میں اپنے باپ کی دردناک موت پر اتنا دکھی ہوں کہ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر تم مجرم نکلے تو تمہیں مار ڈالوں گا ورنہ اگر تم میرے باپ کے دوست ہو تو تمہیں بچانا اور اس کی موت کا اصل سبب جاننا بھی میرا فرض ہے۔ زیادہ شک تو مجھے یہی تھا کہ اصل مجرم پیر سائیں کے غنڈے ہی ہیں۔ تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ تھانے میں ابا کے قتل کی جو رپورٹ درج ہوئی ہے، اس میں تمہیں مفرور قاتل ظاہر کیا گیا ہے اور ثبوت میں جائے وقوعہ سے تمہارا موبائل اور شناختی کارڈ ملنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ میں نے بہت کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اس رپورٹ کی مخالفت کرنا چاہتا تھا لیکن میری ماں نے مجھے روک دیا۔ اس کا کہنا ہے کہ شوہر کے بعد وہ اپنے بچوں کو نہیں کھونا چاہتی اس لیے خاموشی ہی بہتر ہے۔ ماں کے احترام میں، میں نے سر جھکا دیا لیکن میں کسی طرح اپنے باپ کے قتل کو نہیں بھول سکتا تھا اس لیے حرکت میں آگیا۔" علی بخش نے اسے تفصیل سے بتایا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں کہاں قید ہوں؟ پھر تم ٹھیک اسی کمرے کے ہوادان تک پہنچ گئے جہاں مجھے رکھا گیا تھا۔" مشابرم خان بھی اپنی ساری الجھنیں دور کرنے پر تلا ہوا تھا۔

"تمہیں جہاں رکھا گیا تھا، وہ مکان باقی گاؤں سے کافی ہٹ کر ہے اور آسیب زدہ مشہور ہے اسی لیے اس کے آس پاس کا علاقہ بھی ویران ہی رہتا ہے۔ ہمارے پاس چند پالتو بکریاں اور بھیڑیں وغیرہ ہیں۔ میں ان کے لیے چارے کا بندوبست کرنے کبھی کبھی اس طرف بھی نکل جاتا تھا اس لیے میری نظر میں یہ بات آگئی کہ اس مکان میں پیر سائیں کے مریدوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ میں نے انہیں وہاں کچھ رکھتے یا نکالتے بھی دیکھا ہے۔ ڈبے میں پیک وہ کیا چیز ہوتی ہے مجھے نہیں معلوم لیکن میں نے ابا کی تدفین کے بعد جب تمہیں تلاش کرنے کے بارے میں سوچا تو میرے ذہن میں یہی آیا کہ پیر سائیں کے غنڈے تمہیں وہیں لے گئے ہوں گے۔ میں گھر سے جانوروں کے لیے چارا لانے کا بہانہ کر کے نکلا اور مکان کے قریب چھپ کر نگرانی کرنے لگا۔ جب میں نے پیر سائیں کے واجد نامی چہیتے مرید کو اپنے آدمیوں کے ساتھ وہاں آتے دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ تم وہیں ہو۔ خوش قسمتی سے دو سال تک ہمارے اسکول میں ایک ایسے استاد نے بھی پڑھایا تھا جنہوں نے ہمیں اسکاؤٹس بننے کی تربیت دی۔ اسی تربیت کی وجہ سے میں رسّی کی مدد سے اوپر ہوادان تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اور یہ اتفاق ہی تھا کہ تم اسی کمرے میں موجود تھے۔ مکان کا پچھلا حصہ ہونے کی وجہ سے کسی نے مجھے وہاں دیکھا بھی نہیں اور میں آرام سے تمہیں وہاں سے نکال لایا۔"

علی بخش کی بتائی ہوئی ہر بات اس کے ذہن میں اٹھتے ہوئے سوالوں کا جواب بنتی جا رہی تھی چنانچہ وہ سکون بھرا ایک گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ "مجھے امید ہے کہ اب تمہارا مجھ پر سے ہر شک دور ہو گیا ہوگا اور اب تم مجھے گاؤں سے باہر نکالنے میں کوئی حرج نہیں سمجھو گے؟"

"بالکل ... کیوں نہیں؟ لیکن تمہیں ایک بار پھر گھاس کے ٹھڑوں کے نیچے لیٹنے کی زحمت کرنی پڑے گی۔ میں جس راستے سے تمہیں گاؤں سے باہر نکالنے والا ہوں، وہ عام گزرگاہ نہیں ہے لیکن پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔" علی بخش نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے جو تم مناسب سمجھو۔" وہ فوراً ہی راضی ہو گیا اور ایک بار پھر پہلے والے انداز میں لیٹ گیا۔ علی بخش اس کے جسم پر گھاس کے ٹھڑ جمانے لگا۔

"ایک بات سنو علی بخش!" اس نے ذہن میں آنے والے ایک خیال کے تحت اسے پکارا۔

"ہاں بولو بھائی۔" وہ فوراً ہی متوجہ ہو گیا۔

"میں تم پر زور نہیں دے رہا۔ نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ تمہاری جان خطرے میں پڑے لیکن اگر تم اپنے باپ کے قاتلوں کو انجام تک پہنچانا چاہتے ہو تو اتنا کر سکتے ہو کہ اپنے ہاتھ پیر بچاتے ہوئے ان لوگوں پر نظر رکھو کہ یہ پیری مریدی کے بھیس میں اصل کام کیا کر رہے ہیں۔ کسی دن میں یا میرا کوئی آدمی آکر تم سے معلومات لے لیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ذرا سی کوشش کی جائے تو ہم ان بہروپیوں کی اصلیت جان کر انہیں بے نقاب کر دیں گے اور تمہارے گاؤں کے سادہ لوح لوگ ان کے شر سے محفوظ ہو جائیں گے۔" مشابرم خان نے بہت سمجھاؤ سے اپنا مدعا بیان کیا جسے سن کر علی بخش نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر فوراً ہی اثبات میں گردن ہلا دی۔ اس کے حامی بھرنے پر وہ خوش ہو گیا پھر علی بخش کو اپنے چہرے کے سامنے ٹھہر رکھتے دیکھ کر سکون سے آنکھیں موند لیں۔ ٹاہلی والا میں بہت مشکل وقت گزارنے کے باوجود وہ یہاں سے بالکل ہی ناکام واپس نہیں جا رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ جتنی کارگزاری وہ دکھا سکا ہے، اسے بھی شہریار کی طرف سے سراہا جائے گا۔

☆☆☆

"بات سنا بہن!" ماہ بانو بس سے اتری تو اس کے ساتھ اترنے والوں میں وہ عورت بھی شامل تھی جو اپنے بچے کے ساتھ اس کے برابر والی نشست پر بیٹھی تھی اور راستے بھر وقفے وقفے سے روٹی کے ٹکڑوں کو آم کے اچار سے کھاتی رہی تھی۔ اپنے مطلوبہ بس اڈے پر اس عورت کو اترتے دیکھ کر اس نے بہتر سمجھا کہ اسی سے اسلم کے گھر کا اتا پتا معلوم کر لے تاکہ بغیر بھٹکے سیدھی وہاں پہنچ سکے۔ اسلم نے اسے بس اڈے سے اپنے گھر تک پہنچنے کے لیے کچھ نشانیاں تو بتائی تھیں لیکن پھر بھی وہ تذبذب کا شکار تھی۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں ایسا کوئی نظام بھی نہیں تھا کہ کسی کا گھر تلاش کرنے کے لیے مکان نمبر یا گلی نمبر کا استعمال کیا جا سکے۔ یہاں یہ طریقہ رائج ہی نہیں تھا۔ چھوٹے سے گاؤں کی مختصر سی آبادی میں لوگ ایک دوسرے کو اتنی اچھی طرح جانتے تھے کہ باپ دادا کے ناموں تک سے بھی واقف تھے۔ یہ بات اسلم نے اسے بطورِ خاص بتائی تھی۔ وہ خود بھی گاؤں دیہاتوں کے اس طرزِ زندگی سے واقف تھی۔ اس لیے اپنی ساتھی مسافر کو اپنے ساتھ ہی اترتے دیکھ کر اسے مخاطب کر بیٹھی۔ وہ عورت اس کی طرح تنہا نہیں تھی بلکہ اس کے ساتھ بس سے ایک مرد بھی اترا تھا۔ دبلا پتلا، گہری رنگت اور دراز قامت والے اس مرد کے چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں جس کی وجہ سے چہرے پر کرختگی سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ عمر میں عورت سے لگ بھگ دس بارہ سال بڑا محسوس ہو رہا تھا۔

"کہڑی گل ہے ادی؟" اس کے پکارنے پر عورت متوجہ ہوئی تو مرد بھی قدرے فاصلے پر رک کر دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ اس نے جان بوجھ کر اسے نظر انداز کر دیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس قسم کے چھوٹے علاقوں میں تنہا عورت خود بہ خود ہی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے اور لوگ اسے عجیب نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں۔

"یہاں اس گاؤں میں اسلم تنیو کی ماں رہتی ہے۔ مجھے اس کے گھر تک جانا ہے۔" اس نے اپنا مدعا بیان کیا جسے سن کر عورت کوئی جواب دیے بغیر ٹکر ٹکر اس کی شکل دیکھنے لگی۔

"اسلم کا باپ اکرم تنیو ریلوے میں ملازمت کرتا تھا اور کئی سال پہلے مر چکا ہے۔ اس کی ایک بیٹی بھی تھی جس نے خودکشی کر لی تھی۔" عورت کے تاثرات سے وہ یہ سمجھی کہ وہ اس کا مدعا سمجھ نہیں سکی ہے اس لیے مزید حوالے دینے لگی۔

"آپ زینت بی بی کا تو نہیں پوچھ رہی ہو؟" عورت کے کچھ بولنے سے قبل مرد نے درمیانی فاصلہ طے کیا اور اس کے دوبدو ہو کر پوچھا۔

"ہاں ہاں وہی ....." اسے یاد آگیا کہ اسلم نے اپنی ماں کا یہی نام بتایا تھا۔

"آپ ہمارے ساتھ چلو۔ میں آپ کو زینت بی بی کا گھر دکھا دوں گا۔" مرد نے فوراً ہی پیشکش کی جسے اس نے قبول کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھا اور ان کا بس اڈے سے پیدل سفر شروع ہو گیا۔ حسبِ توقع سفر لمبا تھا۔

"آپ اسلم کی کون ہو؟" راستے میں مرد نے اس سے دریافت کیا۔ اس کے انداز میں گہرا تجسس تھا۔

"میں ان لوگوں کی دور کی رشتے دار ہوں اور کراچی سے آئی ہوں۔ مجھے کسی سے اطلاع ملی تھی کہ زینت بی بی بیٹی کی موت اور بیٹے کے فرار کے بعد بالکل تنہا رہ گئی ہے۔ میں بھی کراچی میں اکیلی ہی رہتی ہوں اس لیے میں نے سوچا کہ زینت بی بی کو اپنے ساتھ لے جاتی ہوں۔ اس طرح ہم دونوں کی ہی تنہائی دور ہو جائے گی۔" اس نے پہلے سے سوچی ہوئی کہانی اسے سنا ڈالی۔

"تم اکیلی کیوں رہتی ہو؟ تمہارے گھر والے کہاں ہیں؟" مرد نے فوراً ہی ایک دوسرا سوال داغ دیا۔

"میرے شوہر ملک سے باہر ہیں اور سال چھ مہینے میں ہی چکر لگاتے ہیں اسی لیے میں زینت بی بی کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہوں۔" اس نے تحمل سے جواب دیا۔

"تمہارے بچے نہیں ہیں؟" وہ اس کا مکمل انٹرویو لینے پر تلا ہوا تھا۔

"نہیں۔" اس نے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ مختصر جواب دیا۔ مرد کے مقابلے میں عورت نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا تھا اور اپنے بچے کو گود میں اٹھائے چپ چاپ چلتی رہی تھی۔ اس کے ساتھ چلتے مرد کو اتنی توفیق بھی نہیں ہوئی تھی کہ پیدل چلنے کی اس مشقت میں کم از کم عورت کو بچے کے بوجھ سے آزاد کر کے اسے اپنی گود میں لے لے۔

"لاؤ بہن! تھوڑی دیر کے لیے بچہ مجھے تھما دو۔" کچھ عورت کی ہمدردی میں اور کچھ مرد کے سوالات سے بچنے کے لیے اس نے عورت کو پیشکش کی۔

"نہیں ادی! تم پریشان نہ ہو۔ مجھے عادت ہے بچہ گود میں اٹھا کر چلنے کی۔" فوراً ہی اس کا مقصد سمجھتے ہوئے عورت نے جواب دیا۔ جواب دیتے ہوئے اس کی نظریں پل بھر کے لیے ماہ بانو کی نظروں سے ٹکرائی تھیں۔ ان آنکھوں میں عجیب سا تاثر تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اس سے کچھ کہنا چاہ رہی ہو لیکن کہنے سے معذور ہو۔

"یہ ٹھیک بول رہی ہے بی بی! ہماری عورتیں شہری عورتوں کی طرح نازک مزاج نہیں ہوتیں کہ ذرا سا بچہ گود میں لے کر چلنے سے کمر میں بل پڑ جائے۔" مرد نے اپنی دخل اندازی ضروری سمجھتے ہوئے ٹکڑا لگایا۔ جواب میں ماہ بانو نے بحث نہیں کی۔ اس اجنبی گاؤں میں جہاں وہ اسلم کے حوالے کے ساتھ آئی تھی کسی سے بھی غیر ضروری مخالفت مول لینا مناسب نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کبھی کبھی معمولی نظر آنے والی باتیں بھی آگے چل کر بڑی بڑی مصیبتوں کو جنم دیتی ہیں اس لیے بہتر تھا کہ وہ حتی الامکان احتیاط سے کام لیتی۔

"پہلے میں اپنی زنانی کو گھر چھوڑوں گا پھر تمہیں زینت بی بی کا مکان دکھاؤں گا۔" چلتے چلتے جب وہ لوگ ایسے مقام پر پہنچے جہاں سے مکانات نظر آنے لگے تو مرد نے اس سے کہا۔ جواب میں اس نے سر کو اثبات میں جنبش دے کر اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ مکانات کا سلسلہ شروع ہوا تو مرد کے قدموں میں تیزی آگئی اور وہ ان دونوں سے چند قدم آگے بڑھ گیا۔ ماہ بانو کی نظر اسی پر تھی اس لیے جب چلتے چلتے اس نے اچانک اپنے ہاتھ پر دباؤ محسوس کیا تو بُری طرح چونک گئی۔ وہ اس کے ساتھ چلتی عورت تھی جس نے اس کے بائیں ہاتھ پر اپنے ہاتھ سے دباؤ ڈالا تھا۔

"تمہیں اسلم نے یہاں بھیجا ہے نا؟" اس نے بے حد مدھم آواز میں اس سے سوال کیا۔ سوال بھی کیا تھا بس گویا ایک یقین سا تھا اس کے الفاظ میں اور وہ ماہ بانو سے محض تصدیق چاہ رہی تھی۔ اس کے اس قدر درست اندازے پر وہ ششدر سی رہ گئی۔

"تم یہاں سے چلی جاؤ ورنہ اسلم مشکل میں پڑ جائے گا۔" شاید ماہ بانو کے تاثرات نے ہی تصدیق کا کام کر دیا تھا جو وہ اس کی زبان سے جواب سنے بغیر عجلت میں بولی۔

"تم کون ہو، تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہے؟" اس نے سرسراتے لہجے میں سوال کیا۔ لیکن عورت کو جواب دینے کا موقع نہیں ملا اور مرد نے پلٹ کر اسے ڈپٹا۔

"کیا مرے مرے قدموں سے چل رہی ہے۔ گھر جانے کو دل نہیں چاہ رہا کیا؟" اس کے لہجے میں ایسی تندی اور کاٹ تھی کہ عورت کے قدم برق رفتاری سے حرکت میں آگئے اور پل بھر میں ہی وہ اس سے کئی قدم آگے بڑھ گئی۔ ماہ بانو ہکا بکا اسے دیکھتی ہی رہ گئی اور وہ ایک پختہ مکان کے دروازے میں داخل ہو کر غائب بھی ہو گئی۔

"چلو بی بی! اب میں تمہیں زینت بی بی کا گھر دکھا دیتا ہوں۔" اس سے قبل کہ وہ عورت کے دیے مشورے پر عمل کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتی، مرد اس کی طرف پلٹا۔ وہ بھی سر جھٹک کر اس کے پیچھے ہولی۔ اب جبکہ وہ یہاں تک آ ہی گئی تھی تو واپس پلٹنا بیکار تھا۔ رہی خطرہ مول لینے والی بات تو خطرہ تو اس نے یہاں آنے کا فیصلہ کر کے پہلے ہی مول لے لیا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" مرد کے ساتھ چلتے چلتے اس نے اچانک ہی سوال کیا۔

"نواز چانڈیو۔" اس نے بتایا پھر پوچھنے لگا۔ "تم میرا نام کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"بس..... میں نے سوچا کہ زینت خالہ سے ملوں گی تو انہیں بتاؤں گی کہ مجھے ان تک پہنچانے والے مہربان لوگ کون ہیں۔" اس نے بے پروا سا انداز اختیار کر کے جواب دیا۔

"ضرور بتانا۔ وہ میرا نام سن کر بہت خوش ہوگی۔" نواز چانڈیو کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی جسے دیکھ کر ماہ بانو کو اس کی بیوی کی تنبیہہ یاد آگئی اور دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ شاید وہ بہت زیادہ خطرے میں گھر گئی تھی لیکن اب کر بھی کیا سکتی تھی، اب تو کوئی جائے فرار بھی نہیں رہی تھی۔

"وہ دیکھو، وہ رہا زینت بی بی کا گھر۔ تم جا کر اس سے مل لو۔ میں واپس جاتا ہوں۔" اس کے دل میں پیدا ہوتے خدشات کے برخلاف نواز چانڈیو اسے دور ہی سے ایک گھر کی طرف اشارہ کر کے واپس پلٹ گیا۔ وہ کچھ دیر کے لیے اسے وہاں سے جاتا دیکھتی رہی پھر اس مکان کی طرف متوجہ ہوئی جس کی طرف وہ اشارہ کر گیا تھا۔

مکان باہر سے دیکھنے میں بالکل ویران اور بے آباد لگ رہا تھا۔ ایک ایسا مکان جو اپنے مکینوں سے محروم ہو گیا ہو اور وہاں صرف ایک بوڑھی غم زدہ عورت..... باقی رہ گئی ہو۔ اسے ایسا ہی ویران اور وحشت زدہ نظر بھی آنا چاہیے تھا۔ اس نے بوجھل ہوتے دل کے ساتھ آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی لیکن کئی بار کی دستک کے جواب میں بھی اندر سے کوئی جواب وصول نہیں ہوا۔ البتہ وہ اتنا اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گئی کہ دروازہ اندر سے بند نہیں ہے اور اسے ہاتھ سے دھکیل کر کھولا جا سکتا ہے۔ کوئی چارہ نہ دیکھ کر اس نے یہی طریقہ استعمال کیا۔ پرانا بوسیدہ دروازہ اس کے دھکا دیتے ہی چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ کھل گیا اور اس نے ایک بار پھر دستک دینے کے بعد قدم اندر رکھا۔ اندر قدم رکھتے ہی اس کی قوتِ شامہ نے اندازہ لگا لیا کہ یہ دروازہ بہت دنوں بعد کھلا ہے اور اندر صفائی وغیرہ کا کوئی معقول انتظام بھی نہیں ہے۔ گرد

سے اٹے فرش پر اپنے جوتوں کے نشان چھوڑتی ہوئی وہ اندر کا جائزہ لینے لگی۔

گھر چھوٹا سا تھا اور اس میں باورچی خانے اور غسل خانے کے علاوہ صرف دو کمرے تھے۔ ایک کمرے میں جھانکنے پر اسے چارپائی پر پڑا مدقوق سا وجود نظر آگیا۔ ہڈیوں کا ڈھانچا بنی وہ عورت جس کی آنکھیں دروازے پر جمی تھیں، اسلم کی ماں ہے یہ سوچ کر اسے سخت صدمہ ہوا۔ اسلم ایک دن باتوں باتوں میں اس کے سامنے ذکر کر چکا تھا کہ وہ شکل وصورت میں اپنی ماں سے مشابہ ہے لیکن اس کے سامنے جو عورت لیٹی تھی، اس کے نین نقش تو جانے کہاں کھو گئے تھے؟ گوشت سے محروم چہرے پر ہڈیوں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ بس سیاہ آنکھیں تھیں جو دو گڑھوں میں دھنسی دروازے کی جانب نگراں تھیں۔ وہ لپک کر عورت کے قریب پہنچی اور اس کا ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگاتے ہوئے رو پڑی۔ روتے ہوئے اس کے ہونٹوں سے بس ایک لفظ نکل سکا۔

"ماں جی....." اور آگے آنسوؤں کے حلق میں پھنسے گولے نے اسے کچھ بولنے نہیں دیا۔

"اس..... لم۔" جواباً انہوں نے بالکل دھیمی نقاہت زدہ آواز میں ایک لفظ پکارا، وہ بھی ٹکڑوں میں۔ صاف ظاہر تھا کہ کمزوری اتنی زیادہ ہے کہ انہیں بولنے کا بھی یارا نہیں رہا۔

"میں آپ کو اسلم کے پاس لے جانے کے لیے آئی ہوں ماں جی۔" اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ ان سے کہا۔ جواباً انہوں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اوپر کی طرف دیکھا جس سے وہ یہی سمجھی کہ وہ اس حالت میں بھی اپنی ضد پر قائم ہیں اور بیٹے سے ملنے کے لیے راضی نہیں۔

"اسے معاف کر دیں ماں جی! وہ آپ سے بہت محبت کرتا ہے۔ آپ کی ناراضی کا خیال اسے سکون سے جینے نہیں دیتا اور وہ دن رات آپ سے ملنے کے لیے تڑپتا رہتا ہے۔" اس نے گلوگیر لہجے میں ان سے استدعا کی تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ پھر انہوں نے گویا اپنی تمام تر ہمت اور توانائی کو یکجا کرتے ہوئے ہونٹوں کو جنبش دی۔

"ما..... معاف کر دیا اسے، پر اب....." ان کی آواز دھیمی سے دھیمی ہوتی چلی گئی۔ ماہ بانو نے اپنے کان ان کے متحرک ہونٹوں سے تقریباً چپکا لیے۔ وہ ان کی زبان سے نکلنے والے ایک ایک لفظ کو سننے سے محروم نہیں رہنا چاہتی تھی۔

"ملنے کا وقت....." انہوں نے اپنا جملہ مکمل کرنا چاہا لیکن نہ کر سکیں۔ البتہ ماہ بانو نے ان کی بات کا مفہوم سمجھ لیا۔ وہ اسلم کو دل سے معاف کر چکی تھیں لیکن انہیں اپنی حالت کی وجہ سے امید نہیں تھی کہ بیٹے سے مل سکیں گی۔ پہلے بھی اشارے میں شاید انہوں نے اسے یہی بات سمجھانی چاہی تھی۔

"ایسی باتیں نہ کریں ماں جی! میں آپ کو اس کے پاس لے کر چلوں گی۔ ابھی آپ کو بہت دن جینا ہے تاکہ ہم آپ کی دعاؤں کے سائے میں زندگی گزار سکیں۔ ہم شادی کرنے والے ہیں ماں جی اور اس موقع پر آپ کا موجود ہونا بہت ضروری ہوگا۔ آپ کی دعاؤں کے بغیر اسلم کیسے دولہا بنے گا۔" وہ بہت زیادہ جذباتی ہو گئی تھی اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح اس تن مُردہ میں جان ڈال دے۔ بس دل میں یہی خیال تھا کہ اسلم کو دل وجان سے چاہنے والی ماں اس کی خوشی کا سن کر پھر سے جی اٹھے گی اس لیے شرم وحیا کو بھلا کر ان کے سامنے اپنی اور اسلم کی متوقع شادی کا ذکر کر ڈالا۔ اس ذکر کو سن کر بوڑھی نحیف آنکھوں میں خوشی کی رمق سی جاگی اور انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے سر کی طرف بڑھایا۔ ان کا مقصد سمجھ کر اس نے اپنا سر ممکنہ حد تک جھکا لیا تاکہ انہیں زیادہ زحمت نہ کرنی پڑے۔ ان کا ہاتھ بس پل بھر کے لیے اس کے سر پر لگا اور واپس گر گیا۔ وہ فوراً ہی سر اٹھا کر ان کی طرف متوجہ ہوئی۔ گہری گہری سانسیں لیتی وہ اس بُری طرح ہانپ رہی تھیں جیسے نہ جانے کتنی مشقت سے گزری ہوں۔ اس نے پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ پلنگ کے بالکل قریب ہی اسے پھلوں کی دو پیٹیوں کو اوپر تلے رکھ کر بنائی گئی عارضی سی میز نظر آگئی۔ وہاں دیگر سامان کے ساتھ پانی کا ایک کٹورا بھی رکھا تھا۔ اس نے جلدی سے وہ کٹورا اٹھایا۔ اس میں بس تھوڑا سا ہی پانی تھا اور وہ بھی کچھ اتنا صاف نہیں لگ رہا تھا کہ وہ عام حالات میں کسی انسان کو پلانے کا سوچتی لیکن یہاں حالات سخت ناخوش تھے۔ اسے معلوم تھا کہ اس دور دراز گاؤں میں پانی کی کس قدر قلت ہے۔ جیکب آباد سے مال گاڑی کے ذریعے ہفتے میں صرف دو دن آنے والے پانی تک اس بوڑھی کمزور عورت کی پہنچ ہونا ناممکن تھا چنانچہ اس نے دل پر جبر کر کے وہی کٹورا ان کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ پانی کے محض چند قطرے ان کے منہ کے اندر گئے اور باقی پانی باچھوں سے بہہ گیا اور اس سے قبل کہ وہ مزید پانی پلانے کی کوشش کرتی، انہیں ایک جھٹکا لگا اور وہ ساکت ہو گئیں۔

اس نے ہراساں سی ہو کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل ساکت تھیں اور نیم وا آنکھوں کی پتلیاں غیر متحرک نظر آرہی تھیں۔ وہ ششدر سی ان کے وجود کو ٹٹولنے لگی۔ نہ کہیں دھڑکن

تھی اور نہ ہی سانسوں کی آمد و رفت۔ وہ اتنی آسانی اور خاموشی سے دنیا کو خیر باد کہہ گئی تھیں کہ وہ قریب ہونے کے باوجود اندازہ نہیں کر سکی تھی۔ نزع کی تکلیف کا اس نے بہت ذکر سنا تھا۔ خود بھی اپنی آنکھوں کے سامنے کئی لوگوں کو مرتا دیکھ چکی تھی لیکن کبھی کسی کی روح اتنی آسانی سے نکلتے نہیں دیکھی تھی۔ اسلم کی ماں زینت بی بی یقیناً کوئی نیک خاتون تھیں جن کی روح قبض کرتے ہوئے فرشتۂ اجل نے بھی بہت نرمی سے کام لیا تھا۔ اس حادثے پر وہ کئی منٹ تک حیران پریشان سی بے یقینی کے عالم میں وہیں بیٹھی رہی پھر خیال آیا کہ زندگی کی ضرورتوں سے آزاد ہو جانے والی زینت بی بی کو بے گور و کفن تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس سلسلے میں ان کے پڑوسی ہی اس کے سب سے بہترین معاون ثابت ہو سکتے تھے چنانچہ وہ ان کے گھر سے باہر نکلی اور بالکل دیوار سے جڑے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

''کون ہو بی بی؟'' ایک ادھیڑ عمر عورت دروازے پر آئی اور اسے دیکھ کر حیرت سے پوچھنے لگی۔

''میں آپ کے برابر والے گھر سے آئی ہوں۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔ زینت بی بی کا انتقال ہو گیا ہے۔'' اس نے اسلم کے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عورت کو اطلاع دی جسے سن کر اس کے چہرے پر دکھ کے تاثرات ابھرے لیکن پھر وہ بڑی بے رخی سے بولی۔

''ابھی میں مصروف ہوں، بعد میں آجاؤں گی۔'' اپنی بات کہہ کر اس نے اسے ذرا بھی مہلت نہیں دی اور دروازہ بند کر لیا۔ وہ حیران پریشان سی کھڑی رہ گئی۔ ایسی سرد مہری اور بے اعتنائی تو اس نے شہروں میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ لوگ کسی کی خوشیوں میں شامل ہوں نہ ہوں لیکن ایسے بُرے وقت میں تو بہر حال تھوڑا بہت ساتھ دے ہی دیتے ہیں۔ گاؤں دیہاتوں کی تو پھر بات ہی الگ تھی۔ لوگ ایک دوسرے کی چھوٹی بڑی خوشیوں اور غموں میں شامل ہونا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ لیکن یہاں جانے کیا بات تھی کہ زینت بی بی کی قریب ترین پڑوسن نے بھی اس کے مرنے پر بے رخی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس صورتِ حال پر وہ مایوس اور افسردہ سی تھکے تھکے قدموں سے واپس اسلم کے گھر کی طرف چل پڑی۔ دھول مٹی میں اٹے اس گھر میں اسلم کی ماں کی لاش موجود تھی اور وہ اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

زینت بی بی کے کمرے میں پہنچ کر اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ چند لمحے پہلے جس پڑوسن نے شدید بے اعتنائی کا مظاہرہ کیا تھا، وہ زینت بی بی کے مردہ جسم سے لپٹی بری طرح رو رہی تھی۔ وہ اس معمے کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر دلاسا دینے لگی۔ آخر کچھ دیر میں عورت نے خود کو سنبھال ہی لیا اور سیدھی بیٹھ کر اپنی آنکھوں میں آئے آنسو خشک کرتے ہوئے بولی۔

''معاف کرنا بیٹی! میں نے مجبوری میں تمہارے ساتھ وہ سلوک کیا تھا۔ مجھے تمہارے پیچھے کافی فاصلے پر نواز چانڈیو کھڑا ہوا نظر آ گیا تھا اس لیے میں نے تمہارے ساتھ وہ سلوک کیا۔ وہ بہت کمینہ آدمی ہے۔ اگر میں تمہارے ساتھ فوراً ادھر آجاتی تو وہ میری بچی کا جینا اور بھی مشکل کر دیتا۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں خالہ۔'' اس کے لیے عورت کے وہ جملے واقعی ناقابلِ فہم تھے اس لیے بے بسی سے بولی۔

''ہاں، تم کیسے سمجھو گی....'' عورت نے ایک گہرا سانس لیا پھر اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''تم زینت بی بی کی کون ہو؟ میں نے اس سے پہلے بھی تمہیں یہاں نہیں دیکھا۔'' جواب میں اس نے وہی کہانی دہرا دی جو اس سے قبل نواز چانڈیو کو سنائی تھی۔

''خیر..... تم جو بھی ہو لیکن مجھے یقین ہے کہ تم زینت اور اس کے بیٹے کی ہمدرد ہو اس لیے تمہیں تفصیل بتا دیتی ہوں۔'' عورت کا انداز ایسا تھا جیسے اسے ماہ بانو کی بات پر یقین نہ آیا ہو لیکن اس نے بحث نہیں کی اور گفتگو پر آمادہ نظر آنے لگی۔

''تمہیں یہ تو معلوم ہوگا نا کہ زینت کا بیٹا اسلم ایک بھاگا ہوا مجرم ہے اور یہاں اس کے خون کے پیاسے آج بھی اس کا انتظار کر رہے ہیں؟'' اس نے شاید بہت لمبی تفصیل میں جانے سے بچنے کے لیے اس سے یہ سوال کیا تھا۔ ماہ بانو نے فوراً ہی اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بس سارا کھیل ہی اس انتقام کا ہے۔ اسلم نے جسے قتل کیا تھا، اس کے گھر والے آج بھی بدلہ لینے کے لیے بے چین ہیں۔ اسلم کے یہاں سے بھاگنے کے بعد انہوں نے بے چاری زینت بی بی کا جینا مشکل کر دیا تھا۔ اسے مزدوری بھی بہت مشکل سے ملتی تھی اور پینے کے پانی کا کوٹا بھی۔ میں پڑوسی ہونے کی وجہ سے اس کی تھوڑی بہت مدد کر دیا کرتی تھی۔ زینت کا مجھ پر ایک احسان بھی تھا کہ اس نے میری بیٹی فاخرہ کو اپنا دودھ پلایا تھا۔ فاخرہ کی پیدائش پر میں اتنی بیمار ہو گئی تھی کہ اسے دودھ ہی نہیں پلا سکی تھی۔ دودھ کے رشتے سے فاخرہ بھی زینت سے بالکل ماں جیسی محبت کرتی تھی اور ہر وقت اس کی خدمت کے لیے تیار رہتی تھی۔ دشمنوں کو اس کی یہ ادا اچھی نہیں لگی اور ظالم نواز چانڈیو نے میری بچی کو اغوا کر کے ہمیں یہ پیغام بھجوا دیا کہ لڑکی کا میرے ساتھ نکاح پڑھوا دو

ورنہ میں اس کی عزت برباد کر دوں گا۔ نواز چانڈیو عمر میں فاخرہ سے بہت بڑا ہے پھر اس کی پہلے سے شادی بھی ہو چکی تھی۔ لیکن وہ وقت ایسا تھا کہ ہم اس کی بات ماننے پر مجبور ہو گئے۔ اگر نہ مانتے تو عزت بھی جاتی اور فاخرہ کی کہیں شادی بھی نہ ہو پاتی۔ شادی کے بعد اس ظالم نے میری پھول جیسی بچی پر بہت ظلم کیا اور ہمیں بھی پیغام بھجوا دیا کہ اگر ہم نے زینت بی بی کے ساتھ میل جول رکھا تو وہ فاخرہ کے ساتھ اور ظلم کرے گا۔ بس پھر ہم نے مجبوراً زینت سے کھلے بندو ملنا چھوڑ دیا۔ وہ تو شکر تھا کہ ہماری برسوں کی گہری محبت کی وجہ سے دونوں گھروں کے درمیان ایک کھڑکی موجود تھی۔ میں اس کھڑکی سے ہی کبھی کبھار زینت سے بات کر لیا کرتی تھی اور تھوڑی بہت مدد بھی کر دیتی تھی۔ زینت بڑی ہمت والی عورت تھی۔ میں نے کئی بار اسے کہا بھی کہ یہاں سے نکل کر کہیں اور چلی جائے لیکن وہ اپنا علاقہ چھوڑنے پر راضی نہیں ہوئی اور جو بھی تھوڑی بہت روکھی سوکھی کما کر کھا سکتی تھی، اس پر گزارہ کرتی رہی۔ شاید بیٹے سے ناراضی کے باوجود اسے یہ آس بھی تھی کہ ایک دن وہ لوٹ کر یہیں آئے گا۔ بیچ میں ایک بار وہ آیا بھی تھا لیکن تب حالات اتنے بُرے نہیں تھے اس لیے زینت کی ضد بھی قائم تھی۔ بہر حال، قصہ مختصر یہ کہ زینت یہاں رہتی رہی اور حالات کی چکی میں پستی رہی۔ پچھلے ایک مہینے سے اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ بیماری میں نہ دوا تھی اور نہ غذا..... نہ ہی کوئی خدمت کرنے والا۔ میں ہی ڈرتے ڈرتے ایک آدھ چکر لگا لیتی تھی لیکن صفائی وغیرہ نہیں کرتی تھی کہ کہیں اچانک چانڈیو خاندان کا کوئی فرد ادھر آجائے اور صاف ستھرا گھر دیکھ کر شک میں پڑ جائے۔ آج پورے دن سے بھی میرا یہاں آنا نہیں ہو سکا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آج زینت کی زندگی کا آخری دن ہے۔ ورنہ کسی طرح آہی جاتی۔'' اپنی بات کے اختتام پر اس نے پھر سے رونا شروع کر دیا جبکہ ماہ بانو کے ذہن کی بہت سی گتھیاں سلجھ گئیں۔ اسے سمجھ آ گئی کہ نواز چانڈیو کے ساتھ موجود عورت فاخرہ ہی تھی جس نے اسے یہاں سے بھاگ جانے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ نہ تو تب اس مشورے پر عمل کر سکی تھی اور نہ ہی اب کر سکتی تھی۔ اس کے لیے اسلم کی ماں کی لاش کو بے گور و کفن چھوڑ کر جانا منظور نہیں تھا اس لیے اس کی باعزت تدفین تک یہیں رکنا چاہتی تھی۔

''اب ان کی تدفین کا انتظام کیسے ہوگا؟'' اس نے عورت سے پوچھا۔

''میں مجبور ہوں بیٹی، کچھ نہیں کر سکتی۔ تم گاؤں کے دوسرے لوگوں سے بات کر کے دیکھو۔ میں تو اب یہاں زیادہ دیر رک بھی نہیں سکتی۔ کسی اور نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو نواز کو بھی خبر ہو جائے گی۔'' وہاں سے بے بس سا جواب آیا۔

''ٹھیک ہے۔ آپ جائیں میں خود ہی کچھ کرتی ہوں۔'' ماہ بانو نے پُرخیال انداز میں عورت سے کہا اور خود گھر سے باہر کا رخ کر لیا۔ عام حالات میں لواحقین اپنے مردے کو تنہا چھوڑنا کبھی گوارا نہیں کرتے۔ خود اسے بھی زینت بی بی کی لاش کو تنہا چھوڑ کر جانا اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن مجبوری یہ تھی کہ اس کے باہر نکلے بغیر ان کی باعزت تدفین ممکن ہی نہیں تھی۔ اپنے ذہن میں آئے منصوبے کے تحت وہ وہاں سے نکل کر نواز چانڈیو کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی اور اس کے دروازے پر پہنچ کر زوردار دستک دی۔ دستک کے جواب میں نواز سے مشابہ مگر عمر میں چند سال کم، ایک آدمی دروازے پر نمودار ہوا۔

''مجھے نواز چانڈیو سے ملنا ہے۔'' اس نے اس آدمی کے سوال کرنے سے قبل ہی اپنا مدعا بیان کیا۔

''میں یہاں ہوں بی بی..... کیا مسئلہ ہے؟'' فوراً ہی اسے اپنے عقب سے آواز آئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ نواز اس کے بالکل پیچھے کھڑا تھا، یعنی اسلم کی پڑوسن صحیح کہہ رہی تھی۔ وہ اسلم کے مکان کے اردگرد ہی کہیں چھپ کر اس کی نگرانی کرتا رہا تھا اور اسے اپنے گھر کی طرف آتا دیکھ کر پیچھے ہی آ گیا تھا۔

''مجھے آپ سے ایک ضروری کام تھا اس لیے یہاں آئی تھی۔'' اپنے اندر اٹھتی ناگواری کی لہر کو دباتے ہوئے اس نے تحمل سے بات کا آغاز کیا۔

''ضرور کرو جی لیکن پہلے اندر تو آؤ۔ اوئے سرفراز..... راستہ دے بی بی کو۔'' اس نے اسے پیشکش کرنے کے ساتھ اب تک دروازے میں کھڑے شخص کو حکم دیا۔

''جی گا بھرا۔'' اس نے فوراً حکم کی تعمیل کی لیکن ماہ بانو نے قدم آگے نہیں بڑھائے اور لجاجت سے بولی۔

''میں زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتی۔ مجھے فوراً زینت بی بی کے گھر واپس جانا ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے یہاں آئی تھی لیکن وہ بے چاری تو میرے گھر میں قدم رکھتے ہی مر گئی۔ اب میں اس کے لیے اور تو کچھ کر نہیں سکتی اس لیے اس کے کفن دفن کا انتظام کرنا چاہتی ہوں۔ یہاں گاؤں میں میری آپ کے سوا کسی سے جان پہچان بھی نہیں ہے اس لیے آپ کے گھر چلی آئی۔ زینت خالہ کی پڑوسن تو بہت عجیب عورت تھی۔ میری بات ڈھنگ سے سنی بھی نہیں اور دروازہ بند

کرلیا۔'' نواز چانڈیو سے اپنی آمد کا مقصد بیان کرتے ہوئے اس نے دانستہ پڑوسن کا ذکر کیا..... کیونکہ وہ جانتی تھی کہ نواز نے اسے وہاں جاتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ اس ذکر کو گول کر کے اپنے بارے میں شک کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

''اوہ..... تو آخر بڑھیا مر ہی گئی۔'' نواز کے کوئی جواب دینے سے قبل سرفراز نے نفرت سے کہا لیکن ماہ بانو نے دیکھا کہ نواز نے اسے آنکھ کا اشارہ کر کے خاموش رہنے کو کہا اور خود اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''ٹھیک ہے بی بی..... تم جو چاہتی ہو کرو۔ ہم تمہیں روکنے ٹوکنے والے کون ہوتے ہیں؟''

''میرا مطلب یہ تھا کہ آپ اس سلسلے میں میری مدد کریں۔ کفن دفن پر جو خرچہ ہوگا، وہ تو میں خود دے دوں گی لیکن ظاہر ہے مجھے یہاں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ کون لوگ یہ کام کر سکتے ہیں۔ آپ میری ایسے لوگوں سے ملاقات کروادیں۔'' وہ اپنی عمر سے کہیں بڑھ کر بردباری اور سمجھ داری سے کام لے رہی تھی۔

''ایرے غیروں سے کیا مدد لینا بی بی۔ فون کر کے بڑھیا کے بیٹے کو بلوالو۔ ساری حیاتی اِدھر اُدھر موج کرتے ہوئے گزار لی۔ اب کم سے کم اپنی ماں کو آکر قبر میں تو اتار دے۔'' نواز چانڈیو کی بہت بے نیازی سے کہی اس بات میں بڑی گہرائی تھی۔ ماہ بانو کا دل سن کر زور سے دھڑکا۔ یعنی نواز نے بھی اس کی کہانی کو قبول نہیں کیا تھا اور اس شک میں مبتلا تھا کہ اسے اسلم نے یہاں بھیجا ہے یا کم سے کم یہ کہ وہ اسلم سے رابطے میں تو ضرور ہی ہے۔

''میں کہاں سے اسے فون کروں؟ مجھے کیا معلوم کہ وہ کہاں ہے اور کہاں نہیں؟'' اس نے ذرا تیز لہجے میں نواز کی بات کا جواب دیا۔

''تمہارا بھی عجیب ہی قصہ ہے۔ نہ جانے اچانک کہاں سے زینت بی بی کی رشتے دار بن کر ٹپکی ہو ورنہ دیکھنے میں تو کسی طرح اس کی برادری کی نہیں لگتیں۔ تمہاری تو بول چال بھی بالکل الگ ہے۔'' جواباً نواز نے بھی چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے جو بات کہی، اس سے اس کے اندر کا شک اور بھی ظاہر ہوگیا۔

''میرے شوہر کا تعلق پنجابی خاندان سے ہے۔ ان سے شادی ہونے کی وجہ سے میری بول چال پر بھی اثر پڑا ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم مجھے زینت خالہ کا رشتے دار ماننے سے انکار کردو۔ اگر میری ان سے رشتے داری نہ ہوتی تو مجھے کیا ضرورت پڑی تھی کہ اتنا لمبا سفر کر کے یہاں آتی۔ ان کی کون سی یہاں زمینیں جائدادیں ہیں جن پر مجھے قبضہ کرنا ہے یا اپنا حصہ لینا ہے۔'' اس نے حاضر جوابی سے کام لے کر اپنے دفاع میں دلائل دیے۔

''مجھے یہی تو حیرت ہے کہ اتنے برسوں بعد تم یہاں پہنچیں کیسے؟ تمہیں کس نے بتایا کہ زینت بی بی اکیلی ہے؟'' اس کی بحث ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ماہ بانو اس ساری حجت کا مقصد سمجھ رہی تھی۔ وہ اس سے بحث کر کے کسی نہ کسی طرح یہ اندازہ لگانا چاہ رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، اس میں سچائی بھی ہے یا پھر وہ اسلم کی طرف سے وہاں بھیجی گئی ہے۔

''رشتے داروں کو آپس میں ایک دوسرے کے حالات معلوم ہو ہی جاتے ہیں۔ مجھے بھی کافی عرصے سے زینت خالہ کے بارے میں معلوم تھا لیکن تم اسے میری خودغرضی سمجھ لو کہ اب جبکہ میں خود تنہا رہ رہی ہوں تو مجھے اپنا اکیلا پن دور کرنے کے لیے ان کا خیال آگیا، ورنہ شاید میں اب بھی یہاں کا رخ نہ کرتی۔'' اس نے بالکل حقیقی اداکاری کرتے ہوئے خود کو ایک ایسی خودغرض رشتے دار ظاہر کیا جسے اپنی غریب خالہ ضرورت کے وقت ہی یاد آئی تھی لیکن اب وہ اس کی موت کے بعد اپنے رویے پر شرمسار تھی۔ اس کی اداکاری اور الفاظ کے چناؤ نے شاید نواز چانڈیو کو بھی متاثر کیا تھا کیونکہ وہ کچھ تذبذب کا شکار نظر آرہا تھا۔

''میں لاکھ خودغرض سہی لیکن اب میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ میں زینت خالہ کو کفنائے دفنائے بغیر یہاں سے چلی جاؤں۔ اگر تم میری مدد کرو تو میں جلد از جلد اس کام سے فارغ ہو کر آج ہی یہاں سے روانہ ہوسکتی ہوں۔ زینت خالہ کا گھر میں نے دیکھا ہے۔ اس کی حالت تو اتنی خراب ہے کہ بندہ دو چار گھنٹے بھی گزار لے تو بڑی بات ہے، پوری رات گزارنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' اس نے لوہا گرم دیکھ کر ایک اور ضرب لگانے کی کوشش کی۔ ویسے یہ حقیقت تھی کہ وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ یہاں عدم تحفظ کے احساس کے علاوہ اسے اسلم کے پاس بھی وقت پر واپس لوٹنے کی جلدی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کے واپس پہنچنے تک وہ بے کل رہے گا۔

''چنگی گل ہے بی بی! تمہارے کہنے پر ہم سارا بندوبست کر دیتے ہیں..... ورنہ فرض تو یہ بڑھیا کے بیٹے کا بنتا تھا کہ آکر اپنی ماں کو مٹی دیتا، پر ایسے ڈاکولٹیروں کو ماں بہنوں کی فکر ہی کہاں ہوتی ہے۔'' نواز چانڈیو نے اس پر احسان جتاتے ہوئے آخر ہامی بھر ہی لی۔ ماہ بانو نے اس سے

اخراجات کا تخمینہ لگوا کر اپنے شولڈر بیگ سے رقم نکال کر اسے تھمائی اور واپس زینت بی بی کے گھر کی طرف چل دی۔ آہستہ آہستہ وہاں گاؤں کی عورتیں بھی جمع ہونا شروع ہوگئیں۔ ان عورتوں نے مل کر گھر کی صفائی ستھرائی کی اور زینت بی بی کو آخری سفر کے لیے غسل دے کر کفن پہنا دیا۔ ماہ بانو ہر کام میں ان عورتوں کے ساتھ پیش پیش رہی۔ اس دوران اسے عورتوں کی دبی دبی زبان میں کی جانے والی گفتگو سے یہ اندازہ ہوگیا کہ گاؤں میں زینت بی بی کے مرنے کی خبر عام کرنے والا نواز چانڈیو ہی تھا۔ عورتوں کو اس امر پر حیرت تھی کہ نواز چانڈیو سب سے بڑا دشمن ہو کر زینت بی بی کی تجہیز و تدفین میں کیسے پیش پیش ہے؟ کوئی اسے خوفِ خدا، تو کوئی نئی چال گردان رہی تھی۔ انہی عورتوں کی باتوں سے اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ چانڈیو گھرانے کے سب ہی مرد بڑے غصیلے اور ہتھ چھٹ ہیں اسی وجہ سے گاؤں کے زیادہ تر لوگ ان سے دبتے تھے اور زینت بی بی کے معاملے میں کبھی کھل کر ان کی مخالفت نہیں کر سکے تھے۔

وہ بلاتبصرہ ان عورتوں کی باتیں سنتی رہی۔ ان عورتوں کو اس کے بارے میں بھی بہت تجسس تھا کہ وہ کون ہے اور کس حوالے سے زینت بی بی کی رشتے دار ہوتی ہے؟ اس نے انہیں بھی وہی کچھ بتایا جو نواز چانڈیو کو بتا چکی تھی اور زیادہ گہرائی میں جا کر معلومات کرنے کا موقع دیے بغیر قرآن شریف کی تلاوت کرتی رہی۔ اس طرح اسے عورتوں کے سوال جواب سے بھی نجات مل گئی اور اسلم کی ماں کی بے بس موت پر مضمحل ہوتے دل کو بھی خاصا سکون ملا۔

اس کی خواہش کے مطابق نواز چانڈیو نے سارے مراحل سرعت سے مکمل کروادیے تھے اور زینت بی بی کو آخری آرام گاہ تک پہنچانے کے بعد بھی اتنی مہلت تھی کہ وہ وہاں سے روانہ ہوسکتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ نواز چانڈیو خود بھی کسی وجہ سے اس کی وہاں سے جلد از جلد روانگی کا متمنی ہے، جب ہی اس کے بولے بغیر خود ہی واپسی کا ٹکٹ بھی لے آیا۔ اس نے کسی قسم کے شک کا اظہار کیے بغیر قیمت ادا کر کے شکریے کے ساتھ ٹکٹ وصول کرلیا۔ بوجھل دل اور قدموں کے ساتھ جب وہ اس چھوٹے سے گاؤں سے روانہ ہو رہی تھی جہاں سے اسلم کا آخری رشتہ بھی ٹوٹ چکا تھا تو تمام تر اندرونی کیفیات کے باوجود پوری طرح الرٹ تھی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں یہاں سے اس کا تعاقب کر کے کوئی اسلم تک پہنچنے کی کوشش نہ کرے۔ لیکن اپنے اردگرد اسے ایسا کوئی چہرہ نظر نہیں آیا۔ یہاں تک کہ نواز چانڈیو بھی اسے سوار کروانے کے بعد الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتا ہوا رخصت ہوگیا۔

اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی بس چل پڑی اور تھکی ہاری غم زدہ ماہ بانو نے بھی آخرکار آنکھیں بند کر کے سر پشت گاہ سے ٹکالیا۔ اس بس کو لگے بندھے مخصوص راستوں پر چل کر طے شدہ منزل پر ہی پہنچنا تھا چنانچہ کوئی اس کے تعاقب میں تھا یا نہیں، اس بارے میں خود کو فی الحال ہلکان کرنا بیکار تھا۔

☆☆☆

''تمہاری کارکردگی ہماری توقعات سے بہت کم ہے مسٹر چودھری! کوئی بڑا کام کرنا تو دور کی بات، تم تو ابھی تک اپنے کارخانے میں بھروسے کے نچلے درجے کے ملازمین کا بھی ڈھنگ سے بندوبست نہیں کر سکے ہو۔ میرے آدمی کام شروع کرنے کے لیے بالکل تیار ہیں لیکن جب تک ان کی سیکیورٹی کا ڈھنگ سے بندوبست نہیں ہوتا، میں انہیں وہاں نہیں بھیج سکتا۔ وہ معمولی لوگ نہیں ہیں۔ ہم نے ڈالروں کی برسات کر کے ایک ایک ایکسپرٹ کو تیار کیا ہے۔ اگر تمہاری غفلت نے انہیں ذرا سا بھی گزند پہنچایا تو میں تمہاری بنیادیں تک ہلا کر رکھ دوں گا۔ ہم وہ لوگ ہیں جو چاہیں تو حکومتوں کے تختے الٹ دیں، تمہارے جیسے فیوڈل لارڈز کو تو ہم پیروں کی خاک بھی نہیں گردانتے۔ اگر کبھی تم پر ہمارا غضب نازل ہوا تو سمجھو زمین پر تمہارا نام و نشان بھی نہیں ملے گا۔'' دوسری طرف مسٹر الفا کے نام سے اسے اپنا تعارف کروانے والا وہ لٹ کھنیا بلا تھا جس نے لندن میں اس سے ملاقات کی تھی اور بڑی آسانی سے بلنڈا کو اس کے پہلوسے نکال کر لے گیا تھا۔ مسٹر الفا نے اسے لندن بلا کر تفصیلی ملاقات کی تھی اور بتایا تھا کہ اس کے جوتوں کے کارخانے کو آگ لگادی گئی ہے تاکہ وہاں تعمیرِ نو کے بہانے ایک ایسا تہ خانہ بنایا جائے جو زیرِ زمین ہیروئن کی تیاری کے لیے لیبارٹری کا کام دے سکے۔ لیبارٹری کا نقشہ بھی اس نے تیار کروادیا تھا اور وہاں ضروری مشینوں کی تنصیب اور عملے کی فراہمی بھی اپنے ذمے رکھی تھی۔

چودھری کو صرف اتنا کرنا تھا کہ وہاں کی حفاظت اور کام کاج کے لیے ایسے افراد کا بندوبست کردے جو وفادار بھی ہوں اور لڑنے بھڑنے میں ماہر بھی۔ اس لیبارٹری میں پیرآباد سے متصل جنگلات میں کاشت کی جانے والی افیون سے ہیروئن سازی کا کام ہونا تھا۔ چودھری کے ہی تعاون سے کاشت کی جانے والی اس افیون کو وہ لوگ پہلے ہی تجربے کی بھٹی سے گزار کر پرکھ چکے تھے کہ اس سے تیار ہونے والی ہیروئن کسی طرح معیار میں اس ہیروئن سے کم نہیں جو شمالی

علاقہ جات میں کاشت کی گئی افیون سے تیار کی جاتی رہی ہے۔ چودھری نے اندازہ لگایا تھا کہ الفا اور اس کے دوسرے ساتھی بہت چالاک ہیں اور انہوں نے اس امر پر پوری طرح نظر رکھی ہوئی ہے کہ اگر کبھی شمالی علاقہ جات میں ان کے قدم اکھڑ جائیں تو مستقبل میں انہیں اپنا کاروبار چلانا مشکل نہ ہو۔ پنجاب کے ایک منفرد خصوصیات رکھنے والے جنگل میں افیون کی کاشت سے لے کر چودھری کے کارخانے کو ہیروئن سازی کی لیبارٹری میں تبدیل کرنے تک ان کے منصوبہ ساز ذہن کی ساری ہوشیاری نمایاں تھی۔ وہ مہینوں یا سالوں کے بجائے نسلوں تک کی منصوبہ بندی کرنے والے لوگ تھے جنہوں نے آنے والے خطرات کو قبل از وقت بھانپ کر اپنی کارروائی شروع کر دی تھی۔ لیکن چودھری اپنے خانگی مسائل میں الجھ جانے کے باعث قابلِ اطمینان کارکردگی نہیں دکھا سکا تھا اور اب اپنی صرف ''ہیلو'' کے جواب میں الفا کی نان اسٹاپ پھٹکار سن رہا تھا۔ یہ ذلت دولت کے لالچ میں اس نے خود مول لی تھی اور آقا سے محکوم بننے کے ذلت آمیز تجربے سے گزر رہا تھا۔ پھر بھی مطمئن تھا کہ یہ ذلت بڑے محدود پیمانے پر ہے اور صرف وہ خود ہی اس سے واقف ہے ورنہ باقی لوگوں پر تو اس کا سکہ اب بھی پہلے ہی جیسا چلتا ہے۔ اس محدود ذلت کے مقابلے میں اس کے لیے ڈالروں میں بڑھتے بینک بیلنس کی زیادہ اہمیت تھی جو ماضی میں تمام تر بے ایمانی اور مظالم کرنے کے باوجود کبھی اتنی تیزی سے نہیں بڑھا تھا، چنانچہ اپنے بدیسی آقا کو منانے کے لیے خوشامدی لہجے میں بولا۔

''آپ کو تو معلوم ہے سر کہ میری بیوی کا انتقال ہو گیا ہے۔ میں ذرا اس کی آخری رسومات وغیرہ کی ادائیگی میں مصروف تھا۔ آپ اطمینان رکھیں، اب دوبارہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔''

''دوبارہ شکایت ہوئی تو میں تمہارا اطمینان رخصت کر دوں گا کیونکہ مجھے بھی معلوم ہے کہ تمہاری بیوی کی موت کے طبعی ہونے کا امکان بہت کم ہے اور ائرپورٹ سے تم جو تابوت لاد کر اپنے گاؤں تک لے گئے تھے، وہ برطانیہ تو کیا کسی بھی بیرونِ ملک سے نہیں لایا گیا۔ میرے خیال میں اگر میں اس سلسلے میں تمہارے بیٹے کو بریف کر کے تمہاری بیوی کی قبر کشائی اور پوسٹ مارٹم پر اکساؤں تو ایسے کچھ انکشافات ہوں گے جن کے بعد تمہارے لیے اپنے بیٹے سے سامنا کرنا ممکن نہیں رہے گا۔'' اس کا لہجہ حد درجے زہریلا تھا۔

چودھری پہلی بار صحیح معنوں میں اندر تک کپکپا گیا۔ نیویارک جاتے ہوئے ڈیوڈ سے ٹکراؤ ہونے سے لے کر اب تک وہ لوگ اس پر دو ہی حربے آزماتے رہے تھے۔ ایک لالچ دوسرا بلیک میلنگ۔۔۔۔ لیکن آج کی بلیک میلنگ سب سے سوا تھی۔ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کے سامنے یہ راز کسی صورت کھلتے نہیں دیکھ سکتا تھا کہ اس نے خود وڈی چودھرائن کو ہلاک کروایا ہے۔ وہ لاکھ مہذب و مؤدب سہی لیکن اپنی ماں کے قتل کو کسی صورت معاف نہیں کر سکتا تھا۔ چودھری کو اندازہ تھا کہ مسٹر الفا نے اسے جو دھمکی دی ہے، وہ قطعی کھوکھلی نہیں ہو گی۔ وہ لوگ جو لندن میں بیٹھے بیٹھے اس کے کارخانے کو آگ لگوا دیں اور عمارت کا پرانا نقشہ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ نیا نقشہ بھی بنا کر اس کے سامنے رکھ دیں، ان کی رسائی اور اختیار کے بارے میں کوئی شک کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔

''میں نے کہا ہے... نا سر کہ میری طرف سے آپ کو دوبارہ شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ آپ میری بات پر یقین رکھیں۔'' اس نے کنپٹی سے بہہ کر گردن کی طرف جاتی پسینے کی لکیر کو صاف کیے بغیر ہکلاتے ہوئے یقین دہانی کروائی۔

''اچھی بات ہے۔ اب تم ذرا دوبارہ سے اپنے لیے مقرر کیے ہوئے کام ذہن نشین کر لو۔ آدمیوں کی تقرری کے بعد تمہیں ایسے افراد سے رابطہ کرنا ہو گا جو ہماری تیار کی گئی ہیروئن کی مقامی مارکیٹ میں کھپت کے ساتھ ساتھ بیرونِ ملک سپلائی میں بھی کام آ سکیں۔ پہلی کیٹیگری کے لیے بظاہر عزت دار لیکن جرائم کی دنیا سے وابستہ لوگوں سے رابطہ کرنا مناسب رہے گا جبکہ دوسری کیٹیگری کے لیے مکمل طور پر عزت دار لوگ مناسب رہیں گے۔ آگے تم خود اپنی صوابدید کے مطابق بھی کام کر سکتے ہو۔ مجھے اصل غرض نتائج سے ہے کیونکہ تم جانتے ہو کہ مارکیٹ میں ہیروئن کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ پہلے سے موجود لوگوں کی موجودگی میں ہمارے مال اور آدمیوں کو اپنی جگہ بنانے میں مشکل ہو گی۔ اور ہاں، یہ خیال رکھنا کہ ہمارے کچھ آدمی پہلے ہی سے اس میدان میں کام کر رہے ہیں۔ تم بے خبری میں کہیں ان سے الجھ مت بیٹھنا۔'' اسے مکمل طور پر دبا لینے کے بعد مسٹر الفا نے اپنی ہدایات اور احکامات جاری کرنے شروع کر دیے۔

''اوکے سر! باقی سب کچھ تو میں آپ کی ہدایات کے مطابق کر لوں گا لیکن مارکیٹ میں پہلے سے اپنے آدمیوں کی موجودگی والی بات نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔ میں ان آدمیوں سے واقف نہیں ہوں اس لیے لاعلمی میں ہمارے آدمیوں کے آپس میں تصادم کی نوبت آ سکتی ہے۔'' چودھری نے اسے اپنی مشکل کا احساس دلایا۔

''پہلی بات تو یہ یاد رکھو کہ تمہیں کوئی بالکل نچلے درجے پر کام نہیں کرنا ہے۔ نہ ہی تم چھوٹے موٹے جرائم پیشہ افراد سے رابطے میں رہو گے۔ تمہیں ان معزز مجرموں سے رابطے میں رہنا ہے جو مختلف طرح کی تجارت یا کاروبار کی آڑ میں ہیرا پھیری کے کام کرتے ہیں، یا ذرا سے لالچ کے لیے کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ آگے وہ اپنے کانٹیکٹس خود بنائیں گے البتہ تمہارا ہر ایک سے باعلم ہونا ضروری ہے۔ رہی آپس میں تصادم کی بات تو یہ یاد رکھنا کہ براہ راست اور فوری تصادم سے ہر حال میں گریز کرنا ہے۔ اس قسم کی صورتِ حال سامنے آنے پر پہلے کنفرمیشن ضروری ہے۔

''یہاں میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ جلد میں تمہیں ایک اسپیشل موبائل فون بھجوانے والا ہوں۔ اس فون کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی کالز ٹریس کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہو گا۔ موبائل میں خاص طور پر ایک ایسا سسٹم انسٹال کیا گیا ہے کہ اگر کسی نے کال ٹریس کرنے یا ریکارڈ کرنے کی کوشش کی تو خودبخود رابطہ منقطع ہو جائے گا۔ اس موبائل سیٹ سے تم محدود پیمانے پر میسیجز بھی بھیج سکتے ہو۔ یوں سمجھ لو کہ تم اس سے جو میسج سینڈ کرو گے، وہ صرف مخصوص لوگوں تک ہی جا سکے گا۔ کسی مسئلے کی صورت میں تمہیں میسج کا ہی استعمال کرنا ہو گا۔ مجھ سمیت چند خاص لوگ اس میسج کو پڑھ سکیں گے اور تمہیں بروقت ہدایات مل جائیں گی۔ یہ چند موٹی موٹی باتیں ہیں جو میں نے تمہیں بتا دی ہیں، باقی جب سیٹ تمہارے ہاتھ آئے گا تو تم خود بھی اس کی خصوصیات جان لو گے۔ بعد میں، میں بھی وقت کے ساتھ ساتھ تمہیں آگاہ کرتا رہوں گا۔'' الفا کا لہجہ اب خاصا نرم ہو گیا تھا جس پر چودھری نے سکون کا سانس لیا۔

''شکریہ سر! میں بے چینی سے آپ کے اس تحفے کا انتظار کروں گا۔'' الفا کے نرم لہجے کے باوجود وہ اس سے موبائل فون سیٹ کو بھیجنے کے وقت اور طریقے کے بارے میں استفسار نہیں کر سکا۔

''اوکے، بائے۔'' اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور چودھری بے ساختہ ہی رومال کی مدد سے چہرے پر بہنے والے پسینے کی لکیریں صاف کرنے لگا۔

''میں اندر آ جاؤں اباجی!'' وہ مراد شاہ تھا جو دروازے کے باہر کھڑا اس سے پوچھ رہا تھا۔

''آ ہو پتر! آ جا، تینو بھلا اجازت لینے کی کی لوڑ ہے۔'' اپنے ولی عہد کی آواز سن کر وہ بری طرح چونکا اور اس گھبراہٹ میں کہ کہیں اس نے اس کی ٹیلی فونک گفتگو نہ سن لی ہو، جلدی سے بولا۔

''کیا کروں اباجی! فرنگیوں کے ساتھ رہ کر ان کی بہت سی عادتیں بھی اپنا لی ہیں۔ خاص طور پر اچھی عادتیں۔'' وہ مسکراتا ہوا اندر داخل ہو گیا اور باپ کے اشارے پر ایک نشست سنبھال لی۔

''چل یہ بھی چنگی گل ہے کہ تُو نے ان کی چنگی گلاں ہی سیکھی ہیں ورنہ تو جتنے عرصے سے ادھر رہ رہا ہے، پورا پکا فرنگی بھی بن سکتا تھا۔'' مراد شاہ کا مزاج اعتدال پر دیکھ کر اس نے اندازہ لگا لیا کہ اس نے اس کی گفتگو نہیں سنی ہے چنانچہ ہلکا پھلکا سا ہو کر ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''میں اتنا بودا نہیں ہوں جو آسانی سے کسی کے رنگ میں رنگ جاؤں۔ جن کی شخصیت کمزور ہو وہ تو یہاں رہ کر بھی فرنگی بننے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔''

''جیوندا رہ میرا پتر! مجھے بھی علوم ہے کہ میرا شیر کسی سے دبنے والا یا اس کے پیچھے چلنے والا نہیں ہے۔ میں تو ایویں تجھ سے تھوڑا مذاق کر رہا تھا۔ تو چھوڑ اس قصے کو اور بتا کہ ادھر آرام نال تو ہے نا؟ کسی چیز کی کمی ہو تو منشی کو پیغام بھجوا دے۔ گھنٹے دو گھنٹے میں وہ تیرا ہر مسئلہ حل کر سکتا ہے۔'' چودھری کو لگا کہ مراد کو اس کی بات بُری لگی ہے اس لیے فوراً ہی اس کی دل جوئی کرنے لگا۔

''کسی شے کی ضرورت نہیں ہے اباجی۔ حویلی میں ہر وہ سہولت موجود ہے جو کسی بڑے اور ترقی یافتہ شہر کے گھر میں ہو سکتی ہے۔ ویسے بھی مجھے کون سا ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔ میں آپ کے پاس آیا ہی اس لیے تھا کہ آپ سے واپسی کے سلسلے میں اجازت لے سکوں۔ باہر کے باہر ہی دو چکر مار کر گیا ہوں لیکن آپ بڑی لمبی بات چیت میں مصروف تھے اس لیے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔''

''ہاں، وہ ایک ضروری کاروباری فون تھا اس لیے مجھے تھوڑا ٹیم لگ گیا۔'' اس نے سرسری سے لہجے میں جواب دے کر بات کو ٹالنا چاہا۔

''آپ بات کرتے ہوئے کافی پریشان لگ رہے تھے۔ اس لیے مجھے تھوڑی تشویش ہونے لگی تھی۔'' وہ بھی گویا اس موضوع کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''کاروباری پریشانی ہی تھی پتر۔ میں نے تجھے بتایا تو تھا کہ میرا کارخانہ جل گیا ہے، اب ادھر اس کی دوبارہ تعمیر ہو رہی ہے اور ٹھیکیدار کا کہنا ہے میری وہاں موجودگی ضروری ہے، پر میرا جی کچھ کرنے کو نہیں چاہتا۔ ابھی تیری ماں کو مرے دن ہی کتنے ہوئے ہیں جو میں خود کو سنبھال کر ان مصروفیتوں میں الجھ سکوں۔'' اس نے نہایت غم زدہ شکل بنا کر اپنی فرضی مشکل کا ذکر کیا حالانکہ درحقیقت وہ صرف شہر جانے کے لیے

جواز پیدا کر رہا تھا۔

''زندگی نام ہی اسی کا ہے ابّا جی! آدمی کو بڑے سے بڑا غم سہہ کر بھی خود کو سنبھالنا پڑتا ہے۔ میرے خیال میں تو آپ شہر چلے جائیں تو مصروفیت میں آپ کا دل بہل جائے گا۔ میں خود بھی اسی وجہ سے یہاں سے جلد روانہ ہونے کا خواہش مند ہوں۔ نیویارک پہنچ کر اپنی جاب کی مصروفیت میں الجھوں گا تو ذہن بٹ جائے گا۔ ورنہ یہاں تو ہر دم اماں کا ہی خیال ذہن پر سوار رہتا ہے۔ انہیں اپنے سامنے لحد میں اتارنے کے باوجود یقین نہیں آتا کہ وہ اس طرح اچانک دنیا سے چلی گئی ہیں۔ کہتے ہیں مرنے سے قبل قدرت انسان کے منہ سے ایسی کوئی نہ کوئی بات کہلواتی ہے جو بعد میں یاد آئے تو لواحقین کو خیال آتا ہے کہ مرنے والے کو اپنی موت کے اشارے ملنا شروع ہو گئے تھے، جب ہی ایسا کہہ گیا لیکن مجھے تو بہت یاد کرنے پر بھی اماں کی ایسی کوئی بات یاد نہیں آتی جس سے لگے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہی تھیں۔ وہ تو زندگی سے بڑی محبت کرنے والی اور ایک ایک لمحہ اپنی مرضی سے گزارنے والی خاتون تھیں۔ وہ کیسے اتنی خاموشی سے چلی گئیں، یقین نہیں آتا۔'' مراد شاہ نے جو موضوع چھیڑ دیا تھا، وہ ذرا نازک تھا۔ اگر وہ تفصیل سے وڈی چودھرائن کی موت پر گفتگو کرنے بیٹھ جاتا تو وہ مشکوک حالات ضرور زیرِ بحث آتے جس سے چودھری گریز ہی کرنا چاہتا تھا چنانچہ تیزی سے پینترا بدلتے ہوئے رقت زدہ لہجے میں بولا۔

''بس پتر! اللہ کی مرضی کے آگے کسی کی کیا چل سکتی ہے۔ تُو بھی صبر کر میں بھی صبر کی کوشش کرتا ہوں ورنہ سچ پوچھ تو حال ایسا ہے کہ راتوں کو ڈھنگ سے نیند نہیں آتی اور دل میں درد کی لہریں سی اُٹھتی محسوس ہوتی ہیں۔ سوچ رہا ہوں کہ کارخانے کا کام دیکھنے لاہور جاؤں گا تو اپنا مکمل چیک اَپ بھی کروالوں گا۔''

''ایسی بات تھی تو آپ کو پہلے ذکر کرنا چاہیے تھا ابّا جی! میں آپ کو خود اسپتال لے کر چلتا۔'' حسبِ توقع مراد کا دھیان ماں کی طرف سے ہٹ گیا اور وہ اس کے لیے تشویش میں مبتلا ہونے لگا۔

''او نہیں اوئے۔ ایسی بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔ یہ تو صدمے کی وجہ سے میں ذرا ڈھیلا پڑ گیا ہوں ورنہ تو جاندا ہے کہ تیرا پیو ابھی اتنا بوڑھا نہیں ہوا کہ سہارے تلاش کرے۔ ہور فیر تیرا سہارا کیا لینا۔ تو ٹھہرا دو دن کا مہمان۔ آگے بھی تو میں نے اپنے سارے کم آپ ہی دیکھنے ہیں تو فیر بیکار میں عادت کیوں خراب کروں۔'' مراد شاہ کے ساتھ لاہور جانا اس کے کاموں میں رکاوٹ بن سکتا تھا اس لیے فوراً ہی انکار کر دیا۔ ساتھ ہی وہ بیٹے پر طنز کے تیر چلانے سے بھی باز نہ آیا تھا کہ اس طرح ایک طرف تو اپنے دل کی بھڑاس نکل جاتی تھی تو دوسری طرف اگلا بھی دباؤ میں آ کر کچھ بولنے کے قابل نہ رہتا تھا۔ اب بھی یہی ہوا۔ مراد شاہ گردن جھکائے چپ بیٹھا رہ گیا اور وہ خود دل ہی دل میں اپنے آپ کو اس ہوشیاری پر داد دیتا بظاہر ناراض سا اٹھ کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

شہر یار پریشان سا اپنے دفتر میں ٹہل رہا تھا۔ مشابرم خان اس کی خواہش پر ٹاہلی والا گیا تھا اور وہاں سے واپس لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ واپس نہ آنا اتنا تشویش ناک نہ ہوتا اگر وہ وہاں سے اس سے رابطہ کر لیتا لیکن اس نے تو پلٹ کر اپنی کوئی خبر ہی نہیں دی تھی۔ خود شہر یار کی اپنی کوششیں بھی بارآور ثابت نہیں ہوئی تھیں۔ مشابرم خان کا فون مسلسل بند جا رہا تھا اور یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ موبائل بند ہونے سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ وہ ایسے حالات کا شکار ہے کہ اس کے لیے اپنا موبائل استعمال کرنا ممکن نہیں۔ اب یہ حالات کچھ بھی ہو سکتے تھے۔ ممکن تھا کہ رازداری اور احتیاط کے باعث اس نے خود ہی اپنا موبائل بند کر دیا ہو۔ یا پھر کسی وجہ سے وہ اپنا سیٹ کھو بیٹھا ہو۔ یہ دونوں امکانات ذرا قابلِ اطمینان تھے لیکن تیسرا امکان بہت دہشت ناک تھا۔ ممکن تو یہ بھی تھا کہ کسی وجہ سے مشابرم خان مخالفین کی نظر میں آ گیا ہو اور انہوں نے اس کا سیٹ چھین کر اسے آف کر دیا ہو اور اب وہ کڑی پوچھ گچھ کے مراحل سے گزر رہا ہو۔ خود اس کے سامنے کالے میاں کی مثال موجود تھی۔ پیر سائیں کے اس چیلے کو گھیرنے کے بعد انہوں نے سب سے پہلے اس کے سیٹ پر ہی قبضہ کیا تھا اور بعد میں حقائق اگلوانے کے لیے اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ زخمی کالے میاں ابھی تک نور کوٹ کے سرکاری اسپتال میں زیرِ علاج تھا اور اس کے کمرے کے باہر پولیس کے سپاہی متعین تھے۔ اس کی استدعا پر ایس پی نے کالے میاں کا کیس منظرِ عام پر نہیں آنے دیا تھا اور شہر یار کی طرف سے اشارہ ملنے تک اس کی گرفتاری کو صیغۂ راز میں ہی رکھا جانا تھا۔

شہر یار نے سوچ لیا تھا کہ پیر سائیں کی شخصیت کو بے نقاب کرنے کے بعد کالے میاں کے جرم کا صحیح تعین کرتے ہوئے اس کی رہائی یا اسیری کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اگر ابھی وہ اسے منظرِ عام پر لے آتا تو پیر سائیں اور اس کے ساتھی

ہوشیار ہو جاتے اور انہیں حقائق معلوم ہونا ناممکن ہو جاتا لیکن ابھی تو اصل مسئلہ مشابرم خان کا تھا۔ اسے کسی طرح اس کی خیر خبر لینی تھی لیکن وہ طریقۂ کار کا تعین نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک طریقہ تو اس کے ذہن میں یہ تھا کہ وہ اس ضلع کے اے سی سے جس میں ٹاہلی والا گاؤں موجود تھا، رابطہ کرتا اور اسے اعتماد میں لیتے ہوئے اس سے مشابرم خان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی استدعا کرتا لیکن یہ طریقۂ کار کئی وجوہات کی بنا پر خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ اوّل تو وہ وہاں اپنے ہم منصب کی شخصیت سے اچھی طرح واقف نہیں تھا کہ آیا وہ کوئی ایماندار اور فرض شناس افسر ہے یا پھر بہت سوں کی طرح بس کرسی پر بیٹھ کر راج کر رہا ہے۔ کسی بے ایمان اور راشی افسر سے مدد ملنا تو دور کی بات مشابرم خان کی مشکلات میں مزید اضافہ ہونے کا خطرہ تھا۔ پھر یہ بھی ممکن تھا کہ مشابرم خان کو وہاں بھجوائے جانے کا مقصد اگلے بندے کو پسند نہیں آتا اور وہ اسے اپنی حدود میں مداخلتِ بے جا گردانتا۔ یہ اعتراض ایماندار اور بے ایمان دونوں طرح کا افسر کر سکتا تھا اور اس میں کوئی ایسی غلط بات بھی نہیں ہوتی..... کیونکہ یہ حقیقت تو اپنی جگہ تھی کہ شہر یار اپنی حدود سے باہر نکل کر ہی کام کر رہا تھا چنانچہ اپنے ذہن میں آنے والے اس خیال کو تو اس نے خود ہی مسترد کر دیا۔

اس خیال کو مسترد کر دینے کے بعد اس کے پاس دوسری راہ یہ رہ جاتی تھی کہ وہ اپنے طور پر کسی دوسرے آدمی کو مشابرم خان کے سلسلے میں سن گن لینے کے لیے ٹاہلی والا بھیجے لیکن ایسا آدمی آتا کہاں سے؟ یہاں اس کے پاس قابلِ اعتماد بندے تھے ہی کتنے؟ مشابرم خان کے بعد ایک عبدالمنان ہی رہ جاتا تھا اور وہ اپنے تمام تر خلوص کے باوجود ایسی صلاحیتوں کا مالک نہیں تھا کہ اس پر اس قسم کے کسی کام کا بوجھ ڈالا جاتا۔ لے دے کر ایک جگو ہی رہ جاتا تھا لیکن اسے بھی وہ کتنی بار زحمت دیتا۔ جگو خود ایک سیاسی جماعت سے وابستہ تھا اور ان کے لیے غنڈا گردی کرتا تھا۔ اسے بھی بار بار اس کی ڈیوٹی سے ہٹا کر اپنے کاموں کے لیے بلانا صحیح نہیں تھا۔ اس قسم کی سرگرمیوں میں مبتلا لوگوں کا کچھ پتا تھوڑی تھا کہ کب ان کے پیچھے خفیہ ایجنسی کے بندے لگ جائیں اور پھر خود اس کی راہ پر بھی ہو لیں۔

وہ جو کچھ کر رہا تھا، بے شک وطن کی محبت میں کر رہا تھا لیکن قانون کہتا تھا کہ وہ سب اس کے دائرۂ اختیار میں نہیں آتا۔ وہ خود بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتا تھا اور ابتدا میں کوشش بھی کرتا رہا تھا کہ ہر کام طریقۂ کار کے مطابق ہو لیکن اس نے دیکھ لیا تھا کہ ہر جگہ اتنی کالی بھیڑیں تھیں کہ کام بننا ہی مشکل ہو جاتا تھا اور وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو اپنی بے بسی تسلیم کر کے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر ایک طرف ہو بیٹھیں۔ وہ انسانیت اور اپنے وطن کے لیے جو کچھ کر سکتا تھا وہ ضرور ہی کر گزرنا چاہتا تھا لیکن ابھی تو اصل مسئلہ تھا کہ مشابرم خان کا احوال کیسے معلوم ہو؟ وہ ایک بار پھر شدت سے اس امر کی ضرورت محسوس کر رہا تھا کہ اپنی ایک بڑی اور فعال ٹیم تشکیل دے سکے تا کہ وقتِ ضرورت آدمیوں کا ایسا کال محسوس نہ ہو۔

فی الحال تو اس نے سوچ لیا تھا کہ چند گھنٹے مزید اگر مشابرم خان کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا تو وہ تمام تر مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر خود نکل کھڑا ہو گا۔ مشابرم خان اس کے کہنے پر ٹاہلی والا گیا تھا اس لیے وہ ساری ذمے داری بھی اپنے ہی شانوں پر محسوس کر رہا تھا۔ اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد اسے قدرے سکون محسوس ہوا تو اپنے دفتر کا طول و عرض ناپنے کا سلسلہ چھوڑ کر کرسی پر جا بیٹھا۔ اسی وقت موبائل کی گھنٹی چیخی۔ اس نے اسکرین پر جگمگاتا نام دیکھ کر فوراً ہی کال ریسیو کر لی۔ اسے کال کرنے والا میجر ذیشان تھا۔ وہی میجر ذیشان جس نے مولوی کا بہروپ دھارے را کے ایجنٹ کو گرفتار کرنے میں اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا اور اب بھی وہ ایجنٹ اس کی کسٹڈی میں زیرِ تفتیش تھا۔

''السلام علیکم میجر صاحب! مزاج بخیر..... آج کیسے آپ نے ہمیں یاد فرمایا؟'' اپنی تمام تر پریشانی کے باوجود اس نے بات کرنا شروع کی تو لہجہ ہموار اور شگفتہ تھا۔

''وعلیکم السلام اے سی صاحب۔ مزاج بالکل بخیر ہے، رہی آپ کو یاد کرنے کی بات تو وہ تو ہم اکثر کرتے ہی رہتے ہیں لیکن فون کرنے کی نوبت اسی وقت آتی ہے جب آپ کو بتانے کے لیے کچھ خاص موجود ہو، ورنہ آپ جس طرح اداس ہوتے ہیں مجھے اپنی نااہلی کا بڑی شدت سے احساس ہوتا ہے۔'' اس کے ہر سوال کا ترتیب وار جواب دیتے ہوئے میجر ذیشان کا لہجہ بھی خوشگوار تھا بلکہ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مسکرا رہا ہے۔

''ایسی کوئی بات ہے تو فوراً بتا دیجیے۔'' شہر یار اس کی کال کا مقصد سمجھ کر بے چین ہو گیا۔

''اشیش پر کام کرتے رہنے سے ہمیں بڑی کامیابیاں ملی ہیں اور ہم سخت محنت کے بعد اس کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اس نے اپنے کچھ ساتھیوں کے نام اور ٹھکانے بتانے کے ساتھ ساتھ ایسے منصوبوں کے بارے میں بھی اعتراف کیا ہے جن سے بھارت کی پاکستان دشمنی کھل

کر سامنے آگئی ہے۔ میں فون پر آپ کو اتنی زیادہ تفصیلات نہیں بتا سکتا۔ مل بیٹھنے کا موقع نکلا تو پھر آگاہ کروں گا۔'' میجر ذیشان کے پاس اس کے لیے واقعی بڑی خبریں تھیں۔

''تو پھر جلد از جلد یہ موقع نکالتے ہیں۔ ویسے میرے خیال میں جو کچھ معلوم ہو چکا ہے، اس کی بنیاد پر بھی بھارت پر کافی دباؤ ڈالا جا سکتا ہے۔ آپ اشیش کو میڈیا کے سامنے لے آئیں تاکہ ساری دنیا بھارت کے کرتوتوں سے آگاہ ہو سکے۔'' وہ بہت کم اتنا جذباتی ہوتا تھا جتنا اس وقت ہو رہا تھا۔

''اسے میڈیا پر لانا تو خیر ممکن نہیں ہے۔ بھارتی فوراً ہی اسے ہمارا پروپیگنڈا قرار دیتے ہوئے اشیش سے لاتعلقی ظاہر کر دیں گے، البتہ اس سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں اس کے ساتھیوں کی بیخ کنی کی جا سکتی ہے۔'' میجر ذیشان نے اسے بڑا نپا تلا جواب دیا تو اسے بھی احساس ہوا کہ واقعی اس کا مشورہ قابلِ عمل نہیں ہے۔

''آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ میرے خیال میں اب آپ لوگوں کو بالکل بھی دیر نہیں کرنا چاہیے۔ ڈائریکٹ ایکشن لیں ان لوگوں کے خلاف۔ پہلے ہی اشیش کی زبان کھلوانے میں اتنی زیادہ دیر لگ گئی ہے۔ وہ لوگ کہیں ہوشیار ہو کر بھاگ ہی نہ نکلے ہوں۔'' اس نے ایک اور مشورے سے نوازا۔

''اندیشہ تو ہمیں بھی یہی ہے لیکن بہرحال ہم اوپر والوں کے حکم کے محتاج ہوتے ہیں اور اپنی مرضی سے کوئی ایکشن نہیں لے سکتے۔'' میجر ذیشان نے بے بسی سے جواب دیا۔

''اوپر والوں کے فیصلے اور احکامات تو جانے کن بنیادوں پر کیے جاتے ہیں۔ اوپر والوں کی ڈھیل کی وجہ ہی سے تو بھارت کو کھلی بدمعاشی دکھانے کا موقع ملتا ہے۔ ہم عجیب بدنصیب قوم ہیں کہ ہماری قومی سلامتی کے فیصلے اوپر والوں کے مفادات کی نذر ہو جاتے ہیں۔'' اسے بہت شدت کے ساتھ غصہ آیا تھا اور نہ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو صرف حکومت کو کوستے رہنے پر اکتفا کر کے خود ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتے ہیں۔

''یہ تو بہت کھلے حقائق ہیں جنہیں ہر شخص جانتا ہے لیکن ہم کر ہی کیا سکتے ہیں؟'' میجر ذیشان نے مایوسی کے ساتھ کہا۔

''اور کوئی نہیں لیکن کم از کم فوج تو کچھ نہ کچھ کر سکتی ہے۔ ہماری قوم پاک فوج سے اندھی عقیدت رکھتی ہے۔ لوگوں کے دل میں یہ یقین ہے کہ بُرے وقت میں ان کی فوج کا ہر سپاہی سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر دشمن کی راہ میں کھڑا ہو جائے گا۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اگر مخلص لوگ چاہیں تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ بس ایک ایسے ونگ کی تشکیل کی ضرورت ہے جو آزادانہ ملکی مفادات کے لیے کام کرتے ہوئے دشمن کو نیست و نابود کر سکے۔'' اس نے اپنے ذہن میں پیدا ہونے والا آئیڈیا میجر ذیشان کے گوش گزار کر دیا۔

''میں کچھ کچھ آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔ یعنی آپ چاہتے ہیں کہ جس طرح آپ ذاتی حیثیت میں چند لوگوں کے ساتھ کام کر رہے ہیں اسی طرح فوج کے کچھ لوگ بھی کرنے لگیں؟'' میجر ذیشان چونک کر بولا۔

''بالکل..... میں بالکل یہی چاہتا ہوں کیونکہ ہم جس طرح کے حالات کا شکار ہیں، ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ ہمیں اپنے ملکی مفادات کے لیے اس طرح کے اقدامات اٹھانے ہی ہوں گے۔ لیکن مجبوری یہ ہے کہ میرے پاس افراد و وسائل دونوں کی کمی ہے۔ اگر فوجی قیادت اس طرح کا کوئی ونگ تشکیل دے دیتی ہے تو اس سے مجھ جیسے افراد کو بھی سپورٹ مل جائے گی کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ میں جس راستے پر چل پڑا ہوں، آگے چل کر معاملات بہت گمبھیر ہو جائیں گے اور مجھے کسی مضبوط سپورٹ کی ضرورت پڑے گی۔ یہ تو آپ کے بھی سامنے ہے کہ تھوڑی سی ہی بھاگ دوڑ کے نتیجے میں میرا را کے ایجنٹوں سے واسطہ پڑ چکا ہے اور آگے بھی جانے کن کن ملک دشمنوں کو بے نقاب ہونا ہے۔'' وہ اپنی تجویز کے حق میں دلائل دیتا چلا گیا۔

''آئیڈیا تو شاندار ہے لیکن معلوم نہیں کہ عمل بھی ہو سکے گا یا نہیں۔ اس قسم کی خفیہ تنظیم کو بنانا پھر اس سے اس طرح سے کام لینا کہ ہم اس کے وجود کو خفیہ رکھیں، کچھ اتنا قابلِ عمل نہیں لگتا۔'' میجر ذیشان خود بڑا محبِ وطن آدمی تھا اور دل سے اس بات کا خواہش مند رہتا تھا کہ ملک کے دشمنوں کو نیست و نابود کر ڈالے لیکن فوجی پابندیوں کی وجہ سے اکثر بس پر پھڑ پھڑا کر ہی رہ جاتا تھا اس لیے اسے اس کا آئیڈیا پسند آیا لیکن ساتھ ہی وہ اس سلسلے میں شکوک و شبہات کا بھی شکار تھا۔

''انسان کرنا چاہے تو سب کچھ کر سکتا ہے۔'' شہریار نے پُرامید لہجے میں کہا۔

''میں کرنل صاحب سے بات کروں گا۔ وہی اس معاملے کو آگے بڑھا سکتے ہیں ورنہ خود میری تو کوئی ایسی حیثیت نہیں کہ میں اتنا بڑا کام کروا سکوں۔''

''آپ کام کے آغاز کے لیے جو معمولی سی کوشش کریں گے وہ بھی بہت اہم ہے۔ مشین کا کوئی بھی پرزہ چاہے وہ کتنا

ہی چھوٹا ہو، کبھی ناکارہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے نہ ہونے سے مشین ضرور ناکارہ ہو سکتی ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں اپنی سی پوری کوشش کروں گا کہ اس آئیڈیے پر عمل ہو سکے۔ آپ میری کامیابی کے لیے دعا کیجیے گا۔'' میجر ذیشان کی آواز پُرعزم ہو گئی۔

''انشاءاللہ..... بلکہ میں صرف دعا ہی نہیں کروں گا، خود بھی کوشش کروں گا۔ میرے بھی کچھ اہم افسران سے ذاتی روابط ہیں۔ میں انہیں قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو سمجھیں ہمیں اپنے حق میں کئی اہم ووٹ مل جائیں گے۔'' اس نے میجر کی ہمت بڑھائی۔

''بس تو پھر انشاءاللہ اگلی بار بات ہونے پر ہمارے پاس ایک دوسرے کے لیے اچھی خبریں ہوں گی۔ تب تک کے لیے اجازت دیجیے۔ اللہ حافظ۔'' میجر ذیشان نے اختتامی جملے ادا کر کے کال منقطع کر دی تو اس نے بھی زیرِلب اللہ حافظ کہتے ہوئے موبائل واپس میز پر ڈال دیا۔ میجر ذیشان سے آج اس کی جو گفتگو ہوئی تھی، وہ اتنی اہم اور حوصلہ بخش تھی کہ مشابرم خان کی گمشدگی سے طاری ہونے والا اعصابی دباؤ بھی کافی کم محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ بے اختیار ہی تھوڑا ریلیکس ہو کر بیٹھ گیا۔ اسی دم انٹرکام بول اٹھا۔

''سر! مشابرم خان کافی خراب حالت میں دفتر پہنچا تھا اور آپ سے ملاقات کا خواہش مند تھا۔ میں نے زبردستی اسے اسپتال روانہ کر دیا ہے لیکن اس کا اصرار تھا کہ آپ کو ضرور اس کی آمد سے آگاہ کر دیا جائے۔'' دوسری طرف عبدالمنان تھا جو ہیجان زدہ لہجے میں اسے اطلاع دے رہا تھا۔

''میری گاڑی نکلواؤ۔ میں ابھی اسی وقت اسپتال جاؤں گا۔'' مشابرم خان کی واپسی کی اطلاع نے اس کو بالکل الرٹ کر دیا اور اس نے فوری طور پر خود بھی اسپتال جانے کا فیصلہ کیا۔

''او کے سر۔'' عبدالمنان کے اس دولفظی جواب کا مطلب تھا کہ اس کے احکامات پر فوری عمل ہو گا چنانچہ اس نے بھی فوراً ہی سیٹ چھوڑ دی۔ ایک طرف اگر یہ ایکسائٹمنٹ تھی کہ مشابرم خان ٹاہلی والا سے کون کون سی خبریں لے کر لوٹا ہے تو دوسری طرف اس کی حالت کی طرف سے بھی تشویش تھی کہ جانے وہ وہاں کیا کچھ سہہ کر آیا ہے۔

اپنے دفتر سے نکل کر اسپتال پہنچنے میں اسے چند منٹوں سے زیادہ وقت نہیں لگا تھا لیکن اسپتال میں اسے کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔ ڈاکٹرز مشابرم خان کی مرہم پٹی کر رہے تھے۔ اس مرحلے سے فارغ ہو کر وہ اس کے سامنے پہنچا تو باوجود تکلیف کے مسکرا رہا تھا۔ شہریار کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی آمد کی اطلاع سن کر اس نے ڈاکٹر کو اپنے جسم میں سکون آور دوا انجیکٹ نہیں کرنے دی تھی تاکہ پہلے اس سے پورے ہوش و حواس کے ساتھ ملاقات کر سکے۔

''کیسے ہو یار مشابرم خان! تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔'' شہریار نے شاید پہلی بار اس کے سامنے ایسی جذباتیت کا مظاہرہ کیا تھا۔ رتبے کے اعتبار سے وہ بہت نیچے کا آدمی تھا۔ ایک ڈرائیور کو یہاں پوچھتا ہی کون ہے لیکن شہریار کے لیے وہ صرف ایک عام سا ڈرائیور نہیں تھا۔ وہ اس کے مشن پر کام کرنے والا سب سے فعال اور نڈر سپاہی تھا جسے وہ کسی بھی قیمت پر کھونے کے لیے تیار نہیں تھا، چنانچہ بڑے مشتبہ حالات کے بعد اس کے واپس لوٹنے پر جذباتی ہونا سمجھ میں آتا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں سر! بس ذرا پھنس گیا تھا اس لیے آپ کو انتظار کی تکلیف اٹھانی پڑی۔'' اس کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

''بے وقوف آدمی! مجھے تم سے شکوہ نہیں ہے۔ میں تمہارے لیے پریشان ہو رہا تھا۔'' شہریار نے اسے ڈپٹا تو اس کی آنکھوں میں اس محبت بھری ڈانٹ پر نمی سی آگئی جسے چھپا کر وہ اپنے اوپر گزرنے والے حالات کی تفصیل سنانے لگا۔ ٹاہلی والا سے نکل کر بھی وہ بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچا تھا کہ نہ جیب میں کرائے کی رقم تھی اور نہ ہی رابطے کا کوئی ذریعہ۔ پھر اسے یہ بھی ڈر تھا کہ پیچھے سے کوئی اسے ڈھونڈتا ہوا نہ آ رہا ہو۔ اس لیے بہت احتیاط سے کام لینا پڑا تھا۔ وہ کچھ فاصلے کے لیے لفٹ لے کر اور کافی راستہ پیدل چل کر یہاں تک پہنچا تھا اس لیے پیر سائیں کے غنڈوں سے مار کھایا ہوا جسم اور بھی بدحال ہو گیا تھا۔ شہریار اس کی سنائی گئی تفصیل کا ایک ایک لفظ غور سے سنتا رہا اور اس کے ذہن میں یہ خیال اور بھی راسخ ہو گیا کہ اس نے میجر ذیشان کے سامنے جس خفیہ ونگ کی تشکیل کی تجویز پیش کی تھی، ان حالات سے نمٹنے کے لیے اس کا قیام ناگزیر ہے۔ اب اسے اپنی تجویز پر عمل درآمد کروانے کے لیے اور بھی زیادہ شدت سے کوشش کرنی تھی۔ اس کوشش میں کامیاب ہونے تک بھی وہ چپ ہو کر بیٹھنے والا نہیں تھا۔ ٹاہلی والا میں پیری مریدی کی آڑ لے کر منشیات کا خطرناک دھندا کرنے والے ملک دشمن کو جلد اور بروقت سبق سکھانا بے حد ضروری تھا اور اس سلسلے میں اس کا ذہن فوری طور پر منصوبہ بندی کرنے کے لیے متحرک ہو گیا تھا۔

☆☆☆

جیکب آباد کے بس اڈے پر اتر کر اس نے اردگرد

طائرانہ نظر ڈالی۔ اپنے اطراف میں اسے ایسا کوئی چہرہ نظر نہیں آیا جسے وہ مشکوک قرار دے سکے۔ بس میں اس کے ساتھ موجود مسافروں میں سے بھی کچھ راستے میں ہی مختلف مقامات پر اتر گئے تھے اور کچھ یہاں اس کے ساتھ اترنے کے بعد اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے۔ ان سب کو یقیناً اپنی پہلے سے طے شدہ منزل کی طرف جانا تھا اور ان میں سے کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیتے ہوئے خود بھی اس ہوٹل تک جانے کا فیصلہ کیا جہاں اسلم ٹھہرا ہوا تھا اور یقیناً بڑی شدت سے اس کی واپسی کا بھی منتظر تھا۔ ہوٹل تک کے سفر کے لیے اس نے تانگے کا انتخاب کیا۔ ویسے تو وہ یہ فاصلہ پیدل بھی طے کرسکتی تھی لیکن اسلم کے گاؤں تک کے سفر اور پھر وہاں پیش آنے والے واقعات نے اسے بُری طرح تھکا دیا تھا اس لیے اس میں پیدل چلنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ اپنی کیفیت اور حالات کے اعتبار سے اسے تانگا ہی سب سے موزوں سواری محسوس ہوئی تھی۔ اس میں بیٹھ کر وہ پیدل چلنے کی زحمت سے بھی بچ جاتی اور اردگرد پر نظر رکھنا بھی آسان رہتا۔

وہ تانگے میں سوار ہوئی تو اس کے ساتھ مرد وزن اور دو بچوں پر مشتمل ایک خاندان بھی سوار ہوگیا۔ اس نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ اگر کوئی اس کے پیچھے ہوا بھی تو وہ اکیلا مرد ہی ہوگا۔ کم از کم بیوی بچوں کو ساتھ لے کر کوئی اس قسم کی مہم جوئی کے لیے نہیں نکل سکتا تھا۔ وہ اطمینان سے بیٹھی رہی۔ تانگا حرکت میں آیا تو اس کی آنکھ کی متحرک پتلیاں بھی اردگرد کا جائزہ لینے لگیں۔ دور دور تک ایسا کوئی فرد یا سواری نہیں تھی جسے وہ اپنے تانگے کے تعاقب میں محسوس کرتی۔ اس کے ساتھ تانگے میں سوار ہونے والا خاندان بھی ایک مقام پر تانگا رکوا کر اتر گیا۔ اس سے آگے ہوٹل تک کا راستہ بھی خیریت سے گزرا۔ اس نے ہوٹل پہنچ کر اپنے اور اسلم کے لیے مخصوص کمرے کے دروازے پر دستک دی تو فوری طور پر اندر سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ ایک ڈیڑھ منٹ کے وقفے سے اس نے دوبارہ دستک دی لیکن جواب ندارد۔ وہ حیران رہ گئی۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ وہ موجود نہیں تھی اور اسلم لمبی تان کر سو گیا ہو پھر اس خاموشی کا کیا مطلب تھا؟ اسے کچھ گھبراہٹ سی ہونے لگی پھر خیال آیا کہ ہو سکتا ہے وہ باتھ روم میں ہو اور فوری طور پر جواب دینے کی پوزیشن میں نہ ہو۔ اس خیال پر اسے قدرے اطمینان محسوس ہوا اور وہ ذرا صبر سے انتظار کرنے لگی۔

انتظار کا یہ دورانیہ طویل ثابت نہیں ہوا اور مزید ایک منٹ گزرنے سے پہلے دروازہ کھل گیا۔ سامنے اسلم موجود تھا جو سر پر تنکوں رومال باندھے کھڑا تھا۔ اس کی پتلون کے پائنچے بھی ٹخنوں سے اوپر تک مڑے ہوئے تھے۔ ماہ بانو کو دیکھ کر اس نے بے قرار نظروں سے اس کے عقب میں کچھ تلاشا اور پھر مایوس سا ہو کر پیچھے ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ تھکی ہوئی اور اعصاب زدہ ماہ بانو پیر گھسیٹتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ کمرے میں اس کی نظر ایک کونے میں بچھی جانماز پر پڑی۔ وہ سمجھ گئی کہ اسلم اس کی سلامتی اور کامیابی کے لیے اللہ کے حضور سربسجود تھا اسی لیے اسے دروازہ کھولنے میں تاخیر ہو گئی تھی۔ اسلم کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمکین پانی بھرنے لگا جسے چھپانے کی کوشش کرتی ہوئی وہ وہاں بچھی ایک چارپائی پر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

''ناکام واپس آئی ہو نا؟ میری ماں نے تمہارے کہنے پر بھی مجھے معاف نہیں کیا نا؟'' وہ دل گرفتگی سے کہتا ہوا اس کے سامنے فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ تھام کر اس کی پشت پر گرے شفاف قطرے کو دیکھنے لگا۔ یہ قطرہ ماہ بانو کی آنکھ سے ٹپکا تھا جس سے اس نے اس کی ناکامی کو اخذ کیا تھا۔

''ایسی بات نہیں ہے اسلم! ماں جی نے تمہیں معاف کر دیا ہے بلکہ میرے جانے سے پہلے ہی وہ میری سفارش کے بغیر تمہیں معاف کر چکی تھیں۔ وہ لاکھ ضدی اور اصول پرست سہی لیکن تمہاری ماں تھیں اسلم! یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ تمہیں معاف نہ کرتیں۔ انہوں نے خود میرے سامنے تمہارے لیے معافی کا اعلان کیا تھا'' وہ بھیگی آواز سے اسے بتانے لگی۔

''تو پھر وہ تمہارے ساتھ آئیں کیوں نہیں؟ وہ مجھ سے ناراض نہیں تو انہیں تمہارے ساتھ آنا چاہیے تھا۔'' اس نے کسی روٹھے ہوئے ضدی بچے کی طرح مچل کر احتجاج کیا۔

''وہ مجبور تھیں۔ شاید ان کے دل میں بھی تم سے ملنے کے لیے آنے کی خواہش تھی لیکن وقت نے انہیں مہلت.....'' اسے اپنا جملہ مکمل کرنے میں دقت ہو رہی تھی۔

''کیا مطلب؟ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟'' اسلم نے اسے جھنجوڑا لیکن ماہ بانو اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ ہراساں نظروں سے اس کی پشت پر موجود دروازے کو دیکھ رہی تھی جسے اسلم اپنے اضطراب میں کھلا ہی چھوڑ آیا تھا۔

یہ پُرپیچ وسنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آیندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

زندگی میں جب کبھی کوئی انہونی ہونی ہوتی ہے تو پھر خود بخود راستے بنتے چلے جاتے ہیں۔ ایک ایسے ہی شخص کا ماجرا... جو اپنے معمولات زندگی سے مطمئن اور آسودہ تھا کہ اچانک اس کے سپرد ایک ایسا کام کر دیا گیا جو وہ کسی صورت انجام نہیں دینا چاہتا تھا۔

ایک مجرم کی آخری خواہش سے شروع ہونے والی سنسنی خیز کہانی

جائے پناہ

تنویر ریاض

یہ مارٹن سلون کا روزانہ کا معمول تھا۔ دفتر سے گھر واپس آنے کے بعد وہ سیدھا بیڈروم میں جاتا۔ کوٹ اور ٹائی اتارنے کے بعد کچن میں جا کر فریج سے بیئر کی بوتل نکالتا اور لونگ روم میں آ کر صوفے پر نیم دراز ہو جاتا پھر ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کرتا اور گلاس میں بیئر انڈیل کر چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگتا۔ اسے توقع تھی کہ ہمیشہ کی طرح آج بھی چکروں کی ابتدا کسی بریکنگ نیوز سے ہوگی۔ مثلاً یہ کہ عراق یا افغانستان کی جنگ میں مزید کتنے امریکی فوجی مارے گئے یا خلیج میں پُرکشش پیٹرولیم آئل کو خسارہ ہونے سے کتنے لوگ بے روزگار ہو گئے وغیرہ وغیرہ لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ

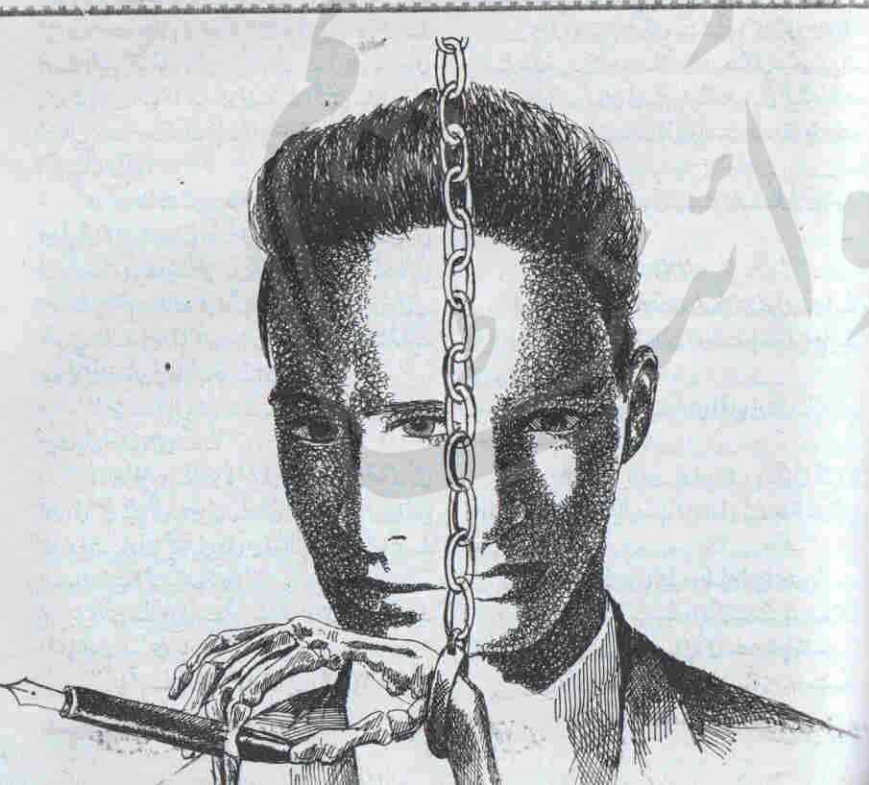

رہی جب لیڈ اسٹوری کے طور پر ایک مقامی خبر سے بلیٹن کا آغاز ہوا۔ خبر کے مطابق مقامی جیل میں ایک سزا یافتہ قاتل راجر کیب نے مہلک انجکشن سے مرنے کے بجائے پھانسی کے پھندے کا انتخاب کیا تھا۔ اسے جمعرات کو سزائے موت دی جانے والی تھی۔ راجر کیب پر اپنی بیوی کو قتل کرنے کا الزام تھا اور وہ آخری قیدی تھا جس کے پاس اپنی موت کا طریقہ منتخب کرنے کا اختیار حاصل تھا گو کہ دو ماہ قبل ہی ریاست میں سزائے موت کے لیے مہلک انجکشن کے استعمال کا قانون منظور ہو چکا تھا لیکن راجر کیب کو جب سزا سنائی گئی تو اس وقت پھانسی کا طریقہ بھی رائج تھا لہٰذا قانون کے مطابق اسے یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ اپنی موت کے لیے ان میں سے کسی بھی طریقے کا انتخاب کر سکتا ہے۔ اس زمرے میں دو سرے نو قیدی بھی شامل تھے جنہوں نے اپنے لیے مہلک انجکشن کا انتخاب کیا جبکہ آخری قیدی راجر کیب نے پھانسی کو ترجیح دے کر جیل کی انتظامیہ کو ایک نئی اُلجھن میں ڈال دیا۔

مارٹن سلون ایک مجسمے کے مانند اپنی جگہ پر بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں ٹی وی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں جہاں راجر کیب کی ایک پرانی فلم چل رہی تھی جس میں اسے سزائے موت سننے کے بعد کمرۂ عدالت سے باہر آتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ مارٹن نے آہستہ سے سر ہلایا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ راجر کیب نے انجکشن کے ذریعے آسان موت مرنے کے بجائے پھانسی جیسے تکلیف دہ عمل کا انتخاب کیوں کیا؟

وہ اسی حالت میں بیٹھا ہوا تھا کہ اس کی دوسری بیوی ہیزل بھی کام سے فارغ ہو کر گھر آگئی۔ وہ مقامی اسپتال میں نرس تھی۔ اس نے ایک نظر مارٹن کو دیکھا جو معمول کے مطابق صوفے پر نیم دراز بیئر کی بوتل ہاتھ میں پکڑے ٹی وی پر نظریں جمائے بیٹھا تھا لیکن وہ اس کے چہرے کے تاثرات نہ دیکھ سکی اور کچن کی جانب جاتے ہوئے بولی۔

''میرے خیال میں رات کے کھانے پر اسپاگیٹی اور میٹ بال ٹھیک رہیں گے۔''

مارٹن سلون نے بیئر کا آخری گھونٹ لیا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ہیزل نے کچن میں رکھا ہوا فون اٹھایا اور بولی۔ ''مارٹی! تمہاری پہلی بیوی کا فون ہے۔ کیا تم نے اسے اس مہینے کا خرچہ نہیں بھیجا؟''

مارٹن نے جلدی سے قریب رکھا ہوا پورٹیبل ٹیلی ویژن سیٹ اٹھایا اور بولا۔ ''ہیلو! ماریا۔''

''کیا تم نے آج شام کی خبریں دیکھیں؟'' اس کی سابقہ بیوی نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''کیا تم پریشان نہیں ہو؟ میرا مطلب ہے دوبارہ وہاں واپس جانے پر۔۔۔''

''تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں دوبارہ واپس جاؤں گا؟'' مارٹن اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''میں کئی سال پہلے یہ کام چھوڑ چکا ہوں۔''

''تم نہیں تو پھر کون؟'' ماریا نے چیلنج کرنے کے انداز میں کہا۔ ''وہ اتنی جلدی دوسرا آدمی تو تلاش نہیں کر سکتے۔''

''ماریا! میں تم سے فی الحال اس موضوع پر کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔''

''میرے سوا تم کسی اور سے یہ بات کر بھی نہیں سکتے۔ میرا تو خیال ہے کہ تم نے ابھی تک اسے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

مارٹن نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''میں جانتی ہوں کہ تم نے ابھی تک اپنی بیوی کو یہ نہیں بتایا کہ اپنی گزر اوقات کے لیے تم لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارتے تھے۔'' مارٹن نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

''ہیزل کو یہ معلوم نہیں ہے کہ تم ماضی میں جلاد ہوا کرتے تھے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں یہ راز کسی پر ظاہر نہیں کروں گی۔ تم جانتے ہو مارٹی کہ علیحدہ ہو جانے کے باوجود میرے دل میں تمہارے لیے وہی جذبات ہیں۔''

مارٹن نے کوئی جواب دینے کے بجائے ٹیلی فون بند کر دیا۔

☆☆☆

اگلے دن دوپہر کے وقت مارٹن کی سیکریٹری بار برا نے انٹر کام پر بتایا کہ کوئی مسٹر لاسن اس سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

مارٹن نے بے دلی سے فون اٹھایا اور کہا۔ ''مارٹن سلون بول رہا ہوں۔''

''میرا نام بنجمن لاسن ہے اور میں بارنا بائی جیل کا وارڈن ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ہماری پہلے ملاقات نہیں ہوئی؟''

''نہیں، میں کئی سال پہلے وہ جگہ چھوڑ چکا ہوں۔''

''میرا خیال ہے کہ تم نے راجر کیب کے بارے میں سن لیا ہوگا۔ وہ انجکشن کے بجائے پھانسی سے مرنا چاہتا ہے۔''

''ہاں، آج کے تمام اخباروں میں یہ خبر موجود ہے۔''

''پھر تو تم یہ بھی سمجھ گئے ہو گے کہ میں نے تمہیں کیوں فون کیا ہے۔'' لاسن نے کہا۔ ''ہمیں تمہاری ایک بار پھر ضرورت پیش آرہی ہے۔''

''شاید یہ ممکن نہ ہو۔'' مارٹن نے اپنے پر قابو رکھتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ ''میں کئی سال پہلے یہ کام چھوڑ چکا ہوں۔''

''میں سمجھتا ہوں۔ اب یہ طریقہ کہیں بھی رائج نہیں ہے اور راجر کیب وہ آخری قیدی ہے جس نے اپنے لیے پھانسی کا انتخاب کیا ہے۔ گو کہ تم ریٹائرڈ ہو چکے ہو لیکن جانتے تو ہو کہ یہ کام کس طرح کیا جاتا ہے۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مجھے یہ کام آتا ہے یا نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ میں یہ کام کرنا ہی نہیں چاہتا۔ بہتر ہوگا کہ تم کسی دوسرے شخص کو تلاش کرو۔''

''اتنی جلدی یہ کیسے ممکن ہے۔ کیا میں اس کے لیے اخبار میں اشتہار دوں؟''

''میں نہیں جانتا کہ تمہیں کیا کرنا ہوگا۔'' مارٹن نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''یہ تمہارا مسئلہ ہے میرا نہیں۔ خدا حافظ۔''

رات کے کھانے پر ہیزل کی بیٹی سوسن بھی آئی ہوئی تھی جس کی چند ماہ بعد ایک بینک منیجر ڈون ایگل سے شادی ہونے والی تھی۔ اس وقت بھی ان تینوں کے درمیان اسی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ہیزل جاننا چاہ رہی تھی کہ ڈون نے ہنی مون کے لیے کس جگہ کا انتخاب کیا ہے جبکہ سوسن کو اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا اسی دوران ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ہیزل نے فون اٹھایا اور مارٹن سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

''کوئی شخص تم سے بات کرنا چاہ رہا ہے۔''

مارٹن نے ریسیور ہاتھ میں لیا۔ دوسری جانب سے لاسن بول رہا تھا۔ ''اصولاً مجھے اس وقت فون نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہوں لیکن پرانا ریکارڈ دیکھنے پر میری نظر ایک ایسے کاغذ پر گئی جو تمہارے لیے بھی دلچسپی کا سبب ہو سکتا ہے اور وہ ہے تمہارا کنٹریکٹ۔''

''یہ تو بیس سال پرانی بات ہے۔'' مارٹن الجھتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے لیکن یہ معاہدہ کچھ اور کہہ رہا ہے۔'' لاسن نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس میں ایک شق ایسی ہے جس کی رو سے اس کی تجدید خود بخود ہر سال ہوتی رہے گی اور یہ اس وقت تک مؤثر رہے گا جب تک کوئی ایک پارٹی اسے منسوخ نہ کر دے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں اسے منسوخ کرتا ہوں۔'' مارٹن پھنکارتے ہوئے بولا۔

''نہیں جناب! زبانی کہہ دینے سے کام نہیں چلے گا۔ اس کے لیے تمہیں لکھ کر دینا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں لکھ کر بھی دے دوں گا۔'' مارٹن غصے سے بولا۔ ''کل صبح کی ڈاک سے تمہیں یہ تحریر مل جائے گی۔''

''اس کے لیے تمہیں تیس دن کا نوٹس دینا ہوگا اور تمہارے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ راجر کیب کو آٹھ دن بعد پھانسی ہونی ہے۔''

''میں تم سے آخری بار کہہ رہا ہوں۔'' مارٹن نے سختی سے کہا۔ ''میں یہ کام کسی صورت میں بھی نہیں کروں گا۔ آئندہ مجھے گھر پر فون نہ کرنا۔''

☆☆☆

اگلے روز مارٹن ٹھیک طرح سے ناشتا بھی نہ کر سکا۔ اس کا خیال تھا کہ دفتر جا کر کچھ بندوبست کرے گا۔ وہ اسٹاک مین کورڈیج کمپنی میں ملازمت کرتا تھا جو کہ ملک کی سب سے بڑی، پرانی اور قابلِ اعتماد رسی بنانے والی کمپنی تھی۔ صرف کمپنی کے مالک آئزک اسٹاک مین ہی مارٹن کے ماضی سے واقف تھا لیکن اس نے کمپنی کی نیک نامی کی خاطر یہ بات کسی پر ظاہر نہیں کی تھی۔ ویسے بھی مارٹن اس کی کمپنی کے لیے بہت سود مند ثابت ہوا تھا کیونکہ اسے رسّی اور ڈوریاں بنانے والے تمام اجزا مثلاً پٹ سن، سوت اور گھاس وغیرہ کی بہت اچھی پہچان تھی۔ مارٹن نے بھی دورانِ ملازمت اپنے آپ کو اس ذمّے داری کا اہل ثابت کر دیا تھا اور ترقی کرتے کرتے مینوفیکچرنگ کے شعبے میں نائب صدر کے عہدے تک پہنچ گیا تھا۔

دفتر پہنچ کر اس نے اپنی سیکریٹری بار برا سے کہا کہ اس نے ٹھیک طرح سے ناشتا نہیں کیا۔ اگر ممکن ہو تو وہ اس کے لیے کچھ انتظام کر دے۔ بار برا چند منٹ بعد ہی اس کے لیے سینڈوچ اور کافی لے کر آگئی۔ مارٹن نے کافی کا پہلا گھونٹ ہی لیا تھا کہ بار برا کچھ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

''مسٹر سلون! گھر میں سب ٹھیک تو ہے۔ گو کہ مجھے کچھ پوچھنے کا حق تو نہیں لیکن میں گزشتہ ایک سال سے آپ کے ساتھ کام کر رہی ہوں لیکن میں نے کبھی آپ کو اتنا مضطرب نہیں دیکھا۔ امید ہے کہ آپ کچھ خیال نہیں کریں گے۔''

''بالکل نہیں۔'' مارٹن نے زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ تم نے میری پریشانی کو محسوس کیا۔ دراصل میری سوتیلی بیٹی کی شادی ہونے والی ہے۔ وہ اور میری بیوی بروقت اسی موضوع پر باتیں کرتی رہتی ہیں جس کی وجہ سے مجھے بعض اوقات الجھن سی ہونے لگتی ہے لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا اظہار میرے چہرے سے ہو رہا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ کسی نے بھی اس پر غور نہیں کیا ہوگا۔'' باربرا اس سے قریب ہوتے ہوئے بولی۔ ''کیا میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد کرسکتی ہوں؟''

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو باربرا تیزی سے اپنی میز کی جانب لپکی اور مارٹن سوچنے لگا کہ یہ لڑکی اس کی کیا مدد کرسکتی ہے۔ بیٹی کی شادی کا موازنہ اس حقیقی مسئلے سے نہیں کیا جاسکتا جو دو ہفتے قبل شروع ہوا تھا۔ جب اس کی ملاقات شاپنگ مال میں اپنی سابقہ بیوی ماریا سے ہوئی۔ کچھ گلے شکوے ہوئے پھر وہ اس کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ میں چلا گیا۔ اس واقعے کے بعد بھی دو مرتبہ وہ اس کے ساتھ اچھا وقت گزار چکا تھا لیکن اب اس سے بھی بڑا مسئلہ جیل وارڈن کی صورت میں سامنے آگیا جو اسے کسی قیدی کو پھانسی دینے پر مجبور کررہا تھا۔

''مسٹر ہاروے آپ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔'' باربرا نے انٹرکام پر اطلاع دی۔ ''ان کا تعلق اسٹیٹ اٹارنی جنرل کے دفتر سے ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میرے کمرے کا دروازہ بند کردو۔'' پھر اس نے فون اٹھایا اور ناگوار لہجے میں کہا۔

''مارٹن سلون بول رہا ہوں۔''

''گڈ مارننگ مسٹر سلون! میں ڈپٹی اٹارنی جنرل ہاروے مائیلو ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ جیل وارڈن لاسن کے ساتھ تمہارا تنازعہ چل رہا ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے مسٹر ہاروے۔'' مارٹن نے اپنے لہجے کو نرم کرنے کی کوشش کی۔ ''وہ مجھ سے ایک ایسے کام کے لیے کہہ رہا ہے جو میں کئی برس پہلے چھوڑ چکا ہوں لہٰذا میں نے اسے انکار کردیا؟''

''میرا خیال ہے کہ تم انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔'' ہاروے نے کہا۔ ''میں نے وہ معاہدہ دیکھا ہے جس پر تم نے دستخط کیے تھے۔ اس میں واضح طور پر لکھا ہے کہ اس کی تجدید خودبخود ہر سال ہوتی رہے گی تاوقتیکہ فریقین میں سے کوئی ایک اسے منسوخ نہ کردے لہٰذا یہ معاہدہ اب بھی مؤثر ہے اور اس کے تحت تم قانونی طور پر یہ فرض انجام دینے کے پابند ہو۔''

''یہ پاگل پن ہے۔'' مارٹن احتجاج کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا ایسا کوئی طریقہ ہے کہ ہم اس مسئلے پر کوئی سمجھوتا کرسکیں۔''

''مجھے ایسی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ریاست کو اس وقت تمہاری ضرورت ہے اور ہمارے پاس اتنا وقت نہیں کہ تمہاری جگہ دوسرا آدمی تلاش کرسکیں۔''

''بہتر ہوگا کہ تم اس کام کے لیے کسی دوسرے شخص سے رابطہ کرو۔'' مارٹن نے غصے سے کہا۔ ''کیونکہ میں اس کے لیے بالکل تیار نہیں ہوں۔ بے شک تم مجھ پر معاہدہ کی خلاف ورزی پر عدالت میں مقدمہ دائر کردو۔ مجھے اس کی بھی پروا نہیں۔''

کچھ دیر بعد اس نے فون کرکے اپنی بیوی ہیزل کو بتایا کہ اسے رات کو دیر تک کام کرنا ہوگا۔ دوسرا فون اس نے ماریا کو کیا کہ کام کی زیادتی کی وجہ سے وہ رات کو اس کے پاس نہیں آسکے گا۔ اس شام وہ پہلی بار اپنی سیکریٹری باربرا کے ساتھ ڈنر کے لیے گیا۔

☆☆☆

دوسری صبح اسے کمپنی کے مالک آئزک اسٹاک مین نے اپنے دفتر میں طلب کرلیا۔ مارٹن اس کے سامنے بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ شاید کسی نے اسے باربرا کے ساتھ ڈنر کرتے دیکھ لیا ہوگا اور اسی سلسلے میں اس کی طلبی ہوئی ہے۔ اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے وعدہ کیا کہ آئندہ وہ باربرا کے ساتھ کہیں جانے میں احتیاط سے کام لے گا۔ گزشتہ رات اس کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کے بعد اس سے دوبارہ ملنا ضروری ہوگیا تھا۔ باربرا اس کی دونوں بیویوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ پُرکشش تھی لیکن فی الحال تو آئزک کو مطمئن کرنا زیادہ اہم تھا۔

''مارٹن! گزشتہ رات گورنر نے مجھے فون کیا تھا۔'' آئزک نے اپنی کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''اس نے مجھے بتایا کہ ایک قیدی انجکشن کے بجائے پھانسی کے ذریعے موت کو گلے لگانے کا خواہش مند ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں جیل وارڈن اور ڈپٹی اٹارنی جنرل پہلے ہی تم سے رابطہ کرچکے ہوں گے۔''

''ہاں، اور میں نے انہیں صاف انکار کردیا۔''

''مجھے بتایا گیا ہے کہ تم معاہدے کے تحت اس کام کو کرنے کے پابند ہو۔''

''بظاہر تو ایسا ہی ہے۔''

اسٹاک مین چھت کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''جیسا کہ تم جانتے ہو مارٹن کہ ریاست کے ساتھ ہمارا بہت بڑا بزنس ہے اور نوّے فیصد رسی اور ڈوریاں ہم ہی سپلائی کرتے ہیں۔'' اس نے چھت سے نظریں ہٹائیں اور مارٹن کے چہرے پر جمادیں۔

''اس کے علاوہ گورنر سے میرے ذاتی تعلقات بھی ہیں۔ ہم دونوں کالج کے زمانے میں ایک ساتھ فٹ بال کھیلتے رہے ہیں اس نے رات گھر پر فون کرکے بتایا کہ اٹارنی جنرل کا دفتر اس سلسلے میں عدالتی حکم حاصل کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔''

''کیا وہ ایسا کرسکتے ہیں؟'' مارٹن نے پوچھا۔ ''کیا قانون میں اس کی گنجائش ہے؟''

''بالکل! تم معاہدے کے تحت ان کا کام کرنے کے پابند ہو۔''

''کیا عدالت مجھے اس آدمی کو پھانسی دینے کا حکم دے سکتی ہے؟'' مارٹن نے یقین نہ کرنے کے انداز میں پوچھا۔

''ہاں اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو توہینِ عدالت کے جرم میں جیل بھیج دیے جاؤ گے۔''

''یہ ناقابلِ یقین ہے۔'' مارٹن اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''ان لوگوں کو انکار کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ میں اپنی کمپنی اور اپنے ساتھیوں کے سامنے شرمندہ ہونا نہیں چاہتا تھا۔ یقین جانو کہ میری بیوی بھی میرے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔''

''بیٹھ جاؤ۔'' اسٹاک مین نے اس پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''یہ صورتِ حال اتنی بری نہیں۔۔۔ جتنی تم سمجھ رہے ہو۔۔۔ کیا تم گمنام رہ کر یہ کام کرنے کے لیے تیار ہو؟''

''یہ ناممکن ہے۔'' مارٹن نے کہا۔ ''یہ معاملہ برقی کرسی کا نہیں جہاں ایک نامعلوم شخص بجلی کا بٹن دبا دیتا ہے لیکن پھانسی دینے والا اپنے آپ کو گمنام نہیں رکھ سکتا۔ اسے مجرم سے مل کر اس کی پیمائش اور وزن لینا ہوتا ہے پھر پھانسی کے وقت اس کے چہرے پر نقاب اور گردن میں پھندا ڈالنا ہوتا ہے۔ وہاں کئی دوسرے لوگ مثلاً محافظ، ڈاکٹر، پادری، وکیل اور اخباری نمائندے موجود ہوتے ہیں پھر میں کس طرح اپنی شخصیت کو گمنام رکھ سکتا ہوں۔''

''فرض کرو ایسا نہ ہو۔'' آئزک نے کہا۔ ''اس موقع پر صرف چند افراد وہاں ہوں گے جن میں سے کوئی بھی تمہیں نہیں پہچانتا ہوگا۔''

''لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔ اخبار والوں کو کون روک سکتا ہے۔ وہ تو وہاں لازماً موجود ہوں گے؟''

''پریس والوں کو بتا دیا جائے گا کہ تمہیں کسی دوسری ریاست سے اس شرط پر بلایا گیا ہے کہ تمہاری شناخت ظاہر نہیں کی جائے گی۔ اس سلسلے میں وارڈن تم سے مکمل طور پر تعاون کرے گا۔ اس کے علاوہ دیگر لوگوں کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا جائے گا۔ گورنر نے مجھے یقین دلایا ہے کہ ایسا ممکن ہے کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ یہ کام تم نے کیا ہے۔''

مارٹن نے اپنی نظریں آئزک کے چہرے پر جماتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم بھی یہی چاہتے ہو کہ میں یہ کام کروں؟''

''میرا خیال ہے کہ تمہارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ تم گمنام رہ کر یہ کام کرسکتے ہو۔''

''اس سے میری ملازمت پر تو کوئی اثر نہیں پڑے گا۔'' مارٹن نے پوچھا۔

''یقیناً نہیں۔'' آئزک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بلکہ میں تو تمہارے لیے سینئر وائس پریذیڈنٹ کا عہدہ تخلیق کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ یہ سن کر کیسا محسوس ہو رہا ہے؟''

خوشخبری

طلسماتی انگوٹھی ایک عظیم تحفہ ہے۔ ہم نے سورۂ یاسین کے نقش پر فیروزہ، یمنی، عقیق، پکھراج، لاجورد، نیلم، زمرد، یاقوت پتھروں سے تیار کی ہے۔ انشاءاللہ جو بھی یہ طلسماتی انگوٹھی پہنے گا اس کے تمام بگڑے کام بن جائیں گے۔ مالی حالات خوب سے خوب تر اور قرضے سے نجات مل جائے گی۔ پسندیدہ رشتے میں کامیابی، میاں بیوی میں محبت، ہر قسم کی بندش ختم، رات کو تکیے کے نیچے رکھنے سے لاٹری کا نمبر، جادو کس نے کیا، کاروبار میں فائدہ ہوگا یا نقصان معلوم ہوجائے گا۔ آفیسر اپنی طرف مائل، نافرمان اولاد نیک، میاں کی عدم توجہ، جج یا حاکم کے غلط فیصلے سے بچاؤ، مکان، فلیٹ یا دکان کسی قابض سے چھڑانا، معدے میں زخم، دل کے امراض، شوگر، یرقان، جسم میں مرد و عورت کی اندرونی بیماری، مردانہ کمزوری، ناراض کو راضی کرنے یہ سب کچھ اس انگوٹھی کی بدولت ہوگا۔ یاد رکھو سورۂ یاسین قرآن پاک کا دل ہے۔

رابطہ: صوفی علی مراد

0333-3092826,021-32446647

M-20A الرحمان ٹریڈ سینٹر بالمقابل سندھ مدرسہ کراچی

مارٹن کو اپنا دل سینے میں اچھلتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ بمشکل اتنا ہی کہہ سکا۔ ”میرے لیے اس سے اچھی خبر اور کیا ہوسکتی ہے۔“

اس لمحے اسے یوں لگا جیسے اس کے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ اسے بس ایک مجرم کو پھانسی ہی تو دینا تھی۔ اس کے بعد ایک روشن مستقبل اس کا منتظر تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن وہ اپنی سابقہ بیوی ماریا کے اپارٹمنٹ میں دوپہر کے کھانے پر مدعو تھا۔ تبھی اس نے ماریا کو آئزک کے ساتھ ہونے والی ملاقات کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ ”ایسا لگ رہا ہے کہ مجھے یہ کام کرنا ہی ہوگا لیکن کسی کو میری شناخت کا علم نہیں ہوگا۔ اور میں گمنام رہ کر یہ کام کر سکوں گا۔“

”تم ہیزل سے یہ بات کس طرح چھپاؤ گے؟“

”وہ ان دنوں اپنی بیٹی کی شادی میں مصروف ہے۔ اس کے پاس میرے لیے بالکل وقت نہیں ہے۔“

”پھر کب ملو گے؟“ ماریا نے اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”ممکن ہے کہ چند روز تک ہماری ملاقات نہ ہوسکے کیونکہ اس کام کے سلسلے میں مجھے جیل کے کئی چکر لگانا ہوں گے۔“

آئزک نے اسے ایک ہفتے کی چھٹی دے دی تھی تاکہ وہ جیل جاکر اپنے کام کی تیاری کرسکے۔ مارٹن نے بھی ایسا ہی کیا اور اس نے باربرا کو ایک ہفتے کی چھٹی دیتے ہوئے اپنے ساتھ چلنے کی پیشکش کی۔ بارنا نائی قصبے کے قریب ہی جنگل میں ایک خوب صورت لاج تھی۔ اس نے باربرا کو بتایا کہ وہ ایک خاص قسم کے پودے پر تحقیق کے لیے وہاں جارہا ہے جو مستول کے رسے کی تیاری میں استعمال ہوسکتا ہے۔ باربرا خوشی خوشی اس کے ساتھ چلنے پر تیار ہوگئی۔ وہ جانتی تھی کہ مارٹن کی گھریلو زندگی خوشگوار نہیں ہے۔ لہٰذا اس نے باس کی دل جوئی کرنا اپنا فرض سمجھا۔

انہوں نے اس بنگلے میں اپنے آپ کو میاں بیوی کے طور پر متعارف کروایا۔ جس پر باربرا نے تھوڑا سا منہ بنایا لیکن موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوتے خاموش رہی۔ وہ بنگلا قصبے کے جنوب میں واقع تھا جبکہ اس کے شمال میں جیل تھی۔ مارٹن نے باربرا کو سمجھا دیا تھا کہ اسے پودے پر تحقیق کے لیے روزانہ ماہر نباتیات سے ملاقات کرنا ہوگی لیکن شام کا وقت وہ اسی کے ساتھ گزارے گا۔ اسی طرح وہ ہیزل اور ماریا سے بھی سیل فون کے ذریعے رابطے میں تھا۔ ماریا تو اس کے کام کی حقیقت سے واقف تھی۔ البتہ ہیزل کو وہی پودے والی کہانی سنائی گئی تھی۔

دوسرے دن وہ ماہرِ نباتیات سے ملنے کے بہانے بنگلے سے نکلا اور گاڑی چلاتا ہوا جیل خانہ پہنچ گیا جہاں وارڈن بنجمن لاسن اس کا منتظر تھا۔ اس نے مارٹن کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے امید ہے کہ اب اس کام کے حوالے سے تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“

”بالکل نہیں۔“ مارٹن نے اسے یقین دلایا۔ ”اب یہ تمہاری ذمے داری ہے کہ میری شخصیت کو گمنام رکھنے کا انتظار کرو۔“

”اس کی تم فکر مت کرو۔ میں نے تمہارے لیے ایک کپتان، دو لیفٹیننٹ اور دو سارجنٹ کا انتظام کردیا ہے جو تمہاری حفاظت کریں گے۔ ان میں سے کوئی بھی تمہارا اصل نام نہیں جانتا اور انہیں بھی بتایا گیا ہے کہ تم دوسری ریاست سے آئے ہو۔ اس کے علاوہ میں نے وکیل، پادری اور اخباری نمائندوں کو بھی کنٹرول کرنے کا پورا بندوبست کرلیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان اقدامات کے بعد کوئی تمہیں نہیں پہچان سکے گا۔“

”مجھے بھی یہی امید ہے۔“ مارٹن نے کہا۔

”تم سب سے پہلے کیا کرنا چاہو گے؟“

”پہلے ہم پھانسی گھاٹ کی طرف چلیں گے۔“

وارڈن اسے لے کر ایک دو منزلہ عمارت کی جانب چل دیا جو جیل کمپاؤنڈ کے ایک کونے میں واقع تھی۔ مارٹن نے پھانسی گھاٹ پر ایک نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”اس کا پلیٹ فارم فرش سے کتنا اونچا ہے؟“

وارڈن نے جیب سے ایک نوٹ بک نکالی اور اس کے صفحے پلٹتے ہوئے بولا۔ ”آٹھ فٹ دو انچ۔“

”تمہارے خیال میں کیب کا وزن کتنا ہوگا؟“

”ایک سو نوے یا پچانوے۔“

”ٹھیک ہے۔ کچھ ریت کی بوریوں کا انتظام بھی کرنا ہوگا۔ ان کا وزن ساڑھے چار سو پونڈ تک ہونا چاہیے۔“

☆☆☆

دوسرے روز مارٹن نے فرمائش کی کہ اسے ایک علیحدہ کمرا چاہیے جہاں بیٹھ کر وہ پھنسی کا رسا تیار کرے گا۔

”ہمارے پاس ایک کمرا خالی ہے۔ وہ تم استعمال کرسکتے ہو۔“

”بس تو ٹھیک ہے۔“ مارٹن نے کہا۔ ”آج میں رسا تیار کرلوں گا اور کل قیدی سے مل کر اس کا ناپ اور صحیح وزن بھی لے لوں گا۔ پھانسی کب ہے؟“

”پرسوں صبح۔ ناشتے کے فوراً بعد تقریباً سات بجے کے قریب۔“ لاسن نے جواب دیا۔

☆☆☆

بنگلے کی طرف واپس جاتے ہوئے مارٹن نے ہیزل کو فون کرکے اس کی خیریت دریافت کی اور شادی کی تیاریوں کے بارے میں پوچھا۔ ”کوئی خاص تیاری نہیں ہورہی۔ ویسے تم کب واپس آرہے ہو؟“

”جمعے کے روز سہ پہر میں کسی وقت۔“

دوسرا فون اس نے ماریا کو کیا اور جواب میں اس نے جو کچھ کہا۔ اسے سن کر مارٹن کے ہوش اڑ گئے۔

”تمہارے بغیر بہت اُداس ہوں ہنی۔“ وہ جذباتی انداز میں کہہ رہی تھی۔ ”میں نے کمپیوٹر پر چیک کیا ہے۔ وہاں جیل کے قریب ہی ایک بہت خوب صورت رومانی لاج موجود ہے۔ سوچ رہی ہوں کہ وہیں آجاؤں تاکہ ہفتے کے بقیہ دن ہم اکٹھے گزار سکیں۔ تم کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟ مجھے تو وہاں کوئی موٹیل نظر نہیں آیا۔“

مارٹن نے ایک طویل سانس لی اور بولا۔ ”دراصل میں جیل کے مہمان خانے میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ وارڈن اور اس کی بیوی بہت اچھے ہیں۔ میں روزانہ رات کا کھانا انہی کے ساتھ کھاتا ہوں۔“

”اوہ! پھر تو میرا آنا بیکار ہی ہوگا۔“ وہ کچھ مایوس ہوتے ہوئے بولی۔

”تم فکر مت کرو۔ واپس آنے کے بعد میں تمہارے ساتھ ڈھیر سارا وقت گزاروں گا۔“

مارٹن جب بنگلے پر پہنچا تو رات کے کھانے کا وقت ہوچکا تھا اور باربرا منہ پھلائے بیٹھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی بولی۔

”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ہم دونوں کو ساتھ وقت گزارنے کا موقع نہیں ملے گا تو شاید کبھی نہ آتی۔“

”سوری، مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ لوگ میرا اتنا وقت لے لیں گے۔ سمجھو ہمارا کام تقریباً ختم ہوچکا ہے۔ کل کا دن اور ہے۔ پرسوں صبح ناشتے پر ایک میٹنگ ہوگی اور اس کے بعد چھٹی۔“ وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ ”شہر واپس جاکر میں ایک ہفتے کی چھٹی لوں گا اور پھر ہم کہیں گھومنے جائیں گے۔“

پریشانی

نوجوان خاتون نے شادی کے ایک سال بعد دو جڑواں بچوں کو جنم دیا۔ کچھ دیر بعد اسپتال میں اس کا شوہر ملنے آیا اور دس پندرہ منٹ ٹھہر کر واپس چلا گیا۔

نرس نے خاتون کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی دیکھیں تو پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ تم بڑی اداس اداس سی نظر آرہی ہو؟“

”بات کیا ہوتی؟“ خاتون نے کہا۔ ”میرا شوہر بڑا شکی ہے۔ جب میں نے دونوں جڑواں بچوں کو اسے دکھایا تو خوش ہونے کے بجائے جانتی ہو، کیا کہنے لگا؟“

”کیا؟“ نرس نے بڑی دلچسپی سے دریافت کیا۔

”کہنے لگا، ایک بچے کی صورت دودھ والے سے ملتی جلتی ہے اور دوسرے کی بجلی والے سے۔“

عجب خان، گلگت

”واقعی۔“ باربرا خوشی سے چہچہاتے ہوئے بولی۔ ”ہم کہاں جائیں گے؟“

”میں نہیں جانتا۔“ وہ اس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جگہ کا انتخاب تم کروگی۔“

☆☆☆

دوسرے دن وارڈن لاسن پھانسی کے قیدی راجر کیب کو طبی معائنے کے لیے لے کر آیا۔ اس کے ساتھ تین محافظ بھی تھے جو مارٹن کو نہیں جانتے تھے۔ کمرے میں مارٹن کے علاوہ مقامی اسپتال کا ڈاکٹر بھی موجود تھا۔ کیب کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی اور وہ خاصا صحت مند و توانا نظر آرہا تھا۔

”کیب۔“ وارڈن نے قیدی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ڈاکٹر مارک ہیں جو پہلے بھی تمہارا طبی معائنہ کرتے رہے ہیں اور آج بھی اسی لیے یہاں آئے ہیں۔“

”یہ یقین کرنے کے لیے کہ میں بالکل صحت مند ہوں اور مجھے پھنسی دی جاسکتی ہے۔“ کیب طنزیہ انداز میں بولا۔

”نہیں، بلکہ یہ معمول کی کارروائی ہے۔“ وارڈن اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا پھر اس نے مارٹن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ صاحب تمہیں پھانسی دیں گے اور اس وقت یہ تمہارا ناپ لینے اور وزن کرنے آئے ہیں۔“

"فرض کرو۔ میں ایسا نہ چاہوں تو۔۔۔" کیب ان دونوں کو گھورتے ہوئے بولا۔

"ایسی صورت میں مجھے اندازے سے کام لینا ہو گا۔" مارٹن بولا۔ "اگر میرا اندازہ صحیح ہوا تو تمہاری موت فوراً واقع ہو جائے گی اور تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی لیکن اندازے کی غلطی تمہارے لیے تکلیف دہ ہو سکتی ہے۔"

پھر وہ اس کے قریب آ کر بولا۔ "مجھے بتاؤ مسٹر کیب کہ تم نے زہریلے انجکشن کے بجائے پھانسی کا انتخاب کیوں کیا؟"

"کیونکہ مجھے انجکشن کی سوئی سے ڈر لگتا ہے۔" کیب نے سرگوشی میں جواب دیا۔

اس کے بعد ڈاکٹر اور مارٹن نے اپنے اپنے حصے کا کام مکمل کیا۔ اس دوران میں کیب نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اس کارروائی کے بعد کیب کو واپس اس کی کوٹھڑی میں بھیج دیا گیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد مارٹن بھی واپس جانے کے لیے اپنی کار میں سوار ہو گیا۔ اس وقت اس کی وہی کیفیت ہو رہی تھی جو کئی برس پہلے اس کام کو کرتے وقت ہوا کرتی تھی۔

☆☆☆

اس شام وہ لاج کے ڈائننگ ہال میں باربرا کے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا کہ ایک جوان شخص ان کے پاس سے گزرا اور مسکراتے ہوئے باربرا سے بولا۔

"ہیلو! تم سے اتنی جلدی دوبارہ مل کر خوشی ہوئی۔"

"ہیلو!" باربرا بھی مسکراتے ہوئے بولی۔ "کیا تمہیں کمرے کی چابی مل گئی؟"

"ہاں، وہ میں گفٹ شاپ میں چھوڑ آیا تھا۔"

اس کے جانے کے بعد مارٹن نے پوچھا۔ "یہ کون تھا؟"

"ہو گا کوئی۔ میں نہیں جانتی۔ اس سے میری ملاقات دوپہر کے کھانے پر ہوئی تھی۔ وہ اکیلا تھا۔ لہٰذا ہم دونوں ایک ہی میز پر بیٹھ گئے۔"

"کیا اس نے تمہیں اپنا نام بتایا تھا؟"

"شاید بریڈ یا ایسا ہی کچھ تھا۔" باربرا کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ "مجھے یاد نہیں رہا۔"

"کیا اس نے بتایا تھا کہ وہ یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ وہ بھی ہماری طرح یہاں ٹھہرا ہوا ہے لیکن تم اتنے سوال کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"کوئی خاص وجہ نہیں۔" مارٹن ٹالتے ہوئے بولا۔

"دراصل یہ آف سیزن ہے اسی لیے مجھے حیرت ہوئی کہ وہ یہاں کیا کرنے آیا ہے۔"

"اگر تم جاننا ہی چاہتے ہو تو سنو۔ وہ ایک ٹریول میگزین کے لیے اشتہارات جمع کرنے کا کام کرتا ہے۔"

"اوہ، خاصا لچسپ کام ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ رسّی بنانے کے مقابلے میں سارے ہی کام دلچسپ ہوتے ہیں۔" باربرا طنز کرتے ہوئے بولی۔ اس وقت وہ بھول گئی تھی کہ مارٹن نے اسے چھٹیوں پر ساتھ لے جانے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ اس نے سردرد کا بہانہ بنایا اور اپنے کمرے میں آرام کرنے آ گئی۔

☆☆☆

دوسری صبح مارٹن چھ بجے کے قریب جیل پہنچ گیا۔ اس نے اپنی کار معمول کے مطابق جیل کے عقبی حصے میں کھڑی کی۔ سامنے والے حصے میں پرائیویٹ کاروں اور پریس کی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ جیسے ہی وہ اپنی کار سے باہر آیا۔ وارڈن کے منتخب کیے ہوئے تین افسروں نے اس کا استقبال کیا اور اپنے ہمراہ پھانسی گھاٹ تک لے گئے جہاں وارڈن لاسن پہلے سے موجود تھا۔ مارٹن کی نظر وہاں رکھی ہوئی ایک درجن کرسیوں پر گئی۔ اس نے وارڈن سے پوچھا۔ "یہ کرسیاں کس کے لیے ہیں؟"

"قانون کے مطابق پھانسی کے وقت بارہ گواہوں کی موجودگی ضروری ہے۔ ان میں میڈیا کے چار لوگ ہوں گے۔ ایک اخباری نمائندہ، ایک ریڈیو اسٹیشن، ایک ٹی وی اور ایک گیبل سروس سے ہو گا لیکن تم فکر نہ کرو۔ یہاں کسی کو کیمرا یا مائیکروفون لانے کی اجازت نہیں۔ چار کرسیاں جج، پولیس آفیسر اور وکیلوں کے لیے ہیں جبکہ چار کرسیاں قیدی کے اہلِ خانہ کے لیے مخصوص ہیں۔ اس کے علاوہ اگر وہ چاہے تو مزید چار افراد کو بلا سکتا ہے لیکن کیب نے ایسی کوئی درخواست نہیں کی۔"

"کیا اس کے گھر والوں میں سے بھی کوئی نہیں آیا؟"

"ہمارے ریکارڈ کے مطابق اس کی دو جوان بیٹیاں ہیں جو اس سے ملنے کبھی نہیں آئیں۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنی ماں کے قاتل سے ملنا کیوں گوارا کریں گی۔"

"کیا تمام انتظامات مکمل ہیں؟" مارٹن نے پوچھا۔

"بالکل، پھر بھی میں ایک دفعہ اور دیکھ لیتا ہوں۔" یہ کہتا ہوں وارڈن وہاں سے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد مارٹن پھانسی گھاٹ کے چبوترے پر رکھی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسے باربرا کا

خیال آیا۔ چلتے وقت وہ اسے تیار رہنے اور سامان پیک کرنے کی ہدایت دے کر آیا تھا۔ پروگرام کے مطابق اس کی واپسی ساڑھے سات بجے تک ہونا تھی اور اس کے فوراً بعد ہی انہیں وہاں سے روانہ ہو جانا تھا۔ باربرا نے ناشتے کے بارے میں پوچھا تھا شاید وہ خالی پیٹ سفر کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ مارٹن نے اسے یقین دلایا تھا کہ راستے میں کسی کافی شاپ پر رک کر اچھا سا ناشتا کریں گے۔

اسی اثنا میں وارڈن لاسن واپس آ گیا۔ اس نے اطلاع دی کہ سب تیاری مکمل ہے۔ اس کے ساتھ سوٹ میں ملبوس دو سیاہ فام افراد بھی تھے۔ وہ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے پلیٹ فارم کی دوسری جانب چلے گئے جہاں دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں اور مارٹن کی نظر اس سے پہلے ان پر نہیں گئی تھی۔ مارٹن ان آدمیوں کے بارے میں لاسن سے پوچھنے ہی والا تھا کہ دوسرے گواہوں کی آمد شروع ہو گئی۔ مارٹن نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ چھ بج کر پچاس منٹ ہو چکے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہی ایک وین میں راجر کیب کو لایا گیا۔ اسے چار محافظوں نے زنجیروں سے پکڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی اور پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں اور وہ نارنجی رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھا۔ جیسے ہی اسے تختۂ دار تک پہنچایا گیا، لاسن نے مارٹن کو اپنی جگہ سے اٹھنے کا اشارہ کیا۔

مارٹن آگے بڑھا اور اس نے چمڑے کی پٹی سے قیدی کے دونوں گھٹنے باندھ دیے۔ اسی طرح دوسری پٹی اس کے بازوؤں اور کمر۔۔۔ کے گرد باندھ دی۔ پھر سیاہ نقاب سے اس کا چہرہ ڈھک کر اس کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال دیا۔ اب اس کا ہاتھ لیور پر تھا۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ "خدا تم پر مہربان ہو مسٹر کیب۔" یہ کہہ کر اس نے لیور دبا دیا اور اس کے ساتھ ہی راجر کیب کا بے جان جسم تختے پر جھول گیا۔

☆☆☆

وہ تیزی سے گاڑی دوڑاتا ہوا لاج تک آیا۔ اسے امید تھی کہ باربرا سامان سمیت اس کا انتظار کر رہی ہو گی لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کا بیگ تو موجود تھا لیکن باربرا اور اس کا سامان نظر نہیں آ رہا تھا۔

"تمہاری بیوی تمہارے لیے یہ چھوڑ گئی ہے۔" استقبالیہ کلرک نے ایک لفافہ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اور ہاں یو ایس ٹوڈے، میں تمہاری بہت اچھی تصویر بھی آئی ہے۔"

ایک اہم خط

بل گیٹس صاحب! میں کوئی عام آدمی نہیں، اپنی قوم کا عاقل و فاضل ہوں۔ میں نے 1970ء میں "فروٹ اور ڈرائی فروٹ کے چھلکوں سمیت استعمال کے فوائد" پر زبردست تحقیق کر کے تین ہزار صفحات کا تھیسس لکھا اور خالصہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ میں نے آم اور کیلے سے بادام، پستہ، اخروٹ... حتیٰ کہ ناریل تک کے چھلکے سمیت... استعمال کے فوائد پر الگ الگ باب لکھے ہیں جو پڑھے جانے کے قابل ہیں لیکن افسوس کہ کمپیوٹر کے آنے کے بعد لوگوں میں کتابیں اور مقالے پڑھنے کا شوق ختم ہو گیا ہے..... میں آپ سے چند سوالوں کے جوابات چاہتا ہوں۔

1۔ کمپیوٹر کی ایجاد سے اب تک کسی نے کی بورڈ کی غلطی پر توجہ نہیں دی۔ ہم نے ساری عمر اے کے بعد بی، سی، ڈی پڑھی ہے۔ کی بورڈ کے شروع میں اے کے بجائے کیو اور آخر میں زیڈ کے بجائے بی کیوں ہوتا ہے۔ اس غلطی کو فوراً درست کیا جائے۔

2۔ آپ کا نام گیٹس ہے اور پروگرام ونڈوز بناتے ہیں۔ ازراہ کرم اپنا نام بل ونڈوز رکھ لیں یا پروگرام کا نام گیٹس کریں تاکہ دروازے اور کھڑکی کا ابہام نہ رہے۔

3۔ سنا ہے کہ آپ بہت دیالو ہیں۔ اگر آپ مجھے ارجنٹ منی گرام سے بیس ہزار ڈالر بھیج دیں تو میں اپنا تھیسس کتابی صورت میں چھپوالوں گا۔ اپنے دستخط کے ساتھ دس پندرہ کاپیاں آپ اور آپ کے سجنوں کو مفت بھیجوں گا۔ رقم ملنے کے بعد میں پورے خلوص سے اپنی قوم کو یہ یقین دلا سکوں گا کہ آپ واقعی دیالو ہیں۔

آپ کا مخلص اور خیر خواہ
سردار جوگندر سنگھ (پی ایچ ڈی)

"کیا؟" مارٹن کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ "کیسی تصویر؟"

استقبالیہ کلرک نے اخبار اس کی جانب بڑھا دیا۔ اس میں اس کی لاج کے باہر لی گئی تصویر شائع ہوئی تھی جب وہ گزشتہ روز جیل سے واپس آیا تھا اور اس پر لکھا تھا۔ آخری جلاد اور یہ تصویر کسی بریڈ فورڈ جیمسن نے کھینچی تھی۔

بریڈ فورڈ سے مارٹن کو بریڈ یاد آ گیا جو گزشتہ شب باربرا سے ڈائننگ ہال میں ملا تھا اور جس نے اپنے آپ کو کسی ٹریول میگزین کا نمائندہ ظاہر کیا تھا۔ وہ دراصل اخباری رپورٹر تھا۔ مارٹن کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگیں۔ اس نے بوکھلاہٹ کے عالم میں لفافہ کھولا۔ باربرا نے لکھا تھا۔

"مارٹن! بہتر ہوتا کہ تم مجھے حقیقت بتا دیتے لیکن تم نے یہ سب کچھ مجھ سے چھپایا۔ میں کسی ایسے شخص سے محبت نہیں کر سکتی جس کے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہوں۔ میں بریڈ کے ساتھ جا رہی ہوں۔ وہ ٹیلی ویژن پر میرے انٹرویو کا انتظام کر دے گا۔ اس کا کہنا ہے کہ میں بہت جلد اسٹار بن جاؤں گی۔ مجھے افسوس ہے کہ ہمارا ساتھ بس اتنا ہی تھا۔ باربرا۔"

"آپ کے لیے ٹیلی فون کال ہے جناب۔" استقبالیہ کلرک مداخلت کرتے ہوئے بولا۔ "آپ اپنے کمرے کے فون پر بات کر سکتے ہیں۔"

دوسری جانب سے اسٹاک مین کی غصے میں بھری ہوئی آواز سنائی دی۔ "اس بار تم نے واقعی حماقت کا ثبوت دیا ہے، تمہاری تصویریں تمام اخبارات اور ٹیلی ویژن پر نظر آ رہی ہیں اور میرے دفتر کے باہر اخباری نمائندوں کی قطار لگ گئی ہے۔ تم نے میری کمپنی کی ساکھ کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اب یہاں آنے کی کوشش مت کرنا کیونکہ میں نے تمہارا سارا سامان اٹھا کر بھٹی میں پھنکوا دیا ہے۔ اب تم ساری زندگی اس کمپنی میں کام نہیں کر سکتے۔"

فون بند ہونے کی آواز آئی اور مارٹن ریسیور ہاتھ میں پکڑے سوچنے لگا کہ آناً فاناً یہ سب کیا ہو گیا۔ اس کی نوکری، اس کا مستقبل سب کچھ تباہ ہو گیا۔ اس نے ریسیور کریڈل پر رکھا ہی تھا کہ استقبالیہ کلرک نے کاؤنٹر پر بیٹھے بیٹھے چلاتے ہوئے کہا۔

"آپ کے لیے ایک اور کال ہے۔"

"اب کون سی مصیبت نازل ہو گئی۔" اس نے بے دلی سے فون اٹھاتے ہوئے سوچا۔ دوسری جانب سے ماریا غضب ناک آواز میں بول رہی تھی۔ "میں صبح سے تمہارے سیل فون پر بات کرنے کی کوشش کر رہی ہوں لیکن رابطہ نہیں ہو سکا۔ پھر میں نے جیل فون کیا۔ جہاں تم ٹھہرے ہوئے تھے لیکن انہوں نے بتایا کہ تمہارا قیام اس ہوٹل میں ہے۔ لہٰذا میں نے تھوڑی دیر پہلے یہاں فون کیا تو جواب ملا کہ مسز سیلون تھوڑی دیر پہلے چلی گئی ہیں جبکہ تم ابھی موجود ہو۔ میں ہر پندرہ منٹ بعد فون کرتی رہی۔ بالآخر تم سے رابطہ ہو ہی گیا۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ وہ کون حرافہ تھی جس کے ساتھ تم رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ میں ابھی ہیزل کو فون کر کے تمہارے کرتوتوں سے آگاہ کرتی ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔ مارٹن نڈھال ہو کر لابی کے کونے میں رکھی ایک کرسی پر ڈھے گیا۔ اس کی آنکھیں خلا میں گھور رہی تھیں اور ہونٹ بے جان ہو چکے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ خودکشی کرنے کا سب سے آسان طریقہ کیا ہو سکتا ہے۔

اس نے دو آدمیوں کو اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا۔ یہ وہی سیاہ فام تھے جنہیں اس نے پھانسی کے وقت دیکھا تھا لیکن وہ یہاں کیا کر رہے تھے۔

"معافی چاہتا ہوں مسٹر سلون!" ان میں سے ایک انتہائی نرم لہجے میں بولا۔ "مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

"کس سلسلے میں؟" مارٹن نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"پہلے ہم اپنا تعارف کروا دیں۔ میرا نام احمر تبوک ہے اور یہ میرا معاون ہوفر جیال ہے۔ ہم جمہوریہ ابادال کے وزیراعظم کے نمائندے ہیں۔"

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" مارٹن نے پوچھا۔

"ہم اپنے وزیراعظم کی طرف سے ایک تجویز پیش کرنا چاہتے ہیں۔"

"کیسی تجویز؟"

"وزیراعظم چاہتے ہیں کہ تمہیں جمہوریہ ابادال کا سرکاری جلاد مقرر کر دیا جائے۔ ہمیں یہاں تمہاری کارکردگی کا مشاہدہ کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا اور ہم نے وزیراعظم کو ٹیلی فون پر بتا دیا ہے کہ تم نے اپنا کام بڑی مہارت اور صفائی سے انجام دیا۔ اسی بنیاد پر انہوں نے ہمیں اس اہم تقرری کا اختیار دے دیا۔"

"کیا کہا تم نے؟ تمہارا تعلق کس ملک سے ہے؟" مارٹن نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"جمہوریہ ابادال۔ یہ خلیج عمان کا ایک چھوٹا سا آزاد

ملک ہے۔''

''اور تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے ملک کا سرکاری جلّاد بن جاؤں؟''

''جی ہاں، ہمارے وزیراعظم نے فیصلہ کیا ہے کہ پھانسی دینے کے لیے کسی غیر ملکی کا انتخاب کیا جائے کیونکہ ہمارے شہری اپنے ہی ہم وطنوں کو موت کے گھاٹ اتارنا پسند نہیں کرتے۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں۔''

''ہاں۔'' مارٹن اپنی کرسی پر سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم بتا سکتے ہو کہ تمہارے ملک میں اوسطاً سالانہ کتنے لوگوں کو پھانسی پر لٹکایا جاتا ہے؟''

''پھانسی پانے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔'' ہوفر نے جواب دیا۔ ''پہلے صرف قتل، زنا، منشیات کی اسمگلنگ، جاسوسی، دہشت گردی، ہم جنس پرستی اور جسم فروشی پر سزائے موت دی جاتی تھی۔ اب اس میں کچھ دوسرے جرائم مثلاً کرنسی کا غیر قانونی کاروبار، جادو اور الحاد وغیرہ کا بھی اضافہ ہوگیا ہے۔''

مارٹن نے اپنا گلا صاف کیا اور بولا۔ ''میں تمہارے وزیراعظم کی جانب سے اس پیشکش کو اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تم لوگوں کے مذہبی عقائد اور رسم و رواج کو دیکھتے ہوئے میں اس کام کے لیے مناسب نہیں ہوں۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' احمر بولا۔ ''تمہیں ہمارے درمیان رہنے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں ایک بلند و بالا عمارت میں لگژری اپارٹمنٹ دیا جائے گا جہاں تمہارے ملک کے علاوہ برطانیہ فرانس، اٹلی اور دوسرے ملکوں سے تعلق رکھنے والے ماہرین بھی رہتے ہیں۔ جس دن تمہاری ضرورت ہوگی۔ اس روز ایک لیموزین کار تمہیں رہائش گاہ سے جیل پہنچا دے گی اور اپنا کام کرنے کے بعد تم واپس اسی گاڑی سے گھر چلے جاؤ گے۔ تمہارے رہن سہن اور گھومنے پھرنے پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔''

''میں سمجھ گیا۔'' مارٹن اپنے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ ''تم نے یہ تو بتایا نہیں کہ سال میں اندازاً مجھے کتنی مرتبہ پھانسی دینا ہوگی؟''

''میرے پاس حقیقی اعداد و شمار نہیں لیکن سال میں سو کے قریب تو ہوتی ہوں گی۔''

''مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔'' مارٹن نے کہا۔

''نہیں جناب۔'' احمر بولا۔ ''تمہیں ابھی اور اسی وقت فیصلہ کرنا ہے۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ وزیراعظم تمہارے جواب کا انتظار کررہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے لیکن میں ابادال کس طرح جاسکتا ہوں۔ میرے پاس تو پاسپورٹ بھی نہیں ہے۔''

''تمہیں اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم ہمارے ساتھ ڈپلومیٹک حیثیت میں ہمارے سرکاری ہوائی جہاز میں سفر کرو گے۔''

''اور مجھے اس کام کا کتنا معاوضہ ملے گا؟''

''پانچ لاکھ دینار سالانہ۔ امریکی کرنسی میں یہ رقم سات لاکھ ڈالر بنتی ہے۔''

''واقعی یہ تو ایک معقول رقم ہے۔'' مارٹن سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''گویا تم اس تقرری کے لیے تیار ہو؟'' احمر نے پوچھا۔

''ہاں۔'' مارٹن نے جواب دیا۔

احمر نے مارٹن کے عقب میں دیکھ کر کسی کو اشارہ کیا۔ اچانک ہی ایک پُرکشش سیاہ فام عورت نمودار ہوئی۔ اس نے سیاہ اسکرٹ، سیاہ کوٹ اور سفید بلاؤز پہن رکھا تھا۔ احمر نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''یہ مینا ضخیم ہے۔ تمہاری پرسنل سیکریٹری۔ تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو۔ اس سے کہہ سکتے ہو۔''

نوجوان لڑکی مسکرائی اور اس نے تعظیم کے انداز میں تھوڑا سا سر جھکا دیا۔

''باہر ایک لیموزین کھڑی ہے جو ہمیں ائرپورٹ لے جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چلنا چاہیے۔''

وہ چاروں باہر جانے کے لیے لابی سے گزرے جہاں سے مارٹن نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا۔ لیموزین میں سوار ہوتے وقت مارٹن اور اس کی سیکریٹری کو پیچھے بٹھا دیا گیا جبکہ اگلی نشستوں پر احمر اور ہوفر براجمان ہوگئے۔ عین ممکن تھا کہ مارٹن اپنی سیکریٹری کے قرب سے بہک جاتا لیکن اس وقت اس کے ذہن میں مستقبل کا نقشہ گھوم رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر لوٹ کر اسی مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں سے اس نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ اب اسے سال میں سو مرتبہ پھانسی دینے کا فریضہ انجام دینا تھا۔ اپنے وطن میں اس کا مستقبل تاریک ہوچکا تھا اور اب یہی اجنبی دیس اس کی جائے پناہ ہوسکتا تھا۔

فائنل لیول

سلیم انور

فصل ہو یا نسل.... بیج بونے سے لے کر.... جڑیں پکڑنے تک عمل نہایت تن دہی اور محنت کا متقاضی ہوتا ہے ... ذرا سی بے احتیاطی سب کچھ برباد کردیتی ہے.... ان والدین کے لیے ایک لمحۂ فکریہ.... جو اپنی سہولت کے لیے شیر خواروں تک کو ٹیلی وژن اور کمپیوٹر کے سامنے بٹھا کر فرصت کے چند لمحے سمیٹنے کے عادی ہوتے ہیں۔

مختصر پیرائے میں یاد رکھنے والی عبرت اثر کتھا

رسل نے میز کی دوسری جانب بیٹھی ہوئی اپنی بیوی قیسی کی طرف دیکھا۔ قیسی کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ وہ سر کو جھٹکتے ہوئے بولی۔ ''تم اس بارے میں کچھ کرو گے یا مجھ ہی کو کرنا ہوگا؟''

اوپری منزل پر بھاری قدموں کی دھمک تین مرتبہ

ابھری اور بچن کی لائنیں ٹمٹمانے لگیں۔

رسل نے ایک آہ بھری۔ ''مجھے ہی بھگتنا ہوگا۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھا اور تھکے قدموں سے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر اپنے بیٹے کے کمرے میں پہنچ گیا۔

جب اس نے اپنے بیٹے کے کمرے کا دروازہ کھولا تو بروکس نے پلٹ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ بروکس کی نگاہیں ٹی وی اسکرین پر مرکوز تھیں جہاں کسی ویڈیو گیم کا ایک کردار.... شاٹ گن لیے کسی شہر سے گزر رہا تھا۔ بروکس جوائے اسٹک ہاتھوں میں دبائے اِدھر سے اُدھر مچل رہا تھا جیسے وہ شاٹ گن خود اس نے تھامی ہوئی ہو۔

ویڈیو گیم کے کردار نے جس کی عمر سترہ برس رہی ہوگی اپنی شاٹ گن اٹھائی اور ایک راہ چلتی بوڑھی عورت پر تان لی۔ بوڑھی عورت نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے لیکن اس نوعمر نے ٹریگر دبا دیا۔ بوڑھی عورت کا چہرہ خون میں نہا گیا اور وہ زمین پر گر پڑی۔

بروکس نے بے ساختہ قہقہہ بلند کیا۔

''بیٹے، یہ تم کیا کھیل رہے ہو؟'' رسل نے پوچھا۔

بروکس آواز سنتے ہی ایک جھٹکے سے گھوم گیا۔ ''ہائے... ڈیڈ! میں نے آپ کو سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتے ہوئے نہیں سنا۔''

''میں دبے پاؤں اوپر آیا ہوں اس لیے تمہیں پتا نہیں چلا۔ اسے اسٹیلتھ موڈ کہتے ہیں۔''

''اسٹیلتھ موڈ کیا ہوتا ہے؟''

''پنجوں کے بل چلنے کو کہتے ہیں تاکہ پیروں کی آہٹ سنائی نہ دے۔''

''اسٹیلتھ موڈ!'' بروکس نے آہستہ سے دہرایا۔

''اچھا اب یہ بتاؤ کہ تم کیا کر رہے تھے؟''

''میں گیم کھیل رہا تھا، ڈیڈ۔''

''مجھے اس گیم کے بارے میں بتاؤ؟''

''یہ گیم 'ٹیکنگ اٹ ٹو دی گرونز' کہلاتا ہے۔''

''یہ گیم تمہارے پاس کہاں سے آیا؟''

''انکل نیڈ میرے لیے خرید کر لائے تھے۔''

''تم وہ لڑکے ہو، وہ کردار جو اس گیم میں ہے؟''

بروکس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''وہ اس بلاک کا سب سے بدترین لڑکا ہے۔ وہ ہر کسی کو مار ڈالتا ہے۔ وہ...''

''تم نے اس لیڈی کو شوٹ کیوں کیا؟''

''کسے، دادی اماں کو؟''

''ہاں، اس نہتی دادی اماں کو۔''

''وہ مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔''

رسل کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ ''تم نے کیا کہا؟''

''پُرسکون ہو جائیں، ڈیڈ۔ یہ صرف ایک گیم ہے۔'' بروکس نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

''مجھے پُرسکون رہنے کو مت کہو بیٹا۔ کیا سمجھے؟'' رسل نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''یس سر!''

''اس گیم کا مقصد کیا ہے؟'' رسل نے جاننا چاہا۔

''حقیقت میں تو کچھ بھی نہیں۔ بس لڑکے گھومتے پھرتے ہیں اور دنیا کو اپنے قبضے میں لینا چاہتے ہیں۔'' بروکس نے بتایا۔

''اور گرونز کیا ہیں؟''

''یہ گرون اپس (Grown-ups) کا کوڈ ہے۔ اس سے مراد بالغ افراد ہیں۔''

رسل قدم اٹھا کر گیم سسٹم کے پاس پہنچا اور ''ایجیکٹ'' کا بٹن دبا دیا۔

بروکس اپنے بیڈ پر اچھل کر نیچے اترا۔ ''یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟'' وہ چیخ پڑا۔ ''میں گیم کے فائنل لیول میں داخل ہونے والا تھا۔''

رسل نے پلٹ کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔ اس کا بارہ سالہ بیٹا مٹھیاں بھینچے کھڑا سرخ چہرے کے ساتھ اسے گھور رہا تھا۔ آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں۔

رسل نے تنبیہی انداز میں انگلی سے بروکس کی جانب اشارہ کیا اور سخت لہجے میں بولا۔ ''بہتر ہوگا کہ تم اپنی مٹھیاں کھول دو اور اس جارحانہ انداز سے باز آجاؤ، لڑکے! کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو؟''

بروکس نے اپنے ہونٹ اس سختی سے بھینچے ہوئے تھے کہ ان پر سفیدی نمایاں ہو گئی تھی۔ اس نے دھیرے دھیرے اپنی گھونسا نما بند مٹھیوں کو کھول دیا اور دانت پیستے ہوئے بولا۔ ''یس سر!''

رسل پلٹ گیا اور اس نے ایک جھٹکے سے پاور کورڈ دیوار میں لگے ساکٹ سے کھینچ لی پھر میز پر سے گیم کا پورا

سسٹم تاروں سمیت سمیٹ لیا اور تمام چیزوں کو بغل میں دباتے ہوئے بولا۔ ''اب میری سمجھ میں آیا کہ تم یہ بُرے طور طریقے کہاں سے سیکھ رہے ہو۔''

''ڈیڈ، آئی ایم سوری۔''

رسل نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''ڈیڈ، پلیز...'' بروکس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔

''تمہیں ایک ہفتے کی سزا دی جارہی ہے۔ ایک ہفتے تک گیم کھیلنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ ایک ہفتے کے بعد جب یہ گیم سسٹم تمہیں واپس ملے گا تو صرف وہ گیم کھیلنے کی اجازت ہوگی جو ڈیون کھیلتا ہے۔ سمجھ گئے؟'' رسل نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''لیکن ڈیڈ، ڈیون تو ابھی صرف تین سال کا بچہ ہے۔'' بروکس نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

''بالکل، میرا بھی یہی مقصد ہے۔'' رسل یہ کہہ کر جانے کے لیے پلٹا لیکن پھر رک گیا اور بولا۔ ''اور ہاں، تم فرش پر پیر پٹخنا بھی بند کردو۔ تم اپنی ممی کو پاگل کیے دے رہے ہو۔''

☆☆☆

جب رسل سیڑھیوں سے اتر کر نیچے آیا تو قیسی نے اپنی پلیٹ پر سے سر اٹھا کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''کیا ہو رہا تھا؟''

''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس لڑکے کو کیا ہو گیا ہے۔ اس کے ذہن میں کیا چیز گھس گئی ہے۔ اسکول کے تمام امتحانات میں وہ ''اے'' گریڈ حاصل کرتا رہا ہے۔ لیکن اب وہ ان مار دھاڑ اور قتل و غارت سے بھرپور گیمز سے اپنے ذہن کو زہر آلود کر رہا ہے۔''

''اوہ رسل، کیا تمہارے خیال میں تم بے جا اور شدید ردِعمل کا اظہار نہیں کر رہے ہو؟'' قیسی نے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔

''اس نے ایک بوڑھی عورت کو صرف اس وجہ سے مار دیا کہ وہ اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔'' رسل نے بتایا۔

''وہ صرف ایک گیم ہے۔''

''گیم کی ایسی کی تیسی۔'' رسل نے ایک گالی دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ گیم تشدد کو پروان چڑھا رہا ہے۔''

''اپنے بچوں کو اس بات کا کریڈٹ بھی دو کہ وہ اتنا اسمارٹ ہے کہ حقیقت اور بے بنیاد مفروضوں میں فرق کو جانتا ہے۔'' قیسی نے کہا۔

''اس کو اتنا اسمارٹ ہونا چاہیے کہ آئندہ یہ لغو گیم کبھی نہ کھیلے۔'' رسل نے غصے سے کہا۔ ''حقیقت میں کسی کو بھی یہ گیمز کھیلنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔''

''واقعی؟''

''ہاں۔'' رسل نے پُرزور لہجے میں کہا۔

''تو پھر کاؤ بوائز اور ریڈ انڈینز کے بارے میں کیا خیال ہے؟ یا پھر ان پُرتشدد ایکشن فلموں کے متعلق کیا کہو گے جو تم بڑے شوق سے دیکھتے ہو؟'' قیسی کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

''وہ مختلف چیز ہے۔''

''یقیناً مختلف ہے۔'' قیسی کا لہجہ کسیلا تھا۔

رسل پلٹ کر جانے لگا تو قیسی سے رہا نہ گیا۔ وہ بولی۔ ''چل دیے۔''

رسل نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''تمہاری خاموشی ثابت کرتی ہے کہ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔'' قیسی نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

اپنے بیڈ پر جانے سے پہلے رسل نے رک کر ڈیون کے کمرے کا جائزہ لیا۔ ڈیون گہری نیند سو رہا تھا۔ اس نے اپنا نیا سپر مین ایکشن فیگر اپنے سینے سے چمٹایا ہوا تھا۔ گہری نیند میں ہونے کے باوجود خوشی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

رسل نے اس کے سنہری بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیریں اور پھر ماسٹر بیڈروم کی جانب چل دیا۔

بیڈروم میں پہنچ کر اس نے قیسی کو پکارا۔ ''میں بیڈ پر جارہا ہوں۔''

''شب بخیر!'' قیسی نے کچن سے جواب دیا۔ ''جیسی تمہاری مرضی۔''

''جہنم میں جاؤ۔'' رسل بڑبڑاتے ہوئے بیڈ پر گر پڑا اور آنکھیں بند کرلیں۔

☆☆☆

رسل ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور آنکھیں پھاڑ کر وحشت سے اندھیرے میں گھورنے لگا۔ اس کا دل سینے میں تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ''یہ کم بخت کیا تھا؟'' وہ بڑبڑایا۔

قیسی بھی بیدار ہو چکی تھی۔ وہ گہری گہری سانسیں لے رہی تھی اور اس کی آواز ایک خوف زدہ سرگوشی کی طرح تھی۔

''میرے خیال میں کوئی گھر میں ہے۔''

''کیا کہیں...''

اچانک مکان کے دوسرے حصے میں ایک زوردار دھماکا ہوا اور ان کی روحیں تک تڑپ کر رہ گئیں۔ پورا مکان لرز گیا تھا۔

رسل کے کانوں میں ڈیون کے کمرے سے اس کی ہسٹریائی انداز میں رونے کی آواز سنائی دی تو وہ بیڈ پر سے قلابازی کھاتا ہوا نائٹ اسٹینڈ کی دراز تک جا پہنچا اور ایک جھٹکے سے دراز کھول کر اپنے اعشاریہ تین پانچ سات کے اسمتھ اینڈ ویسن ریوالور کو ٹٹولنے لگا جو وہ دراز میں چھپا کر رکھتا تھا۔ ''شٹ!'' وہ بڑبڑایا۔

''کیا ہوا؟'' قیسی کی آواز اسے اپنی پشت پر سنائی دی۔

''کیا میرا ریوالور تم نے اٹھایا ہے؟''

''نہیں۔''

قیسی خوف کے مارے رسل کی پیٹھ سے چپٹی ہوئی تھی۔ رسل نے خود کو قیسی کی گرفت سے آزاد کرایا اور تیزی سے الماری کی جانب لپکا۔ پھر وہ دیوانوں کی طرح الماری کے اوپری شیلف پر ٹٹولنے لگا۔

اسی اثنا میں ایک اور فائر کی آواز مکان میں گونجنے لگی۔

ڈیون کا رونا یکلخت بند ہو گیا۔

قیسی کے حلق سے ایک زوردار چیخ بلند ہوئی۔ پھر رسل کے کانوں میں قیسی کے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ فرش پر ننگے پیر کمرے سے باہر جا رہی تھی۔

جب رسل کو احساس ہوا کہ الماری میں سے اس کی شاٹ گن بھی غائب ہے تو اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہری دوڑ گئی۔

''رسل! جلدی سے اِدھر آؤ۔'' اس کے کانوں میں قیسی کی تیز آواز سنائی دی۔ ''اوہ، مائی گاڈ! نہیں... نہیں... یہ مت کرو...''

رسل بجلی کی سی سرعت سے کمرے سے باہر لپکا تو عین اسی لمحے اس نے قیسی کو پیچھے کی جانب لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا۔ اس کے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں اور آنکھوں میں جلن مچ گئی۔

اس دوران قیسی گھوم چکی تھی۔ تب رسل نے مدھم روشنی میں دیکھا کہ قیسی کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا اور اس میں سے خون رس رہا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس کے نائٹ گاؤن میں بھی ننھے سوراخ بن چکے تھے جن سے خون بہہ رہا تھا۔

پھر قیسی کی دہشت زدہ آنکھیں دھیرے دھیرے بند ہوتی چلی گئیں اور وہ اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی۔

رسل نے نظریں اوپر اٹھائیں تو اسے اپنے دل کی دھڑکن رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کے چہرے کے مقابل اس کی اپنی ہی شاٹ گن کی نال تنی ہوئی تھی۔

رسل کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ ''بروکس، یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' اس نے روہانسے لہجے میں کہا۔

''میں فائنل لیول میں سب کو مات دے رہا ہوں۔''

''بیٹا پلیز! شاٹ گن نیچے رکھ دو۔''

بروکس تناؤ کے ان لمحات میں کئی سیکنڈ تک بارہ گیج کی شاٹ گن کو مضبوطی سے تھامے رہا۔ بالآخر اس نے ایک گہری سانس لی اور شاٹ گن نیچے فرش پر گرا دی۔ ''یہ گن ویسے بھی بہت بھاری ہے۔'' وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔

رسل نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اچانک رک گیا۔

بروکس کا ہاتھ اپنی کمر کی بیلٹ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ بروکس کی جینز کی بیلٹ میں اڑسا ہوا اسمتھ اینڈ ویسن ریوالور صاف دکھائی دے رہا تھا۔

رسل بمشکل تمام تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''تم... تم نے یہ سب کیسے کیا؟ تم نے میرا ریوالور اور شاٹ گن کیسے نکالیں؟''

اس سوال پر بروکس مسکرا دیا۔ ''میں اسٹیلتھ موڈ سے اندر گیا تھا۔ یاد ہے، وہی طریقہ جو آپ نے مجھے بتایا تھا؟ چپکے چپکے... دبے پاؤں... پنجوں کے بل...''

رسل نے ایک قدم آگے بڑھایا اور ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ ریوالور مجھے دو۔ فوراً اور ابھی۔''

اس بات پر بروکس نے ایک جھٹکے سے اپنی جینز کی بیلٹ میں اڑسا ہوا ریوالور باہر نکالا اور اس کی نال کا رخ رسل کے سینے کی جانب کرتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔

پھر فاتحانہ انداز میں ہاتھ لہراتے ہوئے بولا۔ ''گیم ختم ہو گیا، گرون اپ (Grown-up) میں نے فائنل لیول میں سب کو مات دے دی۔''

جمال دستی

فیصلہ

کچھ لمحات انتہائی سنسنی خیز ہوتے ہیں... جو انسان کو ایسی کیفیات سے دوچار کر دیتے ہیں جن سے چھٹکارا پانا ناممکن ہو جاتا ہے... دو دوستوں کی کہانی جن کی دوستی ایک دوراہے پر آ گئی تھی...

دوستی اور فرض کے درمیان حائل امتحان کی کٹھن گھڑیاں

سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔

سائے دراز ہو رہے تھے۔ مغرب کی طرف سے ہلکی ہلکی خنک ہوا چلنی شروع ہو گئی تھی۔ جنید کھڑکی کے قریب بیٹھا خلا میں گھور رہا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں بے شمار بُرے دن دیکھے تھے لیکن آج کا دن ان سب پر سبقت لے گیا تھا۔ ابھی یہ دن ختم نہیں ہوا تھا۔ سورج کی روپہلی کرنیں درختوں کی چوٹیوں پر چمک رہی تھیں۔ آج کا سورج اس کے لیے تباہی کا پیغام لے کر طلوع ہوا تھا۔ وہ کافی دیر سے

وہاں بیٹھا خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

لان کے اندر اس کے کم سن بیٹے نوید اور سعدیہ لوڈو کھیل رہے تھے۔ یہ لوڈو میگنیٹڈ تھا جو شفیق درانی نے انہیں لاکر دیا تھا۔ وہ ان کا پڑوسی تھا اور بڑا اچھا آدمی تھا۔ دونوں گھروں کے درمیان صرف ایک باڑ حائل تھی لیکن ان کے خوش گوار تعلقات کے مابین کوئی باڑ حائل نہیں تھی۔ وہ ہر خوشی اور غم کے معاملات میں برابر کے شریک ہوتے تھے۔

جنید نے ایک گہری سانس خارج کی اور لان کے ایک گوشے میں پڑی ہوئی گھاس کاٹنے والی مشین کو دیکھنے لگا جو اس نے شفیق درانی سے عاریتاً لی تھی۔ اسے اب تک مشین واپس کر دینی چاہیے تھی لیکن محض بے پروائی کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکا تھا۔ اب وہ درانی کے سامنے جاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ بات ہی کچھ ایسی تھی۔ ان کی مثالی دوستی کے درمیان فرض کی دیوار حائل ہوگئی تھی۔

جنید کے خیالات پچھلی رات کی طرف چلے گئے، وہ ایک فارماسیوٹیکل کمپنی میں سیلز منیجر تھا۔ حسبِ معمول گزشتہ روز وہ شام کو اپنی کار میں گھر لوٹ رہا تھا۔ اس کی جیب میں خطیر رقم تھی جو اس نے ڈرافٹ کرنا تھی۔ رقم کمپنی کی تھی، وہ چار بجے بینک پہنچا۔ اپنی کار سے اتر رہا تھا کہ کسی نے عقب سے اس پر چوٹ لگائی۔ چوٹ زیادہ زوردار نہیں تھی۔ وہ تیزی سے پیچھے گھوما اور حملہ آور کی طرف دیکھا جو دوسری چوٹ لگانے کے لیے ہاتھ اٹھا چکا تھا... اس نے چوٹ سے بچنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا اور فی الفور بے ہوش ہو گیا۔ حملہ آور نقدی کا لفافہ لے کر فرار ہو گیا۔ جب اسے ہوش آیا تو اس کے ذہن میں حملہ آور کے دھندلے نقوش موجود تھے اور اس کا خیال تھا کہ وہ حملہ آور کو دوبارہ دیکھ کر فوراً پہچان سکتا ہے۔

ہوش میں آنے کے بعد وہ سیدھا پولیس اسٹیشن پہنچا اور واردات کی رپورٹ درج کرا دی۔ اتفاق سے کیس کی تفتیش اس کے پڑوسی شفیق درانی کے سپرد ہوئی جو پولیس انسپکٹر تھا۔ جنید اپنے پڑوسی اور دوست کی بھرپور مدد کرنا چاہتا تھا۔ چونکہ جنید نے حملہ آور کی جھلک دیکھی تھی اور وہ اسے شناخت کر سکتا تھا اس لیے انسپکٹر درانی اسے عادی مجرموں کی تصاویر دکھانے کے لیے پولیس ہیڈ کوارٹر لے گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے تک دونوں مجرموں کی تصویریں دیکھتے رہے۔ دفعتاً ایک تصویر دیکھ کر دونوں ہی چونک گئے۔ وہ جنید کی تصویر تھی... سات سال پرانی تصویر۔ اس پر صرف مونچھیں زائد تھیں۔ انسپکٹر درانی غیر محسوس طور پر ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا پھر اس نے البم کا صفحہ پلٹ دیا۔ وہ صفحات پلٹتا رہا، مزید تصویریں اور نام سامنے آتے رہے لیکن جنید کو اب کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے خیالات دور... بہت دور ماضی کے اندھیروں میں بھٹک رہے تھے۔

اسے پورا یقین تھا کہ درانی اس کی تصویر پہچان چکا ہے۔ تصویر دیکھتے ہی اس نے دھیرے سے سانس اندر کھینچا تھا اور اس کے کندھے سیدھے ہو گئے۔ تاہم نہ تو اس نے جنید کی طرف دیکھا اور نہ ہی کسی فوری ردِعمل کا اظہار کیا لیکن جنید جانتا تھا کہ وہ نہایت اصولی انداز میں کام کرتا ہے۔ اس کے رخصت ہو جانے کے بعد درانی نے اس کے کیس کی فائل چیک کی ہوگی اور اب تک ہر بات سے آگاہ ہو چکا ہوگا۔ وہ درانی کو بہ خوبی جانتا تھا۔ وہ فرض شناس اور بااصول افسر تھا۔ ذاتی مصلحت پر اصول کو قربان کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔ ان لوگوں میں سے بھی نہیں تھا جو حالات کے پیشِ نظر اصولوں میں لچک پیدا کر لیتے ہیں۔ وہ قانون کا احترام کرتا تھا اور اس پر عمل کرانا بھی اپنا فرض سمجھتا تھا۔

چند سال قبل جنید سے ایک جرم سرزد ہو گیا تھا۔

وہ جرم اس نے حالات سے مجبور ہو کر کیا تھا۔ اس واقعے کو چھ یا سات سال گزر چکے تھے۔ وہ واقعہ قصۂ پارینہ بن چکا تھا لیکن آج یہ بھولا بسرا ماضی بھیانک شکل میں اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ اچانک قدموں کی چاپ سن کر اس نے نیم تاریک کمرے میں گردن گھما کر دیکھا۔ اس کی بیوی ثمینہ اندر داخل ہو رہی تھی۔

''تم یہاں چھپے بیٹھے ہو اور میں سارے گھر میں تمہیں تلاش کر رہی ہوں۔ آؤ ذرا، میرے ساتھ باورچی خانے میں شامی کباب کا قیمہ میش کر دو مجھے...''

دفعتاً وہ چپ ہو گئی اور تشویش ناک نظروں سے اپنے شوہر کو دیکھنے لگی۔

''کیا بات ہے جیدی؟'' اس نے کہا۔ ''تمہارے چہرے پر یہ ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟''

ثمینہ دبلی پتلی اور خوش شکل عورت تھی۔ وہ جنید سے والہانہ محبت کرتی تھی اور اسے تکلیف میں دیکھ کر ایک دم پریشان ہو جاتی تھی۔

جنید نے تھوک نگلتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور ارادے کے باوجود کچھ نہیں کہہ سکا۔

''تم بولتے کیوں نہیں، جیدی؟'' وہ بولی۔ ''کچھ بتاؤ، مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔''

جنید نے خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھے افسوس ہے ثمینہ! آج میں بہت بُری خبر لایا ہوں۔''

''کیسی بُری خبر؟'' ثمینہ کے ہونٹوں پر تکلیف دہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ ''کیا تمہیں ملازمت سے جواب مل گیا ہے؟ یا پھر کوئی اور مسئلہ ہے؟''

''نہیں۔'' جنید نے ہولے سے جواب دیا۔

''تو پھر کیا بات ہے؟'' ثمینہ نے بے تابی سے پوچھا۔ ''صاف صاف کیوں نہیں بتاتے؟''

جنید نے اٹک اٹک کر کہا۔ ''تمہیں یاد ہوگا ثمینہ! ایک مرتبہ مجھ سے ایک جرم سرزد ہو گیا تھا۔''

''کک... کیا کسی نے تمہیں پہچان لیا ہے؟''

''ہاں۔'' جنید نے جواب دیا۔ ''درانی نے۔''

پھر اس نے تصویر والی بات تفصیل سے اسے بتا دی۔

ثمینہ کی آنکھوں سے بھی خوف جھلکنے لگا۔ برسوں پرانا خوف... یہ خوف ایک طویل عرصے تک ان کے اعصاب پر مسلط رہا تھا... پھر رفتہ رفتہ معدوم ہو گیا لیکن آج دوبارہ اس پرانے خوف نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

دونوں دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔

بالآخر ثمینہ نے ہولے سے سر ہلا دیا مگر منہ سے کچھ نہیں کہا۔

سات سال قبل دونوں ایک چھوٹے سے قصبے میں رہتے تھے۔ جنید ایک چھوٹی سی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ اچانک بعض وجوہات کی بنا پر فیکٹری بند ہو گئی اور جنید بے روزگار ہو گیا۔ ان دنوں اس کی دو سالہ بچی سعدیہ اور بیوی دونوں ہی بیمار تھے۔ رفتہ رفتہ اس کی جمع پونجی تمام ہو گئی۔ تھوڑا بہت دوستوں اور عزیزوں سے ادھار لے کر کام چلتا رہا مگر کب تک؟ مزید ادھار ملنے کی بھی قطعاً کوئی توقع نہیں تھی۔

آمدنی ہو یا نہیں، ضروریات تو کبھی ختم نہیں ہوتی ہیں۔

بالآخر اس نے چوری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ رات اسے آج بھی اچھی طرح یاد تھی۔ اس کی بچی سعدیہ جو اس وقت صرف دو سال کی تھی، سخت بیمار تھی۔ ثمینہ بھی بیمار تھی اور وہ خود خالی ہاتھ بیٹھا اپنی لاچارگی و بے بسی پر آنسو بہا رہا تھا۔ دوا کے پیسے تو کجا اس رات ان کے گھر میں کھانا بھی نہیں تھا۔ وہ دن بھر پیسوں کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا تھا لیکن ہر طرف ناکامی نے خیر مقدم کیا تھا۔ دوست احباب اسے دیکھتے ہی کنارہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

اس وقت اس پر ایسی کیفیت طاری تھی جو جائز و ناجائز کی تمیز مٹا دیتی ہے اور انسان ہر قسم کے خطرے میں کودنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ پس رات کے ایک بجے وہ سیدھا ایک گیس اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ وہ گیس اسٹیشن اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر ایک قدرے ویران جگہ پر واقع تھا اور عام طور پر رات کے گیارہ بجے بند ہو جاتا تھا۔ اس نے آہنی راڈ کے ساتھ کھڑکی کا شیشہ توڑا اور اندر داخل ہو کر کیش بکس توڑ کر اس کے اندر موجود چھوٹے بڑے نوٹ نکال لیے... سارا کام بہت ہی آسان ثابت ہوا تھا۔ اتنی رقم ملنے کی توقع اسے نہ تھی کیونکہ یہ ایک چھوٹے قصبے کا پمپ تھا۔ یہ خطیر رقم اس کی یومیہ آمدنی تو نہیں ہو سکتی تھی، بہرطور... جنید کو یہ سب سوچنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اسے آم کھانے سے مطلب تھا۔

لیکن سات سال کے بعد آج پولیس کے ریکارڈ میں اپنی تصویر دیکھ کر اسے سخت حیرت ہوئی، کیونکہ اس کے خیال میں اس چوری کے بارے میں اس کی بیوی ثمینہ کے سوا کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔

طویل خاموشی کے بعد ثمینہ نے کہا۔ ''لیکن پولیس کے پاس تمہاری تصویر کیسے پہنچ گئی؟''

''میں خود حیران ہوں۔ پہلے تو خود مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔''

''کیا تمہیں یقین ہے کہ... انسپکٹر درانی نے تمہاری تصویر شناخت کر لی ہے؟''

''سو فیصد یقین ہے کہ وہ میری تصویر پہچان چکا ہے۔''

''مجھے امید ہے کہ انسپکٹر درانی تمہارے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرے گا۔'' ثمینہ نے کہا۔ ''نہیں... نہیں، وہ ایسا کچھ نہیں کرے گا۔ خوامخواہ پریشان ہو رہے ہو، وہ تمہیں بھائیوں کی طرح چاہتا ہے۔ تم دونوں اکٹھے شکار بھی کھیلنے جاتے ہو پھر شام کو تاش اور شطرنج کھیلتے ہو۔ ہم ہر ہفتے ایک دوسرے کی کھانے پر دعوت کرتے ہیں۔ یہ خدا درانی ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ یوں بھی تم اب ایک معزز حیثیت و شخصیت کے مالک ہو۔''

جنید نے صدمے سے سر ہلا دیا۔ گزشتہ سالوں کے دوران میں اس نے اپنی محنت اور ایمانداری کے ساتھ واقعی

ایک معزز حیثیت حاصل کرلی تھی، اچھی نوکری کے علاوہ سوشل سرگرمیوں میں بھی بھرپور حصہ لیتا تھا۔ جیم خانہ کا نہ صرف وہ ممبر تھا بلکہ آفیسرز اسپورٹس کلب کا سیکریٹری بھی تھا۔ حال ہی میں کمیونٹی انوائرمنٹ کا چیئرمین بھی منتخب کیا گیا تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کو یاد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ قانون کی نظر میں وہ مجرم تھا اور سزا کا مستحق تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور ثمینہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم درانی کو نہیں جانتیں، وہ دیانت دار پولیس افسر ہے۔ کبھی اپنے فرض سے دھوکا نہیں کرسکتا۔''

''میں ہرگز یہ بات نہیں مان سکتی۔'' ثمینہ نے کہا۔ ''اگر درانی کو کچھ کارروائی کرنی ہوتی تو اب تک کرچکا ہوتا۔''

''درانی کبھی عجلت کا مظاہرہ نہیں کرتا، ہمیشہ سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتا ہے۔''

''میرا تو خیال ہے کہ اس نے تمہاری تصویر شناخت ہی نہیں کی، تم یونہی گھبرا رہے ہو۔''

''نہیں ثمینہ! میں خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہتا۔'' جنید نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''تم اس مسئلے کا کوئی حل سوچو۔ میں چند ضروری انتظامات کرلوں۔''

☆☆☆

انسپکٹر درانی کھڑکی کے قریب بیٹھا شام کے بڑھتے ہوئے سایوں کو گھور رہا تھا۔ سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا اور ہلکی ہلکی خنک ہوا چلنی شروع ہوگئی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں بے شمار مسائل کا سامنا کیا تھا۔ لیکن آج کا مسئلہ ان سب پر سبقت لے گیا تھا۔ وہ کافی دیر سے بیٹھا کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک طرف فرض تھا اور دوسری طرف دوستی۔ دونوں کے درمیان زبردست کشمکش جاری تھی۔ اسے معلوم تھا کہ بالآخر اسے فرض کے سامنے ہی جھکنا پڑے گا پھر بھی وہ سخت متذبذب تھا۔

اس نے سوچا کیوں نہ وہ ایک پولیس افسر کے بجائے کچھ دیر کے لیے ایک جج اور منصف بن جائے اور جنید کی حمایت میں فیصلہ صادر کردے... لیکن یہ بات اس کے اختیارات سے باہر تھی۔ وہ ایک پولیس افسر تھا۔ اس کا کام فیصلہ کرنا نہیں بلکہ مجرم کو قانون کے حوالے کرنا تھا۔

وہ نظریں گھما کر جنید کے لان کی طرف دیکھنے لگا جہاں اس کے دونوں بچے لوڈو کھیل رہے تھے۔ ان کی..... خوش گوار آوازیں سارے ماحول پر چھائی ہوئی تھیں۔ اپنے لان میں بڑھی ہوئی گھاس دیکھ کر اسے یاد آیا کہ جنید نے اس سے گھاس کاٹنے والی مشین لی تھی۔ اب اسے مشین واپس لے کر اپنے لان کی درستگی کرلینی چاہیے۔

آج جب اس نے ہیڈ کوارٹر کی البم میں جنید کی تصویر دیکھی تو وہ دم بخود رہ گیا۔ اس نے بہ مشکل اپنی حیرت کو چھپایا تھا۔ جنید کے جانے کے بعد اس نے دوبارہ تصویر نکال کر غور سے اسے دیکھا تھا۔ یہ واقعی جنید کی تصویر تھی، صرف مونچھوں کا اضافہ تھا۔ بائیں گال پر زخم کا نشان بھی موجود تھا۔

پھر اس نے فائل نکال کر دیکھی۔ نام میں معمولی سا فرق تھا۔ جنید کے بجائے جنید احمد جیدی لکھا تھا۔ اس نے نام میں معمولی سی تبدیلی کرلی تھی اور مونچھیں صاف کروادی تھیں۔ اگر جنید کے ساتھ اس کے اتنے قریبی تعلقات نہ ہوتے تو وہ کبھی یہ بات نہ جان سکتا کہ تصویر اس کی ہے۔ اگر جنید نے اپنی تصویر پہچان بھی لی تھی تو اس نے اپنے چہرے سے اس بات کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا۔

ریکارڈ کے مطابق جنید نے سات سال قبل ایک گیس اسٹیشن میں چوری کی تھی۔ چوری کا کوئی چشم دید گواہ نہیں تھا لیکن جائے واردات پر انگلیوں کے نشانات پائے گئے تھے۔ پولیس نے رسمی کارروائی پوری کرنے کے لیے یہ نشانات ہیڈ کوارٹر بھجوا دیے تھے اور وہاں انگلیوں کے نشانات شناخت کرلیے گئے۔ لیکن پولیس اس کو تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہوسکی تھی۔

آہ... یہ ناخوش گوار فریضہ اس کو ادا کرنا تھا۔ جنید نہ صرف اس کا دوست تھا بلکہ ایک معزز شہری بھی تھا۔ اس نے جنید کے بارے میں کبھی اس قسم کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ دونوں ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے اور سیر و تفریح کرتے تھے۔ اکثر و بیشتر ایک دوسرے کے گھر کھانا بھی کھاتے تھے۔

اور اب وہ اسے حوالات میں بند کرنے پر مجبور تھا۔

وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ اس کی بیوی سونیا اندر داخل ہوئی۔ انسپکٹر درانی اپنی بیوی سے والہانہ محبت کرتا تھا۔ جب وہ مسکرا کر اس کی طرف دیکھتی تو وہ اپنی عمر پندرہ سال کم محسوس کرنے لگتا تھا۔

''تم یہاں چھپے بیٹھے ہو۔'' سونیا نے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔ ''بچوں نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ذرا انہیں اپنے پاس بلالو تو میں کچھ کام کرلوں۔''

''تم خود ہی سنبھالو بچوں کو... میرا دماغ پہلے ہی الجھا ہوا ہے۔''

''کیا پھر کوئی مشکل کیس آگیا؟''

''کیس تو بالکل سیدھا سادہ ہے لیکن...''

''لیکن کیا؟''

''میرا خیال ہے کہ مجھے جنید احمد کو گرفتار کرنا پڑے گا۔''

''کک... کیا؟'' سونیا نے تیزی سے کہا۔ ''کیا تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا؟''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں سونیا۔''

سونیا بھویں سکیڑ کر سوچنے لگی پھر بولی۔ ''کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ گزشتہ روز جنید نے ڈکیتی کی جو رپورٹ درج کروائی ہے، وہ جھوٹی ہے؟ اور اس نے خود ہی رقم غائب کی ہے؟''

''وہ رپورٹ تو بالکل ٹھیک ہے، جنید ایک اور کیس میں پولیس کو مطلوب ہے۔''

پھر اس نے مختصر الفاظ میں ساری تفصیل اپنی بیوی کو سنا دی۔ کچھ دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ درانی نے ایک سگریٹ سلگا لیا تھا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا پھر سونیا نے سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

''بہتر یہی ہے کہ تم یہ سب کچھ بھول جاؤ۔ تمہارے سوا کوئی یہ بات نہیں جانتا اور غالباً کوئی اس کی تصویر کو شناخت نہیں کرسکتا۔''

''تصویر تو میں بھی شناخت نہ کر پاتا۔'' درانی نے کہا۔ ''لیکن جنید اس وقت میری نظروں کے سامنے کھڑا تھا۔''

''بس! اس بات کو یہیں ختم کردو۔''

''بہ خدا میں بھی یہی چاہتا ہوں لیکن یہ ناممکن ہے۔ میں... میں اس بات کو نظرانداز نہیں کرسکتا۔''

''نہیں درانی! تم ایسا نہیں کرسکتے۔'' سونیا نے جوش سے کہا۔ ''یہ سخت زیادتی ہوگی۔ خدا کے لیے سوچو تو سہی، جنید کے بچے تمہارے بارے میں کیا سوچیں گے۔ میں اس کی بیوی ثمینہ کو زندگی بھر منہ نہیں دکھا سکوں گی۔ ان کے بچے ہمارے بچوں کی طرح ہیں، وہ ہمارے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔ تمہیں یاد ہے، پچھلی سالگرہ پر ثمینہ نے مجھے کتنا خوب صورت جوڑا تحفہ کردیا تھا اور ولی کی پیدائش پر وہ کئی ہفتوں تک میری خدمت کرتی رہی تھی۔''

''سونیا! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں نے پوری ملازمت کے دوران ذرا سی بھی بے قاعدگی نہیں کی۔ کبھی کسی سے ایک سگریٹ تک نہیں لیا۔ میں قانون نہیں بناتا اور نہ ہی حالات کا ذمے دار ہوں۔ جنید نے چوری کا ارتکاب کیا ہے اور اس کا یہ جرم میرے علم میں آچکا ہے۔ اگر میں اس کی پردہ پوشی کرتا ہوں تو خود بھی مجرم ٹھہرتا ہوں۔''

''میرا خیال ہے کہ جنید نے حالات سے مجبور ہوکر جرم کا ارتکاب کیا ہوگا۔'' سونیا نے کہا۔ ''اس بات کی تم بھی گواہی دے سکتے ہو کہ جنید ایک شریف آدمی ہے۔ میری مانو تو اس بات کو بھول جاؤ۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ تم کئی مواقع پر جنید سے قرضہ بھی لے چکے ہو؟ کیا اتنے اچھے آدمی کو تم جیل میں بند کروگے؟''

''مجھے کچھ نہیں پتا... مجھے کچھ نہیں پتا۔'' انسپکٹر شفیق درانی نے پریشان کن لہجے میں کہا اور اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ ''ٹھیک ہے جنید میرا دوست ہے وہ ایک شریف آدمی ہے لیکن قانون ان باتوں کو نہیں دیکھتا، قانون اندھا ہوتا ہے۔''

وہ بار بار اپنے سر کو جھٹک رہا تھا۔ سونیا لحہ بھر تک اسے گھورتی رہی پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''میں کچھ نہیں کہتی درانی! جو تمہارے جی میں آئے کرو۔ مجھے معلوم ہے تم نے کبھی کوئی غلط کام نہیں کیا۔'' پھر وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

درانی کمرے سے نکل کر لان میں آگیا۔ اس نے دیکھا جنید پہلے ہی سے باڑ کی دوسری طرف کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر عزم اور اطمینان جھلک رہا تھا۔

''ہیلو جنید!'' درانی نے اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''ہائے درانی!'' جنید نے خوش اخلاقی سے کہا۔ ''غالباً تم گھاس کاٹنے والی مشین لینے آئے ہو۔ مجھے افسوس ہے میں وقت پر مشین واپس نہیں کرسکا۔''

درانی اس کی بات نہیں سن رہا تھا۔ وہ اضطرابی کیفیت سے دوچار تھا۔ اس نے جیب سے ایک سگریٹ نکال کر منہ میں دبایا اور پھر ماچس تلاش کرنے لگا۔ جنید چند لمحوں تک پُرسوچ نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر لائٹر جلا کر اس کے سامنے کردیا۔ درانی نے سگریٹ سلگانے کے بعد شکریہ ادا کیا اور بات کرنے کے لیے مناسب الفاظ تلاش کرنے لگا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہاں سے بات شروع کرے۔

''کیا بات ہے درانی؟'' جنید نے پوچھا۔ ''تم کچھ پریشان پریشان سے لگ رہے ہو... کیا میں تمہاری کچھ مدد کرسکتا ہوں؟''

درانی نے سگریٹ کا ایک مختصر سا کش لیا اور مضطرب نظروں سے جنید کی طرف دیکھنے لگا۔ جنید کے چہرے پر اطمینان نظر آرہا تھا اور یہ بات درانی کے لیے سخت الجھن کا

باعث تھی۔ اس نے سوچا کہ غالباً جنید اس بات سے آگاہ نہیں ہے کہ میں نے اس کی تصویر شناخت کرلی ہے۔

''بات یہ ہے جنید!'' اس نے اپنے جذبات کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''کبھی کبھی انسان کو مشکل فیصلے کرنے پڑتے ہیں... اور بعض اوقات تو انسان یہ سوچتا ہے کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں دور چلا جائے۔''

جنید نے اس کی باتوں پر غور کرنے کے انداز میں اپنی جیب سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا پھر کش لگانے کے بعد بولا۔

''خصوصاً قانونی اداروں سے تعلق رکھنے والے افراد پر بعض بڑے مشکل لمحات آتے ہیں، مثلاً کبھی کبھی انہیں فرض اور دوستی میں سے ایک چیز کو قربان کرنا پڑتا ہے۔''

درانی نے چونک کر جنید کی طرف دیکھا۔ ''میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔''

''میرا خیال ہے ہمیں کھل کر بات کرلینی چاہیے۔'' جنید نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''آج پولیس ہیڈ کوارٹر میں تم نے میری تصویر دیکھی تھی۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟''

درانی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جنید نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''پولیس ریکارڈ کے مطابق میں ایک مفرور مجرم ہوں۔ میرا خیال ہے کہ کیس کی تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں کیونکہ تم ریکارڈ میں سب کچھ دیکھ چکے ہوگے۔ میں تمہیں اس کیس سے متعلق چند ایسی باتیں بتانا چاہتا ہوں جو پولیس کے ریکارڈ میں موجود نہیں ہیں۔''

''مجھے معلوم ہے تم کیا کہنا چاہتے ہو۔'' درانی نے کہا۔ ''لیکن میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ قانون یہ نہیں دیکھتا کہ کسی شخص نے کن حالات سے مجبور ہو کر جرم کیا تھا۔''

''تم غلط سمجھے ہو۔'' جنید نے کہا۔ ''میں حالات کی مجبوری بیان کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ میں تمہیں کچھ اور بتانا چاہتا ہوں۔ میں نے گیس اسٹیشن سے پینتالیس ہزار روپے چوری کیے تھے۔ یہ میری زندگی کا پہلا اور آخری جرم ہے۔ مجھے اس پر سخت ندامت تھی۔ تقریباً دو سال بعد جب میرے مالی حالات اچھے ہو گئے تو میں نے متعلقہ گیس اسٹیشن کو پچاس ہزار روپے کا ایک چیک مختصر سے تحریری نوٹ کے ساتھ بھجوا دیا تھا... اصل رقم کے ساتھ پانچ ہزار بہ طور ہرجانہ۔''

''اوہ۔'' درانی کے منہ سے بے اختیار طمانیت آمیز سانس خارج ہوگئی۔ لیکن پھر اس نے سوچا کہ اس کے باوجود جرم کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک بار پھر تاریکی چھا گئی۔

اسی لمحے دور سے پولیس سائرن کی آواز سنائی دی۔

''اچھا دوست۔'' جنید نے آواز کی طرف کان لگاتے ہوئے کہا۔ ''ثمینہ اور بچوں کا خیال رکھنا، شاید میں ایک روز تک...''

''کیا مطلب؟'' درانی نے گھبرا کر کہا۔

''ہاں دوست! میں نے تھوڑی دیر پہلے پولیس کو فون کر کے اپنے بارے میں اطلاع دے دی تھی۔'' جنید نے بتایا۔ ''یہ گاڑی اسی طرف آرہی ہے۔''

درانی نے غیر یقینی انداز میں کہا۔ ''تم نے پولیس کو فون کر دیا تھا، یہ تم نے کیا کیا؟''

''میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ ناخوش گوار کام میرے دوست کے ہاتھوں انجام پائے۔''

''اوہ۔'' درانی نے ایک گہری سانس لی اور اس کے کندھے ڈھیلے پڑ گئے۔ ''غضب کر دیا تم نے... مجھ سے مشورہ تو کر لیتے۔''

''میں تمہیں آزمائش میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔''

درانی نے سوچا۔ واقعی وہ ایک بڑی آزمائش سے بچ گیا تھا۔ اس اثنا میں پولیس کی کار لان کے سامنے آکر رک گئی۔ درانی اچھل کر باڑ کی دوسری طرف پہنچ گیا اور جنید کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر باہر چل پڑا۔

''میرا خیال ہے کیس زیادہ سنگین نہیں رہا۔'' اس نے کہا۔

''شاید ایک رات تمہیں حوالات میں رہنا پڑے، میں کل صبح تمہاری ضمانت کا انتظام کرلوں گا۔'' پولیس موبائل کے اندر درانی کے دو اسسٹنٹ اے ایس آئی جمال ظفر اور خاور علی بیٹھے تھے۔ درانی نے انہیں ساری تفصیل بتانے کے بعد کہا۔

''میرے دوست کا خیال رکھنا ظفر! اور یہ بات پریس والوں کو ہرگز معلوم نہ ہو۔''

ظفر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جنید دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور درانی کو مخاطب کر کے بولا۔

''دوست! گھاس کاٹنے والی مشین خود ہی لے لینا اور بچوں کا خیال رکھنا۔ ویسے میں نے ثمینہ کو ساری بات سمجھا دی ہے۔''

اس کے ساتھ ہی پولیس موبائل آگے بڑھ گئی۔

جاسوسی کی سالگرہ کا پہلا تحفہ خاص

کاشف زبیر

بازگشت

مادی اور روحانی کے علاوہ بھی انسان بہ اندازِ دیگر زندگی گزارتا ہے... اور یہ زندگی اس کی فطری جبلت کے قریب ہوتی ہے... اور زیادہ تر خوابوں کی ہمنوائی میں بسر ہو جاتی ہے... جنگل کی خوبو سے مشابہ ماحول میں بسیرا کر لینے والے کردار کی زندگی کے نشیب و فراز... وہ اپنے چاہنے والوں سے دور کسی اور ہی دنیا میں کھو کر اپنے شب و روز بتا رہا تھا...

اس شخص کا ماجرا جو لوگوں سے کم آشنائی اور گریز پائی کے اصول پر عمل پیرا تھا

''حنا۔'' ثنا نے کمرے میں جھانکا۔ ''اٹھ جاؤ بیٹا، جانے کا وقت ہو گیا ہے۔''

حنا جاگ گئی تھی لیکن کمبل کی گرمی اور نرمی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ماں کی آواز پر وہ اٹھ بیٹھی۔ دسمبر کا پہلا ہفتہ تھا۔ حنا کو بستر سے نکلتے ہوئے پھریری سی آگئی۔ وہ جلدی سے واش روم میں آئی، گرم پانی سے منہ ہاتھ دھو کر کچن میں آئی تو ثنا ناشتا بنا رہی تھی۔ اس نے ماں کو پیار کیا اور اپنے لیے اور نچ جوس نکالنے لگی۔ ثنا نے پیار سے اسے دیکھا۔ وہ اس کی ایک ہی بیٹی تھی بلکہ اس دنیا میں ثنا کا اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔

ثنا کمال خود ماں باپ کی اکلوتی تھی۔ چند ایک دور کے رشتے دار تھے جن سے بہت کم ملنا جلنا تھا، بعد میں یہ بھی نہ رہا۔ زمانہ طالب علمی میں ثنا کی ملاقات بختیار احمد سے ہوئی جو پسند میں بدل گئی۔ بختیار احمد کسی وجہ سے اپنے خاندان والوں کو اس شادی میں شریک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت ثنا کی ماں زندہ تھیں۔ ان کی رضامندی سے ان کی شادی ہوئی لیکن یہ شادی صرف تین سال قائم رہی۔ بختیار نہ صرف عمر میں ثنا سے بڑا تھا بلکہ اس کا ذہن بھی مختلف تھا۔ وہ زیادہ تر شہر سے دور اپنی جاگیر میں رہتا تھا۔ تین سال بعد انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی گاڑی مزید نہیں چل سکتی اس لیے انہوں نے باہمی رضامندی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ بختیار نے شہر کے پوش علاقے میں ایک چھوٹا سا بنگلا لے کر حنا کے نام کر دیا اور اسی کے نام سے ایک بینک اکاؤنٹ کھول کر اس میں بھاری رقم جمع کرا دی۔ ثنا کے خیال میں اس کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ تعلیم مکمل کر کے ایک سرکاری کالج میں لیکچرار بن گئی تھی اور اس کی تنخواہ دونوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی تھی۔ علیحدگی کے بعد بختیار احمد کبھی نہ لوٹنے کے لیے واپس چلا گیا۔

شروع میں ثنا کو کچھ دشواری پیش آئی۔ اکیلے ایک چھوٹی بچی کے ساتھ رہنا آسان کام نہیں تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس نے دشواریوں پر قابو پا لیا۔ حنا کی دیکھ بھال کے لیے اس نے ایک کل وقتی ملازمہ رکھ لی تھی۔ جب وہ کالج جاتی تو ملازمہ حنا کو دیکھتی۔ اس کے علاوہ گھر کے کچھ کام بھی وہی کرتی تھی۔ اس نے چھ سال کی عمر میں حنا کو اسکول میں داخل کرا دیا۔ اسکول ثنا کے کالج کے ساتھ تھا، وہ صبح جاتے ہوئے اسے چھوڑ جاتی

اور دوپہر میں چھٹی کے وقت اسے اسکول سے لے کر گھر آجاتی۔ کالج پرنسپل نے تعاون کر کے اس کی کلاسز اس طرح سیٹ کرادی تھیں کہ وہ وقت سے پہلے چھٹی کر کے جاسکتی تھی۔ یہ سلسلہ میٹرک تک چلا۔ اس کے بعد حنا خود کالج میں آگئی اور خود سے آنے جانے لگی۔ ملازمہ دو سال پہلے بیماری کی وجہ سے کام چھوڑ کر اپنے گاؤں واپس چلی گئی تھی اور اب دونوں ماں بیٹی خود سے سب کر لیتی تھیں۔ صرف کپڑے دھونے کے لیے ایک ملازمہ رکھی تھی جو اتوار والے دن آکر کپڑے دھو جاتی تھی۔ باقی گھر کی صفائی بھی حنا خود کر لیتی تھی۔

ایک ہفتہ پہلے حنا کے گریجویشن فائنل کے پرچے مکمل ہوئے تھے۔ وہ اور رنج جوس پی رہی تھی۔ ثنا نے سکے ہوئے توس اور ابلے ہوئے انڈے اس کے سامنے رکھ دیے۔ دونوں سادہ ناشتے کے عادی تھے، ثنا ناشتا اس کے سامنے رکھ کر چلی گئی۔ حنا جانتی تھی کہ ماں اس کا بیگ تیار کرنے گئی ہے۔ وہ بڑی ہو گئی تھی، آنے والے دنوں میں اس کی اکیسویں سالگرہ تھی مگر ثنا اب بھی اس کے بہت سارے کام اپنے ہاتھ سے کرتی تھی۔ وہ ناشتا کر کے کمرے میں آئی تو ثنا اس کے بستر پر بیٹھی کوئی چیز دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اس نے وہ چیز جلدی سے اس کے بیگ کے سائڈ والے خانے میں رکھ دی۔ حنا نے توجہ نہیں دی۔ اس نے اپنا لباس اٹھایا اور خود سے لگاتے ہوئے بولی۔

"ماما! یہ کیسا لگے گا؟"

ثنا مسکرائی۔ "میری بیٹی پر تو ہر لباس سجتا ہے لیکن اوپر سویٹر ضرور لینا، آج بہت سردی ہے۔"

"جی ماما۔" حنا نے کہا اور واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ تیار ہو کر وہ باہر آئی۔ ثنا نے اس کے لیے ایک سویٹر بھی نکال دیا تھا۔ اسے فکر تھی کہ حنا بے پروائی نہ کرے اور اسے سردی نہ لگ جائے۔ وہ موسم کی کم ہی پروا کرتی تھی۔ اس نے سویٹر پہنا اور بیگ اٹھا کر باہر آئی۔ ثنا گاڑی کے پاس کھڑی تھی۔ ان کے پاس ایک پرانی کلٹس تھی لیکن ثنا نے اسے بہت سنبھال کر رکھا تھا، بالکل نئی جیسی لگتی تھی۔ پہلے وہ حنا کو ڈرائیو نہیں کرنے دیتی تھی لیکن ایک سال سے اسے اجازت مل گئی تھی کہ وہ ڈرائیو کر سکتی ہے۔ اگر آس پاس کوئی کام ہوتا تو حنا ڈرائیو کر لیتی تھی۔ حنا نے بیگ پچھلی نشست پر رکھا اور بنگلے کا گیٹ کھولا۔ ثنا نے گاڑی باہر نکالی۔ حنا نے گیٹ بند کر کے اسے لاک کیا اور ماں کے برابر میں آبیٹھی۔ وہ دونوں اداس تھیں۔ حنا نے محسوس کیا کہ ماں زیادہ اداس ہے۔ اس نے ماں کا شانہ تھام لیا۔

"ماما! بس ایک مہینے کی تو بات ہے۔"

ثنا نے گہری سانس لی۔ "یہی سوچ کر تو صبر کر رہی ہوں۔ میں سوچتی ہوں کہ جب تمہاری شادی کر دوں گی، تب میں کیسے اکیلی رہوں گی۔"

"آپ اکیلی نہیں رہیں گی۔" حنا نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہوں گی، شادی کے بعد بھی۔"

"حنا! ہمارے معاشرے میں اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا۔"

"نہ سمجھا جاتا ہو۔" اس نے بے پروائی سے کہا تو ثنا رشک سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اس کی بیٹی کتنی مضبوط تھی۔ اسے لوگوں کی پروا نہیں تھی جبکہ خود ثنا نے بہت ڈر ڈر کر زندگی گزاری تھی۔ اسے ہمہ وقت یہ فکر لگی رہتی تھی کہ لوگ کیا کہیں گے۔ جبکہ حنا اس معاملے میں شروع سے راست رو تھی۔ اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ اس نے ماں کی طرف دیکھا۔ "میں نے سوچ لیا ہے کہ شادی کے بعد بھی آپ میرے ساتھ ہی رہیں گی۔ میں کسی صورت آپ سے الگ نہیں ہوں گی اور نہ آپ کو اکیلا چھوڑوں گی۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" ثنا ہنس کر بولی۔

"ماما! آپ مذاق نہ سمجھیں، میں اس معاملے میں سنجیدہ ہوں۔"

"میں مذاق نہیں اڑا رہی۔" ثنا نے اسے یقین دلایا اور پھر موضوع بدل دیا۔ "تم راستے میں اپنا خیال رکھنا اور وہاں پہنچتے ہی مجھے اطلاع کرنا ورنہ میں پریشان رہوں گی۔"

"آپ فکر نہ کریں ماما۔" حنا نے سعادت مندی سے کہا۔ "میں پہنچتے ہی کال کروں گی۔"

کچھ دیر میں وہ بس ٹرمینل پر تھے جہاں سے شہر سے باہر جانے والی بسیں چلتی تھیں۔ ثنا نے پہلے ہی سیٹ بک کرالی تھی۔ بس اپنی جگہ تیار تھی اور کچھ دیر میں اس کی روانگی تھی۔ بس کے سامان والے خانے میں سامان رکھا جا رہا تھا۔ حنا نے اپنا بیگ جمع کرایا۔ ثنا نے اسے گلے لگایا۔ "اپنا بہت خیال رکھنا اور ہو سکے تو مجھے روز کال کرنا۔"

"جی ماما۔" حنا نے کہا اور ماں کو پیار کر کے بس میں آگئی۔ بس روانہ ہونے والی تھی، تقریباً تمام نشستیں پُر تھیں اور کچھ دیر میں بس حرکت میں آگئی۔ ثنا باہر کھڑی ہاتھ ہلا رہی تھی اور وہ اس وقت تک ہاتھ ہلاتی رہی جب تک بس نظر آتی رہی۔ حنا ماں کو دیکھتی رہی پھر سیدھی ہو کر اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔ اب تک وہ بہت پُرسکون تھی مگر بس روانہ ہونے کے

بعد اس کے چہرے پر فکر کے تاثرات ابھرنے لگے۔ چار دن پہلے تک اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اسے یہ سفر کرنا پڑے گا۔ اب وہ بس میں تھی اور بس اس طرف جا رہی تھی جس کے بارے میں اس نے سنا ہی سنا تھا، کبھی دیکھا نہیں تھا۔

ہوش سنبھالنے کے بعد اس نے جب بھی ماں سے اپنے باپ کے بارے میں پوچھا تھا، ثنا نے اسے یہی بتایا کہ جب وہ بہت چھوٹی سی تھی، تب اس کے بابا انتقال کر گئے تھے۔ حنا کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کے قریبی دو ھیالی رشتے دار ہیں یا نہیں۔ اس موضوع پر اس نے کبھی بات بھی کی تو آگے سے ثنا نے چپ سادھ لی تھی۔ اس سے حنا نے اندازہ لگایا کہ اس کے کچھ نہ کچھ دھیالی رشتے دار ہیں لیکن اس کی ماں ان سے ملنا یا ان کا ذکر کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔ حنا کا تجسس اس بارے میں بہت زیادہ نہیں تھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ بہت خوش تھی۔ بس کبھی کبھی اسے خیال آتا تو وہ ماں سے بات کر لیتی تھی۔ اس نے کبھی اس معاملے میں ایک حد سے زیادہ تجسس کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

چار دن پہلے جب حنا اپنے بنگلے کے چھوٹے سے لان میں جھولے پر شام کی دھوپ سے لطف اندوز ہو رہی تھی تو اندر فون کی بیل بجی۔ ثنا نے کال ریسیو کی اور جب وہ کچھ دیر بعد باہر آئی تو حنا نے محسوس کیا کہ وہ پریشان ہے۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ "کیا ہوا ماما؟"

"کچھ نہیں۔" ثنا نے اسے ٹالا مگر اس کے دو دن بعد آنے والی رات جب وہ سونے کے لیے کمرے میں آئی تو کچھ دیر بعد ثنا بھی آگئی۔ اس نے حنا سے کہا۔ "میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں؟"

حنا کمبل میں سمٹ کر بیٹھ گئی۔ "جی ماما کہیے؟"

ثنا نے گہری سانس لی۔ "حنا! آج سے پہلے تم نے اپنے ددھیال کے بارے میں جب بھی بات کی، میں نے تمہیں ٹال دیا۔"

"جی ماما! مجھے لگا کہ آپ اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتیں اس لیے میں نے بھی اصرار نہیں کیا۔"

"اس کی وجہ تھی۔" ثنا بولی۔ وہ بہت سنجیدہ تھی۔ "میں نے تم سے غلط کہا تھا کہ تمہارے بابا تمہارے بچپن میں مر گئے تھے۔"

حنا چونک گئی۔ "غلط کہا تھا ماما آپ نے؟"

"ہاں کیونکہ تمہارے بابا کی یہی خواہش تھی۔ میری اور ان کی علیحدگی ہو گئی تھی۔ وہ ایک روایتی جاگیردار گھرانے سے تھے جہاں خاندان سے باہر شادی کا رواج نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے گھر والوں سے چھپ کر مجھ سے شادی کی۔ لیکن ہماری بنی نہیں کیونکہ ہمارے مزاجوں میں فرق تھا۔ اس سے پہلے بات خرابی کی طرف جاتی، ہم نے باہمی رضامندی سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت بختیار نے مجھ سے کہا کہ میں تمہیں یہی بتاؤں کہ تمہارے بابا مر چکے ہیں تاکہ تمہارے اندر کوئی خلش باقی نہ رہے۔"

"تو بابا زندہ ہیں۔" حنا نے خود سے کہا اور پھر ماں کی طرف دیکھا۔ "جب آپ نے ساری عمر مجھ سے یہ بات چھپا کر رکھی تو اب کیوں بتا رہی ہیں؟"

ثنا نے گہری سانس لی اور دکھی لہجے میں بولی۔ "کیونکہ اب تمہارے بابا کا سچ مچ انتقال ہو گیا ہے۔"

حنا ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گئی پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ثنا نے اسے سینے سے لگا لیا اور تھپکتی رہی۔ رفتہ رفتہ حنا نے خود پر قابو پا لیا۔ یہ باپ کی لاشعوری محبت تھی جس نے اسے رونے پر مجبور کر دیا ورنہ اس کے اندر باپ کی محبت کا شعور نہیں تھا۔ حنا نے اپنے آنسو صاف کیے۔ "یہ کب کی بات ہے؟"

"بیس دن ہو گئے ہیں۔"

"اور انہوں نے ہمیں اب بتایا ہے؟" حنا کے لہجے میں برہمی آگئی۔

"تمہارے ددھیال والے ہمارے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے، یہ تو انہوں نے جب بختیار کا سامان دیکھا تو اس میں سے میری اور تمہاری تصاویر اور دوسری چیزیں نکلیں۔ ایک ڈائری میں اس نے سارا احوال لکھا تھا، تب ان لوگوں کو علم ہوا کہ بختیار نے شہر میں ایک شادی کی تھی اور اس کی ایک بیٹی بھی ہے۔"

"آپ سے کس نے رابطہ کیا تھا؟"

"بختیار کے بھتیجے افتخار نے رابطہ کیا تھا۔"

"صرف اطلاع دینے کے لیے؟" حنا نے سوال کیا۔

"اگر صرف اطلاع دینے کے لیے کیا ہوتا تو میں شاید کبھی تمہیں نہ بتاتی لیکن بعض معاملات کی وجہ سے تمہارا شاہ پور جانا ضروری ہو گیا ہے۔"

"بابا کی وصیت؟"

"شاید۔" ثنا نے جواب دیا۔ "اس کا کہنا ہے کہ تمہیں چند دن میں لازمی شاہ پور بھیج دیا جائے۔"

"ماما! آپ نے تصدیق کی کہ یہ بات درست ہے؟"

ثنا نے اثبات میں سر ہلایا۔ "تمہارے انکل جیلانی

کی اسی علاقے میں پوسٹنگ ہے۔ میں نے ان سے تصدیق کرائی ہے۔ تم ان کا نمبر نوٹ کر لینا، اگر کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو انہیں کال کر دینا۔''

احمد جیلانی ثنا کی ایک دوست کا شوہر تھا۔ وہ آرمی میں تھا اور ان دنوں اس کی پوسٹنگ شاہ پور کے ساتھ کہیں تھی۔ حنا مطمئن ہو گئی۔ اس نے ماں کی طرف دیکھا۔ ''آپ چاہتی ہیں کہ میں جاؤں؟''

''ظاہر ہے، یہ تمہاری قانونی اور اخلاقی ذمے داری ہے۔ تمہیں جانا چاہیے۔'' ثنا نے سر ہلایا۔

حنا اگرچہ لڑکی تھی لیکن ثنا نے اس کی تربیت اس طرح سے کی تھی کہ اس میں اعتماد تھا۔ وہ اکیلے بھی کہیں جا سکتی تھی اور مشکل حالات سے بھی نمٹ سکتی تھی۔ جب بھی اسکول کالج کی طرف سے کہیں باہر جانے کا پروگرام بنتا تھا تو اس میں حنا کی شمولیت لازمی ہوتی تھی۔ کالج کے دنوں میں وہ دو بار شمالی علاقے بھی جا چکی تھی۔ اس کے علاوہ بھی ملک کے کئی شہر اس کے دیکھے ہوئے تھے۔ اس کے لیے اکیلے سفر کرنا کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ بس ایئر کنڈیشنڈ تھی اس لیے باہر کی خنکی کا احساس نہیں ہو رہا تھا، اندر کا درجۂ حرارت خوشگوار تھا۔ یہ پہاڑی علاقہ تھا۔ بس بل کھاتی اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ حنا باہر کے مناظر دیکھتے ہوئے شاہ پور اور وہاں موجود اپنے ددھیال کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ پتا نہیں وہ لوگ کیسے تھے اور اس سے کس طرح پیش آتے۔ یہ بڑی نشستوں والی لگژری کوچ تھی اس لیے حنا آرام سے بیٹھی تھی۔ اس کے برابر میں گھنی مونچھوں والا ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ حنا نے وقت گزاری کے لیے بیگ سے ایک کتاب نکالی تو وہ ہاتھ سے پھسل گئی۔ نوجوان نے جلدی سے پیروں میں گرنے والی کتاب اٹھا کر اسے دی۔ حنا نے کہا۔ ''شکریہ۔''

''کوئی بات نہیں، ویسے شفیق الرحمٰن میرے بھی پسندیدہ رائٹر ہیں۔''

حنا کا خیال تھا کہ اس کے بعد نوجوان اس سے مزید گفتگو کرنے یا فری ہونے کی کوشش کرے گا لیکن اس کے بعد اس نے چپ سادھ لی تھی۔ وہ کتاب میں گم ہو گئی۔ شہر سے شاہ پور کا سفر کوئی پانچ گھنٹے کا تھا۔ حنا کتاب میں ایسی گم ہوئی کہ اسے پتا نہیں چلا کہ کب شاہ پور آ گیا۔ بس رکی تو نوجوان نے اس سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ کا اسٹاپ آ گیا ہے۔''

حنا چونک کر اٹھ گئی۔ باہر منظر تو سرسبز تھا لیکن اسے کوئی باقاعدہ اسٹاپ نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہ ہی وہاں کوئی آبادی، دکان یا انسان تھا۔ اس نے اٹھ کر کنڈیکٹر سے تصدیق چاہی۔ ''یہی شاہ پور کا اسٹاپ ہے؟''

''جی بی بی۔'' اس نے جواب دیا۔ حنا نیچے آئی۔ کنڈیکٹر بھی اس کے ساتھ آیا اور سامان کے خانے سے اس کا بیگ نکال کر اس کے حوالے کیا۔ بس کا دروازہ بند ہوا اور بس وہاں سے روانہ ہو گئی۔ حنا ذرا حیران و پریشان چاروں طرف دیکھتی رہی۔ دن کے تین بج رہے تھے اور سردیوں کی وجہ سے سورج جلدی مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ ابھی وہ سوچ رہی تھی کہ کس طرف جائے کہ ایک طرف سے ایک چھوٹی جیپ نمودار ہوئی اور اس کے پاس آ کر رکی۔ اس میں ایک نوجوان لیکن کسی قدر سخت چہرے والا شخص بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخی مائل، ہونٹ موٹے اور بال سرمئی رنگ کے تھے۔ البتہ وہ بولا تو اس کا لہجہ نرم تھا۔

''مس حنا بختیار؟''

''یس۔'' وہ بولی اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''میرا نام افتخار شہریار ہے۔''

حنا ہچکچائی لیکن اس نے پوچھ لیا۔ ''میں کس طرح یقین کروں جبکہ میں نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا ہے۔''

نوجوان نے خاموشی سے اپنا پرس نکالا اور اس میں سے اپنا شناختی کارڈ اور ڈرائیونگ لائسنس نکال کر اسے دے دیا۔ اس پر افتخار شہریار کا نام اور اس کی تصویر تھی۔ حنا نے غور سے ان دونوں چیزوں کا معائنہ کیا اور مطمئن ہو کر اسے واپس کر دیں۔ ''اب میں مطمئن ہوں۔''

''تو پھر گاڑی میں آ جائیں۔'' اس نے کہا۔ ''ابھی ہمیں مزید نصف گھنٹے کا سفر کرنا ہے۔''

حنا نے بیگ کی طرف دیکھا تو اس نے جیپ کے عقبی حصے کی طرف اشارہ کیا مگر خود سے اتر کر رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ حنا کو اس کی بدتہذیبی پر غصہ آیا لیکن وہ بیگ رکھ کر خاموشی سے اس کے برابر میں آ بیٹھی۔ شاید یہ شناخت نامہ طلب کرنے پر اس کا ردِعمل تھا۔ اس نے جیپ آگے بڑھا دی۔ ''کیا شاہ پور نزدیک نہیں ہے؟''

''نہیں، یہاں سے کوئی پندرہ کلومیٹرز کے فاصلے پر ہے لیکن بس یہیں تک آتی ہے۔''

راستہ سرسبز جھاڑیوں اور پھولوں سے لدے چھوٹے ٹیلوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ یہ ویران علاقہ تھا اور شاید ناہموار زمین کی وجہ سے اسے زیرِ کاشت لانے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ زیرِ کاشت زمین کوئی پندرہ منٹ کے سفر کے بعد شروع ہوئی تھی۔ یہ چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں

بٹی زمین تھی جس پر گندم اور سرما کی دوسری فصلیں کاشت کی گئی تھیں۔ پھر ایک چھوٹی سی بستی نمودار ہوئی۔ اس میں زیادہ مکان نہیں تھے مشکل سے کوئی دو سو گھر ہوں گے۔ افتخار نے بستی کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ شاہ پور ہے، اس کی مناسبت سے یہ پورا علاقہ شاہ پور کہلاتا ہے۔''

''یہاں بس یہی آبادی ہے؟''

افتخار نے سر ہلایا۔ ''اس کے علاوہ یہاں بڑے زمینداروں کی حویلیاں اور زمینیں ہیں لیکن وہ سب ایک دوسرے سے دور ہیں۔ سرحد پاس ہونے کی وجہ سے یہاں لوگ آباد ہونا پسند نہیں کرتے۔ شاہ پور کی آبادی بھی نصف صدی سے اتنی ہی ہے۔''

''آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟''

''فی الحال تو اپنی آبائی حویلی لے جا رہا ہوں۔ چچا بختیار کی رہائش پر بعد میں لے جاؤں گا۔''

حنا چونکی۔ ''بابا کہیں اور رہتے تھے؟''

''ہاں، وہ شروع سے سب سے الگ تھلگ رہنے کے عادی تھے۔'' افتخار نے جواب دیا۔ ''وہ حویلی سے بھی کم ہی تعلق رکھتے تھے۔''

''آپ ہمارے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے؟''

''نہیں، چچا جان کی موت کے بعد پتا چلا کہ اس دنیا میں ان کی ایک سابق بیوی اور ایک بیٹی بھی ہے۔ ورنہ سب ان کو اکیلا ہی سمجھتے تھے۔''

حنا پھر چونکی۔ ''تو بابا نے دوسری شادی نہیں کی؟''

''حویلی والوں کو حیرت ہے کہ انہوں نے ایک شادی بھی کیسے کر لی۔ چچا بختیار جوانی سے الگ اور سب سے کٹ کر رہنے والے شخص تھے۔ اسی وجہ سے انہوں نے دادا جان کی زمین میں سب سے دور دراز حصہ پسند کیا اور وہیں اپنے لیے بنگلا بنا کر رہنے لگے۔ یہ جگہ سرحد سے کچھ ہی دور ہے۔''

حنا ہچکچائی۔ ''مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ آپ کے سوا میرے اور کتنے رشتے دار ہیں؟''

''اگر چچا بختیار کے بہن بھائی دیکھے جائیں تو ان کے دو بھائی اور ایک بہن ہے اور یہ تینوں ہی موجود ہیں اور اسی حویلی میں رہتے ہیں۔ میرے والد شہریار احمد کی مجھ سمیت چار اولادیں ہیں۔ ان سے چھوٹے منصور چچا کی تین اولادیں ہیں اور پھوپی شہناز کی دو اولادیں ہیں۔''

''کیا یہ سب حویلی میں رہتے ہیں؟''

افتخار نے سر ہلایا۔ ''تقریباً..... سوائے جہانگیر بھائی کے جو آرمی میں ہیں۔ منصور چچا کی بیٹی نازیہ کی شادی ان سے ہوئی ہے اس لیے وہ بھی ان کے ساتھ ہوتی ہیں۔''

کچھ دیر بعد جیپ ایک سرخ رنگ کی اونچی چار دیواری میں داخل ہوئی۔ حویلی تقریباً ایک ایکڑ رقبے پر تھی اور اس کے چاروں طرف دکھائی دینے والی وسیع زرعی زمین بھی ان لوگوں کی ملکیت تھی۔ حویلی کی مرکزی عمارت بہت شاندار اور دو منزلہ تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹی ایک منزلہ عمارت بھی الگ سے بنی ہوئی تھی۔ افتخار نے جیپ روکتے ہوئے کہا۔ ''یہ عمارت پھوپی کے استعمال میں ہے۔''

''ان کے شوہر.....؟''

''وہ جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ رات کھانے پر سب لوگوں سے آپ کی ملاقات ہو جائے گی۔'' افتخار بولا اور نیچے اتر آیا۔ فوراً ہی اندر سے ایک عورت نمودار ہوئی۔ افتخار نے اس سے کہا۔ ''یہ حنا بی بی ہیں بختیار چچا کی بیٹی۔ ان کا سامان ان کے کمرے میں پہنچا دو۔''

اس عورت کے سوا وہاں کوئی نہیں آیا تھا اس لیے حنا کو یہ اندازہ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ اسے یہاں خوش دلی سے نہیں بلایا گیا ہے۔ شاید بختیار احمد کی وصیت کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ اسے اطلاع کرنے کی زحمت بھی نہ دیتے۔ ملازمہ آگے آئی اور گرم جوشی سے بولی۔ ''سلام بی بی! آیئے آپ کو آپ کا کمرا دکھاتی ہوں۔''

افتخار اس دوران میں لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا اندر جا چکا تھا۔ ملازمہ نے اس کا سامان اٹھا لیا اور حنا اس کے پیچھے چل دی۔ مہمان خانہ مرکزی عمارت میں تھا۔ کمرا بہت شاندار اور بہترین فرنیچر اور چیزوں سے آراستہ تھا۔ سب سے بڑھ کر وہاں فون بھی تھا۔ ملازمہ کا نام صائمہ تھا، اس نے پیش کش کی۔ ''بی بی جی! آپ کا سامان الماری میں رکھ دوں؟''

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' حنا نے جواب دیا۔ ''آپ نہا لیں تھکی ہوئی آئی ہیں۔'' اس نے غسل خانے کی طرف اشارہ کیا۔ ''آپ بتا دیں آپ کے لیے کیا لے کر آؤں؟''

حنا کو ہلکی سی بھوک لگی تھی۔ اس نے ملازمہ سے کہا۔ ''چائے کے ساتھ کوئی ہلکی پھلکی چیز لے آؤ۔''

ملازمہ چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد حنا نے فون اٹھا کر چیک کیا پھر ماں کا موبائل نمبر ملایا۔ ثنا بھی شاید فون لیے بیٹھی تھی۔ اس نے فوراً کال ریسیو کی۔ حنا نے اسے اپنے خیریت سے پہنچ جانے کی اطلاع دی تو ثنا مطمئن ہوئی

بہر حال وہ بچی کی ماں تھی اور اسے فکر تھی کہ حنا شہر سے دور دراز اکیلے گئی تھی۔ ماں سے بات کر کے اس نے اپنا بیگ کھولا اور لباس دیکھ رہی تھی کہ اسے یاد آیا، ماما نے کوئی چیز بیگ کی پاکٹ میں رکھی تھی۔ اس نے زپ کھولی تو اندر سے ایک چھوٹے سائز کی تصویر نکل آئی۔ اس میں ثنا اور ایک جوان آدمی ایک بچی کو گود میں لیے کھڑے تھے۔ پس منظر سے لگ رہا تھا کہ یہ کوئی پہاڑی مقام ہے۔ حنا ساکت رہ گئی۔ ماما کے ساتھ یہ یقیناً اس کے بابا تھے اور ماما کی گود میں وہ خود تھی۔ ثنا نے اس سے پہلے کبھی یہ تصویر اسے نہیں دکھائی تھی۔ اس کے پاس بختیار کی کوئی اور تصویر نہیں تھی۔ یہ شاید ایک ہی تھی جو اس نے آتے ہوئے اس کے بیگ میں رکھ دی تھی۔ حنا کو کچھ دیر بعد احساس ہوا کہ اس کے آنسو رخسار پر پھسل رہے ہیں۔ اس نے جلدی سے آنسو صاف کیے اور تصویر واپس بیگ میں رکھ دی۔ پھر اس نے ایک جوڑا نکالا اور باتھ روم میں آ گئی۔ اس نے نہا کر کپڑے بدلے اور باہر آ کر آئینے کے سامنے بال سلجھا رہی تھی کہ صائمہ چائے کی ٹرالی لے کر آ گئی۔ اس میں گھر کے بنے بسکٹس کے ساتھ سموسے اور نان خطائی بھی تھیں۔ اس نے حنا کی طرف دیکھا اور ستائشی لہجے میں بولی۔

''بی بی! آپ کے بال کتنے اچھے ہیں۔ ویسے تو آپ پوری ہی بہت پیاری ہیں۔''

''شکریہ صائمہ۔'' وہ صوفے پر آ گئی۔ صائمہ نے اس کے سامنے چیزیں نکال کر رکھیں۔

''یہ سموسے لیں بی بی۔''

''اس عمارت میں کون رہتا ہے؟''

''بڑے صاحب اور چھوٹے صاحب کے گھر والے رہتے ہیں۔'' صائمہ نے جواب دیا۔ اس کی مراد غالباً شہریار اور منصور کے خاندان سے تھی۔

''شہناز.... پھوپی الگ کیوں رہتی ہیں؟'' اس نے ہچکچا کر پوچھا۔

''بڑے مالک نے انہیں الگ سے جگہ بنا دی ہے۔ وہ ان کی جگہ ہے۔''

حنا نے سموسے اور نان خطائی لی۔ پھر اس نے چائے بنانے کو کہا۔ صائمہ اس سے مزید بات کرنا چاہتی تھی لیکن حنا کا موڈ نہیں تھا اس لیے وہ چائے کے بعد کھڑی ہو گئی۔ ''میں تھکی ہوئی ہوں، آرام کروں گی۔''

صائمہ سمجھ دار تھی، وہ بھی جلدی سے کھڑی ہو گئی اور ٹرالی لے کر وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد حنا نے کمرا اندر سے بند کیا اور بستر پر دراز ہو گئی۔ بند کمرے میں سردی اتنی نہیں تھی کہ اسے کمبل یا کسی اوڑھنے والی چیز کی ضرورت محسوس ہوتی۔ بس کی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے وہ تھک گئی تھی۔ گرم پانی سے غسل نے اس کی کسل مندی دور کر دی تھی لیکن ساتھ ہی جسم پر سکون کی ایسی کیفیت طاری ہو گئی کہ اسے نیند آ گئی۔ کسی وقت دروازے پر دستک کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی اور اسے تعجب ہوا کہ وہ اس اجنبی ماحول میں سو کیسے گئی۔ شاید اس کے لاشعور میں یہ بات تھی کہ اس گھر سے اس کا تعلق بھی بنتا ہے۔ یہاں کے لوگ اس کے معاملے میں روکھے سہی لیکن اس سے ان کا رشتہ تو تھا۔ وہ بال سمیٹتے ہوئے اٹھی۔ باہر صائمہ تھی۔

''بی بی جی! آٹھ بجے کھانا لگ جائے گا۔''

ابھی ساڑھے سات ہو رہے تھے۔ ''ٹھیک ہے، تم مجھے لینے آ جانا۔''

حنا نے بال باندھے اور پھر ہلکا سا تیار ہوئی۔ ٹھیک آٹھ بجے صائمہ اسے لینے آ گئی۔ مرکزی ڈائننگ ہال میں کھانے کی میز پر تقریباً سب موجود تھے۔ اس نے سلام کیا تو کسی نے آواز سے جواب دیا اور کسی نے سر ہلایا۔ صرف منصور بچا اٹھ کر اس سے ملے۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ حنا ایک لمحے کو جذباتی ہوئی مگر فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔ افتخار سمیت سب وہاں موجود تھے۔ جہانگیر اور نازیہ کے بارے میں افتخار اسے بتا چکا تھا۔ اسے میز پر پانچ بڑوں کے علاوہ سات نوجوان بھی نظر آئے۔ ان میں تین لڑکیاں اور افتخار سمیت چار لڑکے تھے۔ ان میں سے اکثر اسے بے تاثر انداز میں دیکھ رہے تھے لیکن ایک تیکھے نقوش والی لڑکی کی آنکھوں میں واضح طور پر ناپسندیدگی تھی۔ چوڑے دہانے، ستواں ناک اور کسی قدر چھوٹی سرمئی آنکھوں کے ساتھ وہ خوب صورت لگتی اگر اس نے صورت نہ بنا رکھی ہوتی۔ کھانا خاموشی سے کھایا گیا۔ کھانے کے بعد شہریار چچا سب سے پہلے اٹھے اور انہوں نے حنا سے کہا۔

''بیٹی..... کھانے کے بعد تم بڑی نشست گاہ میں آ جانا، تم سے بات کرنی ہے۔''

''جی چچا جان۔'' اس نے کہا۔ ایک ایک کر کے تمام بڑے اٹھ کر چلے گئے۔ پھر چھوٹے بھی کھڑے ہونے لگے۔ افتخار نے جانے سے پہلے کہا۔ ''جب بڑے تم سے بات کر لیں گے تو ہماری باری آئے گی۔''

''واقعی؟'' اس نے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔ ''بڑوں کی تو مجبوری ہے لیکن تم لوگ بھی مجھ سے بات کرنا چاہو گے؟''

''اپنا لہجہ قابو میں رکھو۔'' تیکھے نقوش والی لڑکی بولی۔

''مہناز۔'' افتخار نے جلدی سے اسے ٹوکا۔ ''یہ بھی ہماری کزن ہے اور اس حویلی کا ایک حصہ ہے۔''

مہناز کے ساتھ حنا کو بھی امید نہیں تھی کہ افتخار اس کی حمایت کرے گا اس لیے دونوں نے اسے حیرت سے دیکھا مگر ردِعمل مختلف تھا۔ مہناز جھٹکے سے کھڑی ہوئی اور پاؤں پٹختے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ حنا نے تشکر آمیز انداز میں افتخار کی طرف دیکھا لیکن وہ اسے نظر انداز کر کے وہاں سے چلا گیا۔ باقی بھی جا چکے تھے۔ صائمہ وہاں موجود تھی۔ حنا نے گہری سانس لے کر اس سے کہا۔ ''بڑی نشست گاہ کس طرف ہے؟''

''میرے ساتھ آیئے بی بی۔'' صائمہ اسے بڑی نشست گاہ میں لے آئی جہاں خاندان کے تمام بڑے موجود تھے اور ان کے چہروں کا تناؤ بتا رہا تھا کہ معاملہ خوشگوار نہیں ہے۔ شہریار احمد کے اشارے پر حنا ایک الگ صوفے پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر کے لیے اسے یوں لگا جیسے وہ کسی ملزم کی حیثیت سے عدالت کے سامنے ہے اور ابھی اس پر فردِ جرم عائد کی جائے گی۔ اسے پھوپی شہناز کے چہرے پر تقریباً مہناز جیسی ناپسندیدگی دکھائی دی تھی۔ اس کا اندازہ تھا کہ مہناز ان کی بیٹی ہے۔ ان کے نقوش بہت مل رہے تھے۔ شہریار احمد کے نقوش نرم تھے اور منصور احمد کے ان سے بھی نرم نقوش تھے مگر ان کی بیگمات کے چہروں پر تناؤ تھا۔ شہریار احمد کی بیگم رابعہ تھیں جبکہ مسز منصور کا نام مہرین تھا۔ حنا منتظر تھی کہ کوئی گفتگو کا آغاز کرے مگر خاصی دیر تک کوئی کچھ نہ بولا تو اسے بولنا پڑا۔

''میں جاننے کی منتظر ہوں کہ مجھے یہاں کیوں بلایا گیا ہے۔''

شہناز نے اسے تیز نظروں سے دیکھا اور بولیں۔

''لڑکی! تمہاری زبان بہت تیز ہے۔''

''میں نے ایسی کون سی بات کی ہے؟ صرف یہی تو پوچھا ہے کہ مجھے یہاں کیوں بلایا گیا ہے۔''

شہریار احمد کھنکھارے۔ ''حنا بیٹی! بات یہ ہے کہ ہمیں تمہارے وجود کا سرے سے علم نہیں تھا۔''

''اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔''

منصور احمد نے سر ہلایا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن پھر بھی ہمارے لیے یہ بات شاک سے کم نہیں تھی کہ بختیار نے سب سے چھپ کر شہر میں شادی کی اور پھر بیوی بچی کو چھوڑ کر یہاں آ گیا۔''

''وہ مجھ سے اور ماما سے دوبارہ کبھی نہیں ملے۔'' حنا نے واضح کیا۔

''اس کے باوجود اس نے تمہیں اپنا وارث مقرر کیا ہے۔'' شہناز کا لہجہ ناگوار تھا۔

''اگر آپ اس سے متفق نہیں ہیں، تب بھی اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔'' حنا نے کہا تو شہناز تلملا کر کھڑی ہو گئی۔

''منصور، شہریار! اب میں اسے برداشت نہیں کر سکتی۔''

کسی نے اسے نہیں روکا اور وہ نشست گاہ سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد منصور نے کہا۔ ''بختیار نے وصیت کی ہے کہ اس کے حصے کی ساری زمین اور اس کی تمام دولت کی وارث تم ہو۔ کل اس کا وکیل تم سے آ کر ملے گا اور ضروری کارروائی کرے گا۔''

حنا نے باری باری ان سب کی طرف دیکھا۔ ''مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ میرے بابا زندہ ہیں۔ اگر انہوں نے مجھے اپنا وارث مقرر کیا ہے تو یہ صرف ان کا فیصلہ ہے۔''

''لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' رابعہ پہلی بار کچھ بولیں۔ ''اصل بات یہ ہے کہ تم بختیار کی زمین اور دولت کی وارث بن چکی ہو۔''

''کیا آپ لوگ اس سے خوش نہیں ہیں؟''

''ہماری خوشی کو چھوڑو۔'' مہرین نے بھی کہا۔ ''اب یہ سب تمہیں دیکھنا ہے۔''

''مجھے کیا دیکھنا ہے؟''

''بختیار کے معاملات..... اور کیا دیکھنا ہے تمہیں؟'' رابعہ نے کسی قدر حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ اس کے انداز پر حنا الجھ گئی۔

''کیا بابا کے معاملات میں کوئی مسئلہ ہے؟''

''اپنے دماغ کو مت تھکاؤ۔'' منصور نے نرمی سے کہا۔ ''جلد تم تمام چیزوں سے واقف ہو جاؤ گی۔''

''میرا خیال ہے کہ اب تم آرام کرو۔'' شہریار نے کہا اور وہ سب کھڑے ہو گئے۔ ''افتخار اور دوسرے بچے تمہارا خیال رکھیں گے۔''

وہ سب نشست گاہ سے نکل گئے۔ کچھ دیر بعد صائمہ اندر آئی۔ ''حنا بی بی! افتخار صاحب اور دوسرے لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

حنا نے سر انداز میں کہا۔ ''میں تھک گئی ہوں، اب آرام کروں گی۔''

صائمہ چپ ہو گئی پھر اس نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے، آیئے میرے ساتھ۔''

اس رات حنا کو اچھی طرح نیند نہیں آئی۔ وہ بار بار

چونک جاتی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے نہ جانے پر کوئی پوچھنے آئے گا لیکن کسی نے زحمت نہیں کی تھی۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہوگیا تھا اس لیے کمبل لینا لازمی تھا۔ حویلی ویرانے میں تھی کیونکہ اس کے آس پاس سوائے کھیتوں اور جنگل کے کچھ نہیں تھا۔ پاس ہی چند کوٹھریوں میں زمینوں پر کام کرنے والے رہتے تھے لیکن یہاں گھرانے آباد نہیں تھے۔ رات بھر گیدڑوں اور دوسرے جانوروں کی آوازیں آتی رہیں۔
وہ صبح جلدی اٹھ گئی تھی۔ وہ واش روم سے ہو کر آئی تو صائمہ ناشتے کی اطلاع لیے موجود تھی۔ ناشتا سب اپنے کمروں میں کرتے تھے اس لیے اسے بھی کمرے میں کرنا تھا۔ وہ ناشتے کے بعد بے دلی سے چائے پیتے ہوئے بختیار احمد کی دولت اور جائداد کے مسئلے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ یہ بات اس حویلی کے مکینوں کو نہایت ناگوار گزری تھی کہ بختیار احمد نے اسے اپنا وارث کیوں بنایا۔ دروازے پر دستک ہوئی تو اس نے بلند آواز سے کہا۔

''آجاؤ۔''

آنے والا افتخار تھا۔ ''گڈ مارننگ کزن۔''

''گڈ مارننگ۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تو تم لوگوں نے مجھے کزن تسلیم کرلیا ہے؟''

''تسلیم؟'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''تم ہماری کزن ہو، اس میں تسلیم کرنے والی کون سی بات ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ یہاں موجود بہت سارے لوگوں نے اس حقیقت کو دل سے تسلیم نہیں کیا ہے۔''

افتخار نے شانے اچکائے۔ ''کم سے کم میں ان میں سے نہیں ہوں۔''

''تم نے سن لیا ہوگا کہ بابا نے مجھے اپنا وارث بنایا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے حنا نے اسے غور سے دیکھا۔

''اگر وہ نہ بناتے، تب بھی ان کی وارث تم ہی ہو۔'' افتخار سنجیدگی سے بولا۔ ''تم رات کو آئیں کیوں نہیں چھوٹی سٹنگ میں ... ہم تمام کزنز جمع تھے۔''

''میں تھک گئی تھی اور پھر اس اطلاع نے مجھے ذہنی طور پر منتشر کردیا تھا۔ اس وقت میں کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ افتخار نے اس کے جواب پر کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔ اس نے کہا۔

''میں تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ وکیل آج دوپہر سے پہلے نہیں آسکے گا۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں چچا بختیار کی زمین اور رہائش دکھالاؤں؟''

حنا نے سوچا اور سر ہلادیا۔ ''ٹھیک ہے، ویسے بھی یہاں میرے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔''

''تم ایک گھنٹے بعد تیار رہنا اور اگر تمہارے پاس فل شوز ہیں تو وہ پہن لو تاکہ زمین پر گھومنے کا ارادہ ہو تو کوئی مشکل نہ ہو۔''

''میرے پاس فل شوز نہیں ہیں۔''

افتخار نے اس کے پیروں کا معائنہ کیا۔ ''میں شازمین سے کہتا ہوں، اس کے پاس ہیں۔''

''شازمین کون ہے؟''

''میری واحد بہن۔'' افتخار نے جاتے ہوئے بتایا۔

گزشتہ رات کھانے کی میز پر مہناز کے علاوہ دو لڑکیاں اور بھی تھیں۔ ان میں ایک دل کش گول چہرے اور گلابی رنگ والی لڑکی تھی۔ اس کی عمر انیس بیس سے زیادہ نہیں تھی۔ دوسری اس سے بڑی تھی۔ اگرچہ وہ بھی خوب صورت تھی لیکن اس کا رنگ اتنا سرخ و سفید نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد گول چہرے اور گلابی رنگت والی لڑکی اندر آئی۔ اس نے ایک شاپر اٹھا رکھا تھا۔ رات کے برعکس وہ گرم جوشی سے حنا کے گلے لگی۔

''سوری! میں کل تم سے اچھی طرح نہیں ملی تھی۔''

حنا ہنس کر بولی۔ ''تم کیوں سوری کررہی ہو؟ کل تو مجھ سے کوئی بھی اچھی طرح سے نہیں ملا تھا۔''

''مجھے اپنے کزنز کے رویّے کا بھی افسوس ہے۔ تم بھی تو ہماری کزن ہی ہو نا۔'' شازمین نے کہا۔ ''اب تمہیں کم سے کم ہم بہن بھائی سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

''مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔'' حنا نے جواب دیا۔ ''مگر مہناز اور پھوپی کا رویّہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔''

''ان کا مزاج ہی ایسا ہے۔'' شازمین نے شاپر اس کی طرف بڑھایا۔ ''میں یہ لانگ شوز تمہارے لیے لائی ہوں۔ یہاں سانپ پائے جاتے ہیں اور سردیوں میں بعض اوقات دھوپ کے لیے باہر نکل آتے ہیں اس لیے احتیاط لازمی ہے۔''

پھر شازمین نے تمام کزنز کا تعارف کرایا۔ افتخار، شہریار احمد کا دوسرا بڑا بیٹا تھا۔ اس سے بڑا جہانگیر تھا اور چھوٹا عاشر تھا۔ شازمین سب سے چھوٹی تھی۔ منصور چچا کی اولادوں میں سب سے بڑا جہانزیب تھا۔ اس کے بعد نازیہ اور سب سے چھوٹی غازیہ تھی۔ شہناز پھوپی کی دو اولادیں تھیں۔ مہناز بڑی تھی اور عظیم چھوٹا تھا۔ تمام ہی لڑکے زمینوں کی اور دوسرے کاموں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ لڑکیاں حویلی میں مختلف ذمے داریاں نبھاتی تھیں۔ کام کاج کے لیے حویلی میں ... درجن بھر ملازم اور ملازمائیں تھیں۔ زمینوں پر تو درجنوں لوگ کام کرتے تھے۔

افتخار نے کمرے میں جھانکا اور بولا۔

''تیار ہو؟''

''ہاں..... بس جوتے پہننے ہیں۔'' حنا نے کہا۔ جوتے اسے کسی قدر ڈھیلے تھے۔ شازمین کی نسبت اس کے پاؤں ذرا چھوٹے تھے لیکن اس کے خیال میں کام چل جاتا۔ وہ افتخار کے ساتھ باہر آئی۔ شہناز پھوپی کے پورشن کے سامنے مہناز موجود تھی۔ حنا کو دیکھ کر اس کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے اور وہ تیزی سے اندر چلی گئی۔ حنا نے افتخار کی طرف دیکھا۔ ''اسے کیا ہوجاتا ہے مجھے دیکھ کر؟''

افتخار نے کندھے اچکائے۔ ''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ آؤ بیٹھو۔''

یہ جدید ماڈل کی چھوٹی لیکن لگژری جیپ افتخار کی تھی۔ اس کے علاوہ بھی وہاں کوئی چار گاڑیاں موجود تھیں۔ ایک طرف تین موٹر سائیکلیں موجود تھیں۔ حویلی اور گاڑیوں سے لگتا تھا، اس کے ددھیال والے بہت دولت مند لوگ تھے۔ وہ باہر نکلے اور مشرق کی طرف روانہ ہوگئے۔ حنا نے محسوس کیا کہ شاہ پور صاف ستھرا اور خوب صورت علاقہ تھا اور اسے سنوارنے کی کوشش کی گئی تھی۔ تقریباً تمام راستے پختہ تھے۔ جہاں کھیت نہیں تھے، وہاں زمین پر درخت لگائے گئے تھے اور صفائی کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ کھیت ختم ہونے کے بعد سڑک دو طرف سے گھرے درختوں کے درمیان سے گزرنے لگی۔ افتخار نے بتایا کہ یہاں سڑکیں آرمی کے تعاون سے مقامی لوگوں نے خود بنائی ہیں۔ آرمی نے بھاری مشینری اور سامان فراہم کیا۔ مقامی لوگوں نے محنت کی۔ حنا یہ سن کر متاثر ہوئی۔

''اسی لیے اس پورے علاقے میں سڑکیں ہیں۔''

''دفاعی نقطۂ نظر سے یہ بہت ضروری ہیں۔ جنگ کے دنوں میں سرحد کے علاقے میں سامان لانے لے جانے کے لیے یہی سڑکیں استعمال ہوتی ہیں۔ اس سے ہمیں بھی فائدہ ہوتا ہے۔ ان سڑکوں کی مرمت اور دیکھ بھال ہم خود کرتے ہیں۔''

درخت ختم ہوئے تو دوبارہ کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ تقریباً ایک کلومیٹرز سفر کے بعد خار دار تاروں میں گھرا ایک احاطہ نظر آیا۔ احاطہ خاصا بڑا تھا۔ افتخار نے ایک طرف لگے گیٹ سے جیپ اندر داخل کی، وہاں کوئی نہیں تھا جو ان کو روکتا۔ حنا سمجھ گئی کہ یہ اس کے بابا کی زمین ہے لیکن اسے حیرت ہوئی جب اس نے زمین کو پوری طرح اجاڑ پایا۔ اس پر شاید سالوں پرانا جھاڑ جھنکاڑ اگا ہوا تھا۔ کہیں بھی زمین زیرِ کاشت نہیں تھی۔ جیپ جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی احاطے کے آخری حصے میں واقع سرمئی رنگ کی عمارت تک پہنچی۔ یہ دو منزلہ پختہ عمارت بھی زمین کی طرح اجاڑ اور بدہیت ہورہی تھی۔ برسوں سے اس کی دیکھ بھال نہیں ہوئی تھی۔ حنا نے حیرت سے افتخار کی طرف دیکھا۔

''بابا یہاں رہتے تھے؟''

افتخار نے سر ہلایا۔ ''شاید تمہیں حیرت ہوئی ہے۔''

''ہاں، تم لوگوں کو دیکھ لینے کے بعد میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ بابا اس طرح رہتے ہوں گے۔''

''ابھی تم مزید حیران ہوگی۔'' افتخار جیپ سے اترتے ہوئے بولا۔

''یہاں کوئی نہیں رہتا؟''

''ایک چوکیدار ہے جو میں نے رکھا ہے۔ چچا بختیار کے پاس ایک ملازم تھا، وہ بھی ان کی وفات کے بعد غائب ہوگیا۔''

حنا نے نیچے اتر کر جھاڑیوں کی طرف دیکھا تو اسے جھرجھری آگئی۔ ان میں سانپوں کی موجودگی عین ممکن تھی۔

''یہاں تو کوئی نہیں ہے۔''

''تم رکو۔'' افتخار ایک طرف جاتے ہوئے بولا۔ ''میں چوکیدار کو دیکھ کر آتا ہوں۔''

افتخار کے جانے کے بعد حنا کچھ دیر تو وہاں کھڑی رہی۔ پھر وہ عمارت کی طرف بڑھی۔ اس نے صدر دروازے کا ہینڈل گھمایا تو خلافِ توقع وہ کھل گیا۔ حنا اندر آئی۔ وہ ایک ہال میں کھڑی تھی جس میں پرانے طرز کا لیکن قیمتی لکڑی سے بنا ہوا فرنیچر تھا۔ ایک طرف سے سیڑھیاں بل کھاتی اوپر کی طرف جارہی تھیں۔ وہ ہچکچاتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس نے ذرا دیر میں دیکھ لیا کہ نیچے ایک نشست گاہ، ایک ڈائننگ ہال اور ایک اسٹڈی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ اسٹڈی میں داخل ہوئی۔ یہ بہت وسیع و عریض تھی اور اس میں چاروں طرف زمین سے چھت تک بنی الماریوں میں ہزاروں کی تعداد میں کتابیں موجود تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ بختیار احمد کو مطالعے کا جنون تھا۔ اسٹڈی میں دو عدد میزیں بھی تھیں۔ ایک تو پڑھنے کے لیے تھی، اس کے ساتھ کرسی بھی رکھی تھی۔ دوسری میز مختلف کاموں کے لیے تھی اور خاصی بڑی تھی۔ اس پر لکھنے پڑھنے کا تمام سامان رکھا ہوا تھا۔

میز پر ایک عدد جدید کمپیوٹر بھی رکھا ہوا تھا۔ حنا نے بے خیالی میں اس کو آن کرنے والا بٹن دبایا تو فوراً ہی اسکرین نمودار ہوئی جس پر پاس ورڈ لکھا ہوا تھا۔ بختیار احمد نے کمپیوٹر کو پاس ورڈ لگا رکھا تھا۔ حنا نے مایوس ہو کر بٹن دبا کر کمپیوٹر بند کردیا۔ یہ بغیر پاس ورڈ کے نہیں کھل سکتا تھا۔ پھر اس نے

ایک دراز کھولی۔ اس میں مختلف اقسام کے کاغذات بھرے ہوئے تھے۔ اس نے کاغذات کی تہیں کھنگالیں لیکن ان میں بھی کچھ نہیں تھا۔ یہ سب عام سے کاغذ تھے۔ وہ دراز بند کرنے لگی، تب دراز کے نیچے اسے ٹرے نما ایک پتلی سی دراز الگ سے نظر آئی۔ یہ اوپر والے حصے کے ساتھ کھل گئی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے دیکھتی، اسے دروازے کی طرف سے آہٹ محسوس ہوئی۔ افتخار آ گیا تھا۔ حنا نے جلدی سے ٹرے اندر کھسکا دی اور بظاہر میز کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

''چوکیدار مل گیا؟''

افتخار نے جواب نہیں دیا۔ وہ اس کے قریب آ گیا۔ حنا نے دراز بند کر دی اور مڑنے لگی تھی کہ ایک بالوں بھرا ہاتھ عقب سے آ کر اس کی گردن کے گرد لپٹ گیا۔ وہ تڑپی لیکن اتنی دیر میں وہ شخص اپنی گرفت مضبوط کر چکا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے حنا کی گردن جکڑ لی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اس کے جسم کو قابو کر رہا تھا۔ وہ اس کا گلا دبا رہا تھا۔ پہلے تو حنا کچھ اور سمجھی۔ حملہ آور کے عزائم سمجھ کر وہ لرز اٹھی لیکن جلد اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کا مقصد اسے مارنا ہے، وہ اس کا گلا دبا رہا تھا۔ حنا کا سانس رک رہا تھا اور اب وہ خود کو چھڑانے کے بجائے سانس لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ خود کو چھڑانے کا جو وقت تھا، وہ اس نے حیرت میں ضائع کر دیا تھا۔ وہ کمزور لڑکی نہیں تھی لیکن اس پر حملہ کرنے والا بہت مضبوط اور طاقتور شخص تھا۔ مزاحمت کرتے ہوئے اچانک حنا کو خیال آیا۔ اس نے جو جوتے پہن رکھے تھے، ان کی ہیل خاصی باریک تھی۔ اس نے ایڑی اٹھا کر آدمی کے پاؤں پر ماری۔ اس کا اثر ہوا۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑی تو حنا نے دوسری بار زیادہ قوت سے ایڑی ماری۔ اس بار آدمی کے منہ سے غراہٹ نما کراہ نکلی اور اسی لمحے افتخار کی آواز آئی۔ وہ حنا کو پکار رہا تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی حملہ آور نے حنا کو اس طرح دھکا دیا کہ وہ منہ کے بل فرش پر گری۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی، حملہ آور کھڑکی کھول کر باہر کود گیا۔

افتخار اسٹڈی میں داخل ہوا تو حنا کو زمین سے اٹھنے کی کوشش کرتے دیکھ کر تیزی سے اس کے پاس آیا اور اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ ''کیا ہوا.... تم کیسے گر گئی تھیں؟''

''میں.... گری.... نہیں تھی۔'' حنا نے بمشکل کہا۔ ''کسی نے پیچھے سے مجھ پر حملہ کر کے میرا گلا دبانے کی کوشش کی تھی۔ تم نے آواز دی تو وہ مجھے چھوڑ کر کھڑکی سے بھاگ نکلا۔''

افتخار نے اس کا گلا دیکھا جو سرخ ہو رہا تھا۔ پھر وہ بھی کھڑکی سے کود کر باہر نکل گیا۔ حنا اسے روکنے کا ارادہ کرتی رہ گئی۔ اب اسے اکیلے رہتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ وہ حملہ آور کو نہیں دیکھ سکی تھی، سوائے ایک بالوں بھرے ہاتھ کے۔ افتخار کچھ دیر میں واپس آ گیا۔ ''باہر کوئی نہیں ہے، میرا خیال ہے کہ وہ فرار ہو گیا ہے۔ تم نے اسے دیکھا تھا؟''

حنا نے اسے بتایا کہ اس نے حملہ آور کو کس حد تک دیکھا تھا۔ بالوں بھرے ہاتھ کا سن کر وہ چونک گیا۔ اس نے حنا سے کہا۔ ''میرے ساتھ آؤ۔''

وہ حنا کو لے کر باہر نکلا۔ اس بار اس نے دروازہ لاک کر دیا۔ جب وہ جیپ میں بیٹھنے لگے تو حنا نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم شاید اس شخص کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟''

افتخار نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''بختیار چچا کے پاس ایک ملازم تھا۔ میں نے ایک دو بار اسے دیکھا ہے، اس کے دونوں بازوؤں پر غیر معمولی طور پر سیاہ بال تھے۔ ان کے قتل کے بعد وہ غائب ہو گیا۔''

''قتل.....!'' حنا تقریباً چلا اٹھی۔ ''بابا کا مرڈر ہوا تھا؟''

''تمہیں نہیں معلوم....'' افتخار نے اس کی طرف دیکھا۔ ''اوہ.... تو بڑوں نے تمہیں نہیں بتایا۔''

''بابا کا مرڈر کیسے ہوا؟'' حنا کا ذہن بے قابو ہو رہا تھا۔ ''اتنی اہم بات اور کسی نے مجھے بتائی ہی نہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ تمہیں یہ صدمہ نہیں دینا چاہتے تھے اس لیے انہوں نے بتانے کا کام وکیل پر چھوڑ دیا ہوگا۔''

''ہاں، وکیل مجھے زیادہ بہتر بتا سکتا ہے۔'' حنا کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''مجھے بتاؤ بابا کے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

''یہ تو پولیس بھی نہیں جان سکی۔ رات سوتے میں کسی نے ان کے منہ پر تکیہ رکھ کر قتل کر دیا تھا۔ ان کی لاش اتفاق سے میں نے ہی دریافت کی تھی کیونکہ میں بابا جان کے حکم پر ان سے ملنے گیا تھا۔ ان کا ملازم غائب تھا۔''

''پولیس کیا کہتی ہے؟''

''بابا جان کی کل علاقے کے ڈی ایس پی سے میٹنگ ہوئی تھی لیکن پولیس کوئی پیش رفت نہیں کر سکی ہے۔ قاتل نامعلوم ہے اور پولیس کے مطابق گھر سے کچھ غائب بھی نہیں ہے اس لیے چوری کی واردات بھی نہیں کہی جا سکتی۔ قاتل قتل کے ارادے سے آیا تھا۔''

''بابا کی کسی سے دشمنی تھی؟''

''پتا نہیں کیونکہ وہ تو کسی سے ملتے جلتے نہیں تھے۔

زمین انہوں نے کس طرح رکھی ہے، یہ تم بھی دیکھ رہی ہو.... یعنی ان کو کاشت کاری سے بھی دلچسپی نہیں تھی۔ دولت کی ان کے پاس کمی نہیں تھی۔ ان کے ملنے جلنے والے نہ ہونے کے برابر تھے۔ تم یقین کرو گی کہ چند کلومیٹر دور رہتے ہوئے بھی وہ سال میں ایک آدھ بار ہی حویلی آتے تھے۔''

''کیا تم لوگوں سے بابا کا کوئی جھگڑا تھا؟''

''بالکل بھی نہیں..... کیونکہ وہ ملتے سب سے تھے لیکن بہت ہی کم.... اور جب ملتے تو اچھی طرح ملتے تھے۔ البتہ کسی کو ان کے گھر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ خاندان میں واحد فرد میں تھا جو ان کے گھر جا سکتا تھا اور انہوں نے مجھے اس کی اجازت دے رکھی تھی۔''

''بابا تم سے کس طرح ملتے تھے؟''

افتخار ہچکچایا پھر اس نے جواب دیا۔ ''بہت اچھے انداز میں نہیں مگر انہوں نے کبھی میری آمد پر ناگواری کا اظہار بھی نہیں کیا۔''

حنا صدمے والی کیفیت سے نکل آئی تھی اور اب اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے افتخار سے کہا۔ ''میرے کچھ سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جواب دو گے؟''

''پوچھو۔''

''جس قسم کی زندگی بابا گزار رہے تھے، ان کے بارے میں لوگوں میں یقیناً کچھ افواہیں بھی ہوں گی۔ کیا بابا کے ساتھ ایسا تھا؟''

''شاید۔'' افتخار نے مبہم انداز میں کہا۔

''تم لوگ بابا کے بارے میں کیا سوچتے ہو؟''

''ہم.....'' وہ گڑبڑا گیا۔ ''ہم ان کے بارے میں کیا سوچتے؟''

حنا نے گہری سانس لی۔ اس نے صاف محسوس کیا تھا کہ افتخار نے دونوں بار درست جواب نہیں دیا۔ وہ اسے ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کے سوالوں کا جواب اس کے پاس تھا لیکن وہ دینا نہیں چاہ رہا تھا۔ بنگلے کی چابیاں افتخار کے پاس تھیں۔ حنا نے چوکیدار کے بارے میں پوچھا۔ ''وہ کہاں ہے اور کیا چابیاں اس کے پاس نہیں ہوتیں؟''

''پتا نہیں وہ کہاں غائب ہے..... اور وہ صرف باہر سے بنگلے کی دیکھ بھال کرتا ہے، اسے اندر جانے کی ضرورت نہیں ہے اس لیے میں نے چابیاں اپنے پاس ہی رکھی ہوئی ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ اب یہ چابیاں مجھے ملیں گی؟''

افتخار اس کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے خاموشی سے جیب سے چابیاں نکال کر اس کے سپرد کر دیں۔ حنا نے چابیاں اپنے پرس میں رکھیں اور بولی۔

''ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ بنگلے کے تمام ہی دروازے کھلے ہوئے تھے۔''

''اس پر تو میں بھی حیران ہوں کیونکہ اندر اور باہر کے تمام کمرے میں نے خود بند کیے تھے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ کسی کے پاس بنگلے کے تالوں کی ڈپلیکیٹ چابیاں ہیں۔'' حنا نے کہا۔ ''کیونکہ کوئی تالا ٹوٹا ہوا نہیں پایا گیا ہے۔''

افتخار نے گہری سانس لی۔ ''میرا بھی یہی خیال ہے۔ میں اپنے ایک دو آدمی یہاں بھیج دیتا ہوں، وہ یہیں رہ کر نگرانی کریں گے۔''

''پہلا آدمی بھی تمہارا تھا؟''

''نہیں، وہ یہیں آس پاس رہتا ہے۔ ایک دن مجھے سڑک پر مل گیا تھا، اسے نوکری کی تلاش تھی اور میں بنگلے کے لیے کسی کو رکھنا چاہتا تھا اس لیے اسے رکھ لیا۔''

حنا نے حیرت سے افتخار کو دیکھا۔ ''یعنی تم نہیں جانتے کہ وہ کون تھا؟''

افتخار بھی اب شرمندہ نظر آنے لگا۔ ''سچ ہے کہ میں نے اس بات پر غور نہیں کیا تھا۔ پھر چچا جان کی رہائش گاہ پر کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کے چرائے جانے کا خطرہ ہوتا.... اور چابیاں میرے پاس تھیں اس لیے میں نے اسے باہر کی دیکھ بھال کے لیے رکھ لیا۔ یہ بھی عارضی بندوبست تھا۔ جب قانونی معاملات نمٹ جاتے تو پھر کوئی مستقل بندوبست بھی کیا جا سکتا تھا۔''

''قانونی معاملات آج شاید نمٹ جائیں گے۔'' حنا نے کہا۔ ''یا کم سے کم آغاز ہو جائے گا۔ لیکن کسی نے پہلے بابا کو قتل کیا اور پھر مجھ پر حملہ کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے، یہاں کوئی گڑبڑ ہے۔ کوئی ہمارا دشمن ہے۔''

افتخار ایک لمحے کے لیے چپ ہوا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''کیا تم حویلی میں کسی پر شبہ کر رہی ہو؟''

''نہیں، میں بے وجہ شک کرنے کی عادی نہیں ہوں۔'' حنا نے کہا۔ ''لیکن اس واقعے کی پولیس رپورٹ ضروری ہے۔''

''یہاں فون نہیں ہے، اس کے لیے ہمیں حویلی تک جانا ہوگا۔'' افتخار نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ لیکن حویلی پہنچ کر افتخار نے پہلے پولیس کو کال کرنے کے بجائے

حویلی کے بڑوں کو اس بارے میں بتا دیا اور چند منٹ بعد ہی حنا ان کے سامنے تھی۔ شہریار احمد نے کہا۔ ''تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

''کسی نے بابا جان کی اسٹڈی میں مجھ پر عقب سے حملہ کیا اور میری گردن دبانے کی کوشش کی۔ پھر افتخار آ گیا اور حملہ کرنے والا کھڑکی سے فرار ہو گیا۔ میں اسے نہیں دیکھ سکی تھی۔''

''تب تم پولیس کو کیا بتاؤ گی؟'' شہناز نے تیز لہجے میں کہا۔ ''بلاوجہ پولیس آئے گی اور حویلی کی بدنامی ہوگی۔''

''کسی نے پہلے بابا کو قتل کیا اور پھر مجھے قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ بلاوجہ کی بات نہیں ہے۔'' حنا کو غصہ آ گیا۔ ''دوسرے پولیس تفتیش کے لیے بابا کے بنگلے پر جائے گی یہاں نہیں آئے گی۔''

''لیکن بیٹا۔۔۔۔ یہ سب ہوگا تو حویلی کا نام تو سامنے آئے گا۔'' منصور احمد نے کہا۔

''چچا جان! آپ کو اس بات کی پروا نہیں ہے۔'' حنا نے حیرت سے منصور احمد کی طرف دیکھا۔ ''بابا جان کو قتل کیا گیا اور آپ لوگوں نے یہ بات مجھ سے بھی چھپائی؟''

''ہم تمہیں آتے ہی صدمہ نہیں دینا چاہتے تھے۔'' منصور احمد نے نرمی سے کہا۔ ''اور ہمیں اس کی پروا بھی ہے۔ میں ابھی ڈی ایس پی کو کال کرتا ہوں اور پولیس اس کی تفتیش کرے گی لیکن اس کی کوئی ایف آئی آر درج نہیں ہوگی۔''

حنا نے سوچا اور سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے، آپ میرے بزرگ ہیں اور مجھے آپ پر اعتماد ہے۔''

''یہی ہم چاہتے ہیں۔ اب تم جا کر آرام کرو۔'' شہریار نے کہا۔ ''دوپہر میں وکیل آئے گا اور تمہیں اس کے ساتھ خاصی دیر بیٹھنا پڑے گا۔''

حنا باہر آ رہی تھی تو اس نے پھوپی شہناز کو کہتے سنا۔ ''میں نے کہا تھا نا، یہ لڑکی یہاں آئے گی تو نئے مسائل کھڑے ہوں گے۔''

حنا کی رفتار سست ہو گئی اس لیے اس نے شہریار احمد کا جواب بھی سن لیا۔ ''شہناز! تم فکر مت کرو۔ تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔''

حنا سوچتی ہوئی کمرے میں آئی کہ اس حویلی میں اور بھی کچھ مسائل تھے۔ وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا اور حویلی میں یقیناً کھانا کھا لیا گیا تھا۔ کمرے میں لگا فون انٹر کام بھی تھا۔ اس نے کچن کال کی اور اپنے لیے کچھ لانے کو کہا۔ کھانے کے بعد وہ آرام کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اور پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر مہناز اندر گھس آئی۔ اس کے تیور خطرناک تھے۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ''تم کیا سمجھتی ہو۔۔۔۔ افتخار کے ساتھ کچھ وقت گزار کر اس پر قبضہ کر لو گی؟''

حنا پہلے ہی اس کے اس طرح اندر گھس آنے پر طیش میں تھی، اس کی بات نے حنا کا دماغ گھما دیا۔ ''تمہارا دماغ درست ہے اور یہ تم کس طرح بات کر رہی ہو؟ تمہیں مینرز نہیں ہیں کہ کسی کے کمرے میں آنے سے پہلے اجازت لیتے ہیں۔''

''ہونہہ۔۔۔۔ کسی کا کمرا۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ''اس حویلی سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ اس کمرے سے ہے۔ تم اس فکر میں مت رہنا کہ یہاں سے اپنا کوئی تعلق قائم کر سکو گی۔''

حنا کچھ دیر اسے گھورتی رہی اور پھر یک دم لہجہ بدل کر بولی۔ ''اگر میں تعلق قائم کرنا چاہوں تو۔۔۔۔؟''

اس بار مہناز بھڑک اٹھی۔ ''تب تمہیں کوئی قبول نہیں کرے گا۔''

''کیوں؟'' حنا کا انداز مذاق اڑانے والا ہو گیا۔ ''میں اسی حویلی کے ایک بیٹے کی اولاد ہوں۔''

''یہ تمہارا خیال ہے۔ بختیار احمد کا اس حویلی سے کوئی تعلق نہیں رہ گیا تھا۔ عملاً سب نے اس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔''

اپنے باپ کے بارے میں مہناز کے لہجے پر حنا کو غصہ آ گیا۔ ''تمیز سے بات کرو۔۔۔۔ وہ تمہارے بھی ماموں تھے۔''

''ماموں صرف نام کے تھے کیونکہ اب کوئی انہیں اس حویلی کا نہیں مانتا تھا۔ یقین نہیں آ رہا تو شہریار ماموں یا منصور ماموں سے پوچھ لو۔''

حنا کے لیے یہ ایک اور انکشاف تھا کہ اس حویلی کے لوگوں نے اس کے باپ سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ ''لیکن کیوں؟''

''ان کی حرکتیں ٹھیک نہیں تھیں۔'' مہناز نے نفرت سے کہا۔ ''ان کے بارے میں علاقے میں مشہور ہے کہ وہ سرحد پر اسمگلنگ میں ملوث تھے اور اسی لیے انہوں نے اپنی زمین جو سرحد کے بالکل پاس ہے، اجاڑ رکھی تھی۔ شروع سے خاندان والوں کے علاوہ کوئی ان سے ملنا پسند نہیں کرتا تھا پھر خاندان والوں نے بھی ملنا ترک کر دیا۔''

''جھوٹ۔۔۔۔ بابا یہاں آتے تھے اور افتخار بھی ان سے ملنے جاتا تھا۔''

مہناز نے منہ بنایا۔ ''اس کے ساتھ پتا نہیں کیا مسئلہ تھا۔ جب سب نے ماموں کو چھوڑ رکھا تھا تو وہ ان کے پاس گھستا تھا۔''

''یہ۔۔۔۔ یہ غلط ہے۔ میرے بابا اسمگلر نہیں ہو سکتے۔'' حنا کی آواز لرزنے لگی۔ مہناز طنزیہ انداز میں ہنسی۔

''اگر وہ اسمگلر نہیں تھے تو ان کے بارے میں ایسا مشہور کیوں تھا؟ اور سب ان سے اور وہ دوسروں سے دور دور کیوں رہتے تھے؟ انہوں نے اپنی زمین کیوں اجاڑ رکھی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اتنی پُراسرار زندگی کیوں بسر کر رہے تھے کہ ان کے مرنے کے بعد ہمیں پتا چلا کہ ان کی کوئی بیوی اور بیٹی بھی ہے۔''

حنا نے خود پر قابو پا لیا تھا۔ اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''تم یا کوئی اور کچھ بھی کہے۔ میں نہیں مان سکتی کہ میرے بابا مجرم تھے۔ وہ تین سال تک میری امی کے شوہر رہے اور کوئی بیوی اپنے شوہر کے بارے میں سب سے زیادہ جانتی ہے۔ امی آج بھی بابا کا ذکر اچھے الفاظ میں کرتی ہیں۔''

مہناز نے پہلے سے زیادہ بُرا منہ بنایا اور بولی۔ ''ٹھیک ہے، اگر تم خوش فہمی میں رہنا چاہتی ہو تو تمہاری مرضی۔ میں تمہیں صرف یہ بتانے آئی ہوں کہ اس حویلی یا اس کے کسی فرد سے تم کوئی تعلق نہیں رکھ سکتیں۔''

حنا اس کا اشارہ سمجھ رہی تھی۔ اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں یہاں صرف بابا کی وصیت کی وجہ سے آئی ہوں۔''

مہناز نے جلدی سے کہا۔ ''تب خود کو بابا کی وصیت تک ہی محدود رکھنا اور جتنی جلدی ہو سکے، یہاں سے چلی جاؤ۔ یہ تمہارے اور اس حویلی کے لوگوں کے لیے اچھا ہوگا۔''

''مشورے کا شکریہ۔'' حنا نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''آئندہ دستک دے کر اور اجازت لے کر آنا۔''

مہناز تنتناتی ہوئی چلی گئی۔ حنا اگرچہ مہناز کے سامنے خود کو سنبھالے ہوئے تھی لیکن اس کی باتوں نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ شاید افتخار نے انہی باتوں کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ابھی اسے مزید حیران ہونا پڑے گا۔ اس کا باپ ایک اسمگلر تھا، وہ یہ بات کسی صورت ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ پہلے اسے صرف یہ فکر تھی کہ بابا کو کس نے اور کیوں قتل کیا تھا؟ اب اسے یہ فکر بھی تھی کہ ان کا ایسا تاثر کیوں بنا کہ لوگ انہیں اسمگلر سمجھنے لگے تھے اور خاندان والوں نے ان کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ وہ لیٹی ہوئی تھی کہ صائمہ نے آ کر اسے اطلاع دی کہ وکیل صاحب آ گئے ہیں۔

سرورق کی پہلی کہانی

☆☆☆

دسمبر کا تیسرا ہفتہ بہت ہی سرد ہو گیا تھا۔ شمال کی طرف سے تیز سرد ہوا چل رہی تھی اور دن میں سورج بھی روکھا پھیکا سا نکل رہا تھا۔ حنا، افتخار کے ساتھ بختیار کے بنگلے کے سامنے موجود تھی بلکہ اب اس بنگلے اور اس سے ملحق ساری زمین کی مالک وہی تھی۔ گزشتہ روز ہی کاغذی و قانونی کارروائی مکمل ہوئی تھی اور بختیار احمد کی زمین، جائیداد اور بینک بیلنس حنا کے نام پر منتقل ہوا تھا۔ حنا کے حصے میں کل ایک سو تیس ایکڑ زمین آئی تھی جس پر یہ بنگلا بھی بنا ہوا تھا۔ چار مختلف اکاؤنٹس میں بختیار کے کوئی ستر لاکھ روپے جمع تھے۔ افتخار حیران ہوا۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بختیار چچا کے پاس اتنی کم رقم رہ گئی ہوگی۔''

''حالانکہ تم لوگوں کے خیال میں وہ اسمگلر تھے اور ان کے پاس خاصی دولت ہونی چاہیے تھی۔'' حنا کا لہجہ طنزیہ تھا۔

افتخار چونکا۔ ''یہ تم سے کس نے کہا؟''

''مہناز نے۔۔۔۔ اور کیا غلط کہا؟''

افتخار سنجیدہ ہو گیا۔ ''نہیں، اس نے ٹھیک کہا۔ یہاں چچا جان کے بارے میں کچھ ایسا ہی تاثر عام ہے۔''

''خاندان والے بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں؟''

''میں دوسروں کے بارے میں تو نہیں کہہ سکتا لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے، میں چچا جان کو ہرگز ایسا نہیں سمجھتا۔''

''تب تمہارے خیال میں ان کی گوشہ نشینی اور دوسروں سے قطع تعلق کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟''

افتخار نے شانے اچکائے۔ ''شاید وہ تنہائی پسند تھے یا ان کو کوئی ایسی چوٹ لگی تھی جس کی وجہ سے وہ انسانوں سے بیزار ہو گئے تھے۔''

''تم نے بھی مجھے نہیں بتایا کہ لوگ بابا کو یہاں ایسا سمجھتے ہیں۔'' حنا کے لہجے میں شکوہ تھا۔

''سچی بات ہے، میری ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ تمہارے لیے یہ زیادہ صدمے کی بات ہوتی اور میں تمہیں صدمہ دینا نہیں چاہتا تھا۔'' افتخار نے کہا۔ ''خیر اسے چھوڑو، کل میری ڈی ایس پی سے بات ہوئی ہے۔ ان نے کل ہی اپنے آدمی بھیجے تھے اور انہوں نے علاقے میں اس شخص کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جس کے ہاتھوں پر گھنے بال ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے، اس کا نام جاوید ہے۔ وہ چچا بختیار کے پاس کام کرتا تھا۔''

''پولیس اسے تلاش کرنے میں ناکام رہی ہوگی۔'' حنا نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''افتخار! یہ معاملہ مجھے پولیس کے بس کی بات نہیں لگ رہا۔ وہ عام جرائم حل نہیں کر پاتی ہے، بابا کا مرڈر

تو پُراسرار بھی ہے۔ آخر کسی کو ان سے کیا پُرخاش ہو سکتی ہے؟"
افتخار دبی زبان میں بولا۔ "لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دشمنی کا معاملہ ہے۔"
"یعنی بابا کی دوسرے اسمگلروں سے دشمنی کا؟" حنا اس کا مطلب سمجھ گئی۔ افتخار نے سر ہلایا۔
"کچھ ایسا ہی خیال ہے۔"
بنگلے کے پچھلے حصے میں ایک گیراج تھا جس میں بختیار احمد کی پرانی ملٹری ماڈل کی جیپ موجود تھی۔ جیپ اچھی حالت میں تھی کیونکہ اس کی باقاعدگی سے دیکھ بھال کی جاتی رہی تھی۔ بنگلے کے اندر حویلی سے آئی ملازمائیں صفائی ستھرائی میں مصروف تھیں۔ افتخار نے دو دن لگ کر یہاں کام کرایا تھا۔ اس نے سارے تالے تبدیل کرائے تھے۔ جہاں جہاں رنگ و روغن اور مرمت کی ضرورت تھی، وہ کام کرایا۔ آج صفائی ہو رہی تھی۔ افتخار اور حنا بنگلے کے باہر موجود تھے۔ افتخار نے کہا۔ "کیا تم یہاں منتقل ہونے کا ارادہ رکھتی ہو؟"
"میں۔" اس نے حیرت سے کہا۔ "نہیں تو..... میں بس ایک مہینے کے لیے آئی ہوں۔ پھر مجھے واپس جانا ہے۔ رزلٹ آنے والا ہوگا۔ اس کے بعد میرا ماسٹر کرنے کا ارادہ ہے۔"
"کس شعبے میں؟"
"جرنلزم میں..... مجھے یہ شعبہ اچھا لگتا ہے۔"
"تم جرنلسٹ بنو گی؟" افتخار نے غور سے اسے دیکھا۔
"ویسے اگر تم جرنلسٹ بنیں تو بہت کامیاب رہو گی۔"
"وہ کیسے؟" حنا نے اپنے اڑتے بال چہرے سے ہٹائے۔
"کیونکہ پورے ملک میں اتنی خوب صورت صحافی نہیں ہوگی اور لوگ خود تمہیں اطلاعات دینے کے لیے بے تاب رہا کریں گے۔" افتخار نے کہا تو حنا کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کے لیے بدلا پھر اس نے کہا۔
"میں نے سنا ہے کہ ہمارے خاندان میں باہر شادی کا رواج نہیں ہے؟"
"درست ہے، شاید چچا جان نے بھی اسی وجہ سے اپنی شادی چھپائی تھی اور طلاق کے بعد بھی اسے راز رکھا۔"
"کیا رشتے بچپن سے طے کر دیے جاتے ہیں؟"
"اب تک تو ایسا ہی ہوتا آیا تھا لیکن اب یہ تبدیلی آئی ہے کہ بچوں کو موقع دیا جاتا ہے کہ... وہ کسے پسند کرتے ہیں۔ جہانگیر بھائی اور نازیہ کی شادی ان کی پسند سے ہوئی ہے۔ شازمین اور جہانزیب میں بھی ہم آہنگی ہے۔ غازیہ کے لیے شاید عظیم کا رشتہ ہوگا لیکن اس کے بارے میں پکّا نہیں ہے۔"
حنا نے محسوس کیا کہ اس نے جان بوجھ کر اپنا اور مہناز کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "تم نے مہناز کے بارے میں تو بتایا نہیں۔"
افتخار نے گہری سانس لی۔ "پھوپی کی خواہش اور کوشش ہے کہ اس کا رشتہ مجھ سے ہو جائے۔"
"اور تمہاری کیا خواہش ہے؟"
"میں نے مہناز کو کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا۔" اس نے کہا اور موضوع بدل دیا۔ "آؤ اندر چلیں، یہاں دھوپ میں بھی سردی لگ رہی ہے۔"
وہ اندر آئے۔ کچن کا حصہ صاف ہو گیا تھا اور وہاں ضرورت کا سارا سامان بھی تھا۔ حنا نے چائے کا پانی رکھا۔ افتخار وہیں کچن میں رکھی چھوٹی سی میز کی طرف بیٹھ گیا۔ حنا نے اب تک اسے نہیں بتایا کہ اس دن مہناز نے اس سے کیا بات کی تھی اور افتخار کے لیے اس نے کیا کہا تھا۔ چائے بنا کر افتخار کے سامنے رکھتے ہوئے اس نے سرسری سے انداز میں کہا۔
"مہناز اچھی لڑکی ہے، بس ذرا زبان اور مزاج کی تیز ہے۔"
"تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن بات تو پسند کی ہے۔ وہ مجھے اس لحاظ سے پسند نہیں ہے۔"
حنا اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ "تو کیا کوئی اور پسند ہے؟"
"ہو سکتا ہے۔" افتخار نے پُرخیال انداز میں کہا۔
"مطلب؟"
اس نے چائے کا گھونٹ لیا۔ "مطلب یہ کہ ابھی اسے نہیں معلوم کہ میں اسے پسند کرنے لگا ہوں۔ معاملہ تو دونوں طرف سے ہونا چاہیے۔"
"ہاں، معاملہ دونوں طرف سے ہونا ضروری ہے۔" حنا نے اس کی تائید کی۔ پھر اس نے اٹھ کر برتن دھو کر رکھے۔ اوپر نیچے کی صفائی تقریباً مکمل ہو گئی تھی اور چند دن پہلے تک اجاڑ نظر آنے والا بنگلا اب کم سے کم اندر سے چمک رہا تھا۔ افتخار نے فرنیچر بھی پالش کرا دیا تھا۔ البتہ باہر بنگلے کا رنگ ویسا ہی تھا۔ زمین کی حالت بھی نہیں بدلی تھی۔ صرف بنگلے کے پاس آنے والی جھاڑیاں صاف کرا دی تھیں۔ اچانک حنا نے افتخار سے کہا۔ "میں سوچ رہی ہوں آج رات یہیں رک جاؤں۔"
افتخار مضطرب ہو گیا۔ "میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔ یہ جگہ بالکل ویرانے میں ہے اور یہاں تم پر حملہ بھی ہو چکا ہے۔"

"میں اپنی حفاظت کر سکتی ہوں۔" حنا نے کہا۔ "پھر ایک رات کی بات ہے۔ اگر میرے ساتھ کوئی رک جائے تو....."
اس بار افتخار نے مخالفت نہیں کی۔ "ٹھیک ہے، تم صائمہ کو روک لو۔ میں گھر جا کر ایک گارڈ بھیجتا ہوں۔ وہ رات بھر جاگ کر نگرانی کرے گا۔ لیکن تم کیوں رکنا چاہتی ہو؟"
"بس ایسے ہی.... شاید میں بابا کی یادوں اور یہاں ان کی موجودگی کو محسوس کرنا چاہتی ہوں۔ میں ان کی چیزیں دیکھنا چاہتی ہوں۔ ان کا کمپیوٹر ہے لیکن اس پر پاس ورڈ لگا ہوا ہے۔"
"میں نے بھی دیکھا تھا لیکن پاس ورڈ مجھے بھی نہیں معلوم۔"
"ممکن ہے بابا نے کہیں لکھ کر رکھا ہو۔"
افتخار نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے ان کے کاغذات اور دوسری چیزوں میں دیکھا لیکن مجھے کہیں بھی ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی جسے پاس ورڈ قرار دیا جا سکتا ہو..... اور یہ تو آدمی اپنے ذہن میں رکھتا ہے۔"
"تم نے ماما کو بتایا تھا کہ تمہیں بابا کے پاس سے کوئی ڈائری اور ہماری تصاویر ملی تھیں جن سے تمہیں پتا چلا کہ بابا شادی کر چکے ہیں اور ان کی ایک بیٹی بھی ہے۔"
"ڈائری اور البم مجھے ان کے بیڈ کی سائڈ دراز میں ملے تھے اور میں نے وہیں رکھ دیے تھے۔ تم دیکھ سکتی ہو۔"
"میں دیکھ لوں گی۔" اس نے کہا۔
افتخار کھڑا ہو گیا۔ "چائے کا شکریہ... تم بہت اچھی چائے بناتی ہو۔ میں ابھی جا کر کسی کو بھیجتا ہوں۔ تم صائمہ کو روک لینا۔"
صائمہ خوشی سے رک گئی۔ ویسے بھی چند دنوں میں وہ حنا سے بہت قریب ہو گئی تھی اور بہت خلوص سے اس کی خدمت کرتی تھی۔ وہ کھانا بنانا بھی جانتی تھی۔ وہ حنا سے پوچھ کر اس کے لیے کھانا تیار کرنے لگی۔ شام سے پہلے افتخار کا بھیجا ہوا مسلح گارڈ بھی آ گیا تھا۔ اس نے بنگلے کے سامنے اپنی چوکی جمالی تھی۔ حنا گھر کا جائزہ لینے لگی۔ افتخار نے بہت اچھا کام کرایا تھا۔ اسٹڈی صفائی کے بعد چمک رہی تھی۔ حنا کمپیوٹر کی طرف آئی۔ اس نے اسے آن کیا اور پاس ورڈ والی اسکرین آنے پر دوبارہ آف کر دیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ بابا نے کمپیوٹر پر پاس ورڈ کیوں لگایا تھا؟ کیا اس میں انہوں نے کوئی ایسی چیز رکھی تھی جو وہ دوسروں سے چھپانا چاہتے تھے؟ پاس ورڈ کے بغیر..... اسے کسی طرح کھولا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ صرف درست پاس ورڈ لگانے سے کمپیوٹر آن ہو سکتا تھا۔
اچانک اسے دراز کے نیچے موجود پتلی سی ٹرے کا خیال آیا۔ اس نے دراز کا معائنہ کیا۔ اسے دیکھ کر بالکل بھی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اس کے نیچے ایک ٹرے الگ بھی ہو جاتی ہے۔ یہ دراز کا حصہ ہی لگتی تھی۔ اس نے دراز کھینچی تو اس بار ٹرے الگ نہیں ہوئی۔ اس نے بند کر کے دو تین بار اسے کھولا مگر ٹرے نیچے سے جڑی رہی اور الگ نہیں ہوئی۔ حنا نے دراز کے لٹو کا معائنہ کیا اور جلد اسے لٹو کے سامنے ایک ابھار مل گیا جسے دبانے سے دراز سے چپکی ٹرے الگ ہو جاتی تھی۔ اس نے ٹرے کو باہر کھینچا۔ یہ مشکل سے دو انچ گہری تھی لیکن پوری دراز کے برابر ہی تھی۔ اس میں تین چیزیں تھیں۔ ایک پتلی سی پاکٹ سائز ڈائری، ایک سنہری رنگ کا چھوٹا سا پستول اور ایک عدد چابیوں کا گچھا بھی تھا جو شاید اسٹڈی کی الماریوں اور میز کی درازوں پر لگے تالوں کا تھا لیکن یہ صرف تین عدد چابیاں تھیں۔ اس نے پہلے ڈائری نکالی۔ یہ پاکٹ سائز سے بھی ذرا چھوٹی تھی۔
پھر اس نے چابیاں آزمائیں لیکن یہ کسی بھی تالے میں نہیں لگ رہی تھیں۔ ایک ایک کر کے حنا نے اسٹڈی کے تمام تالے چیک کر لیے۔ چابیاں بھی بہت پیچیدہ اور ذرا الگ قسم کی تھیں۔ یقیناً ان کے تالے کہیں اور تھے۔ حنا نے صرف ڈائری نکالی، پستول اور چابیاں واپس اسی دراز میں رکھ دیں اور پھر اسٹڈی کو بھی لاک کر کے باہر آ گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اب کوئی اس کی مرضی کے بغیر یہاں تک رسائی حاصل کرے۔ وہ کچن کے پاس آئی تو صائمہ نے اطلاع دی۔
"کھانا چھ بجے تک تیار ہو جائے گا۔ لیکن آپ جب کہیں تب لگا دوں گی۔"
"ٹھیک ہے، جب کھانا ہوگا تو بتا دوں گی۔ تم باہر موجود گارڈ کا کھانا بھی بنانا اور ابھی مجھے ایک کپ چائے بنا کر اوپر لا دو۔"
"جی اچھا بی بی۔" اس نے مستعدی سے کہا۔
وہ اوپر آئی، یہاں دو بیڈ رومز تھے۔ ایک بختیار احمد کا تھا اور دوسرا شاید کسی آنے جانے والے کے لیے تھا کیونکہ یہ بیڈ روم بھی مکمل طور پر فرنش تھا۔ حنا نے اسے اپنے لیے منتخب کر لیا۔ پھر وہ بختیار احمد کے بیڈ روم میں آئی۔ بستر پر بیٹھ کر اسے عجیب سا احساس ہوا۔ اسے لگا جیسے وہ باپ کی گود میں آ گئی ہو۔ اس کا شفقت بھرا لمس محسوس کر رہی ہو۔ وہ بستر پر دراز ہو گئی۔ چند لمحے کے لیے اسے غنودگی سے آ گئی۔ پھر وہ چونکی۔ اسے لگا جیسے کہیں سے کوئی آواز آئی ہو۔ وہ اٹھ کر

کھڑکی تک آئی۔ یہ کھڑکی مشرق کی طرف کھلتی تھی اور یہاں سے کچھ ہی دور واقع سرحد پر لگی خاردار باڑ... اور مٹی سے اٹھائی لائن کو واضح طور پر دیکھا جاسکتا تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور اندھیرا تیزی سے چھا رہا تھا۔ سرحد اس بنگلے سے چند سو گز سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ اسے خیال آیا کہ شاید اسی وجہ سے لوگ بابا کے بارے میں ایسا خیال کرتے تھے۔ اس نے سر جھٹکا اور خود سے بولی۔

''ایسا نہیں ہوسکتا۔ مجھے یقین ہے کہ میرے بابا ایسے نہیں ہوں گے۔''

وہ بستر کی طرف آئی۔ اسی اثنا میں صائمہ دستک دے کر اندر آئی اور اس نے چائے کی ٹرے تپائی پر رکھ دی۔

''میں بنادوں بی بی؟''

''نہیں تم جاؤ، میں خود بنالوں گی۔''

صائمہ کے جانے کے بعد اس نے چائے بنائی اور اس کے گھونٹ لیتے ہوئے دراز سے ڈائری اور البم نکالی۔ پہلے اس نے البم کھولی۔ اس میں بہت ساری بڑے سائز کی تصاویر تھیں اور وہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ البم میں اس کے بچپن سے لے کر جوانی تک کی تصاویر تھیں۔ ان میں چند مہینے پہلے تک کی تصویر بھی تھی جب وہ کالج کی ساتھیوں کے ہمراہ ایک میلے میں گئی تھی۔ البم میں اس کی سو سے زائد تصاویر تھیں اور یہ سب مختلف مواقعوں پر اس وقت لی گئی تھیں جب وہ کہیں گھر سے باہر تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ بختیار احمد اس سے لاتعلق نہیں تھا۔ وہ اسے دیکھنے آتا تھا اور اسی موقع پر اس کی تصویر لیتا تھا۔ یا ممکن ہے اس نے کسی کی خدمات حاصل کر رکھی ہوں جو اس کی سرگرمیوں پر نظر رکھتا ہوگا اور اس کی تصاویر لے کر بختیار احمد کو بھیجتا ہوگا۔ لیکن جب اسے بیٹی سے اتنا پیار تھا تو وہ اس سے لاتعلق کیوں تھا؟ کبھی اس سے ملنے نہیں آیا، اس نے کبھی بیٹی کو پیار نہیں کیا۔

البم دیکھتے ہوئے حنا کو بار بار اپنی آنکھیں صاف کرنا پڑ رہی تھیں۔ بعض تصاویر میں وہ ماما کے ساتھ تھی۔ یہ تصاویر ان مواقع... پر لی گئی تھیں جب وہ ثنا کے ساتھ کہیں باہر نکلی تھی۔ آخری تصویر دیکھ کر اس نے البم بند کی اور ڈائری کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ ڈائری میں شاید اسے بابا کی طرف سے کوئی تحریر ملے گی جس میں بتایا ہوگا کہ اس کے رویے کی وجہ کیا تھی اور وہ سب سے اور خاص طور سے اپنی اولاد سے کیوں اتنا دور رہا تھا۔ مگر اسے حیرت ہوئی جب ڈائری کے صرف ابتدائی صفحے پر ایک مختصر سی تحریر ملی جس میں اس نے کسی کو مخاطب کیے بغیر بتایا کہ شہر میں اس کی سابق بیوی اور ایک بیٹی موجود ہے اور ان کے گھر کا پتا اور فون نمبر لکھ کر بختیار احمد نے ہدایت کی تھی کہ اگر کسی وجہ سے اس کی موت ہوجائے تو اس کی اطلاع اس کی سابق بیوی اور بیٹی کو دی جائے۔ اس کے علاوہ پوری ڈائری سادہ تھی۔ حنا حیران رہ گئی۔

☆☆☆

حویلی کی بڑی نشست گاہ میں تمام بڑے موجود تھے اور ان کے علاوہ وہاں صرف افتخار تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے افتخار کی پیشی ہوئی ہو۔ شہریار احمد اسے گھور رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''تم یہ کیا کرتے پھر رہے ہو؟''

''کیا بابا جان؟''

''تم اس لڑکی کے ساتھ کیوں پھر رہے ہو؟'' افتخار کی ماں رابعہ نے ناگواری سے کہا۔ ''وہ جس کام کے لیے آئی تھی، وہ ہوگیا ہے۔ اب اسے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔''

افتخار نے حیرت سے ماں کی طرف دیکھا۔ ''لیکن امی وہ ہماری کزن ہے۔ ہمارے چچا کی بیٹی ہے۔''

''چچا کی بیٹی۔'' پھوپی شہناز نے حقارت سے کہا۔ ''تم جانتے ہو، اپنے اس بھائی کو ہم نے خاندان سے نکال دیا تھا۔''

''صرف کچھ افواہوں کی بنا پر۔'' افتخار کا لہجہ کسی قدر تیز ہوگیا۔ ''معذرت کے ساتھ کہوں گا پھوپی جان .... یہ بختیار چچا کے ساتھ زیادتی تھی۔ ٹھیک ہے وہ تنہائی پسند ہوں گے اور وہ دوسروں سے ملتے جلتے بھی کم تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان پر اتنا بڑا الزام لگا دیا جائے۔''

پھوپی شہناز، افتخار کو گھورنے لگیں۔ ''تم بدتمیزی کر رہے ہو۔''

''میں پہلے ہی معذرت کر چکا ہوں۔ کیا چچا جان کے خلاف کبھی کوئی قانونی کارروائی ہوئی؟ پولیس نے انکوائری کی یا ان پر کوئی الزام لگایا گیا؟ تب ان کے خلاف اتنی بڑی بات فرض کرلینا کس طرح مناسب ہوگا؟''

منصور احمد کھنکھار کر بولے۔ ''بختیار جانتا تھا کہ لوگ اس پر کس قسم کے الزامات لگاتے ہیں لیکن اس نے کبھی ان کی تردید کرنے کی کوشش نہیں کی۔''

''چچا جان! اگر ایک آدمی بے گناہ ہے تو وہ بلاوجہ اپنی صفائیاں کیوں پیش کرے؟ ہاں کسی طرف سے باقاعدہ الزام لگے تو الگ بات ہے مگر افواہوں کی تردید کس طرح کی جاسکتی ہے۔ پھر آپ سب جانتے ہیں، چچا جان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ ان کا کل بینک بیلنس صرف ستر ہ لاکھ روپے تھا ہے۔ میں اور آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ سرحدی علاقوں

میں اسمگلر کتنا کماتے ہیں۔ بہت سارے لوگ جن کے پاس کبھی چند ایکڑ زمین بھی نہیں تھی، اب انہوں نے بڑی بڑی کوٹھیاں بنالی ہیں۔''

''ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' پھوپی شہناز نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اصل بات یہ ہے کہ شاہ پور میں سب بختیار احمد کو ایک اسمگلر سمجھتے ہیں۔ اگر اس کی بیٹی یہاں آکر رہے گی تو یہ بدنامی مستقل جاری رہے گی۔''

''اس کا یہاں رہنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' افتخار نے کہا۔

''تب وہ بنگلے کو کیوں رینوویٹ کرا رہی ہے؟'' شہناز کی آواز تیز ہوگئی۔ ''اور تم اس کے کاموں میں کیوں اتنی دلچسپی لے رہے ہو؟''

''وہ رینوویٹ نہیں کرا رہی ہے، صرف اس کی حالت کو بہتر کر رہی ہے۔'' افتخار نے ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ ''پھوپی جان! آپ یہ بات بھول جاتی ہیں کہ وہ میری کزن ہے، کوئی غیر نہیں ہے۔''

''ہمارے لیے تو وہ غیر ہے۔'' شہناز نے منہ بنایا۔ ''بختیار کی حرکتیں ویسے بھی درست نہیں تھیں، اوپر سے اس نے خاندان سے باہر شادی کرلی۔''

افتخار کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اس معاملے میں اپنے بڑوں سے متفق نہیں ہے۔ اگرچہ سوائے پھوپی شہناز کے کوئی اس معاملے میں زیادہ نہیں بولا تھا لیکن بڑوں کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ پھوپی شہناز سے غیر متفق بھی نہیں ہیں۔ یہ حقیقت تھی کہ کچھ بھی سامنے نہ ہوتے ہوئے اور کوئی الزام یا افواہ سچائی سے کوسوں دور ہوتے ہوئے بھی بختیار احمد خاندان والوں کے لیے ایک عضوِ معطل کی حیثیت رکھتا تھا۔ ان میں سے کوئی خوشی سے اس سے ملنا پسند نہیں کرتا تھا۔ سوائے افتخار کے اور وہ بھی دو تین سال پہلے وہاں جانا شروع ہوا تھا۔ اس کے بعد سے اس کی بختیار احمد کے بارے میں سوچ میں تبدیلی آئی تھی۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد شہریار احمد نے کہا۔

''تم کہہ رہے ہو کہ حنا واپس چلی جائے گی؟''

''جی بابا جان!''

منصور احمد نے کہا۔ ''تب وہ یہ زمین اور بنگلا فروخت کیوں نہیں کر دیتی؟ زمین اچھی ہے، اس کے کئی خریدار مل جائیں گے۔''

''جی بہت موقع کی زمین ہے۔ کئی اسمگلر اس کے منہ مانگے دام دینے کو تیار ہو جائیں گے۔'' افتخار نے سادگی سے کہا۔

''تب تم اس سے بات کرو اگر وہ چاہے تو ہم اس سے یہ زمین خریدنے کو تیار ہیں۔'' منصور احمد بولے۔ ''ہم اسے مارکیٹ سے اوپر ہی رقم دیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' افتخار نے بے دلی سے کہا۔ ''میں اس سے بات کرتا ہوں، باقی اس کی مرضی۔''

☆☆☆

حنا رات دیر تک اسٹڈی سے ملنے والی پاکٹ سائز ڈائری دیکھتی رہی۔ اس پر بھی کچھ تحریر نہیں تھا بس تاریخوں اور وقت کے ساتھ اوپر سے نیچے قطار میں ہندسے لکھے ہوئے تھے۔ یہ سب انفرادی ہندسے تھے۔ جیسے ایک صفحے پر اوپر تاریخ درج تھی اور پھر اس کے نیچے مختلف ہندسے درج تھے۔

ڈائری کے تقریباً دو درجن صفحے اسی قسم کی تاریخوں اور ہندسوں پر مشتمل تھے۔ سب سے پہلی تاریخ جنوری 1995ء کی تھی۔ اس کے بعد مختلف سالوں کی تاریخیں تھیں۔ بعض سالوں کی دو تین تاریخیں تھی اور بعض سالوں کی ایک بھی تاریخ نہیں تھی۔ آخری تاریخ اب سے کوئی چھ مہینے پہلے کی تھی۔ ان اعداد کے علاوہ پوری ڈائری میں کہیں ایک لفظ بھی نہیں لکھا تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ تمام ہندسے ایک ہی ہینڈ رائٹنگ میں لکھے ہوئے تھے۔ کہیں وضاحت نہیں تھی کہ ان تاریخوں اور ہندسوں کا کیا مطلب ہے۔

سردی میں شدت کی وجہ سے اس نے بیڈ روم میں موجود آتش دان میں لکڑی جلا لی تھی۔ جلانے کے لیے لکڑی کی کمی نہیں تھی۔ بنگلے کے عقب میں ایک شیڈ تلے بہت بڑی مقدار میں لکڑی موجود تھی اور اس کے ٹکڑے بھی بنے ہوئے تھے۔ اس نے صائمہ سے لکڑی منگوالی تھی۔ وہ نیچے کچن میں اپنا بستر بچھا کر سو گئی تھی جبکہ افتخار کا بھیجا ہوا گارڈ صحن میں الاؤ جلائے پہرا دے رہا تھا۔

ڈائری دیکھنے کے بعد حنا نے ابھی تک سوچا نہیں تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس نے ماں کو کال کر کے بتا دیا تھا کہ بختیار احمد کی وصیت کے مطابق اس کی ساری دولت اور جائداد اس کے نام ہوگئی ہے۔ لیکن اس نے ماں کو یہ نہیں بتایا کہ بختیار احمد کا قتل ہوا ہے اور وہ جاننا چاہتی ہے کہ اس کا قاتل کون ہے۔ پھر اس پر جو الزام تھا وہ اسے بھی کلیئر کرنا چاہتی تھی۔ سوچتے سوچتے اسے نیند آگئی۔ نیند گہری نہیں تھی۔ کسی وقت اسے لگا جیسے کہیں کوئی آہٹ ہو رہی ہو۔ وہ اٹھ کر بیٹھی۔ چاروں طرف سناٹا تھا لیکن غور سے کان لگانے پر اسے لگا جیسے عقب کی طرف سے کچھ آوازیں آرہی ہوں۔ وہ اٹھ کر کھڑکی تک آئی۔ پٹ مکمل طور پر بند تھے اور باہر شروع

دن کے چاند اور ستاروں کی ہلکی سی روشنی تھی۔
مگر غور سے دیکھنے پر اسے لگا جیسے لکڑی رکھنے والے شیڈ کے پاس ہی کوئی چیز دبکی ہوئی ہے۔ اتنی دور سے اور شیڈ تلے تاریکی میں یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کیا چیز ہے۔ کوئی انسان ہے یا جانور ہے۔ حنا کو اس طرح اندازہ ہوا کہ اس نے وہ شیڈ دیکھا ہوا تھا اور شام تک اس جگہ کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ دیر تک اس چیز کو دیکھتی رہی۔ اس نے اپنی جگہ سے قطعی حرکت نہیں کی تھی۔ حنا کو محسوس ہوا کہ شاید اسے دھوکا ہو رہا ہے۔ حنا پلٹنے والی تھی کہ اس کی توجہ جھاڑیوں کی طرف چلی گئی۔ اسے لگا جیسے جھاڑیاں ہل رہی ہوں۔ اگرچہ یہ بہت معمولی سے انداز میں ہل رہی تھیں جیسے کوئی بہت احتیاط سے ان کے درمیان چل پھر رہا ہو۔
حنا کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کیا جھاڑیوں میں کوئی انسان تھا یا جانور؟ باقی جھاڑیاں ساکت تھیں اس لیے ہوا کو اس کا ذمے دار قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ پھر جھاڑیوں سے ایک ہیولہ برآمد ہوا اور بنگلے کی طرف بڑھا۔ حنا نے واضح طور پر دیکھا کہ وہ کوئی انسان ہے اور بالکل چوروں کے انداز میں آ رہا ہے۔ اس کی کوشش تھی کہ کوئی آہٹ نہ ہونے پائے۔ حالانکہ کوئی آہٹ ہوتی تو بھی سنائی نہ دیتی۔ وہ اوپری منزل کے بند کمرے میں تھی۔ آنے والا لان تک آ گیا تھا اور لکڑی والا شیڈ اس کے عقب میں آ گیا۔
حنا دم بہ خود سی اسے دیکھ رہی تھی اور اچانک اس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ شیڈ سے وہی چیز جو اتنی دیر سے ساکت تھی، اچانک حرکت میں آئی اور آنے والے پر جھپٹی۔ حنا نے دیکھا دو انسان آپس میں گتھم گتھا ہو گئے لیکن ان میں سے کسی کے منہ سے آواز نہیں نکلی تھی۔ ذرا سی دیر میں وہ اس طرح گڈمڈ ہوئے کہ حنا شناخت نہیں کر سکی کہ ان میں شیڈ والا کون تھا اور بعد میں آنے والا کون..... پھر ان میں سے ایک کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے اور دوسرا اس پر چڑھا دونوں ہاتھوں سے اسے گھونسے مار رہا تھا۔ حنا کی توجہ اس کے ہاتھوں کی طرف گئی۔ وہ کلائی تک بالکل سیاہ ہو رہے تھے جیسے اس کے ہاتھوں پر گھنے بال ہوں۔ دوسرا آدمی بے دم ہو گیا۔ مارنے والے نے اسے اٹھا کر شانے پر ڈالا اور اسے لے کر جھاڑیوں کی طرف چل پڑا۔ یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ ان میں سے آنے والا کون تھا اور شیڈ تلے دبک کر کون بیٹھا تھا۔ دفعتاً حنا چونکی اور پھر... شال لیتی ہوئی تیزی سے نچلے فلور پر آئی۔ سامنے والا دروازہ کھول کر اس نے گارڈ کو آواز دی۔ وہ لاؤ کے پاس بیٹھا جاگ رہا تھا۔ فوراً دوڑا آیا۔ ”جی بی بی جی؟“

”دیکھو پیچھے کی طرف کچھ لوگ ہیں۔ میں نے ابھی اوپر سے دیکھا ہے، ہوشیار رہنا۔“
یہ سنتے ہی گارڈ پیچھے کی طرف بھاگا۔ حنا نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اسے ڈر لگ رہا تھا۔ اسے اسٹڈی کی میز کی خفیہ دراز میں رکھے اس چھوٹے سے سنہری پستول کا خیال آیا۔ اسے پستول چلانا نہیں آتا تھا لیکن ہاتھ میں ہتھیار ہو تو آدمی خود کو مضبوط محسوس کرتا ہے۔ وہ اسٹڈی سے پستول نکال لائی۔ گارڈ کوئی پندرہ منٹ بعد واپس آیا اور اس نے آواز دے کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ حنا نے دروازہ کھول دیا۔ ”کسی کو دیکھا؟“
”نہیں بی بی جی! اس طرف کوئی نہیں ہے۔ میں دور تک دیکھ آیا ہوں۔ اگر کوئی تھا تو وہ بھاگ گیا ہے۔ پیچھے والے شیڈ میں بھی دیکھ لیا ہے۔“
حنا نے گہری سانس لی۔ ”ٹھیک ہے جاؤ، اب ہوشیار رہنا۔“
وہ واپس کمرے میں آئی اور دروازہ بند کر لیا۔ اسے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ یہاں کوئی گڑبڑ تھی لیکن پولیس اس معاملے میں کچھ نہیں کر رہی تھی۔ پولیس کی رپورٹ میں ڈکیتی کا شبہ ظاہر کیا گیا تھا۔ یعنی کوئی ڈکیتی کی نیت سے اندر گھسا تھا اور بختیار احمد کے جاگنے پر اس نے اسے قتل کر دیا۔ پولیس قاتل کی تلاش میں مزید کیا کر رہی تھی، رپورٹ میں اس کا کوئی ذکر نہیں تھا..... بلکہ پولیس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اسے کسی نامعلوم قاتل کے کھاتے میں ڈال کر کیس داخلِ دفتر کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ ابتدائی تفتیش کے بعد اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔
اب یہ واقعہ ہوا تھا۔ اگرچہ گارڈ کو پیچھے کوئی نظر نہیں آیا تھا مگر حنا کو یقین تھا کہ اس نے جو دیکھا ہے، وہ بالکل درست ہے۔ عقبی لان میں کم سے کم دو افراد تھے جو آپس میں لڑ پڑے تھے اور پھر ان میں سے ایک دوسرے کو اٹھا کر لے گیا تھا۔ اب پتا نہیں دوسرا بے ہوش ہوا تھا یا مر گیا تھا اور پہلا اس کی لاش اٹھا کر لے گیا تھا۔ ان میں سے ایک کے ہاتھوں سے لگ رہا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے پہلے دن اسے اسٹڈی میں مارنے کی کوشش کی تھی۔ کیا بابا کے بارے میں جو افواہیں پھیلی ہیں، ان میں کوئی صداقت ہے؟ یہاں کوئی چکر ہے جس کی وجہ سے یہ واقعات ہو رہے ہیں۔ سوچتے سوچتے اس کے سر میں شدت کا درد ہونے لگا۔ آتے ہوئے ثنا نے اسے مکمل میڈیکل پیکٹ دیا تھا جس میں عام استعمال کی دوائیں بھی شامل تھیں۔ اس نے پیکٹ سے دو عدد پین کلر لے

کر کھائیں اور کمبل میں دبک کر لیٹ گئی۔
صبح بہت بوجھل تھی۔ سر کا درد کم ہوا تھا لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے سر میں مغز کی جگہ پتھر... رکھ دیا ہو۔ ذرا سی حرکت سے وہ بھی ہلتا تھا۔ روشنی ہو چکی تھی لیکن اس کا اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ صائمہ نے دروازے پر دستک دی تو اس نے اٹھے بغیر اسے اندر آنے کو کہا۔ صائمہ نے اطلاع دی۔ ”افتخار صاحب آئے ہیں۔“
”اتنی صبح؟“ وہ چونکی۔
”وہ تو دیر کے آئے ہوئے ہیں، اندر ابھی آئے ہیں۔“
”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ انہیں یہیں بھیج دو اور سنو میرے لیے بلیک کافی لے آؤ۔“
”جی اچھا بی بی۔“ صائمہ نے کہا پھر ہچکچا کر پوچھا۔ ”بی بی! کیا باورچی خانے کا پیچھے والا دروازہ رات آپ نے کھولا تھا؟“
”نہیں تو..... کیا کھلا ہوا تھا؟“
”میں رات کو خود بند کر کے سوئی تھی پر صبح کھلا ہوا تھا۔ میں سمجھی رات کسی وقت آپ نے کھولا ہوگا۔“
”میں نے نہیں کھولا۔“ حنا نے کہا۔ اسے رات والا واقعہ یاد آ گیا۔ کیا دروازہ آنے والے کے لیے کھلا ہوا تھا؟ اس کے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ اگر دروازہ واقعی کسی سازش کے تحت کھلا رہ گیا تھا تو یہ کس کی حرکت ہو سکتی تھی؟ کچن کا لاک ایسا تھا کہ اسے اندر سے کھولا جا سکتا تھا اور باہر سے یہ چابی کی مدد سے کھلتا تھا۔ مگر ساتھ ہی اس میں الگ سے زنجیر اور کنڈی بھی لگی تھی۔ ”شاید اتفاق سے کھلا رہ گیا ہوگا۔“ حنا نے صائمہ کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ چلی گئی اور کچھ دیر بعد افتخار اندر آیا۔ حنا دوبارہ کمبل میں گھس گئی۔ اس کا دوپٹا ایک طرف پڑا تھا، اس لیے اس نے گردن تک کمبل کھینچ لیا۔ ”کیا ہوا تمہاری طبیعت کو؟“
”سر میں درد ہے۔“
”رات والے واقعے کی وجہ سے؟“ افتخار نے کہا تو وہ چونک گئی۔
”تمہیں پتا چل گیا؟“
”ہاں آتے ہی گارڈ نے بتا دیا تھا۔ تم نے کیا دیکھا تھا؟“
حنا نے اسے تفصیل سے بتایا کہ اس نے کیا دیکھا تھا۔ افتخار غور سے سنتا رہا پھر اس نے کہا۔ ”حنا! تمہارا یہاں رہنا بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ یہاں کچھ گڑبڑ ہے۔“

حنا نے سر ہلایا۔ ”میں بھی یہی محسوس کرتی ہوں۔“
افتخار ہچکچایا جیسے کچھ کہنا چاہ رہا ہو پھر وہ بولا۔ ”حنا! میرا مشورہ ہے کہ تم یہ زمین اور بنگلا سیل کر دو۔ ویسے بھی تمہیں یہاں رہنا تو نہیں ہے۔“
حنا کچھ دیر اسے دیکھتی رہی۔ ”یہ تمہارا مشورہ ہے یا حویلی کے بڑوں کا؟“
افتخار شرمندہ ہو گیا۔ ”ایسا ہی سمجھ لو۔“
حنا نے افسردگی سے کہا۔ ”میں جانتی ہوں، انہوں نے مجھے یہاں ویلکم نہیں کیا ہے۔ میں ان کی مجبوری بن کر آئی ہوں۔“
”لیکن یہ تمہارے حق میں بہتر بھی ہے۔ تم شہر کی پروردہ ہو، یہاں نہیں رہ سکتیں..... اور پھر یہاں اکیلی عورتوں کا رہنا بہت دشوار بھی ہے۔“
”میں خود بھی یہاں نہیں رہنا چاہتی لیکن افتخار..... میں اس طرح نہیں جانا چاہتی کہ ایک خلش ساری عمر میرے دل میں رہے۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ بابا کیا تھے؟ لوگ ان کے بارے میں سچ کہتے ہیں یا غلط..... اور پھر انہیں کس نے قتل کیا ہے؟“
”یہ معلوم کرنا تمہارا نہیں، پولیس کا کام ہے۔“
”تم بھول رہے ہو صرف بابا کا قتل نہیں ہوا ہے بلکہ مجھے بھی مارنے کی کوشش کی گئی تھی۔“
”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی چور اُچکا ہو اور تمہیں اکیلا سمجھ کر اس کی نیت خراب ہو گئی ہو۔“
حنا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ چور نہیں تھا۔ کل رات میں نے جن دو آدمیوں کو لڑتے دیکھا، ان میں سے ایک کے بازو اسی طرح سیاہ تھے جیسے مجھ پر حملہ کرنے والے کے تھے۔“
افتخار چونک گیا۔ ”یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں۔“
”میرے ذہن میں نہیں رہا، میرا سر ویسے ہی دکھ رہا ہے۔“
افتخار سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے پوچھا۔ ”تم نے کمپیوٹر کا پاس ورڈ تلاش کر لیا؟“
”نہیں موقع ہی نہیں ملا۔ میں کل سے.....“ حنا بولتے بولتے رک گئی۔
”کل سے کیا.....؟“
”وہ البم اور بابا کی ڈائری دیکھ رہی تھی۔“
”ڈائری میں تو بس ایک تحریر ہے۔“
”ہاں لیکن میں نے اسے لاتعداد بار پڑھا ہے۔“ حنا

نے جواب دیا۔ ''تم انتظار کرو، میں تیار ہو کر آتی ہوں۔''

افتخار اس کا مطلب سمجھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''میں نیچے ہوں۔''

اس کے جانے کے بعد حنا کمبل سے نکلی۔ اس نے بہتر سمجھا کہ گرم پانی سے نہالے۔ اس کا حیرت انگیز اثر ہوا۔ اس کا سر درد خاصی حد تک کم ہو گیا۔ افتخار ناشتا کر چکا تھا۔ حنا کا موڈ نہیں تھا، اس نے اپنے لیے چائے کا کہا اور نشست گاہ میں آ گئی۔ افتخار خاموش بیٹھا تھا۔ حنا نے اس سے پوچھا۔ ''آخر خاندان کے بڑے کیوں چاہتے ہیں کہ میں یہ زمین اور بنگلا فروخت کر کے یہاں سے چلی جاؤں؟''

''ان کا خیال ہے کہ اس طرح علاقے میں پھیلی افواہیں ختم ہو جائیں گی کہ یہ زمین اسمگلنگ کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ کم سے کم خاندان کا نام نہیں آئے گا۔''

''کیونکہ زمین بابا کی تھی اس لیے ان کا نام آتا تھا؟'' حنا نے آہستہ سے کہا تو افتخار نے سر ہلایا۔

''صرف ان کا ہی نہیں بلکہ پھر سارے خاندان کا نام آتا تھا۔ بات یہ ہے کہ دادا جان نے یہاں اپنی زمینوں کو منظم کیا تھا۔ وہ پڑھے لکھے آدمی تھے جبکہ ان کے مقابلے میں یہاں دوسرے زمیندار جاہل اور پرانے طریقوں سے چمٹے رہنے والے تھے۔ تم نے دیکھ لیا ہو گا کہ ہماری زمینیں کس طرح آرگنائز ہیں۔ اس طرح شاہ پور کی بستی کی بہتری کے لیے بھی ہمارے خاندان نے بہت کام کیا ہے۔ یہاں تمام گلیاں پکی ہیں۔ سیوریج اور پانی کی لائنیں ہیں۔ بجلی بھی موجود ہے۔ گیس کے لیے بایوگیس پلانٹ لگائے گئے ہیں۔ دوسرے ان باتوں سے جلتے ہیں۔ وہ اور تو کسی طرح سے ہمیں تنگ نہیں کر سکتے لیکن چچا بختیار والے معاملے کو لے کر باتیں اچھالتے ہیں۔''

''میں سمجھ گئی لیکن سوال یہ ہے کہ اگر میں زمین فروخت کر کے چلی جاتی ہوں، تب بھی کیا لوگ ماضی بھول جائیں گے؟''

''دیکھو، کچھ عرصے بعد ہر واقعہ لوگوں کے ذہن سے نکل جاتا ہے اور اس میں کوئی حقیقت نہیں ہے، صرف افواہیں ہیں جو خود بہ خود دم توڑ دیں گی۔''

''تم بھی یہی چاہتے ہو کہ میں زمین فروخت کر کے یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلی جاؤں؟''

''میری بات چھوڑو۔'' افتخار کھڑا ہو گیا۔ ''لیکن میں نہیں چاہتا کہ تمہیں کوئی نقصان ہو۔ میں شام کو تمہیں لینے آؤں گا۔''

افتخار چلا گیا اور حنا چائے کا مگ لے کر عقبی لان میں نکل آئی۔ یہاں کبھی گھاس لگی ہو گی لیکن اب سوائے خشک زمین کے اور کچھ نہیں تھا۔ وہ لکڑی والے شیڈ کی طرف آئی۔ اس نے وہ جگہ دیکھی جہاں اسے رات آدمی دبکا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اس جگہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو نیم تاریکی میں آدمی کا تاثر دیتی۔ اس نے پیچھے کی طرف موجود جھاڑیوں کی طرف دیکھا۔ یہاں کچھ جھاڑیاں یوں ہٹی ہوئی تھیں جیسے ان کے درمیان سے کوئی گزرا ہو۔ حنا واپس آئی۔ اس نے لانگ شوز پہنے اور ایک اسٹک لے کر باہر آ گئی۔ اس نے صائمہ یا گارڈ کو نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ وہ خاموشی سے جھاڑیوں میں گھسی اور پھر پہلے سے بنے ایک راستے پر آگے بڑھنے لگی۔ لیکن یہ راستہ مستقل استعمال میں نہیں تھا بلکہ بہت کم استعمال ہوتا تھا۔ وہ آگے بڑھتی رہی۔ اس نے خیال رکھا تھا کہ مشرق کی طرف نہ جائے کیونکہ اس طرف سرحد تھی۔

اچانک اسے لگا جیسے اسے کوئی دیکھ رہا ہے۔ حنا ڈر کر رک گئی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا لیکن مٹی کے رنگ جیسی جھاڑیوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس نے واپسی کا سوچا اور تیزی سے پلٹ گئی۔ اسی لمحے اسے لگا جیسے اس کے پیچھے کوئی آیا ہے۔ اس کی رفتار بڑھ گئی اور ساتھ ہی عقب سے آتی آوازوں کی رفتار بھی بڑھ گئی۔ اس کا دل بے پناہ تیزی سے دھڑک رہا تھا اور وہ پوری رفتار سے بھاگنا چاہتی تھی لیکن اس کے قدم ہی نہیں اٹھ رہے تھے۔ خدا خدا کر کے وہ جھاڑیوں سے باہر آئی اور اس نے پہلی بار پلٹ کر دیکھا۔ دور جھاڑیاں ہل رہی تھیں۔ پھر جھاڑیاں ہلنا رک گئیں اور کچھ دیر بعد ایسا لگا کہ اس کے پیچھے آنے والا واپس جا رہا ہو۔ وہ اپنی حالت پر قابو پاتی ہوئی اندر آئی۔ صائمہ نشست گاہ میں صفائی کر رہی تھی۔ حنا نے اسٹڈی کا دروازہ کھولا اور اندر آ گئی۔

کچھ دیر وہ اپنی سانسوں پر قابو پاتی رہی۔ کیا جھاڑیوں میں کوئی پہلے سے موجود تھا لیکن کسی کو کیا معلوم کہ وہ جھاڑیوں کی طرف آئے گی۔ تو کیا کوئی مستقل اس جگہ کی نگرانی کر رہا تھا؟ رات کو ایک آدمی انہی جھاڑیوں سے نکلا تھا اور پھر دوسرا بے ہوش ہونے والے کو اٹھا کر انہی جھاڑیوں میں غائب ہو گیا تھا۔ حنا بڑی میز والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس نے کمپیوٹر کی طرف دیکھا اور اسے آن کیا۔ پاس ورڈ والی اسکرین نمودار ہوئی۔ حنا کچھ دیر اس پر ممکنہ پاس ورڈ آزماتی رہی لیکن ہر بار اس کا لگایا ہوا پاس ورڈ مسترد ہو جاتا تھا۔ تھک ہار کر حنا نے کمپیوٹر بند کر دیا۔ اس نے خفیہ دراز سے ملنے والی ڈائری اپنے سامان والے بیگ میں رکھ لی تھی۔ وہ

یہاں آتے ہوئے بیگ بھی ساتھ ہی لے آئی تھی۔

دوپہر کے بعد موسم کے تیور خراب ہونے لگے۔ آسمان پر گہرے سرمئی بادل جمع ہونے لگے اور ایسا لگ رہا تھا کہ جلد بارش ہو جائے گی۔ افتخار کا بھیجا ہوا دوسرا گارڈ باہر موجود تھا، رات والا واپس چلا گیا تھا۔ بارش کے آثار دیکھ کر وہ صدر دروازے کے سامنے برآمدے کے نیچے آ گیا۔ پھر سورج غروب ہونے سے پہلے بارش شروع ہو گئی اور بارش بھی اتنی تیز تھی کہ رات کا سماں ہو گیا۔ یکدم سردی بڑھ گئی۔ حنا نے پہلے ہی آتش دان میں لکڑیاں ڈلوالی تھیں۔ دوپہر میں اس نے برائے نام کھایا تھا، اس کے باوجود بھوک نہیں تھی۔ اس نے صائمہ کو اپنے لیے کچھ بنانے سے منع کر دیا۔ یہاں کافی کا سامان بھی تھا، وہ کافی بنا کر اوپر آ گئی۔ صائمہ کام کر چکی تھی اس لیے وہ جلدی سونے چلی گئی۔ افتخار نے کہا تھا کہ وہ اسے شام کو لینے آئے گا لیکن وہ ابھی آیا نہیں تھا۔

حنا نے اپنی البم نکالی اور تصویریں دیکھتی رہی۔ پھر اس نے ڈائری نکالی اور اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے اس میں لکھے ہندسوں اور تاریخوں کے معمے کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کا ذہن الجھتا اور بھٹکتا رہا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ کہیں ان ہندسوں سے الفاظ تو نہیں بن رہے ہیں۔ لیکن کسی ہندسے سے لفظ کیسے بن سکتا تھا؟ اگر یہ کوڈ تھا تو یقیناً کسی طریقے سے ہو گا اور اسے ڈی کوڈ کرنے کا مخصوص طریقہ کار ہو گا۔ حنا نیچے اسٹڈی میں آئی اور اس نے ایک نوٹ پیڈ اور پین لیا۔ واپس آ کر وہ ڈائری میں لکھے ہندسوں کو الفاظ میں ڈھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے غور کیا تو سب سے بڑا ہندسہ چھبیس کا تھا۔ ایک سے لے کر چھبیس تک تمام ہندسے استعمال ہوئے تھے۔ اسے خیال آیا کہ انگریزی الفابیٹ بھی چھبیس ہی ہوتے ہیں۔ اگر ایک سے مراد اے ہے تو چھبیس سے مراد زیڈ ہو گی۔ اس نے نوٹ پیڈ پر انگریزی کے مکمل الفابیٹ لکھے اور پھر ان کے نیچے ترتیب وار نمبر بھی لکھ لیے۔

کچھ ہی دیر میں اس کے سامنے ڈائری اور اس کے ہندسوں کا معما حل ہو گیا تھا۔ یہ مختلف نام تھے۔ ہر تاریخ کے ساتھ مختلف نام لکھے ہوئے تھے۔ وہ کوڈ کے تحت تاریخ وار نام نوٹ پیڈ پر اتارتی رہی۔ ذرا سی دیر میں اس نے پوری ڈائری ڈی کوڈ کر لی لیکن اس میں سوائے ناموں کے اور کچھ نہیں تھا۔ یہ اب بھی معما ہی تھا کہ ان تاریخوں کے ساتھ یہ نام اس ڈائری میں کیوں لکھے تھے؟ حنا اس کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اس کے باپ نے اس ڈائری کو کہیں بختیار احمد کا قفل اسی ڈائری کی وجہ سے تو نہیں ہوا تھا؟ اور اسے قتل کرنے والے اب بھی ڈائری کی تلاش میں تھے؟ انہوں نے ہی حنا پر حملہ کیا تھا اور وہ اب بھی اس کی تاک میں تھے؟ حنا نے نوٹ پیڈ کے لکھے سارے کاغذ آتش دان میں ڈال دیے اور ڈائری نیچے اسٹڈی میں میز کی خفیہ دراز میں چھپا دی۔

حنا اپنے کمرے میں آ گئی لیکن اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ باہر بارش کے ساتھ بادلوں کی گرج چمک بھی جاری تھی۔ بہت دیر بعد جا کر اسے نیند آئی۔ پھر اسے سوتے میں ہی عجیب سی بُو کا احساس ہوا لیکن اس سے پہلے کہ وہ چونکتی نیند اس پر دوبارہ حاوی ہو گئی اور پھر ایک تیز چبھتی ہوئی بُو اسے ہوش میں لے آئی۔ بُو اس کی ناک سے لگی چھوٹی سی بوتل سے اٹھ رہی تھی۔ وہ سیدھی دماغ پر لگ کر اسے بیدار کر رہی تھی۔ وہ چونکی اور پھر کسمسا کر رہ گئی کیونکہ وہ اسٹڈی میں کرسی سے بندھی بیٹھی تھی۔ اس کے سینے اور پیٹ کے گرد لپٹی رسّی نے اسے پوری طرح جکڑ لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی یا آواز نکالتی، ایک پستول آ کر اس کے ہونٹوں سے لگ گیا۔

''بولنا مت۔'' کسی نے عجیب سی آواز میں کہا اور پھر وہ سامنے آ گیا۔ اس نے سیاہ جیکٹ اور سیاہ پتلون کے ساتھ سر پر سیاہ ہی نقاب چڑھا رکھی تھی اور ہاتھوں میں سیاہ دستانے تھے۔ حنا کا دم خشک ہو گیا اور اس نے بمشکل سر ہلا کر اشارے سے کہا کہ وہ آواز نہیں نکالے گی۔ اس پر سیاہ پوش نے پستول اس کے لبوں سے ہٹا لیا۔ پستول دیکھ کر وہ چونکی تھی۔ یہ ویسا ہی سنہری پستول تھا جیسا اس نے میز کی خفیہ دراز میں دیکھا تھا۔ کیا یہ وہی پستول تھا؟ اور اگر یہ وہی پستول تھا تو اس کا مطلب تھا کہ ڈائری اور چابیاں بھی اس شخص کو مل گئی تھیں۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

''کون ہو تم؟''

''اس سے تمہیں کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔'' اس بار دائیں طرف سے کسی نے کہا۔ حنا نے چونک کر سر گھمایا تو ایسا ہی ایک سیاہ پوش موجود تھا۔ وہ حنا کے پاس آیا اور میز پر ہاتھ رکھتے ہوئے جھک کر بولا۔ ''ہمیں اس کمپیوٹر کا پاس ورڈ چاہیے۔''

''اس کا پاس ورڈ میرے پاس نہیں ہے۔'' حنا نے کسمسا کر کہا۔ وہ اس کے بہت قریب تھا۔ ''تم کون ہو اور اندر کیسے آئے؟''

"یہ سب فضول کے سوال ہیں۔" پہلا سیاہ پوش بولا۔ "لڑکی..... تمہیں اس پر غور کرنا چاہیے کہ تمہاری جان کیسے بچ سکتی ہے۔"

"اگر ہمیں پاس ورڈ نہیں ملا تو تمہاری جان بھی جا سکتی ہے۔"

"میرے پاس پاس ورڈ نہیں ہے۔" حنا نے جواب دیا۔ "کیا میرے بابا کو تم لوگوں نے قتل کیا ہے؟"

"ایسا ہی سمجھ لو..... اور اگر تم نے ہم سے تعاون نہیں کیا تو تم بھی مر سکتی ہو۔ اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ تمہیں کوئی بچا لے گا۔ جیسے ہم تمہیں بے ہوش کر کے یہاں لائے ہیں، اسی طرح تمہاری خادمہ اور گارڈ بھی بے ہوش پڑے ہیں۔"

"تم مکمل طور پر ہمارے رحم و کرم پر ہو۔" دوسرے نقاب پوش نے اسے گھورا۔ نقاب کے پیچھے اس کی سرخ آنکھیں بہت خوفناک لگ رہی تھیں۔ حنا کے اندر ہیجان پیدا ہو رہا تھا۔ اس کے باپ کے قاتل اس کے سامنے کھڑے تھے اور وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اگر وہ کھلی ہوتی تب بھی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ دونوں مسلح اور اس سے کہیں زیادہ طاقتور تھے۔

"کیا سچ مچ میرے بابا اسمگلر تھے؟"

پہلا نقاب پوش ہنسا۔ "تو کیا تم اپنے باپ کو شریف سمجھتی ہو؟ وہ جرائم پیشہ ہی تھا۔"

"یہ جھوٹ ہے، میں کسی صورت نہیں مان سکتی۔" حنا کا لہجہ تیز ہو گیا۔

"مت مانو۔" نقاب پوش نے بے پروائی سے کہا۔ "لیکن تمہیں ہمارا مطالبہ پورا کرنا ہی پڑے گا۔"

"میں بتا چکی ہوں کہ اس کمپیوٹر کا پاس ورڈ میرے پاس نہیں ہے۔" حنا تیز لہجے میں بولی۔ "تم لوگوں کی مرضی جو کرنا ہے کر لو۔"

پہلے نقاب پوش نے کسی قدر نرم لہجے میں کہا۔ "لڑکی..... مجھے تم پر رحم آ رہا ہے۔ بہتر یہی ہو گا کہ تم اس جنجال سے جان چھڑا کر واپس چلی جاؤ اور سب بھول جاؤ۔"

"ابھی تمہیں پاس ورڈ چاہیے تھا اور ابھی تمہیں مجھ پر ترس آنے لگا ہے۔" حنا نے طنز کیا۔

"کیونکہ ان معاملات سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔" نقاب پوش نے کہا اور اچانک ہی جیکٹ کی جیب سے ایک رومال نکال کر اس کے منہ سے لگا دیا۔ حنا تڑپی لیکن اس سے پہلے ہی کلوروفارم کی تیز بو اس کے حواس پر طاری ہو گئی تھی اور چند سیکنڈ میں وہ دوبارہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اگلی بار اس کے حواس بیدار ہوئے تو اسے لگا جیسے کہیں کوئی لکڑی پر ضرب مار رہا ہو۔ صبح ہو چکی تھی اور بارش تھمنے کے بعد بادل بھی چھٹ گئے تھے۔ حنا کے حواس کچھ دیر میں بحال ہوئے تھے اور اس نے سب سے پہلے اپنا معائنہ کیا۔ یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ اس کا لباس ٹھیک تھا اور کسی نے اس کے ساتھ کوئی غلط سلوک نہیں کیا تھا۔ ورنہ رات کو ان نقاب پوشوں کو دیکھ کر اسے اپنی جان سے زیادہ عزت کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ پھر اسے آواز کا خیال آیا اور وہ اٹھی۔ آواز نیچے صدر دروازہ پیٹنے کی تھی۔ وہ خود کو سنبھالتی ہوئی نیچے تک آئی۔ کوئی دروازہ پیٹنے کے ساتھ ساتھ اسے بھی پکار رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو افتخار تیزی سے اندر آیا۔ اس کے پیچھے رات والا گارڈ تھا۔

"حنا! کیا بات ہے، میں اتنی دیر سے دروازہ بجا رہا تھا۔"

"رات کو یہاں کچھ لوگ گھس آئے تھے۔" حنا نے گارڈ کی موجودگی میں زیادہ بولنے سے گریز کیا۔

افتخار نے مڑ کر گارڈ کی طرف دیکھا۔ "تم باہر رکو۔"

گارڈ چلا گیا تو افتخار اور حنا کچن کی طرف آئے جہاں پر صائمہ بے ہوش پڑی تھی۔ حنا نے اسے ہلایا جلایا پھر منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے تو وہ ہوش میں آ گئی۔ اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے بتایا کہ اسے کچھ نہیں معلوم، وہ رات کو سوئی تھی اور ابھی جاگی ہے۔ اس دوران میں یہاں کیا ہوتا رہا، اسے قطعی علم نہیں تھا۔ انہوں نے صائمہ کو کچھ نہیں بتایا۔ افتخار حنا کو لے کر اسٹڈی میں آیا اور اسے کرسی پر بٹھاتے ہوئے پوچھا۔ "حنا! یہاں کیا ہوا تھا؟"

حنا نے رک رک کر اسے بتایا کہ رات کس طرح دو سیاہ پوش اسے بے ہوش کر کے اسٹڈی میں لے آئے تھے اور انہوں نے اس سے کمپیوٹر کا پاس ورڈ پوچھا تھا۔ افتخار یہ سن کر اچھل پڑا کہ انہوں نے بختیار احمد کے قاتل ہونے کا اعتراف کر لیا تھا۔ لیکن حنا کو ان کی اس بات پر یقین نہیں تھا کہ اس کا باپ اسمگلر تھا۔ افتخار ہچکچا کر بولا۔ "جب انہوں نے قاتل ہونے کا اعتراف کر لیا تو ان کی باقی باتیں بھی غلط تو نہیں ہوں گی۔"

حنا نے اسے گھورا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ بابا واقعی میں اسمگلر تھے؟"

افتخار نے گہری سانس لی۔ "یقین تو مجھے بھی نہیں ہے لیکن ان لوگوں نے کیوں کہا؟"

"وہ بکواس کرتے ہیں۔ بابا کے خلاف تھے کسی وجہ سے اور انہوں نے بابا کو دشمنی میں قتل کیا ہے۔ دشمنی میں انسان کسی کی تعریف تو نہیں کرے گا۔" حنا کا لہجہ جارحانہ ہو

گیا۔ "مجھے یقین ہے کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہے۔ شاید کچھ لوگ بابا سے کچھ چاہتے تھے اور جب انہوں نے ان کی بات نہیں مانی تو انہوں نے بابا کو قتل کر دیا۔"

"مثلاً وہ چچا سے کیا چاہتے ہوں گے؟"

"شاید وہ بابا کی زمینوں کو اسمگلنگ کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہوں گے اور بابا کے انکار کے بعد ان کے دشمن بن گئے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ بابا کسی صورت نہیں مان رہے ہیں تو انہوں نے بابا کو قتل کر دیا۔ اب میرے درپے ہیں تاکہ میں ماری جاؤں یا ڈرکر زمین فروخت کر دوں اور وہ اپنا مقصد حاصل کر سکیں۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے افتخار صاحب کہ زمین وہی خرید لیں۔ وہ خود سامنے آئے بغیر کسی اور کے ذریعے بھی زمین خرید سکتے ہیں۔"

"ہاں، یہ ممکن ہے لیکن اگر تم چاہو تو زمین ہم خرید لیتے ہیں۔ اس طرح خاندان کی زمین خاندان میں رہے گی اور کوئی اسے غلط مقصد کے لیے استعمال نہیں کر سکے گا۔"

"میں بھی یہی چاہتی ہوں۔" حنا سوچ کر بولی۔

افتخار خوش ہو گیا۔ "بابا اور چچا منصور مل کر یہ زمین خریدنے کو تیار ہیں۔ تمہیں مارکیٹ سے اچھی قیمت مل جائے گی۔"

"ٹھیک ہے لیکن میں فیصلہ کرنے سے پہلے سوچنا چاہتی ہوں۔ یہ سب مجھے بہت عجیب سا لگ رہا ہے۔"

"کیا عجیب سا لگ رہا ہے؟"

افتخار کے اس سوال کے جواب میں حنا خاموش رہی۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ "اس گھر میں کوئی ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے کچھ لوگ یہاں بار بار گھستے ہیں۔"

افتخار چونکا۔ "کیا مطلب..... وہ تمہیں نقصان پہنچانے نہیں آتے؟"

"تم خود سوچو مجھ پر دو بار حملہ ہوا لیکن مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ دونوں بار حملہ آور ناکام واپس چلے گئے۔ دوسری بار تو انہوں نے مجھے پوری طرح قابو پا کر چھوڑ دیا۔"

افتخار سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے پوچھا۔ "کیا اس گھر میں تمہیں کوئی ایسی چیز ملی ہے جس سے اس چکر کے بارے میں پتا چلتا ہو۔ آخر ان لوگوں کو تم پر کیوں شک ہوا ہے؟"

"میں نہیں جانتی اور مجھے یہاں کوئی ایسی چیز کبھی نہیں ملی ہے۔" حنا نے کہا۔ اس نے افتخار کو ڈائری اور خفیہ دراز کے بارے میں بتانے سے گریز کیا۔ "لیکن مجھے شک ہے کہ یہاں کوئی ایسی چیز ہے۔"

"کمپیوٹر میں؟"

"شاید..... ورنہ بابا اس پر پاس ورڈ لگا کر نہ رکھتے۔" حنا نے سوچ کر کہا۔ "لیکن اگر کمپیوٹر میں کوئی راز کی بات ہے تو وہ لوگ اس کی ہارڈ ڈسک نکال کر لے جا سکتے تھے۔"

افتخار نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔ "ہاں، یہ تو ہے۔ لیکن ممکن ہے چچا نے وہ چیز اس طرح چھپا کر رکھی ہو کہ اس کو تلاش کرنا آسان نہ ہو۔ میں نے سنا ہے کہ کمپیوٹر میں بعض سافٹ ویئر اور فائلیں بھی پاس ورڈ کی مدد سے کھلتی ہیں۔"

"میں اس بارے میں اتنا نہیں جانتی۔" حنا بولی۔ "تم نے بنگلے کے سارے تالے تبدیل کرا دیے لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ پھر اندر پہنچ گئے۔ اس کا مطلب ہے کہ تالے ان کو نہیں روک سکتے۔"

"یہی بات ہے۔ وہ جرائم پیشہ لوگ ہیں اور تالے کھول لینا ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس لیے اب میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں سے چلو۔ میں تمہیں یہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔"

حنا نے سوچا پھر بولی۔ "نہیں افتخار..... میں یہاں رکنا چاہتی ہوں۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے اور بابا کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ سب سے بڑھ کر میں ان کی ذات پر لگا ہوا داغ دھونا چاہتی ہوں۔"

"احمقانہ باتیں مت کرو، تم کسی فلم کی ہیروئن نہیں ہو۔" افتخار نے اسے گھورا۔ "ان معاملات کو پولیس پر چھوڑ دو۔ ہم عام لوگ ہیں، مجرموں سے نہیں لڑ سکتے۔"

"میں جانتی ہوں اور میں بھی کسی سے لڑنا نہیں چاہتی۔" حنا نے آہستہ سے کہا۔ "میں یہاں رک کر پاس ورڈ تلاش کرنا چاہتی ہوں۔ ممکن ہے اس سے یہ معاملہ حل ہو جائے۔ تم بنگلے کی حفاظت کے لیے مزید ایک دو آدمی بھیج دو تو شاید پھر کوئی گھسنے کی ہمت نہ کرے۔"

افتخار کچھ دیر اسے گھورتا رہا پھر اس نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے۔ میں مزید ایک آدمی اور بھیجتا ہوں، وہ بنگلے کے پچھلے حصے کی نگرانی کرے گا۔ شکر ہے کل رات تمہارے ساتھ کوئی مس بی ہیو نہیں ہوا۔"

حنا کا رنگ ذرا دیر کے لیے سرخ ہوا۔ پھر اس نے کہا۔ "مجھے بھی اس بات پر حیرت ہے۔ میں ان کے رحم و کرم پر تھی لیکن انہوں نے مجھے غلط نیت سے دیکھا تک نہیں۔"

افتخار نے پورے بنگلے کا معائنہ کیا لیکن کوئی چیز غائب نہیں تھی اور نہ ہی گھر میں زبردستی گھسنے کے آثار تھے۔ اس نے حنا سے کہا۔ ''پولیس میں رپورٹ کرنی چاہیے۔''

''اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور یہاں کی پولیس کا رویہ تم دیکھ رہے ہو۔'' حنا نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''انہوں نے تو بابا کے قاتل کو تلاش کرنے کی کوشش تک نہیں کی ہے، نہ ہی مجھ پر حملے کو اہمیت دی تھی۔ وہ دوبارہ پلٹ کر نہیں آئے۔''

افتخار نے گہری سانس لی۔ ''لیکن فرض کرو اگر ہم مجرموں کے بارے میں جان جاتے ہیں، تب بھی انہیں پکڑے گی تو پولیس ہی۔''

''وہ دوسری بات ہوگی۔ مجھے مجرموں سے زیادہ بابا کی عزت کی فکر ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ان پر لگا داغ صاف ہو جائے۔''

''میری سمجھ میں تو نہیں آرہا کہ تم یہ کام کس طرح کرو گی۔'' افتخار نے مایوسی سے کہا۔ ''حنا! میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں ان چکروں میں مت پڑو، چھوڑ دو اسے۔''

''تم یہ مشورہ دو گے کیونکہ تمہارے باپ کا معاملہ نہیں ہے۔'' حنا دکھی ہوگئی۔ ''میں نے اپنے باپ کو دیکھا نہیں ہے لیکن میرے دل میں ان کے لیے محبت تو ہے۔''

''ٹھیک ہے، جب تک تم یہاں ہو، اب میں بھی یہیں رہوں گا۔ میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔''

حنا مسکرائی۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے اکیلا نہیں چھوڑو گے۔ اگر تمہاری سپورٹ نہ ہوتی تو شاید میں دوسرے دن یہاں سے واپس چلی جاتی۔''

''کاش، میں نے تمہاری سپورٹ نہ کی ہوتی۔'' افتخار نے سرد آہ بھری۔ ''تم اس خطرے سے دور رہتیں۔ میری اب بھی یہی خواہش ہے کہ تم واپس چلی جاؤ۔''

''خاندان والے اعتراض نہیں کریں گے کہ تم میرے ساتھ رک رہے ہو؟''

افتخار نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''ان کو کیوں اعتراض ہونے لگا؟ تم بھی تو میری کزن ہو۔''

''لیکن کچھ لوگوں کو ضرور اعتراض ہوگا۔'' حنا مسکرائی۔

''اگر کسی کو اعتراض ہوگا بھی تو مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔'' افتخار نے کہا اور کھڑا ہوگیا۔ ''اب میں جاتا ہوں، اس واقعے کی پولیس رپورٹ بھی کرنی ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے لیکن ایک بات ریکارڈ پر آجائے تو برا بھی نہیں ہے۔''

''میں جا کر دوسرے دو بندے بھیجتا ہوں۔ اب یہاں کی باقاعدہ نگرانی ہوگی۔'' افتخار نے کہا اور چلا گیا۔

صائمہ ناشتا بنا رہی تھی۔ حنا کچن میں آئی تو اس نے ندامت سے کہا۔ ''پتا نہیں بی بی میری اتنی آنکھ کیسے لگ گئی ورنہ صبح ہوتے ہی میری آنکھ خود کھل جاتی ہے۔''

''ہو جاتا ہے..... تم ناشتا اوپر لا دینا۔'' حنا نے کہا۔

جب تک ناشتا آتا، اس نے ہاتھ لیا اور کپڑے تبدیل کیے۔ موسم ایک بار پھر سرمئی ہو رہا تھا۔ اگرچہ بادل گھنے نہیں تھے لیکن بارش کا امکان لگ رہا تھا۔ کچھ دیر میں افتخار کے بھیجے ہوئے دو مسلح گارڈ آگئے اور انہوں نے بنگلے کے آگے پیچھے کی نگرانی شروع کر دی۔ ناشتا کر کے حنا اسٹڈی میں آئی۔ اس کا خیال تھا کہ جو کچھ تھا، اسٹڈی میں ہی تھا۔ اس نے اندر سے دروازہ بند کر کے اپنا کام شروع کیا۔ اس نے سب سے پہلے کتابوں کی الماریاں کھول کر دیکھنا شروع کیں۔ ان کی چابیاں اسے میز کی دوسری دراز میں مل گئی تھیں۔

حنا نے ایک الماری کا لاک کھولا اور اس میں رکھی کتابوں کو نکال کر پیچھے دیکھنے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر کوئی چیز چھپی ہوگی تو وہ کتابوں کے پیچھے ہو سکتی تھی۔ پھر ایک کتاب ہٹانے پر اسے عقب میں الماری کی لکڑی کی جگہ کوئی دھاتی چادر دکھائی دی۔ اس نے مزید کتابیں نکالیں۔ جگہ بنتے ہی الماری کے اندر بنا ہوا خفیہ لاکر سامنے آگیا۔ اس کے ہینڈل کے ساتھ تین عدد تالوں کے سوراخ تھے۔ لاکر کو دیکھتے ہی حنا کو ان تین چابیوں کا خیال آیا جو خفیہ دراز میں موجود تھیں۔ یہ یقیناً اسی لاکر کی چابیاں تھیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ لاکر کھولنے کا سوچتی، کسی نے اسٹڈی کا دروازہ بجایا۔ حنا نے تیزی سے کتابیں واپس رکھیں اور الماری لاک کر کے اس کی چابیاں بھی میز کی دراز میں ڈال دیں اور پھر دروازے تک آئی۔

''کون ہے؟''

''افتخار۔'' باہر سے آواز آئی تو حنا نے دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر آیا۔

''خیریت..... تم دروازہ بند کر کے بیٹھی تھیں؟''

''میں کمپیوٹر کا پاس ورڈ لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔'' حنا نے سوچ کر کہا تو افتخار کمپیوٹر کی طرف گیا۔

''یہ تو بند ہے۔''

''ہاں، میں نے بند کر دیا۔'' حنا بولی۔ ''تم جلدی آگئے .... پولیس میں رپورٹ نہیں کرائی؟''

''میرے ساتھ مقامی تھانے کا ایس ایچ او آیا ہے۔''

افتخار نے کہا۔ ''وہ تمہارا بیان لے کر رپورٹ لکھے گا۔''

ایس ایچ او صورت سے ہی دیہاتی اور مخصوص ذہنیت کا آدمی لگتا تھا۔ اس نے روایتی سوالات کیے اور یوں مشکوک نظروں سے حنا کو دیکھتا رہا جیسے اس نے کوئی جرم کیا ہو۔ وہ سوالات کر کے اور اپنی کاپی کا پیٹ بھر کر رخصت ہو گیا۔ حنا نے اس کے جانے کے بعد افتخار سے کہا۔ ''یہ تم کس احمق کو اٹھا لائے تھے۔ یہ ان لوگوں کو تلاش نہیں کر سکتا۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' افتخار نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''یہاں کی پولیس اسی قسم کے نمونوں پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ کچھ نہیں کر سکتے سوائے لوگوں کی مرمت لگانے اور ان کی کھال اتارنے کے۔ بہرحال، میں آگیا ہوں۔ اب میں یہیں رہوں گا۔''

''تمہاری وجہ سے مجھے اطمینان رہے گا۔'' حنا نے کہا اور پھر ہچکچا کر بولی۔ ''تم سو گے کہاں؟''

''میں نشست گاہ میں رہوں گا۔'' اس نے جواب دیا تو حنا نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ اسے یہ سوچ کر عجیب سا لگ رہا تھا کہ افتخار اوپر ساتھ والے بیڈروم میں رکے گا۔ بے شک وہ خود اعتماد لڑکی تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ دوسروں کی سوچ سے بالکل بے نیاز ہو جاتی۔ اسے اندازہ تھا کہ اگر افتخار اوپر رکا تو صائمہ یا دوسرے ملازم اس بارے میں کچھ نہ کچھ سوچیں گے۔ حنا نے کہا۔

''یہ ٹھیک ہے۔''

افتخار نے غور سے اسے دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ ''مجھے تمہاری عزت کا تم سے بھی زیادہ خیال ہے۔ تم فکر مت کرو۔''

حنا جھینپ گئی۔ ''یہ بات نہیں ہے لیکن انسان کسی کی سوچ تو نہیں پکڑ سکتا۔''

''خیر چھوڑو اس بات کو..... تین دن بعد نیو ائیر ہے۔ کیا خیال ہے، کہیں باہر چلیں؟''

''یہاں کیا ہے؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''یہاں سب کچھ ہے، بس شاہ پور سے ذرا باہر جانا ہوگا۔ ہائی وے پر کئی اچھے ہوٹلز اور تفریح گاہیں ہیں۔''

''میں چلوں گی۔'' حنا خوش ہوگئی۔

''بس تو ہم نیو ایئر نائٹ کو چلیں گے۔'' افتخار بھی خوش ہوگیا۔ ''ایک بہت اچھی جگہ ہے۔''

''نیو ایئر نائٹ۔'' حنا ہچکچائی۔ ''وہ دراصل..... میں کبھی اس طرح رات کو باہر نہیں گئی ہوں۔''

''کم آن۔'' افتخار نے کہا۔ ''ہم کزن ہیں، کوئی غیر تو نہیں ہیں۔''

''لیکن دوسرے تو مجھے اپنا سمجھنے کو تیار نہیں ہیں۔'' حنا نے تلخی سے کہا۔

''مجھ سے کسی دوسرے کی بات مت کرو۔'' افتخار نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''تم جانتی ہو، میں تمہیں دل سے اپنا سمجھتا ہوں۔''

حنا نے بے اختیار نظریں جھکا لیں، اس کا دل ذرا مختلف انداز میں دھڑک رہا تھا۔ ''میں..... جانتی ہوں۔''

''بس تو پھر کسی اور کی پروا مت کرو۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟ وہ میرے سگے ہیں۔ میرے چچا، پھوپی اور کزن۔'' حنا نے روہانسے لہجے میں کہا۔ ''اگر وہ مجھ سے یوں بیزار ہوں گے تو مجھے دکھ ہوگا۔ ان سے میرا خون کا رشتہ ہے۔''

''فکر مت کرو، یہ خون ہی رنگ لائے گا اور آہستہ آہستہ وہ بھی تم سے محبت کرنے لگیں گے۔'' افتخار کا لہجہ معنی خیز ہو گیا جیسے کہنا چاہ رہا ہو کہ کوئی پہلے ہی حنا سے محبت کرنے لگا ہے۔ اس نے جلدی سے موضوع بدل دیا۔

''تم یہاں کیا کرتے ہو؟''

''میں زمینوں کی دیکھ بھال اور دیگر کاموں کی نگرانی کرتا ہوں۔'' افتخار نے بتایا۔ ''جہانزیب فروخت کے معاملات دیکھتا ہے۔ حساب کتاب عاشر اور عظیم دیکھتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی لگا بندھا کام نہیں ہے۔ یوں سمجھ لو کہ فیملی بزنس ہے۔ سب مل جل کر کام کرتے ہیں۔ ہمارے اپنے ٹرک ہیں اور اپنی پیداوار ہم براہ راست شہر میں فروخت کرتے ہیں۔ جب فصل نہیں ہوتی تو یہ ٹرک کرائے پر چلتے ہیں، یہ بھی ایک بزنس ہے۔ آنے والے دنوں میں شاید ہم ایک جننگ فیکٹری بھی لگا سکتے ہیں۔''

''یعنی بزنس بڑھ رہا ہے۔'' حنا مسکرائی۔

''چچا نے تمہارے لیے بھی کوئی نہ کوئی بندوبست کیا ہوگا؟''

حنا نے سر ہلایا۔ ''ہاں، انہوں نے میرے نام سے ایک چھوٹی کوٹھی لی تھی اور میرے ہی نام سے بینک اکاؤنٹ کھلوا کر اس میں رقم جمع کرائی تھی۔ لیکن کبھی اسے استعمال کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ماما کالج میں پڑھاتی ہیں اور ان کی تنخواہ ہمارے لیے کافی ہوتی ہے۔ ہم سادہ زندگی گزارنے کے عادی ہیں اس لیے کام چل جاتا ہے۔ ویسے سہولتیں تمام موجود ہیں۔''

''تمہارے رشتے کی کہیں بات ہوئی ہے؟''

حنا جھینپ گئی۔ ''نہیں، ابھی تو میں پڑھ رہی ہوں۔ آگے ماسٹر کرنا ہے، اس کے بعد ہی ایسی کوئی بات ہوگی۔''

''کیا کرو گی آگے پڑھ کر..... اس کے بعد بھی تو شادی کرنی ہے۔''

''ہاں تو میں تعلیم اپنے لیے حاصل کر رہی ہوں ملازمت کے لیے نہیں ..... اور تعلیم ویسے بھی شخصیت بنانے کے لیے ہوتی ہے۔ آدمی کی ذہنی سطح اس کی تعلیم کے لیے لحاظ سے ہوتی ہے۔''

''تم میری ذہنی سطح میں کوئی کمی دیکھتی ہو؟'' افتخار نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں نے گریجویشن کیا ہے۔''

''سچی بات یہ ہے کہ میں تمہارے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتی۔'' حنا نے صاف گوئی سے کہا۔ ''ماما کہتی ہیں کہ جب تک آدمی کے ساتھ کوئی ڈیل نہ ہو، آپ اس کی اصل شخصیت کے بارے میں نہیں جان سکتے۔''

''یہ غیروں کے لیے کہا جاتا ہے، اپنوں کے لیے نہیں۔''

''ہوسکتا ہے لیکن میں نے تمہیں ابھی تک پرکھا نہیں ہے کوئی ایسا موقع آئے جب تمہیں صبر و برداشت کی منزل سے گزرنا پڑے، تب ہی تمہاری اصل شخصیت کھل کر سامنے آئے گی۔''

افتخار خاموش ہوگیا پھر بولا۔ ''آج کھانے میں کیا ہے؟''

''میں دیکھتی ہوں صائمہ کیا بنا رہی ہے۔ ویسے اگر تمہیں کچھ پسند ہے تو بتا دو۔''

''کچھ خاص نہیں، میں سب کھا لیتا ہوں۔'' افتخار نے کہا۔

حنا کچن میں آئی جہاں صائمہ دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔ اسے ہدایت دے کر حنا نے چائے بنائی اور واپس نشست گاہ میں آگئی۔ اس نے افتخار کو کپ دیتے ہوئے کہا۔ ''دن میں تم اپنے کاموں میں مصروف رہا کرو گے؟''

''ان دنوں کوئی مصروفیت نہیں ہے۔ گندم کی فصل لگی ہے۔ اس پر کوئی کام نہیں ہے۔ ایک آدھ گھنٹے کے لیے بس چکر لگا لیتا ہوں تاکہ کام کرنے والے بھی ہوشیار رہیں۔''

حنا خفیہ لاکر کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ اسے افتخار یا کسی کے سامنے نہیں کھولنا چاہتی تھی۔ اگر افتخار مسلسل یہاں موجود رہتا تو وہ اس سے چھپ کر کام نہیں کر سکتی تھی۔ ایسی بات بھی نہیں تھی کہ اسے افتخار پر اعتماد نہیں تھا ورنہ وہ یہاں کیسے رہتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ لاکر میں اگر اس کے باپ کے متعلق کوئی ایسی چیز تھی جس سے اس کی شخصیت داغ دار ہو جائے تو وہ سوائے اس کے اور کسی کو معلوم نہ ہو۔ دوپہر کے کھانے کے بعد بھی افتخار وہیں براجمان رہا۔ پھر اس نے حنا سے کہا کہ وہ جا کر آرام کرے لیکن وہ نہیں گئی۔ شاید اسے ڈر تھا کہ اس کے جانے کے بعد افتخار اسٹڈی میں جائے گا اور اگر اس نے اتفاق سے بھی خفیہ دراز یا لاکر دیکھ لیا تو بات بگڑ جائے گی پھر اسے سب بتانا پڑے گا۔ حنا کو دوپہر میں سونے کی عادت نہیں تھی۔ گھر میں بھی کالج سے آنے کے بعد وہ اس طرح آرام کرتی تھی کہ کوئی کتاب یا رسالہ پڑھ لیا یا پھر ٹی وی دیکھ لیا۔ البتہ رات کو اسے جلد سونے کی عادت تھی۔ حنا، افتخار کے ساتھ ہی بیٹھی رہی پھر وہ شام کو کچھ دیر کے لیے گارڈز کو دیکھنے باہر گیا۔ حنا نے موقع پا کر اسٹڈی لاک کر دی۔

آنے والے تین دنوں میں اسے موقع ہی نہیں ملا کہ وہ لاکر کھول کر دیکھ سکتی۔ صرف ایک بار افتخار کچھ دیر کے لیے بنگلے سے دور گیا تھا لیکن اس وقت صائمہ صفائی میں مصروف تھی۔ جب تک وہ صفائی سے فارغ ہوتی، افتخار واپس آگیا تھا اور وہ دل مسوس کر رہ گئی۔

سال کا آخری دن آگیا۔ افتخار نے پہلے ہی پروگرام بنا لیا تھا۔ وہ اس دن صبح سویرے نکل گیا۔ حنا سو رہی تھی اور پھر جب وہ اٹھ کر ناشتے کے لیے نیچے آئی تو کچھ دیر بعد افتخار آگیا۔ تب حنا کو پتا چلا کہ وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ ''تم کہاں گئے تھے؟''

''ایک ضروری کام سے گیا تھا۔'' افتخار نے ایک بڑا سا شاپر اٹھا رکھا تھا۔ ''تم ناشتا کر لو پھر تمہیں بتاتا ہوں۔''

حنا کو تجسس ہو رہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی ناشتا کیا۔ تین دن میں وہ افتخار سے بہت قریب ہوگئی تھی۔ صبح سے شام تک ساتھ رہنے کا یہ فطری نتیجہ تھا۔ ان تین دنوں میں وہ باہر بھی گئے اور آس پاس کی سڑکوں پر ڈرائیونگ بھی کرتے رہے تھے۔ ناشتا کر کے افتخار ان تین دنوں میں پہلی بار اس کے ساتھ اوپر اس کے بیڈروم تک آیا۔ پھر اس نے شاپر سے ایک ڈبا نکالا اور اس میں سے ایک بہت خوب صورت میکسی نما لباس نکال کر حنا کے سامنے کیا۔ اس پر باریک موتیوں کا کام ہوا تھا۔ آف وائٹ کلر پر یہ کام بہت اٹھر رہا تھا۔ حنا سحر زدہ رہ گئی۔ ہر لڑکی کی طرح اسے بھی اچھے لباس کا بہت شوق تھا۔

''کیسا ہے؟'' افتخار نے پوچھا۔

''بہت خوب صورت۔'' حنا نے بے ساختہ کہا۔

''یہ میں تمہارے لیے لایا ہوں۔'' افتخار نے کہا۔

''میرا خیال ہے، بالکل تمہارے ناپ کا ہے۔''

''شکریہ۔'' وہ خوش ہوگئی۔

''شکریہ بعد میں ادا کرنا۔'' افتخار نے اس بار سینڈل نکالے۔ یہ بھی سوٹ سے میچ کرتے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی پرس اور مصنوعی جیولری سیٹ تھا۔ اس نے چیزیں بستر پر سجاتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب آج رات کے لیے ہے جب ہم باہر جائیں گے۔''

''تم تو بہت کچھ لے آئے ہو۔'' حنا ہچکچائی۔ ''یہ اچھی بات نہیں ہے۔''

''بالکل اچھی بات ہے۔'' افتخار نے جلدی سے کہا۔ ''تم میری کزن ہو اور میں تو سب کو تحفے دیتا ہوں۔''

''تو یہ تحفے ہیں؟''

''میری طرف سے نیو ایئر کا گفٹ سمجھو۔'' افتخار نے کہا۔ ''چھ بجے تک تیار ہو جانا۔''

''میں تیار ہوں گی لیکن ہمیں جانا کہاں ہے؟''

''ذرا دور جانا ہوگا۔ یہاں سے کوئی پچاس کلومیٹرز دور ہائی وے پر ایک بہت اچھی تفریح گاہ ہے۔ وہاں نیو ایئر نائٹ کا پروگرام بھی ہے۔''

''شہر سے دور اس علاقے میں؟'' حنا نے حیرت سے کہا۔

افتخار مسکرایا۔ ''تم کیا سمجھتی ہو، تفریح کے معاملے میں اب دیہات بھی پیچھے نہیں ہیں۔ میں تمہیں دکھاؤں گا۔ آنے جانے میں کچھ وقت لگتا ہے لیکن مزہ آئے گا۔''

تفریح گاہ دیکھ کر سچ مچ حنا کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس میں ہوٹل بھی تھا۔ ریستوران بھی اور شاپنگ ایریا بھی تھا جہاں نیو ایئر نائٹ کی مناسبت سے مختلف چیزوں کے اسٹالز لگے ہوئے تھے۔ نوجوان جوڑے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گھوم رہے تھے اور وہ سب اوپری طبقے کے لگ رہے تھے۔ افتخار نے اسے بتایا۔ ''یہاں موجود ہر شخص کم سے کم کروڑ پتی ضرور ہے۔''

انہیں اس تفریح گاہ تک پہنچنے میں کوئی ڈیڑھ گھنٹا لگا تھا۔ وہ ریستوران والے حصے کی طرف چلے آئے۔ ابھی ڈنر کا موڈ نہیں تھا، اس لیے انہوں نے سوپ لیا۔ اس کے بعد افتخار نے حنا سے کہا۔ ''آؤ اسٹالز دیکھتے ہیں۔''

وہ اسٹالز والے حصے میں آئے۔ یہاں زیادہ تر لڑکیاں کھڑی تھیں اور وہ حلیے اور انداز سے شہر کی لگ رہی تھیں۔ افتخار نے تصدیق کی۔ ''یہ لڑکیاں شہروں سے آتی

ہیں کیونکہ یہاں شوقین مزاج رئیس صرف ان کو دیکھ کر اسٹال سے منہ مانگے داموں خریداری کر لیتے ہیں۔'' حنا چیزیں دیکھنے لگی۔ اسے دھات کا بنا ہوا ایک دو ہزار بارہ کے عدد پر مشتمل لاکٹ پسند آیا۔ اس کے ساتھ مچھلی پکڑنے والی ٹرانسپیرنٹ ڈوری لگی تھی۔ حنا نے اسٹال پر موجود لڑکی سے پوچھا لاکٹ کتنے کا ہے؟

''صرف ایک ہزار کا۔''

حنا کو حیرت ہوئی کہ اتنی معمولی سی چیز ایک ہزار کی لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، افتخار نے پرس نکال کر ادائیگی کر دی اور لاکٹ اٹھا لیا۔ حنا نے کہا۔ ''یہ بہت مہنگا ہے۔''

''اگر تمہیں پسند ہے تو اس کی یہ بہت ہی معمولی سی قیمت ہے۔'' افتخار نے کہا اور لاکٹ اس کی گردن تک بڑھایا۔ اس کا مطلب سمجھ کر حنا نے دوپٹا سرکا دیا اور بالوں کو ایک طرف کیا۔ افتخار نے لاکٹ کی ڈوری پیچھے سے باندھ دی۔ وہاں دیکھنے والے بہت سارے تھے اس لیے حنا کو عجیب سا لگ رہا تھا اور شرم بھی آ رہی تھی لیکن اچھا بھی لگ رہا تھا۔ وہ دوسرے اسٹالوں پر گھومنے لگے۔ انہوں نے کچھ چیزیں اور بھی خریدیں۔ پھر وہ ریستوران میں آئے۔ نو بج رہے تھے، انہوں نے کھانا آرڈر کیا۔ کھانے کے بعد وہ باہر نکل آئے اور تفریح گاہ میں موجود چھوٹی سی جھیل کے ساتھ چہل قدمی کرنے لگے۔ سردی شدت کی تھی اور جھیل سے بھاپ اٹھ رہی تھی لیکن وہ اس سے بھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔

''تمہارا کیا خیال ہے، بابا کے پیچھے پڑنے والے کون ہو سکتے ہیں؟''

''شاید ان کے وہ ساتھی جن سے ان کی کسی بات پر لڑائی ہو گئی ہو اور وہ ان کے درپے ہو گئے ہوں۔''

حنا نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ''یعنی تمہارے خیال میں بابا اسمگلر ہی تھے؟''

''تب تم بتاؤ، اس کے سوا اور کیا بات ہو سکتی ہے؟''

''میرا خیال اس کے برعکس ہے۔ وہ جو بھی ہیں، بابا یا ان کی زمینوں کو غلط کام کے لیے استعمال کرنا چاہ رہے تھے اور جب بابا نے ان کی بات نہیں مانی تو انہیں راستے سے ہٹا دیا۔''

افتخار نے سر ہلایا۔ ''ایسا بھی ہو سکتا ہے۔''

''تب تم نے ایسا ہی کیوں نہیں سوچا؟''

افتخار کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''آئی ایم سوری۔''

وہ ٹہلتے رہے۔ بارہ بجے کا وقت ہو رہا تھا۔ تفریح گاہ کی تمام روشنیاں بند کر دی گئیں۔ بارہ کا گجر بجنے لگا۔ بارھویں ضرب کے ساتھ ہی آسمان پر آتش بازی چھوٹنے لگی اور ماحول رنگوں اور روشنیوں سے بھر گیا۔ یہ سب بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ وہ رات دو بجے کے قریب واپس گھر پہنچے۔ حنا تھک گئی تھی لیکن بہت خوش تھی۔ خلافِ توقع افتخار نے اس سے کہا۔ ''میں آج یہاں نہیں رکوں گا، حویلی جا رہا ہوں۔ دونوں گارڈز یہاں ہوں گے۔''

حنا کو فوراً خیال آیا کہ یہ موقع اچھا ہے۔ وہ آج رات لاکر دیکھ سکے گی۔ افتخار کچھ دیر کے لیے اندر آیا اور دروازے سے رخصت ہو گیا۔ صائمہ سو چکی تھی۔ حنا پہلے اوپر آئی اور اس نے لباس تبدیل کیا۔ اس دوران میں افتخار کی جیپ واپس چلی گئی۔ پھر نیچے آئی اور اس نے اسٹڈی کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ کھڑکیوں کے پردے برابر کر کے صرف ایک لائٹ روشن کی اور خفیہ دراز سے چابیاں نکالیں۔ اس کے بعد لاکر والی الماری سے کتابیں نکالیں۔ لاکر ذرا بلندی پر تھا۔ وہ کرسی اس کے پاس لائی۔ اس نے لاکر کا معائنہ کیا۔ تالوں کے سوراخ پر کسی قسم کا نشان نہیں تھا۔ اسی طرح چابیوں پر بھی کوئی نمبر نہیں تھا۔ اس نے تینوں چابیاں الگ کیں اور ان میں سے ایک پہلے سوراخ میں ڈالنا چاہی لیکن وہ اندر نہیں گئی۔ دوسری چلی گئی، اسی طرح باقی دو چابیاں بھی اپنے اپنے تالوں کے سوراخ میں چلی گئیں۔ پھر اس نے پہلا تالا کھولا اور اس کے بعد باقی دو بھی کھول کر اس نے لاکر کھولا۔ اس کے اندر صرف ایک سیاہ جلد والی درمیانے سائز کی ڈائری تھی۔ 'ایک اور ڈائری۔' اس نے سوچا۔ اس نے ڈائری اٹھالی اور اسے کھولنا چاہا تھا کہ کسی نے عقب سے سرگوشی میں کہا۔

''اسے مت کھولنا۔''

حنا کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور وہ کرسی سے گرتے گرتے بچی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو اسے ایک نوجوان میز کے پاس نظر آیا۔ اس نے سردی کی مناسبت سے لیدر جیکٹ اور موٹے کپڑے کی پتلون پہن رکھی تھی۔

''تت.... تم کون ہو؟'' حنا بولی اور کرسی سے نیچے اتر آئی۔ ''اندر کیسے آئے؟''

''ڈرو مت.... میں تمہیں نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔'' نوجوان نے کہا۔ وہ کلین شیو تھا اور حنا کو اس کا چہرہ جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ ''میں اندر کیسے آیا، یہ تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔

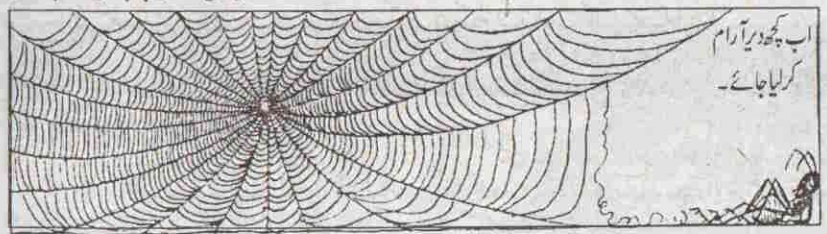

ابھی تم مہربانی کر کے یہ ڈائری میرے حوالے کر دو اور یہاں خاموش بیٹھ جاؤ۔ لیکن اس سے پہلے لاکر سے چابیاں نکال کر الماری بند کر دو۔'' نوجوان نے کہتے ہوئے ایک عدد پستول نکال لیا تھا اس لیے مجبوراً حنا کو وہی کرنا پڑا جو وہ کہہ رہا تھا۔ اس نے الماری بند کی اور کرسی بھی اپنی جگہ رکھ دی۔ پھر ڈائری نوجوان کی طرف بڑھا دی۔ وہ ڈائری لے کر ذرا پیچھے ہوا اور اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''اب کمپیوٹر آن کرو اور پاس ورڈ لگانے کی کوشش کرو۔''

حنا نے اسے گھورا۔ ''تو تم ان لوگوں میں سے ہو؟''

''کن لوگوں میں سے.... میں جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔'' اس نے پستول کو جنبش دی تو حنا کو ایک بار پھر حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔ وہ کمپیوٹر کے سامنے آ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ نوجوان کہاں سے اندر آیا اور اس سے یہ کام کیوں لے رہا ہے۔ نوجوان اس کی پشت کی طرف آ گیا تھا۔ اس نے حنا سے کہا۔ ''اپنا کام جاری رکھو.... پاس ورڈ لگانے کی کوشش کرو۔ اگر یہ کمپیوٹر آن نہیں ہوا تو....''

''تم یہاں سے نکل نہیں سکو گے۔'' حنا نے دل کڑا کر کے کہا۔ ''باہر دو مسلح گارڈز موجود ہیں۔''

''تم ان کی فکر مت کرو۔ میں ان کی موجودگی میں ہی یہاں آیا ہوں۔''

حنا سوچنے لگی کہ یہ نقاب میں کیوں نہیں ہے اور اسے جانا پہچانا کیوں لگ رہا ہے۔ ساتھ ہی وہ پاس ورڈ کی بار میں الٹے سیدھے پاس ورڈ انٹر کر رہی تھی اور ہر بار پاس ورڈ مسترد ہو جاتا تھا۔ وہ سوچوں میں اتنی گم ہوئی کہ اسے نوجوان کا خیال بھی نہیں رہا۔ اچانک ہی ہنگلے کی کال بیل بجی۔ وہ چونکی اور اس نے مڑ کر نوجوان کی طرف دیکھنا چاہا لیکن وہ وہاں نہیں تھا۔ وہ اسٹڈی میں کہیں بھی نہیں تھا۔ حنا کو لگا جیسے وہ سو رہی ہے اور کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ کال بیل دوبارہ بجی تو وہ چونکی۔ اس نے جلدی سے کمپیوٹر بند کیا اور اٹھ کر باہر کی طرف بڑھی۔ اسے ڈر تھا کہ شاید کہیں وہ نوجوان باہر نہ موجود ہو۔ صائمہ کچن میں بدستور سو رہی تھی۔ اسے تعجب ہوا کہ کال بیل کی آواز بھی اسے نہیں جگا سکی تھی۔ تیسری بار بیل بجانے والے نے بٹن پر انگلی رکھ دی۔ حنا دروازے کے پاس آئی اور کیٹ آئی سے باہر جھانکا تو اسے افتخار اور منصور احمد باہر موجود نظر آئے۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ اس کی صورت دیکھ کر افتخار کھٹک گیا۔

''حنا! کیا ہوا.... دروازہ کیوں نہیں کھول رہی تھیں؟''

''وہ.... اسٹڈی میں ایک آدمی آ گیا تھا۔''

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی افتخار تیزی سے اندر بھاگا۔ حنا اور منصور احمد اس کے پیچھے آئے۔ منصور احمد نے اندر آ کر دروازہ بند کر دیا تھا۔ افتخار اسٹڈی کے دروازے پر تھا۔ ''یہاں تو کوئی نہیں ہے۔''

''ہاں جس وقت کال بیل بجی، وہ یہاں نہیں تھا۔ اس سے پہلے وہ میرے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ مجھے کمپیوٹر پر پاس ورڈ لگانے پر مجبور کر رہا تھا۔''

''پاس ورڈ۔'' منصور احمد نے معنی خیز نظروں سے افتخار کی طرف دیکھا۔ ''وہ آیا کہاں سے تھا؟''

''میں بالکل نہیں جانتی۔ میں اسٹڈی میں تھی جب میں نے اسے اچانک ہی یہاں موجود پایا۔''

''لڑکی..... تم صحیح نہیں بتا رہی ہو۔'' منصور احمد کا لہجہ اچانک ہی سخت ہو گیا۔ ''سچ بات کہو۔''

''چچا جان....'' افتخار نے کہنا چاہا۔

''تم چپ رہو برخوردار۔'' منصور احمد نے کہا اور حنا کو گھورا۔ ''تم جھوٹ بول رہی ہو۔ میرا خیال ہے کہ تم اس شخص کو جانتی ہو اور یہ بھی جانتی ہو کہ وہ یہاں کیوں آیا ہو گا۔''

''آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں۔'' حنا نے تیز لہجے میں کہا۔

''چچا جان! مجھے اس سے بات کرنے دیں۔'' افتخار بولا۔ ''حنا! یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص اسٹڈی میں آ جائے اور تمہیں پتا ہی نہیں چلے۔''

''میں قسم کھا کر کہتی ہوں۔'' حنا نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

''تم اس وقت اسٹڈی میں کیا کر رہی تھیں؟'' افتخار نے اچانک ہی سوال کیا تو حنا گڑبڑا گئی۔

''وہ میں..... کوئی کتاب دیکھنے آئی تھی۔''

''افتخار! یہ جھوٹ کہہ رہی ہے۔'' منصور احمد نے پھر خراب لہجے میں کہا۔ ''یہ اس طرح نہیں مانے گی۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔''

افتخار نے گہری سانس لی اور حنا سے کہا۔ ''دیکھو اگر تم کچھ جانتی ہو تو بتا دو ورنہ میں مجبور ہو جاؤں گا۔''

''میں کیا جانتی ہوں اور تم کس بات سے مجبور ہو جاؤ گے؟'' حنا نے اسے اور منصور احمد کو دیکھا۔ ''افتخار! تم اور چچا جان مجھے بدلے ہوئے لگ رہے ہو۔''

''تم نے ٹھیک پہچانا لڑکی۔'' منصور احمد نے کہتے ہوئے اپنی جیب سے ویسا ہی سنہری پستول نکال لیا جیسا کہ میز کی خفیہ دراز میں رکھا تھا اور حنا نے چند دن پہلے آنے والے نقاب پوشوں کے پاس دیکھا تھا۔ حنا کی نظر اس پستول پر جم کر رہ گئی تھی۔ منصور احمد نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم نے اسے پہچان لیا ہوگا۔''

حنا نے گہری سانس لی۔ وہ اپنے اندر گہری افسردگی محسوس کر رہی تھی۔ ''تو وہ آپ دونوں تھے؟''

''ہاں۔''

''آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''

''اس کمپیوٹر کا پاس ورڈ۔''

''وہ میرے پاس نہیں ہے۔'' حنا نے کہا۔ ''ویسے آپ کو پاس ورڈ کیوں چاہیے؟''

''سوال مت کرو۔'' منصور احمد کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ''اس کا پاس ورڈ لگاؤ۔ اس کام کے لیے تمہارے پاس صرف دو منٹ ہیں۔ چلو یہاں آ جاؤ۔''

حنا کمپیوٹر کے سامنے کرسی پر آ گئی۔ اس نے کمپیوٹر آن کیا اور بولی۔ ''کیا بابا کو آپ نے قتل کیا ہے؟''

''لڑکی..... بکواس کرنے کے بجائے جو کہا ہے، وہ کرو۔'' اس بار منصور احمد کا لہجہ پھاڑ کھانے والا تھا۔ ''اگر تم نے پاس ورڈ نہیں بتایا تو اپنے باپ کے پاس ہی پہنچ جاؤ گی۔''

حنا اس کے انداز پر دہل گئی۔ اس وقت وہ لہجے اور تاثرات سے نرم نظر آنے والا منصور احمد لگ ہی نہیں رہا تھا۔ افتخار ایک طرف خاموش کھڑا تھا۔ حنا نے روہانسے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''افتخار! یہ سب کیا ہے؟''

''تم سے جو کہا جا رہا ہے وہ کرو۔'' اس بار افتخار کا لہجہ بھی سرد تھا۔ ''تمہارے اور ہمارے پاس وقت کم رہ گیا ہے۔''

''میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ اس جگہ کو تباہ کر دو۔ اگر ہمارے خلاف کوئی ثبوت ہے تو وہ ضائع ہو جائے گا۔'' منصور احمد نے ناگواری سے کہا۔

''اس سے سرحدی محافظ متوجہ ہو جاتے۔'' افتخار نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''ہمیں بعد میں اس جگہ کام کرنا ہے۔ ایسا کوئی واقعہ پیش آتا تو یہ جگہ مشکوک ہو جاتی۔ بہرحال، اس بحث میں پڑنے کے بجائے ہمیں کام پر توجہ دینی چاہیے۔''

ان کی گفتگو کے دوران حنا غیر محسوس انداز میں ہاتھ دراز کی طرف لے جا رہی تھی۔ اس نے دراز کا نٹو پکڑ کر اس کا مخصوص حصہ دبایا جو دراز کے نیچے لگی ٹرے کو الگ کرتا تھا۔ اچانک منصور احمد کی نظر اس کی طرف گئی۔ ''یہ کیا کر رہی ہو؟'' اس نے جھپٹ کر حنا کا ہاتھ پکڑ لیا اور افتخار سے کہا۔ ''دراز کی تلاشی لو، اس میں کوئی ہتھیار نہ ہو۔''

''یہاں کوئی ہتھیار نہیں ہے۔'' افتخار نے دراز کھولی اور اس کی تلاشی لی۔ ''کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔ آپ بلاوجہ بھڑک رہے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے افتخار نے دراز بند کی تو نیچے والی ٹرے باہر رہ گئی اور ان دونوں کی نظریں اس میں موجود سنہری پستول، پاکٹ سائز ڈائری اور چابیوں پر جم گئی۔ پھر منصور احمد نے حنا کو بالوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ ''تو تم یہ چالاکی کر رہی تھیں۔''

حنا رونے لگی۔ ''پلیز..... پلیز۔''

اس بار افتخار کا موڈ بھی بدل گیا تھا۔ خفیہ ٹرے کی دریافت سے ثابت ہو گیا تھا کہ حنا اس سے یہ بات چھپاتی آئی تھی۔ اس نے چابیاں اٹھا کر حنا کے سامنے کیں۔ ''یہ چابیاں کس چیز کی ہیں؟''

منصور احمد نے اسے گھما کر قالین پر پھینک دیا۔ حنا کی چیخ نکل گئی۔ ''یہ اس طرح نہیں مانے گی۔ چاقو سے اس کے ناک کان کاٹ دو۔'' منصور احمد نے سفاک لہجے میں کہا اور جب افتخار نے جیب سے چاقو نکالا تو حنا زبان بند نہیں رکھ سکی۔ اس نے بتا دیا کہ چابی کہاں کی ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ لاکر میں ایک عدد سیاہ ڈائری بھی تھی اور وہ نوجوان لے گیا تھا۔ افتخار نے چابیوں سے لاکر کھولا اور اسے خالی پا کر مایوسی سے کہا۔

''اس میں تو کچھ نہیں ہے۔''

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟" منصور احمد بولا۔ "یہ جانتی ہے، اسی نے چھپائی ہوگی۔"

"میں نے کچھ نہیں چھپایا۔" حنا ہذیانی انداز میں چلائی۔ "اس میں ایک ڈائری تھی جو یہاں آنے والا شخص لے گیا ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔ بہرحال ابھی پتا چل جائے گا۔" منصور احمد نے کہا اور افتخار کی طرف دیکھا۔ وہ چاقو لے کر حنا کی طرف بڑھا تو وہ چلائی۔

"پلیز..... نہیں، میں سچ کہہ رہی ہوں۔"

مگر افتخار رکا نہیں۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ منصور احمد کی ہدایت پر پورا عمل کرے گا۔ اس نے دھکا دے کر حنا کو نیچے گرایا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ "اگر تم چیخنا چلانا چاہو تو تمہیں اجازت ہے۔ یہاں تمہاری آواز سننے والا کوئی نہیں ہے۔ صائمہ بے ہوشی کی نیند سو رہی ہے اور باہر موجود دونوں آدمی میرے ہیں۔"

اب حنا کی سمجھ میں آرہا تھا کہ وہ نقاب پوش تالے تبدیل کرنے کے باوجود اندر کیسے آگئے تھے۔ آج حنا نے افتخار کے جانے کے بعد تمام دروازوں کی کنڈیاں چڑھا دی تھیں۔ اسی وجہ سے وہ اندر آنے کے لیے بیل بجانے پر مجبور ہوئے تھے۔ حنا کے ذہن میں یہ سوال آیا تھا کہ وہ نوجوان اگر ان دونوں کا ساتھی نہیں تھا تو پھر کون تھا؟ چاقو آنکھوں کے سامنے دیکھ کر حنا بولی۔ "تم یہاں تلاشی لے سکتے ہو۔ اگر میں نے کوئی چیز چھپائی ہے تو یہیں نہیں ہوگی۔"

"بکواس مت کرو۔" منصور احمد بولا۔ "افتخار! اس کا ایک کان کاٹ دو پھر یہ بتائے گی۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ڈائری تلاش کریں۔ ہمیں صبح ہونے سے پہلے اپنا کام کر کے نکل جانا ہے۔"

حنا کو ایک بار پھر لگا کہ وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہے۔ یہی شخص جو چند گھنٹے پہلے اس سے کتنی نرمی اور محبت سے پیش آرہا تھا، اس وقت تیز دھار چاقو اس پر آزمانے کے لیے تیار تھا۔ افتخار اس کی طرف جھکا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے ہاتھ لگاتا، اسی نوجوان کی آواز آئی۔ "تمہیں یہ ڈائری چاہیے نا..... آں ہاں، پیچھے مڑنے کی کوشش مت کرنا۔ میرے ہاتھ میں بھی پستول ہے اور مجھے ٹریگر دبانے میں ذرا بھی دیر نہیں لگے گی۔ اپنا پستول پھینک دو۔"

حنا نے دیکھا کہ نوجوان ایک الماری کے پاس کھڑا تھا اور وہ دیوار سے کسی دروازے کی طرح آگے نکلی ہوئی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں ڈائری اور دوسرے میں سچ مچ ایک پستول تھا۔ منصور احمد نے اپنا پستول قالین پر پھینک دیا۔ افتخار نے بھی چاقو گرا دیا۔ نوجوان اندر آیا اور حنا کی طرف دیکھا۔ "مس..... تم ایک طرف ہو جاؤ۔"

جیسے ہی حنا ایک طرف ہوئی، سرکی ہوئی الماری کے پیچھے سے چار افراد نکلے اور منصور احمد اور افتخار پر ٹوٹ پڑے۔ حنا پھیلی ہوئی آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہی تھی اور اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آنے والوں نے دونوں چچا بھتیجے کو قالین پر گرا کر ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی تھیں۔ حنا کا سر چکرایا اور پھر وہ لہرا کر قالین پر ڈھیر ہوگئی۔

☆☆☆

حنا کو ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھی اور ثنا اس کے پاس تھی۔ اسے ہوش میں آتا دیکھ کر وہ مارے خوشی کے رو دی۔ پھر اس سے معلوم ہوا کہ ثنا کو ایک فون کال سے پتا چلا تھا کہ وہ شہر میں ہی کمبائنڈ ملٹری اسپتال میں ہے۔ ثنا فوراً اسپتال آگئی تھی۔ حنا کو ہوش آگیا تھا لیکن ڈاکٹرز نے اسے نیند کی دوا کے اثر میں رکھا تھا۔ حنا نے پوچھا۔ "مجھے یہاں کون لایا ہے؟"

"میں نہیں جانتی لیکن خدا کا شکر ہے کہ تم ٹھیک ہو میری بچی۔ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟"

حنا نے آہستہ آہستہ ماں کو سب بتا دیا۔ ثنا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ پوری بات سن کر اس نے کہا۔ "میرے خدا! میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ لوگ اس قدر کمینے اور درندہ صفت نکلیں گے۔"

"میں نے بھی نہیں سوچا تھا کہ میرا سگا چچا مجھ پر چاقو آزمانے کو کہے گا اور میرا کزن چاقو نکال لے گا۔"

"لیکن یہ سب کیا ہے، وہ کون شخص تھا جس نے ان چچا بھتیجے کو پکڑ لیا؟"

"میں نہیں جانتی کہ وہ کون تھا۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کے ساتھ آنے والوں نے ان دونوں کو ہتھکڑیاں لگا دی تھیں جیسے پولیس لگاتی ہے اور پھر اس نے مجھے سی ایم ایچ میں داخل کرا دیا۔"

ثنا نے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ حنا کو اسپتال میں کون داخل کرا کر گیا تھا لیکن انتظامیہ نے معذرت کر لی کہ حنا جن ذرائع سے اسپتال تک پہنچی تھی، ان کے بارے میں بتانے کی اجازت نہیں ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ جب تک ان کی طرف سے اجازت نہ مل جاتی، حنا کو وہاں سے جانے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ اس پر ثنا کو غصہ آگیا۔ اس نے ایڈمن

سے کہا۔ "کیا میری بیٹی حراست میں ہے؟"

"بالکل بھی نہیں..... آپ اسے ان کی حفاظت بھی کہہ سکتی ہیں۔" ایڈمن نے کہا۔ "شاید ان کی جان کو خطرہ ہے، اسی وجہ سے انہیں تاحکمِ ثانی اسپتال میں رکھنے کا حکم ہے۔"

بہرحال، حنا سی ایم ایچ میں تھی اور وہ ٹھیک بھی تھی اس لیے ثنا نے پھر کچھ نہیں کہا۔ البتہ حنا یہ سن کر بے چین ہوگئی کہ ابھی اسے اسی اسپتال میں رہنا ہے۔ اس نے ماں سے کہا۔ "میں یہاں رہنا نہیں چاہتی۔"

"یہ سرکاری معاملات ہیں۔" ثنا نے اسے سمجھایا۔ "مجھے لگ رہا ہے کہ بختیار کا بھائی بھتیجا کسی قسم کی مجرمانہ سرگرمی میں تھے اور انہوں نے ہی بختیار کا قتل کیا ہے۔ اس لیے تمہیں یہاں رہنا ہوگا۔ ممکن ہے ان کے ساتھی تمہاری تاک میں ہوں۔"

حنا خاموش ہوگئی۔ ثنا شام تک اس کے پاس ہی رہی۔ وہ صبح سے آئی ہوئی تھی پھر ایک نرس نے اس سے آکر کہا۔ "میڈم! آپ اب مزید یہاں نہیں ٹھہر سکتیں۔"

"ٹھیک ہے، میں جا رہی ہوں۔"

"ان کی طرف سے بے فکر رہیں، ان کا پورا خیال رکھا جائے گا۔" نرس نے حنا کی طرف دیکھا۔ "آج رات یہاں میری ڈیوٹی ہے۔"

ثنا اسے پیار کر کے چلی گئی اور حنا سوچنے لگی کہ یہ سب کیا تھا اور اسے حقیقت کا پتا بھی چلے گا یا نہیں۔ اسپتال میں اسے کوئی تکلیف نہیں تھی بلکہ وہ یہاں محفوظ اور سکون سے تھی۔ وہ گزشتہ رات کا سوچتی تو اسے لرزہ سا آجاتا کہ اگر وہ نوجوان نہ آتا تو وہ یقیناً ماری جاتی۔ وہ مجرم تھے اور کسی ایسے شخص کو ہرگز نہیں چھوڑ سکتے تھے جو ان کے جرم سے آگاہ ہو۔ اس لحاظ سے وہ نوجوان اس کا محسن تھا۔ لیکن وہ اسے اس طرح یہاں کیوں چھوڑ کر چلا گیا؟ اسے بتانا تو چاہیے تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ پھر اسے اپنی سوچ پر ہنسی آگئی۔ وہ اگر سرکاری آدمی تھا تو یہ بات اسے کیسے بتا سکتا تھا۔ ظاہر ہے، یہ خفیہ معاملات تھے۔ رات کے کھانے کے بعد وہ لیٹی ہوئی تھی کہ نرس اندر آئی۔

"مس حنا! ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ کیا میں انہیں یہاں لے آؤں؟"

"اس وقت تو کسی کو ملنے کی اجازت نہیں ہوتی۔"

"جی ہاں لیکن یہ کوئی آفیشل معاملہ ہے۔"

حنا کو خیال آیا کہ یہ کہیں وہی شخص نہ ہو۔ اس نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے۔"

اس کا اندازہ درست نکلا۔ کچھ دیر بعد وہی کلین شیو نوجوان اندر آیا۔ حنا بیٹھ گئی۔ اس نے آتے ہی معذرت کی۔ "سوری! میں نے اس وقت آپ کو ڈسٹرب کیا لیکن یہ ملاقات ضروری تھی کیونکہ اس کے بعد مجھے کئی دن فرصت نہیں ملتی۔"

"میں بالکل برا نہیں مناؤں گی، اگر آپ مجھے حقیقت سے آگاہ کر دیں۔" حنا نے جلدی سے کہا۔ نوجوان نے کرسی کھینچ لی۔

"میرا خیال ہے آپ نے کسی قدر صورتِ حال کا اندازہ کر لیا ہوگا؟"

"جی کسی قدر....." اس کا لہجہ طنزیہ ہوگیا۔ "میں تو آپ کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتی۔"

"آپ مجھے نوید کہہ سکتی ہیں اور میں آپ کو ساری تفصیلات بتانے آیا ہوں۔ ان لوگوں پر عرصے سے ہماری نظر تھی۔"

"آپ کا مطلب ہے، میرے چچا اور کزن پر؟"

"ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ آپ کے چچا اور کزن نکلیں گے۔ بختیار احمد کے قاتل بھی یہی لوگ ہیں۔"

"بابا کے قاتل..... لیکن کیوں؟" حنا نے بے ساختہ کہا۔

نوجوان نے گہری سانس لی۔ "کیونکہ وہ بختیار احمد کی زمین کو اسمگلنگ کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔"

"کیا بابا جانتے تھے کہ انہیں مجبور کرنے والے کون لوگ ہیں؟"

"بالکل جانتے تھے اور انہوں نے یہ سب اسی سیاہ ڈائری میں لکھ دیا تھا۔ لیکن انہوں نے ہمیں اطلاع نہیں دی تھی۔"

حنا چونک گئی۔ "آپ لوگوں کو اطلاع..... کیا مطلب؟"

نوید کے لہجے میں احترام آگیا۔ "مس حنا! آپ کے بابا اصل میں ملک کے لیے کام کرتے تھے۔ وہ برسوں سے اس سرحدی علاقے میں اپنے ملک کے لیے ایسی خدمات انجام دے رہے تھے جو ہر شخص نہیں دے سکتا۔ اس کے لیے انہوں نے اپنے گھر کی قربانی دی اور سب سے کٹ کر اکیلے رہتے تھے۔ ان کی جاب کے لیے ایسا ضروری تھا۔"

"لیکن شاہ پور کے لوگ تو انہیں اسمگلر سمجھتے ہیں؟"

"یہ ان کا کور تھا اور ضروری تھا۔ اس کا منصوبہ بھی

انہوں نے خود بنایا تھا تا کہ کسی کو شک نہ ہو کہ وہ وہاں کیا کر رہے تھے۔"

"خدا کا شکر ہے۔" حنا نے بے ساختہ کہا۔ "لیکن چچا منصور احمد اور افتخار ....."

"یہ اصل مجرم ہیں۔ سرحد کے پاس ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ اسمگلنگ کرتے تھے اور ان کی کوشش تھی کہ بختیار احمد کی زمین بھی اس مقصد کے لیے استعمال کریں۔ وہ بھی عام لوگوں کی طرح انہیں اسمگلر ہی سمجھتے تھے۔ بختیار احمد کے انکار سے مشتعل ہو کر انہوں نے ان کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کیا۔ ان کا خیال تھا کہ وارث ہونے کے ناتے ساری زمین ان کو مل جائے گی اور وہ آرام سے اپنا کام کرسکیں گے..... مگر ان کی بدقسمتی..... پتا چلا کہ نہ صرف بختیار احمد کی بیٹی ہے بلکہ انہوں نے اپنی ساری زمین اور دولت اس کے نام کردی ہے۔"

"تب مجھ پر یہاں آتے ہی کس نے حملہ کیا تھا..... وہ سیاہ بالوں والا؟"

"ہم نے اسے گرفتار کرلیا ہے۔ وہ افتخار کا رکھا ہوا چوکیدار تھا جس کے بازو پر نقلی بال لگا کر اسے بختیار احمد کے اس ساتھی کی صورت دی گئی جو ان کے ساتھ رہتا تھا اور ان کی حفاظت کرتا تھا۔ بدقسمتی سے وہ اس رات ایک ضروری کام سے گیا تھا اور ان لوگوں کو موقع مل گیا۔ اس حملے کا مقصد آپ کو ڈرا کر یہاں سے جانے پر مجبور کرنا تھا لیکن آپ نے وہ خفیہ دراز دیکھ لی۔ اس کے بعد ان دونوں کو بھی شک ہوگیا کہ آپ نے کچھ دیکھ لیا ہے اور وہ آپ کے پیچھے پڑ گئے۔"

"تو یہ بات تھی..... لیکن آپ کہاں سے آگئے تھے اچانک؟"

نوید مسکرایا۔ "مس حنا! میں شروع سے آپ کے آس پاس رہا تھا۔ آپ کو بس میں اپنے برابر میں بیٹھا مونچھوں والا آدمی یاد ہے؟"

"تب ہی میں کہوں، آپ کیوں جانے پہچانے لگ رہے تھے۔"

"بہرحال، کچھ معاملات ایسے ہیں جن کی وجہ سے آپ کو یہاں رہنا ہوگا۔ ابھی اسمگلروں کے اس گروہ کے کچھ لوگ باقی ہیں۔ یہ صرف اسمگلر ہی نہیں، وطن دشمن بھی ہیں اور جاسوسی بھی کرتے ہیں۔"

"میرے چچاؤں کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں ہے پھر انہوں نے اتنی گھٹیا حرکت کیوں کی؟"

"مس حنا! ابھی آپ نے دنیا نہیں دیکھی ہے۔ گھٹیا کام عام طور سے وہی لوگ کرتے ہیں جن کو کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔" نوید نے کہا۔ "آپ کے والد جیسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو ملک کی خاطر اپنے آپ کو مٹا دیتے ہیں۔ بہرحال، ان کی خدمت کا صلہ اللہ ہی دے سکتا ہے۔ ہم تو ان کو نام بھی نہیں دے سکتے۔ وہ ملک کے ان نامعلوم وفاداروں میں سے ہیں جن کا نام کبھی منظرِ عام پر نہیں آتا۔"

حنا کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ "بابا کیا کرتے تھے..... کیا میں بالکل نہیں جان سکتی؟"

افتخار کھڑا ہوگیا۔ "آپ کو صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ وہ ملک کی سلامتی سے متعلق جاسوس نیٹ ورک کا ایک اہم حصہ تھے اور ہمیں ان کا متبادل مشکل سے ملے گا کیونکہ ہر شخص میں اتنی بڑی قربانی دینے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ آپ کا بنگلا کلیئر کیا جا چکا ہے، اب آپ اسے حاصل کرسکتی ہیں۔"

"ایک منٹ مسٹر نوید۔" حنا نے کہا۔ "میں وہ زمین اور بنگلا آپ لوگوں کو دینا چاہتی ہوں تا کہ وہاں سے ملک کی خدمت کا سلسلہ جاری رہے۔"

نوید نے نفی میں سر ہلایا۔ "آپ بختیار احمد کی بیٹی ہیں اور آپ کا دل بھی اتنا ہی بڑا ہے لیکن ہمارے کام میں سب سے زیادہ اہمیت رازداری کی ہوتی ہے۔ وہ جگہ لوگوں کی نظر میں آچکی ہے۔ پھر اصل اہمیت زمین کی نہیں بلکہ افراد کی ہوتی ہے۔ ایسی جگہیں ہمیں کئی مل جائیں گی لیکن بختیار احمد ہمیں نہیں ملیں گے۔ ان کی خدمات کی وجہ سے ہم نے اس معاملے میں دلچسپی لی اور آپ کا تحفظ کرنے کی پوری کوشش کی۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم کامیاب رہے۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔"

نوید جانے کے لیے مڑا۔ حنا نے پھر اسے روکا۔ "ایک منٹ پلیز..... ایک سوال کا جواب اور دیتے جائیں۔ کیا آپ سے دوبارہ ملاقات ہوسکتی ہے؟"

"نہیں، میں آخری بار آپ سے مل رہا ہوں۔" نوید نے اسی طرح مڑے بغیر جواب دیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ حنا گہری سانس لے کر رہ گئی۔ اس نے سوچا یہ ملک یقیناً ایسے ہی راست رو اور جانباز لوگوں کے دم قدم سے قائم ہے جو اپنی ذمے داری نبھانے کی خاطر اپنی عزیز ترین چیز کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ دنیا اس کے باپ کو اسمگلر سمجھتی رہے لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کا باپ کیا تھا اور اس کے لیے یہی کافی تھا۔

جاسوسی کی سالگرہ کا دوسرا تحفۂ خاص

ایک اور لو اسٹوری

احمد اقبال

زندگی کی جھلسا دینے والی دھوپ میں چھاؤں کی خواہش ہر شخص کی فطرت میں شامل ہوتی ہے... اس چھاؤں تلے وقت گزارنے کی بعض اوقات بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے... ایسے ہی کرداروں کا ملنا اور بچھڑنا... جو ماضی کے دھندلکوں سے نکل کر اپنے حال میں جینا چاہتے تھے... لیکن ماضی کی پرچھائیاں مسلسل ان کے تعاقب میں تھیں... جو کسی طور پیچھا چھوڑنے کو تیار نہ تھیں... جذبات کی شدت تھی جو بیتے وقت کی آواز بن کے حال سے ہم آہنگ ہو رہی تھی...

آغاز سے انجام تک کا سفر طے کرنے والے مسافر کا دگرگوں احوال

یہ کہانی ایک چھوٹے سے قصبے سے شروع ہوتی ہے اور نصف صدی گزر جانے کے بعد وہیں ختم ہوجاتی ہے۔

ایسا ہر کہانی کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ خود ہی طے کرتی ہے کہ اس کا آغاز اور انجام کہاں کب اور کیسے ہوگا۔

اب تو خیر وہ ایک چھوٹا سا شہر ہے لیکن نصف صدی پہلے وہاں ہزار دو ہزار گھر تھے... بیشتر کچے اور کچھ پکے... چند حویلی ٹائپ بھی... آپ کسی بھی سمت نکل جائیں ایسا ہی کوئی قصبہ آج بھی آسانی سے نظر آجائے گا... یا ہر کھیت ہوں گے جہاں فصل کھڑی ہوگی یا کسان اگلی کسی فصل کے لیے ہل چلا کے زمین تیار کررہے ہوں گے... کسی جوہڑ میں نالے پر کپڑے دھونے والی خواتین کپڑوں کا میل اور دل کا غبار ایک ساتھ نکال رہی ہوں گی... ساس کتنی کیسی چڑیل ہے... شوہر کیسا جانور ہے... بہو کیسی بے شرم ہے... وغیرہ وغیرہ... شاید وہیں پر ساس، بچوں اور بھینسوں کا غسلِ صحت بھی جاری ہوگا۔

ہم اس قصبے کا نام الف پور فرض کرلیتے ہیں۔

کچھ لوگ بتاتے ہیں کہ الف پور میں پہلے نہ بجلی تھی اور نہ ٹیلی فون... نہ ریڈیو تھا اور نہ بے حیائی کو فروغ دینے والا ٹی وی... الف پور میں نہ کوئی اغوا ہوتا تھا نہ قتل... نہ ڈاکا پڑتا تھا اور نہ چوری ہوتی تھی... نہ کہیں زلزلہ آتا تھا اور نہ سیلاب... یہ لوگ آہ بھر کے کہتے ہیں کہ وہ وقت کتنا اچھا تھا۔

لیکن بزرگ تو ہمیشہ ایسا ہی کہتے ہیں... یعنی وہ بھی جو بچے سے بڑے ہو کے بزرگی کے مرتبے پر فائز ہو چکے... چوہدری فضل دین دو ٹوک الفاظ میں کہتا ہے کہ الف پور میں اغوا ڈکیتی اور قتل جیسے سنگین جرائم کے آغاز کا ذمّے دار شہاب الدین غوری ہے... وہ شہاب الدین غوری نہیں جو ہندوستان کا ایک بادشاہ تھا۔

یہ شہاب الدین ہماری کہانی کا ہیرو ہے جو پہلے شاعر تھا... اس کی عمر کے لڑکے تعلیم حاصل کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے... جو زبردستی پرائمری اسکول میں بھرتی کرا دیے جاتے تھے وہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھی وہی کرتے تھے جو ان کے باپ دادا کرتے آئے تھے... بکریاں چرانا... بھینسوں کو نہلانا... کھیتی باڑی میں ہاتھ بٹانا... اور اس دوران میں جلد از جلد بلوغت کی منازل طے کرنا... پندرہ سال میں وہ کسی چاچے مامے کی لڑکی سے بیاہ دیے جاتے تھے اور بچے پیدا کرتے... معمولات کی زندگی گزارتے گزارتے کسی دن خود گزر جاتے تھے۔

بدقسمتی سے شابو کو تعلیم حاصل کرنے کا شوق ہوگیا اور

باپ نے مجبور ہو کے اسے قریب کے ایک شہر کے ہائی اسکول میں داخل کرا دیا۔ شابو ہر روز سائیکل پر دس کوس آتا جاتا رہا... سردی گرمی کی پروا کیے بغیر... پرانی سائیکل کچے راستوں پر خراب یا پنکچر بھی ہو جاتی تھی... دوبار وہ امتحان بھی نہ دے سکا... ایک بار عین امتحانات کے زمانے میں وہ بیمار پڑ گیا... دوسری بار وقت پر امتحان کی فیس نہ جمع کرا سکا... لیکن آخر کار اس نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا... اس کے باپ نے مٹھائی تقسیم کی... ماں نے بلائیں لیں۔

بہت جلد یہ سوال پیدا ہو گیا کہ اب وہ کیا کرے گا... اس کی عمر سترہ سال ہو گئی تھی... ماں کا خیال ایک ہی تھا کہ اب اسے بلا تاخیر بیاہ کر لینا چاہیے... اس کے پاس نصف درجن ایسی لڑکیوں کے نام تھے جو اس کی بہو بننے کے لیے کوالیفائی کرتی تھیں... باپ چاہتا تھا کہ اب وہ کام میں اس کا ہاتھ بٹائے... سونے کو زیورات میں ڈھالے۔

شابو کی پہلی باقاعدہ جھڑپ اپنی ماں سے ہوئی...

''دیکھو شابو۔''

''پھر وہی شابو... کتنی بار کہا ہے کہ میرا نام شہاب الدین ہے۔'' وہ چڑ کے بولا۔

''بکواس مت کر... میرے لیے تو ساری عمر شابو ہی رہے گا... جو میں پوچھ رہی ہوں اس کا جواب دے۔''

''اس پر میں غور کر رہا ہوں والدہ۔''

''ہر بار یہی بات کرتا ہے... آخر کب تک غور کرے گا تو... تجھ سے بڑی دو اور تین چھوٹی بہنیں اپنے گھر کی ہو گئیں... افضل تجھ سے ایک سال چھوٹا ہے... اس کی بیوی کا دوسرا بچہ ہونے والا ہے۔''

''مجھے سب معلوم ہے... لیکن میں شہاب الدین ہوں... آخر اتنی تعلیم کس لیے حاصل کی تھی میں نے والدہ... غور کرنے کا مقام ہے۔''

''تعلیم کا مطلب کیا یہ ہے کہ بندہ کام نہ کرے... شادی نہ کرے... بس غور کرتا رہے؟'' ماں نے چلا کے کہا۔

''کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے غور کر لینا چاہیے۔'' شہاب الدین نے دروازے کا رخ کیا۔ ''اس میں غلط کیا ہے؟''

ماں اس کی راہ میں حائل ہو گئی۔ ''بہت غور کر چکے ہیں ہم بھی... تیرے ابا کا بھی خیال ہے کہ زیبو اچھی لڑکی ہے۔''

''پھر وہ خود اس سے شادی کر لے۔''

''بے حیا، بے غیرت... وہ تیرے چاچے کی لڑکی ہے۔'' ماں نے اس کو ایک دو ہتڑ مارا۔

شہاب الدین نے برا سا منہ بنا کے کہا۔ ''وہ... وہ جس کا رنگ اور وزن بھوری بھینس جیسا ہے۔ اس کے باپ سے میری نہیں بنتی۔''

ماں ایسے ہار ماننے والی نہیں تھی۔ اس نے متبادل امیدوار کا نام لیا۔ شہاب الدین سب کو مسترد کرتا گیا۔ اس کی ماں پاگل ہے... اس پر جن آتے ہیں... اس کی تو منگنی ہو چکی تھی... وہ چھوڑ کے کیوں بھاگ گیا... میں ہی رہ گیا ہوں قربانی کا بکرا۔

ماں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ''شہاب الدین... سب میں خرابی ہی کیوں نظر آ رہی ہے تجھے... سچ بتا... تجھے کوئی اور پسند آ گئی ہے؟''

جان چھڑانے کے لیے شہاب الدین نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

''ہائے میں مر گئی... آخر کون ہے وہ... نام کیا ہے اس کا؟''

شہاب الدین نے کہا۔ ''مدھو بالا۔''

ماں نے چیخ مار۔ ''کون... وہ کوئی ہندو کی لڑکی... کیا نام بتایا تو نے... باپ کون ہے؟''

''مدھو بالا... مگر وہ ہندو نہیں ہے ماں... اس کا اصل نام ہے ممتاز بیگم... باپ کا نام ہے عطاء اللہ۔''

''پھر... یہ مدھو بالا کیا ہے؟''

شہاب الدین نے لطف لیتے ہوئے کہا۔ ''اس نام سے وہ فلموں میں کام کرتی ہے۔ ابھی نئی فلم لگی ہے اس کی۔ شہر چل دکھاؤں گا تجھے۔''

ماں کی زبان گنگ ہو گئی... وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے بیٹے کو دیکھتی رہی جو فلموں میں کام کرنے والی کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا جس کے باپ نے اسے ہندوانہ نام سے یہ بے حیائی کا کام کرنے کی اجازت بھی دے رکھی تھی۔ شہاب الدین کا یقیناً دماغ چل گیا تھا۔ یا اس پر کسی نے جادو کرا دیا تھا... اب وہ کیا کرے۔ اس کا باپ سنے گا تو کتنا غصہ کرے گا۔ اسے کتنا صدمہ ہو گا... لیکن بتانا تو پڑے گا اسے بھی۔

شہاب الدین کا باپ اپنی بیوی کی بات سن کے ہنس پڑا۔ ''فکر مت کر... وہ تنگ کر رہا ہو گا تجھے... ٹالنا چاہتا ہو گا۔ میں بات کروں گا اس سے۔''

خیر دین کو بیٹے سے بات کرنے کا موقع تین دن بعد ملا۔ ہر صبح وہ دکان پر جاتا تھا تو شہاب الدین سو رہا ہوتا تھا۔ تاکید کر کے جاتا تھا کہ شہاب الدین اٹھے تو اسے دکان پر بھیج

دے... مگر وہ اٹھتا تھا تو سائیکل لے کر نہ جانے کدھر نکل جاتا اور پھر رات کو دیر سے لوٹتا۔ خیر دین کھانے اور عشا کی نماز سے فارغ ہو کے سو جاتا تھا۔ وہ بیوی سے لڑتا تھا۔ ''آخر تو پوچھتی کیوں نہیں... کہاں جاتا ہے وہ... کیا کرتا ہے سارا دن؟''

''کہاں بتاتا ہے وہ مجھے... الٹے سیدھے جواب دیتا ہے... مجھے تو پکا یقین ہے اس پر کسی کا سایہ ہے۔''

''نہیں... اس کا دماغ خراب ہو رہا ہے دس جماعت پڑھ کے... وہ دکان پر میرے ساتھ کام نہیں کرنا چاہتا۔''

باپ کا اندازہ درست تھا۔ اگلے روز اس نے شہاب الدین کے اٹھنے کا انتظار کیا اور دکان پر نہیں گیا۔ شہاب الدین سے چھوٹا پہلے ہی بیوی کی باتوں میں آ کے گھر سے چلا گیا تھا اور سسرال والوں کے ساتھ گھر داماد بن کے بے غیرتی کی زندگی گزار رہا تھا۔ سب خیر دین کو طعنے دیتے تھے۔ بے شک وہ سگا ماما تھا اور اس کی دکان سنبھالنے والا کوئی نہیں تھا مگر دنیا کی زبان کون پکڑ سکتا ہے... خیر دین کی ساری امیدیں اب شہاب الدین سے وابستہ تھیں۔

شہاب الدین قد میں باپ سے نکلتا ہوا تھا۔ اس کی صحت بہت اچھی تھی اور رنگ روپ اپنی ماں پر گیا تھا۔ اس نے باپ کی ساری بات بڑے تحمل سے سنی۔ ''صاف بات ہے ابا... میں یہ کام کرنا نہیں چاہتا۔''

خیر دین نے برہمی سے کہا۔ ''کیوں... کیا خرابی ہے اس کام میں؟''

''خرابی مجھے نظر آتی ہے... دکان پر ہی بیٹھنا ہوتا تو مجھے اتنا پڑھنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''اوئے پاگل... میٹرک کیا ہے نا تو نے... بی اے، ایم اے تو نہیں... تو کہاں ڈپٹی کمشنر لگ جانا ہے... کسی اسکول میں استاد تو بن نہیں سکتا۔''

شہاب الدین نے کسی فلسفی کی طرح فرمایا۔ ''مائی ڈیئر ابا، عقل اور ذہانت کا تعلق کسی ڈگری سے نہیں ہوتا۔''

''اوئے لوہار کا بیٹا لوہار ہی رہتا ہے... میرا باپ زرگر تھا تجھے بھی یہی کام کرنا ہے بالآخر۔''

''نہیں ابا... مجھے بڑا آدمی بننا ہے... میں تجھے ایک درجن مشہور لوگوں کے نام بتا سکتا ہوں جو میٹرک پاس بھی نہیں تھے... مثلاً مرزا غالب۔''

خیر دین نے حیرانی سے کہا۔ ''کون مرزا...؟ میں نے تو کسی مرزا کا نام نہیں سنا... اپنے شیخ صاحب نے بڑی ترقی کی... باپ ان کا گلی گلی پھیرا لگا کے کپڑا بیچتا تھا... اسی الف پور میں... اب فیصل آباد میں کپڑے کی مل لگا لی ہے ان کے بیٹوں نے۔''

''تو نہیں سمجھے گا۔'' شہاب نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''مرزا غالب کی غزل ہر کتاب میں ہوتی ہے... اور بہت مشکل ہوتی ہے۔''

''زرگری بھی بہت مشکل ہے... ہم نے ساری عمر لگا دی۔ آج ہمارا نام ہے اس علاقے میں... تو یہ بات کیوں نہیں سمجھتا؟''

شہاب الدین نے باپ کو سمجھانے کی ایک آخری کوشش کی اور کسی ڈگری کے بغیر شہرت حاصل کرنے والوں کے ایک درجن سے زیادہ نام گنوائے مگر جوش اور جذبات میں اس نے وہ سارے نام لیے جن کے ساتھ خیر دین کی مذہبی عقیدت تھی۔

''اوئے گستاخ... بے ہدایتا... کافر دے تخم...'' خیر دین نے مشتعل ہو کے شہاب الدین پر ایک جوتا فائر کیا۔

شہاب الدین نے فرار اختیار کرنے میں عافیت جانی۔ وہ دروازے میں تھا کہ دوسرا جوتا کسی میزائل کی طرح آیا اور وہ پھرتی سے غوطہ نہ مارتا تو یہ بھی نشانے پر بیٹھتا۔ اس کی زد میں آنے والی ایک بڑھیا نے بہت واویلا کیا جو گلی سے گزر رہی تھی۔ اس وقت تک شہاب الدین خطرے کی حد سے کافی دور نکل گیا تھا۔

اس نے سوچا تھا کہ آج وہ اپنے سنہرے مستقبل کا پورا پلان والد ماجد کے سامنے رکھ دے گا اور کوئی وجہ نہیں کہ سارا خاندان اس پر اُش اُش نہ کرے... مگر جن کو غور کرنے کی عادت نہ ہو وہ بات کہاں سنتے ہیں... خیر، وہ اپنے گھر والوں کو سمجھانے کی کوشش جاری رکھے گا۔

☆☆☆

شہاب الدین کے خیالات میں یہ تبدیلی اچانک نہیں آئی تھی نہ اسے اپنے آبائی پیشے سے نفرت تھی اور نہ اس کے ذہن میں اپنے مستقبل کے لیے کوئی متبادل راستہ تھا۔ اس کا خیال یہی تھا کہ دس جماعتیں پڑھ لینے کے بعد وہ کالج میں بھی داخلہ لے گا۔ اس کے لیے باپ کو منانا ایک مشکل کام ہو گا... وہ ایک چھوٹے سے قصبے کا زرگر تھا چنانچہ اس کی آمدنی محدود تھی۔ اس کے علاوہ اب وہ بوڑھا ہو چکا تھا اور چاہتا تھا کہ اس کے کام میں دونوں بیٹے بھی ہاتھ بٹائیں... اس سے پہلے کہ اس کی نظر بالکل ہی جواب دے جائے اور اس کے ہاتھوں میں رعشہ آ جائے وہ نقاشی اور سونے میں گل کاری کے اس فن کو بیٹوں میں منتقل کر دینا چاہتا تھا پھر وہ کاروبار کو

آگے بڑھائیں... نت نئے ڈیزائن لائیں اور بڑے خاندانی گاہکوں سے رابطہ رکھنے کے ساتھ نئے گاہک بنائیں۔

شادی کے بعد جب شہاب الدین کے چھوٹے بھائی نے بیوی کے کہنے پر سسرال کا رخ کیا اور گھر داماد ہو گیا تو صورتِ حال بدل گئی۔ چھوٹے بھائی نے باپ کی دکان نہیں سنبھالی اپنے سسر کی دکان پر بیٹھ گیا۔ سسر اس کا سگا ماما تھا اور اس کا کوئی بیٹا نہیں تھا جو اس کی مدد کرتا۔ وہ اچانک بیمار ہوا اور اس قابل نہ رہا کہ دکان پر بیٹھ سکے۔

شہاب الدین کو ایسا لگتا تھا جیسے اس کے چھوٹے بھائی نے ہمدردی میں نہیں لالچ میں اپنا گھر چھوڑ کے گھر داماد کی ذلت قبول کی تھی۔ اس کے دل میں یہ لالچ پیدا کرنے والی اس کی بیوی تھی جس کا وہ غلام تھا۔ یہ رائے صرف ساس کی نہیں سارے خاندان کی تھی اور صحیح تھی... صرف چھ ماہ بعد ماما مر گیا تو افضل ایک چلتی ہوئی کریانے کی دکان کا مالک ہو گیا کیونکہ خود اس کی ساس بہت پہلے دنیائے فانی کو خیر باد کہہ چکی تھی۔

شہاب الدین کو اپنا کالج میں داخل ہو کے بی اے ایم اے کرنے کا منصوبہ فیل ہوتا نظر آیا۔ اب اس کے پاس باپ کے خاندانی زرگری کا پیشہ اختیار کرنے کے سوا چارہ نہ رہا تھا۔ افضل دکان چلاتا تو وہ تعلیم جاری رکھ سکتا تھا۔ باپ بہت شور غوغا کرتا کہ اس کے کالج کے تعلیمی اخراجات پورے کرنا ممکن نہیں۔ ماں الگ فساد برپا کرتی کہ کیا وہ بڑھاپے میں شادی کرے گا اور اس وقت اسے اپنی بیٹی دے گا کون؟ ایک بیٹے کو بہو چھین کر لے گئی۔ دوسری کے آنے سے پہلے وہ خود چلی جائے گی۔

ماں کی بات تو ایک کان سے سنی اور دوسرے سے اڑائی جا سکتی تھی۔ باپ کے تعلیمی امداد روک لینے کی دھمکی کا جواب بھی اس نے سوچ رکھا تھا۔ وہ بچوں کو پڑھائے گا اور اپنے اخراجات خود پورے کرے گا۔ افضل کی گھر داماد اور اس کے نتیجے میں عاق کیے جانے کے بعد شہاب الدین نے اپنے منصوبے پر نظرِ ثانی کی اور بہت غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ تقدیر سے نہیں لڑ سکتا۔ اس کے مقدر میں بھی زرگری لکھ دی گئی ہے تو اسے یہی کام کرنا پڑے گا۔ وہ کبھی پروفیسر نہیں بن سکے گا۔

امتحان سے فراغت اور نتیجہ آنے تک اس نے تمام امکانات پر غور کیا لیکن ہر بار اس کی سوچ کا دائرہ وہیں آ کے ختم ہو گیا جہاں اس کا مستقبل اپنے باپ کے ماضی سے مل جاتا تھا۔ اب وہ بھی سونا کوٹے گا اور وہ بُندے... جھومر... نیکلس اور چوڑیاں بنائے گا... جو اس کی ماں کو کبھی نصیب نہ ہوئے تھے۔ زیور میں نئے ڈیزائن کے نقش و نگار تراشتے ہی اس کی اپنی آنکھوں میں بھی ایک دن موتیا اتر آئے گا اور وہ مجبور ہو گا کہ اپنے آباؤ اجداد کی طرح یہ کاروبار اپنی اولاد کے سپرد کر دے۔

شہاب الدین کے لیے زرگری کا پیشہ قابلِ نفرت نہیں تھا۔ یہ جوتے گانٹھنے... گٹر صاف کرنے یا قبریں کھودنے کے مقابلے میں لاکھ درجہ بہتر اور معزز پیشہ تھا۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ بڑھانے کے بجائے روز بروز یہ کام اس خاندان کے لیے خوش حالی کے مواقع کم کر رہا تھا... قصبے میں نئے سنار آ گئے تھے جو خود کو جیولر کہتے تھے۔ ان کے پاس باہر کے ڈیزائن تھے جو وہ فیشن کے رسالوں سے کاپی کرتے تھے۔ الف پور کے رہنے والے بھی شہر جا کے خریداری کرنے لگے تھے۔ یہ روز کی خریداری نہیں تھی جب کسی کی بیٹی یا بیٹے کی شادی قریب آتی تھی تو خوب سے خوب تر کی جستجو اسے ایک طرف سیالکوٹ اور دوسری طرف وزیر آباد سے آگے لاہور تک بھی لے جاتی تھی۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو دبئی سے زیورات لاتے تھے تو کچھ جب حج کی سعادت حاصل کرنے گئے تھے تو تجارت کو بھی نہیں بھولے تھے اور وہاں سے چوبیس قیراط خالص سونے کے بسکٹ تک لے آتے تھے۔

ان حالات میں ایک پرانے خاندانی زرگر کی بقا کا انحصار ان چند خاندانی لوگوں پر رہ گیا تھا جو کتے بھی خاندانی رکھتے تھے۔ وقت کے ساتھ ایسے خریداروں کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی۔ اگلی نسل کے لیے ایسی وفاداری یا وضعداری محض حماقت تھی... جب پیسہ نقد خرچ کرنا ہے تو پھر پابندی کیسی... ساری دنیا ایک بازار ہے... جہاں سستا اور اچھا سودا ہو وہیں سے مال اٹھا لو۔ دکاندار کا خریدار سے جذباتی تعلق کیسا؟

اب پرانے لوگ خیر دین زرگر کو یاد کرتے تھے نہ وہ سر کے بل دوڑتا ہوا ان کے درِ دولت پر حاضری دیتا تھا۔ اس گھر کی بہو بیٹیوں سے پرانی بڑھیوں تک سب کی سنتا تھا اور سب کو قائل کرنے کے لیے اپنی چرب زبانی سے زیادہ خوشامد سے کام لیتا تھا۔ اب وہ پہلے والی بات نہیں تھی کہ ڈیزائن سامنے رکھ دیے اور جو کہا بنا دیا۔ خیر دین کے ڈیزائن اب آؤٹ آف ڈیٹ قرار دے کر مسترد زیادہ کیے جاتے تھے... جو آرڈر دیتے تھے وہ بھی سو چکر لگواتے تھے۔ سو

اعتراض کرتے تھے... اور سو احسان جتاتے تھے کہ تم اس قابل تو نہیں مگر ہم صرف ازراہ بندہ پروری تمہیں یہ آخری موقع دے رہے ہیں... خیر دین ان کے حکم کا غلام ہو گیا تھا۔ اسے عزت کم اور ناقدری زیادہ ملتی تھی۔ آمدنی کم ہونے سے نوبت یہ آ گئی تھی کہ اسے گھر کا خرچ چلانا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی اولاد یہ کاروبار نئے زمانے کے تقاضوں کے مطابق چلائے۔

ایک بیٹے نے پرچون فروشی کا آسان راستہ اختیار کیا۔ گھر چھوڑا... ماں باپ کی ذمے داری سے ہاتھ کھینچا اور خود اپنی دکان داری سے مال دار بن گیا تو خیر دین کے لیے ساری توقعات دوسرے بیٹے سے وابستہ کرنا جائز تھا۔ یہ بیٹا ذہین اور تعلیم یافتہ بھی تھا۔ اسے وہ جیولر بنا سکتا تھا۔ ایک ایسی چمکتی دمکتی دکان کا مالک جس کی پیشانی پر ''خیر دین اینڈ سنز جیولرز'' کا بورڈ جگمگاتا ہو۔

خواب دیکھنے کا حق تو سب کو ہے۔ اسے آئین میں دیے گئے بنیادی حقوق میں شامل ہونا چاہیے... مسئلہ تعبیر کا ہے۔ اس کی ضمانت کون دے سکتا ہے۔

ہر وقت غور کرنے والا شہاب الدین کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا کہ ایک دستِ غیب نے جیسے لیور کھینچ کے وہ پٹری ہی بدل دی جس پر زندگی کی گاڑی ایک ہی سمت میں دوڑ رہی تھی۔ ہر روز سائیکل پر الف پور سے شہر آنے جانے والا شہاب الدین زندگی کے فرق کو دیکھتا تھا تو اسے سارا فرق معاشی نظر آتا تھا۔ پیدل... سائیکل سوار... موٹر سائیکل دوڑاتا اور کار میں زن سے گزر جانے والا سب اسی فرق کی علامت تھے۔ اسکول کے راستے میں ایک نہر کے پل پر اس نے بارہا دیکھا تھا۔ ایک ہاتھ سکہ اچھالتا تھا۔ سردی کی پروا کیے بغیر تین چار ننگ دھڑنگ بچے سکہ حاصل کرنے کے لیے پانی میں کود پڑتے تھے۔ سارا کھیل سکے کا تھا۔ یہی سکہ کرکٹ کے میدان میں ٹاس جتواتا تھا اور اکثر ٹاس جیتنے والی ٹیم ہی میچ بھی جیت جاتی تھی۔

اچانک ایک دن شہاب الدین کی ملاقات شیر افضل سے ہو گئی جو دو سال پہلے اسکول کی کرکٹ ٹیم کا کپتان تھا۔ شہاب الدین اس سے دو سال پیچھے ہونے کے باوجود ٹیم میں نائب کپتان اسی کی مرضی سے بنا تھا۔ وہ آپس میں دوست تھے لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ شہاب الدین ایک اچھا آل راؤنڈر بھی تھا۔ اس کی بالنگ اور بیٹنگ نے ہی اسکول کو ٹورنامنٹ میں چیمپئن بنوایا تھا۔ کپتان مقرر کیے جانے کے بعد ہی شیر افضل نے اپنے دوست کے سامنے اعتراف کر لیا تھا کہ وہ شہاب الدین کے مقابلے میں کچھ نہیں لیکن اس کا چاچا ڈپٹی کمشنر ہے چنانچہ کپتان کوئی اور نہیں بن سکتا تھا۔ شہاب الدین نے دوستی میں اس کے ساتھ معاہدہ کر لیا تھا کہ وہ اس کی کپتانی کی لاج رکھے گا چنانچہ ہر میچ میں عملاً شہاب الدین ہی کپتانی کرتا تھا۔ شیر افضل ہر اوور کے بعد اس سے مشورہ کرتا تھا۔ ٹیم میچ جیت لیتی تھی تو اس کا پورا کریڈٹ شیر افضل کو ملتا تھا۔ دوستی کا یہ معاہدہ دو سال برقرار رہا۔ جب میٹرک پاس کرنے کے بعد شیر افضل چلا گیا تو کپتانی شہاب الدین کو نہیں ملی۔ تحصیل دار کا بیٹا کپتان بنا دیا گیا جو شاید اس قابل بھی نہیں تھا کہ ٹیم میں شامل کیا جائے۔ ٹیم کا بیڑا غرق ہو گیا۔ نیا کپتان اپنی اکڑفوں میں رہتا تھا۔ شہاب الدن نے خراب بالنگ اور بیٹنگ کی کی۔ اسے ٹیم سے نکال دیا گیا۔

وہ دسمبر کی ایک کہر آلود دوپہر تھی جب نہر کے پل پر شہاب الدین نے ایک شخص کو پانی میں سکے اچھالتے دیکھا۔ وہاں ایک نہیں دو بچے تھے جو سخت سردی کے باوجود سکہ فضا میں بلند ہوتے ہی غوطہ مارتے تھے۔ چند منٹ میں کوئی ایک بچہ تہ سے سکہ نکال لاتا تھا۔ سکے فضا میں اچھالنے والا خود پوری طرح گرم کپڑوں میں ملبوس تھا اور اس کھیل کو پوری طرح انجوائے کر رہا تھا۔

شہاب الدین کے لیے بھی یہ نظارہ نیا نہیں تھا لیکن ایک تو سخت سردی میں یہ کھیل کوئی نہیں کھیلتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ اتنی دیر تک اس کھیل کو جاری نہیں رکھتا تھا۔ شہاب الدین نے بھی گرم کمبل لپیٹ رکھا تھا اس کے باوجود سرد ہوا اس کے جسم کو کاٹتی محسوس ہوتی تھی۔ بھیگے کپڑوں والے کمزور سے بچے ٹھٹھر کر کانپ رہے تھے مگر وہ شخص تھا کہ احساس سے عاری اپنے کھیل میں مگن تھا اور ہنس رہا تھا۔

بالآخر شہاب الدین کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس نے کہا۔ ''اوئے ظالم کے بچے... دیکھتے نہیں کیا حالت ہو رہی ہے ان بچوں کی... لٹانے کے لیے اتنا پیسا ہے تو انہیں ایسے ہی دے دو۔''

سکے اچھالنے والے نے گردن گھما کے دیکھا۔ نظریں ملتے ہی وہ چلایا۔ ''اوئے غوری تو۔''

شہاب الدین نے کہا۔ ''شیر افضل۔'' اور دونوں دوست ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ دونوں بچے کچھ مایوس ہوئے کیونکہ ان پر ہونے والی سکوں کی بارش رک گئی تھی۔

شیر افضل ہنسا۔ ''سنار کی اولاد۔ تو یہاں کھڑا کیا غور کر رہا تھا۔ میں تو ان بچوں کو پیسے دے رہا تھا۔''

''میں دیکھ رہا تھا تیری دریا دلی اور سنگ دلی...

کپتان... اوئے پیسا ہے پانی میں پھینکنے کو تو انہیں ایسے ہی دے دے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ایسے نہیں غوری... ذرا غور کرو... یہ حقیر نہیں ہیں اور میں بنانا بھی نہیں چاہتا۔ یہ بڑی محنت سے کما رہے ہیں۔ خیرات نہیں لے رہے ہیں۔ قسمت آزما رہے ہیں۔"

"یار حالت دیکھ ان کی... کوئی مر گیا نمونیے سے پھر؟"

وہ پھر ہنسا۔ "اوئے نہیں یار۔ یہ عادی ہیں۔ ان کا روز کا یہی کام ہے۔ یہ میری تیری طرح نازک مزاج نہیں ہیں۔ انہیں کچھ نہیں ہوگا مگر خیر... تو کہتا ہے تو میں انہیں ایسے ہی دے دیتا ہوں۔"

شیر افضل نے دونوں بچوں کو اشارے سے قریب بلایا اور کوٹ کی ایک جیب سے سارے سکے نکال کر اسے دیے۔ پھر دوسرے کے لیے اس نے دوسری جیب خالی کر دی۔ "دیکھو... جیسا میں نے سمجھایا تھا۔ ویسا ہی کرنا۔ ٹھیک ہے؟ اب جاؤ۔" دونوں بچے سر ہلاتے ہوئے بھاگ گئے۔

غوری نے حیرانی سے کہا۔ "اتنے سکے لایا تھا تو؟"

"ہاں یار... میرا خیال تھا بچے زیادہ ہوں گے۔ مگر دو ہی قسمت والے تھے یہاں... آج ان کے گھر والے کتنے خوش ہوں گے بچوں کی کمائی سے۔"

"یہ کیسے سکے تھے... شیر افضل۔"

"یہ درہم تھے۔ میں نے بچوں کو سمجھا دیا تھا کہ ایک کے کتنے پاکستانی روپے ملیں گے۔ اور کہاں سے۔" وہ غوری کو ساتھ کھینچ کے چل پڑا۔

"درہم کہاں سے آئے تیرے پاس؟"

شیر افضل ہنس پڑا۔ "بنائے ہیں خود میں نے... گھر میں مشین لگا رکھی ہے... ابے ظاہر ہے دبئی سے لایا تھا میں۔"

"تو دبئی کیا لینے گیا تھا؟"

شیر افضل نے پل کے بعد کھڑی ہوئی گاڑی کا دروازہ کھولا۔ "چل بیٹھ۔ کبھی غور کیا تو نے آدمی پردیس کیوں جاتا ہے؟ دولت کمانے اور دولت وہیں مل سکتی ہے جہاں دولت ہو۔"

"یہ گاڑی بھی تیری ہے؟" شہاب الدین دم بخود بیٹھا رہا۔

"نہیں تو کیا میرے باپ نے تحفے میں دی ہے۔ وہ تو ابھی تک اپنی دیسی سائیکل پر پھرتا ہے۔ اپنی داڑھی ٹوپی کے ساتھ۔ مجھ سے بھی ناراض ہے اور چاچا سے بھی۔"

"تیرا چاچا تو ڈپٹی کمشنر تھا۔"

"اسی نے تو مجھے باہر بھجوایا تھا۔ ابا نے بڑی مخالفت کی۔ میں نے کہا کہ دبئی جا کے میں چوری، ڈاکا نہیں ڈالوں گا۔ محنت کروں گا... حق حلال کی روزی وہاں بھی کمائی جا سکتی ہے... مگر اس کی سمجھ میں بات نہیں آتی۔ اس کا خیال ہے کہ وہاں صرف بے حیائی ہے اور فحاشی ہے... دنیا کے مقابلے میں اسے اپنی آخرت سنوارنے کی بہت فکر ہے... میں نے کہا کہ تیری مرضی ابا... خیر تو اپنی سنا... کیا کر رہا ہے... غور کرنے کے علاوہ؟"

"میں رزلٹ کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"وہ تو آئے گا اپنے وقت پر... اس کے بعد... وہی سناروں والا کام؟"

"بہت غور کیا میں نے یار... اور کوئی کام سمجھ میں نہیں آتا۔ گھر کے حالات بھی ایسے ہیں کہ میں پھنس گیا ہوں... کہاں جاؤں؟"

دونوں دوست ایک ہوٹل میں چائے پینے بیٹھ گئے۔ شیر افضل نے کہا۔ "دیکھ یار... سونے کا بزنس کوئی معمولی نہیں ہوتا۔ یہ سبزی یا کریانے کی دکان نہیں کہ جو چاہے کر لے... لیکن اب بڑے بزنس کے لیے سرمایہ بھی بڑا چاہیے... وہ تمہارے پاس ہے نہیں۔"

"اسی لیے حالات تو روز بروز خراب ہو رہے ہیں... بڑے بڑے جیولرز کا مقابلہ ہم کیسے کریں... اور کوئی کام بھی کیا نہیں۔"

"میری مان پتر غوری... غور کرنا چھوڑ... ٹکٹ کٹا اور دبئی آ جا... اگر اس ملک میں رہے گا تو کنگال ہی رہے گا۔"

"یار اب ایسی بات بھی نہیں... یہاں سڑکوں پر گاڑیوں کی تعداد کو دیکھ... کوٹھیوں کو دیکھ۔"

"تو خود کو دیکھ... تو کیا کر سکتا ہے... نہ تیرے پاس مال بنانے کے لیے مال ہے... پیسے کو پیسا کھینچتا ہے۔ یہ پرانی بات ہے مگر آج بھی درست ہے... تیرے پاس کوئی بڑی ڈگری نہیں... تجھے کوئی کام نہیں آتا... یہاں کیا پلمبر، الیکٹریشن اور موٹر مکینک... کیا انجینئر... سب کا حال خراب ہے۔ بڑا افسر بننا بھی تیرے بس کی بات نہیں۔"

"پھر تو ہی بتا کہ میں کیا کروں؟"

"بتایا ہے نا... دبئی آ جا میرے پاس... جیسا تو ہے ویسا ہی اپنا حال تھا... کچھ نہیں آتا تھا... کچھ دن دھکے

کھائے اور سیکھ لیا۔ گیا تو مزدور تھا... پھر راج بن گیا... کام کرتے دیکھا دوسروں کو تو سب سمجھ میں آ گیا... ایک ٹھیکے دار نے نگرانی پر رکھ لیا... صرف ایک سال بعد میں نے خود ایک ٹھیکہ لے لیا... راج مستری، الیکٹریشن، پلمبر سب سے کام لینا آ گیا تھا... دبئی میں دنیا بھر کے دولت مند آتے ہیں... شیوخ ہیں جو پیسا پانی کی طرح بہاتے ہیں... ایک کی جگہ دس لٹاتے ہیں... سب سے تعلق پیدا کر لیا۔"

"مگر تجھے نہ عربی آتی تھی نہ انگریزی؟"

"یار تین مہینے لگتے ہیں۔ آدمی کا بچہ خود اپنے گھر کی زبان بولنے لگتا ہے یا نہیں... اسے کن پڑھاتا ہے... میں بھی ٹوٹی پھوٹی بولتا تھا مگر کام چلاتا تھا... رفتہ رفتہ روانی آ گئی... صرف دو سال ہوئے ہیں بیٹا... میں ٹھیکے دار بن گیا ہوں... ابھی بہت چھوٹا ٹھیکے دار ہوں... لیکن تو دیکھنا دس سال میں کیا بنتا ہوں... مجھے اس وقت ایک قابلِ اعتماد ساتھی کی ضرورت ہے... اسے میں پارٹنر بنا سکوں... جو بھروسے کے قابل ہو... اور تو نے کرکٹ کے میدان میں جس طرح میرا ساتھ دیا... میری مدد کی... میری کپتانی کا بھرم رکھا... وہ مجھے یاد ہے۔"

"لیکن... دبئی میں کیسے آؤں... تیرا تو چاچا ڈپٹی کمشنر تھا۔"

شیر افضل ہنس پڑا۔ "اوئے زرگر کی اولاد... یہ جتنے ایجنٹ ہیں... یہ سارے تیرے چاچے ہیں سمجھ لے... کوئی بھی تجھے بھجوا سکتا ہے... زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ کا نسخہ ہے۔"

"ایک لاکھ..." شہاب الدین کی سانس رک گئی۔ "وہ میں کہاں سے لاؤں گا؟"

"جہاں سے مرضی لا... چوری کر... ڈاکا ڈال... یہ تو قسمت کی لاٹری ہے... آج لاکھ لگا کے کل کروڑ بنا لو... ہمت نہیں تو پھر یہاں بیٹھ کے غور کرتا رہ... اسی طرح جی اور مر جیسے تیرے باپ دادا جیے اور مرے... اسی طرح کنویں کے مینڈک کی زندگی گزار... ورنہ زندگی کیا ہے... یہ پتا چلتا ہے جب دولت ہاتھ میں آئے... پہلے سکھوں کے پانچ کاف تھے۔ کنگھی... کیس کڑا کرپان اور کچھا... اب ساری دنیا کے ہیں۔ کیش... کاروبار... کوٹھی... کار ت کڑی... دنیا کی سب سے سوہنی کڑی بھی اپنی... کار بھی اپنی... کوٹھی بھی اپنی..." وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔ "دیکھ لے دبئی آ کے۔"

شہاب الدین ہکا بکا بیٹھا دوست کی باتیں سنتا رہا اور غور کرتا رہا کہ اس پیشکش سے فائدہ کیسے اٹھائے۔ شیر افضل نے عادت کے مطابق دبئی کی زندگی کا نقشہ کھینچنے میں خاصی مبالغہ آرائی کی تھی اور اس کی عادت سے واقفیت کے باوجود شہاب الدین اسے مکمل جنت کے طور پر قبول کرتا گیا۔ اسے دبئی اپنے خوابوں کی جنت ارضی نظر آتا جہاں دولت کا حصول آسان تھا اور عیاشی کے سارے اسباب ہر ایک کی دسترس میں تھے۔ وہ دور ہی ایسا تھا کہ "دبئی چلو" ہر نوجوان کے دل کی صدا بن گئی تھی۔ یورپ اور امریکا جانے کی خواہش اتنی عام نہ تھی۔ اس سے پہلے کوئی دور کی سوچتا تھا تو سعودی عرب چلا جاتا تھا۔

شیر افضل نے پوچھا۔ "اگر ارادہ بن جائے تیرا تو مجھے فون کر لینا۔ یہ میرا کارڈ رکھ لے۔ زیادہ غور مت کر۔"

شہاب الدین نے کارڈ کو بڑی عقیدت سے تھام لیا۔ "نہیں... میں ضرور آؤں گا۔"

☆☆☆

شہاب الدین کے لیے شیر افضل کی آمد اور اس سے ملاقات گویا تائیدِ ایزدی تھی۔ قدرت اسے راستہ دکھا رہی تھی اور مواقع فراہم کر رہی تھی۔ وقت سے فائدہ اٹھانا خود اس کی کوشش اور ہمت پر منحصر تھا۔ حوصلہ کرنے والی بات صرف ایک تھی۔ ایک لاکھ حاصل کرنے کا خیال کسی سمندری لہر کی طرح آتا تھا تو اس کے خوابوں کے ریت سے بنے محل برابر کر دیتا تھا۔

شیر افضل اس سے بعد میں صرف ایک بار ملا۔ اس سے پہلے پورا ہفتہ شہاب الدین نے دن رات یہ سوچتے گزارا کہ آخر یہ ایک لاکھ کہاں سے اور کیسے فراہم ہوں گے۔ الف پور میں اس کے دوست اور خاندان کے لوگ جان چکے تھے کہ شہاب الدین کن ہواؤں میں اڑ رہا ہے... ظاہر ہے وہ سب اس کا مذاق ہی اڑا سکتے تھے۔ اس کی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ باپ اس سے الگ ناراض تھا اور ماں کی حمایت حاصل نہ ہوتی تو شہاب الدین کو گھر میں نہ گھسنے دیتا۔ وہ اس کے مستقبل کی طرف سے سخت مایوس تھا۔

شہاب الدین کو چوری، ڈکیتی کا راستہ اختیار کرنے میں بھی تامل نہ ہوتا مگر الف پور میں صرف ایک بینک تھا۔ اسے لوٹنے کا سوال ہی نہ تھا۔ شہاب الدین کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں تھا اور دروازے پر کھڑا گارڈ بڑی آسانی سے ایک گولی چلا کے شہاب الدین کی کھوپڑی اڑا دیتا۔ یہی صورتِ حال جیولرز کی اور مالدار لوگوں کی تھی۔ وہ سب اسلحہ رکھتے تھے اور خود شہاب الدین میں اتنا حوصلہ کہاں تھا؟

بالآخر اس نے بے شرمی کا لبادہ اوڑھ کے اپنے

چھوٹے بھائی سے رجوع کیا۔ اس نے اپنے کریانہ اسٹور کو بہت پھیلا لیا تھا۔ اس نے گھر کی بیٹھک کو بھی دکان میں شامل کرلیا تھا اور کریانہ شاپ کا بورڈ ہٹا کے دگنی چوڑائی کے بورڈ پر فضل دین جنرل اسٹور لکھوایا تھا۔ اندر سے بھی دکان کی حالت میں نمایاں تبدیلی آئی تھی۔ اس میں سامان بڑھ گیا تھا۔ چاروں طرف دیواروں پر شیلف لگ گئے تھے اور فضل دین نے سامان تولنے کے لیے ایک لڑکا ملازم رکھ لیا تھا۔ وہ خود ایک کاؤنٹر کے پیچھے کرسی پر بیٹھا صرف پیسے وصول کرتا تھا۔

شہاب الدین کو اپنی دکان میں دیکھ کے وہ خوش بھی ہوا اور حیران بھی۔ اس نے بھائی کو اپنی کرسی دی اور خود اسٹول پر ٹک گیا۔ ٹھنڈی بوتل کا موسم نہ تھا۔ اس نے لڑکے کو بھیج کے قریب کے ہوٹل سے چائے منگوائی۔

''تمہارا کاروبار تو بہت ترقی کر رہا ہے۔'' شہاب الدین نے کہا۔

''بھاجی... محنت کرے بندہ تو پھل ملتا ہے۔'' فضل دین غرور سے بولا۔

شہاب الدین نے یہ کہنے سے گریز کیا کہ اسے تو بغیر محنت کیے ہی پھل دار درخت مل گیا تھا۔ ''بھرجائی کیسی ہے؟''

''اندر گھر میں جا کے خود ہی دیکھ لے... آج کتنے عرصے بعد تو نے اپنی شکل دکھائی ہے... وہ تو بہت یاد کرتی ہے سب کو۔''

شہاب الدین نے پھر سچ کے اظہار سے گریز کیا۔ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ اس کی بھابی نے ہی شوہر کو ورغلایا تھا۔ اکسایا تھا اور مجبور کیا تھا۔ اور گھر سے نکال کر لے جانے میں کامیاب رہی تھی۔ اس سے پہلے وہ گھر میں کتنا فساد برپا کر چکی تھی اور ساس سسر دیور سب سے کہہ چکی تھی... یہ شہاب الدین بھولا نہیں تھا... اس بھابی کے سامنے جا کے اس کی خیریت دریافت کرنا کسی پاگل کتے کے سر پر دستِ شفقت رکھنے کے مترادف ہوتا۔

''بھابی سے پھر آؤں گا تو ملوں گا... ابھی تو میں ایک کام سے آیا تھا... جو صرف تو کرسکتا ہے۔'' شہاب الدین نے چائے کی چسکی لی۔

فضل دین نے مسکرا کے سر ہلایا۔ ''ہاں... ویسے تو کسی کو ہماری یاد آئی نہیں... ماں باپ تک غیر ہو گئے ہمارے لیے... نہ پوتا پوتی اپنے رہے اور نہ بیٹا بہو... خیر تو کام بتا۔''

''پہلے وعدہ کر انکار نہیں کرے گا۔''

''بھاجی... غصہ مت کرنا... تمہارے بارے میں عجیب باتیں سنی ہیں میں نے... خاندان والے بھی کہتے ہیں اور تمہارے یار دوست بھی۔''

''ایسی کیا بات ہے فضل دین... میں بھی تو سنوں۔''

''ایک تو یہ کہ تم کسی مدھو بالا سے شادی کرنا چاہتے ہو جو فلموں میں کام کرتی ہے... تم نے ماں سے کہا تھا۔''

شہاب الدین نے برہمی سے کہا۔ ''فضل دین... تجھے اس دکان میں پڑی ہر چیز کا تھوک اور پرچون بھاؤ معلوم ہوگا... یا نہیں؟''

فضل دین حیرانی سے بولا... ''ہاں ہے مگر میری بات...''

''لیکن تجھے یہ معلوم نہیں کہ مدھو بالا جو فلموں میں کام کرتی تھی اسے مرے زمانہ ہو گیا۔ وہ تو میں نے صرف ماں کو تنگ کرنے کے لیے کہا تھا۔ وہ میری شادی کرانے کے چکر میں تھی۔''

فضل دین جھینپ کے بولا۔ ''بھاجی... میں نے تو زندگی میں کبھی کوئی فلم نہیں دیکھی... مجھے کیا معلوم... ماں کا تیری شادی کے لیے فکرمند ہونا بھی غلط نہیں... تیری بھی ضرورت ہے... اور اس کی ضرورت بھی۔''

''اور کیا سنا ہے تو نے؟''

''یہ بھی مشہور ہو رہا ہے کہ تو نے باپ کے ساتھ کام کرنے سے انکار کر دیا ہے... تو دبئی جا رہا ہے۔''

''ہاں... یہ سچ ہے... میں سوچ رہا ہوں... لیکن ایک مسئلہ ہے جس کے لیے تیرے پاس آیا ہوں۔'' شہاب الدین بولا۔

فضل دین کے کان کھڑے ہوئے۔ ''مسئلہ کیسا؟''

''بندوبست سارا ہو گیا ہے۔ دبئی میں نوکری بھی اچھی ملی ہے... کل پاسپورٹ بھی بنوالوں گا۔''

چھوٹے بھائی نے سکون کا سانس لیا کہ دبئی جانے والا اس سے ماں باپ کی ذمے داری کے موضوع پر بات کرنے نہیں آیا کہ یا انہیں اپنے پاس لے آیا خود ان کے ساتھ رہ۔ ''پھر تو کوئی مسئلہ نہیں... جا خیر سے۔''

''مسئلہ ہے رقم کا... ٹکٹ اور ویزا اور اوپر کے اخراجات کا جو بنتے ہیں تقریباً ایک لاکھ... ابھی تو میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے... لیکن دبئی میں جو ایک لاکھ ہو جائیں گے دو مہینے میں... زیادہ سے زیادہ تین مہینے میں تیری رقم لوٹا دوں گا... ابھی تو مجھے ایک لاکھ ادھار دے سکتا ہے؟''

فضل دین اسے شرمندہ کرنے والی نظروں سے دیکھتا رہا۔ ''اچھا! اس لیے آج تیرے خون نے جوش مارا... چھوٹا بھائی اس لیے یاد آیا۔''

''رشتہ ختم تو نہیں ہوا تھا... اور مصیبت میں یا ضرورت کے وقت کام بھی اپنے ہی آتے ہیں۔''

''بھاجی... کچھ پتا ہے لاکھ میں صفر کتنے ہوتے ہیں؟ میری اتنی بڑی دکان میں سارا سامان ایک لاکھ کا نہیں ہوگا۔ اور یہ دکان داری چلتی ہے ادھار کی پرچون فروشی پر... آٹا، دال، چاول لے جانے والے بھی سب نقد کے خریدار نہیں ہوتے... کچھ مہینے بعد دیتے ہیں تو کچھ دو یا تین مہینے میں... کچھ دیتے ہی نہیں... بے شک دیکھ لے میرے گلے میں جتنے ہوں تیرے۔''

''ایک لاکھ تیرے لیے مشکل نہیں... سب جانتے ہیں تو کتنا منافع لیتا ہے اور تیری روز کی سیل کتنی ہے۔''

''کتنی ہے... چل تو بتا دے۔'' فضل دین گرم ہو گیا۔

''کم سے کم دو ہزار۔''

''بکواس کرتے ہیں ایسی بات کہنے والے... اور بے وقوف ہیں جو اس پر اعتبار کرتے ہیں... لیکن تم تو بڑے عالم فاضل ہو بھاجی... یہ بتاؤ دنیا میں کوئی ادھار دیتا ہے... ضمانت لیے بغیر... بینک ہو... مہاجن یا سودخور... میں کہیں سے ایک لاکھ کر دوں تو واپسی کی کیا ضمانت ہوگی؟ نہ دیے تم نے تو کیا میں دبئی آ کے دعویٰ دائر کروں گا؟''

''مجھے پتا تھا تو بنیا ہو گیا ہے۔ ضمانت کی بات پہلے کرے گا۔ دیکھ ہمارا باپ زرگر ہے... یہاں اس کی ساکھ ضرور ہے... اس کا ایک مکان ہے اور دکان بھی مارکیٹ میں ہے... اس کے وارث ہم دونوں ہیں... میں اپنا حصہ تیرے حق میں چھوڑتا ہوں۔''

فضل دین ہنس پڑا۔ ''تو باپ کی دکان اور اس کے مکان کو گروی رکھنے کی بات کر رہا ہے؟ کیا مالیت ہوگی اس کی... آدھا تو میرا حصہ نکال دے... اس کے علاوہ... کیا ابا اشٹام لکھ کر دے گا؟ پہلے جا کے اس سے پوچھ لے... پھر آنا میرے پاس... چائے پی لی نا... اب جا... دکان داری کا ٹائم ہے۔''

شہاب الدین نے سخت بے عزتی محسوس کی لیکن یہ مایوسی غیر متوقع نہیں تھی۔ اس کی جیب میں دس لاکھ پڑے ہوتے تب بھی وہ ایک لاکھ نہ نکالتا۔ اسے اتنی پروا ہوتی خون

کے رشتوں کی تو گھر چھوڑتا ہی کیوں... دنیا میں رشتے کی کوئی اہمیت نہیں رہی... سب کا خون سفید ہو گیا ہے... وہ واپس آتے ہوئے اندر ہی اندر کسی سوئے ہوئے آتش فشاں کی طرح کھولتا رہا۔

ماں دیکھ رہی تھی کہ وہ کسی بڑی پریشانی میں مبتلا ہے۔ کام کی بات تو اس سے کرنا ہی لاحاصل تھا... وہ نہ جانے کیا کرنا چاہتا تھا... کچھ لوگوں نے اسے بتایا تھا کہ وہ کہیں باہر جانے کے چکر میں ہے... رات کو اس نے کھانا بھی نہیں کھایا اور منہ لپیٹ کر سوتا بن گیا۔ آدھی رات کو بھوک نے ستایا تو اس نے اپنے حصے کا بچا ہوا کھانا کھایا اور پھر سو گیا۔ غور کرتے کرتے غوری کی حالت غیر غور گئی تھی مگر مسئلے کا حل ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ ایک لاکھ کہاں سے ہوں؟ یہ سوال اس کے سامنے پہاڑ بن کے کھڑا تھا۔

اگلے روز اس نے شیر افضل کو تلاش کیا اور اس کے گھر جا پہنچا۔ وہ سفر کی تیاری میں مصروف تھا۔ ''کل میں جا رہا ہوں... تو نے کیا سوچا؟''

''کیا سوچوں یار... مسئلہ ایک لاکھ روپے کا ہے۔''

''میں نے کارڈ کے پیچھے ایجنٹ کا نام لکھ دیا تھا۔ اچھا بندہ ہے۔ پیسا لیتا ہے تو کام ضرور کرتا ہے۔ پیسوں کا انتظام ہو جائے تو اس سے مل لینا، وہ تجھے دھوکا نہیں دے گا۔ دبئی کا کہہ کے مکران کے ساحل پر نہیں اتارے گا... آگے میری ذمے داری۔''

''شیر افضل۔'' شہاب الدین نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''تو کچھ انتظام نہیں کر سکتا؟ آؤں گا تو میں تیرے پاس... میری آمدنی تیرے ہاتھ میں ہو گی... اپنا قرض وصول کر لینا۔''

شیر افضل نے دوست کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''اس بات کی ضمانت ہوتی کہ تو دبئی ضرور آئے گا تب بھی میں انکار ہی کرتا۔ تو نے دیکھا نہیں... ہر جگہ لکھا ہوتا ہے... ادھار محبت کی قینچی ہے... یہ کام مشکل ضرور ہے... ناممکن نہیں ہے... کوشش جاری رکھ۔ صرف غور نہ کر... اللہ بھی ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔''

دوست کی ساری باتیں کتابی تھیں۔ بھائی نے اپنے طریقے سے انکار کیا تھا۔ دوست نے اپنے طریقے سے۔ شہاب الدین نے خود کو بہت اکیلا اور بے سہارا محسوس کیا... لیکن ابھی وہ مایوس نہیں ہوا تھا۔ اس نے غور کرنا جاری رکھا۔ لوگ اس کا مذاق اڑاتے رہے... اس پر ہنستے رہے۔ اس پر آوازے بھی کستے گئے... ارے ہمارا دلیپ کمار دبئی جا رہا ہے مدھو بالا سے شادی کرنے... وہ جہاں جاتا ایسے نعرے سنتا۔

پھر اس وقت جب دبئی کا خیال چھوڑ کے وہ باپ کے کاروبار کو سنبھالنے اور جدید خطوط پر ترقی دینے کے امکانات پر غور کرنے لگا تھا، دستِ قدرت نے وقت کی بساط پر ایک نئی چال سے حالات کا رخ بدل دیا۔ ماں اس کے لیے مولوی صاحب سے تعویذ لائی تھی جو اس نے بڑی ہوشیاری سے شربت میں گھول کے شہاب الدین کو پلا دیا۔ وہ لاہور میں داتا صاحب کے مزار پر دیگ تقسیم کرا چکی تھی... خیر دین کو بھی سیانوں نے صبر سے کام لینے کا مشورہ دیا تھا چنانچہ شہاب الدین پر اب کوئی دباؤ نہیں تھا۔ نہ کام کے لیے نہ شادی کے لیے۔

ایک صبح وہ ناشتا کر رہا تھا کہ خیر دین نے بڑی شفقت سے کہا۔ ''پتر شہاب الدین اور کوئی کام نہیں تو میرے ساتھ چل۔''

''کہاں جانا ہے ابا؟'' شہاب الدین نے شرافت سے پوچھا۔

''اپنے چودھری صاحب نے بلایا ہے۔ کہا ہے نئے ڈیزائن لے کر آؤ۔ ان کے اور ہمارے کاروباری تعلقات تیرے دادا کے زمانے سے ہیں۔ چودھری صاحب سے پہلے ان کے والد مرحوم بڑے قدرداں تھے۔ خاندان میں کوئی شادی ہو... لڑکے کی یا لڑکی کی... زیور ہم نے ہی بنایا۔''

''اب کس کی شادی ہے؟''

''یہ تو جا کے ہی پتا چلے گا... اچھا ہے تو بھی ان سے مل لینا۔ وہ پوچھ رہے تھے۔'' یہ آخری جھوٹ بات میں اثر پیدا کرنے کے لیے تھا۔

☆☆☆

چودھری عبدالغفور بہت بڑے زمیندار تھے۔ ان کے والد نے صوبائی اسمبلی کی سیٹ بھی جیتی تھی۔ اب یہ سیٹ سب سے بڑے بیٹے کے پاس تھی اور چار بھائیوں میں عبدالغفور سب سے چھوٹے تھے۔ ان کے باقی دو بھائی ایک شوگر مل کے مالک تھے۔ تاہم بھائیوں نے باپ کی جائداد تقسیم کر لی تھی اور ان کے درمیان اثر رسوخ کی سرد جنگ نے بیگانگی پیدا کر دی تھی۔ مرا ہاتھی سوا لاکھ کا... چودھری عبدالغفور نے زمینداری کو خوب بڑھایا تھا۔ وہ سال کے سال باغات کے ٹھیکے دے کر لاکھوں کماتے تھے۔ ان کی اصل عزت تھی، ان کی وضعداری اور شرافت سے۔ ان کا سلوک ہر ایک سے مربیانہ رہتا تھا۔

وہ حویلی کے گرد کھنچی ہوئی چار دیواری کے ایک دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ وسیع باغ سے گزرے۔ ایک ملازمہ نے انہیں قدیم طرز سے آراستہ بیٹھک میں پہنچا دیا۔ شہاب الدین اس کی آرائش کو دیکھتا رہا اور یہ غور کرتا رہا کہ کیا اپنی زندگی میں وہ کبھی ایسی حویلی کا مالک بن سکے گا؟

چودھری صاحب اپنی بھاری بھرکم بیوی کے ساتھ آئے تو خیر دین کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے تعارف کرانے پر شہاب الدین سے بھی ہاتھ ملایا پھر ان کے لیے لسی لائی گئی۔ چودھری صاحب نے بتایا کہ وہ حج کے لیے گئے تھے تو کچھ سونا خرید لائے تھے۔ ''وہاں کا مہر والا بسکٹ خالص سونے کا ہوتا ہے۔ یہ تو تم جانتے ہو گے؟''

خیر دین بولا۔ ''جناب عالی مکے مدینے کے سونے کا کیا مقابلہ۔''

''اب ہمارا خیال ہے آنے والی شادی کی تیاری کریں۔ اس کے لیے بلایا ہے تمہیں۔''

''اگر نئے ڈیزائن ہیں تو دکھاؤ۔'' چودھرائن نے نخوت سے کہا۔

خیر دین نے یہ پوچھنا ضروری نہیں سمجھا کہ شادی بیٹے کی ہو گی یا بیٹی کی۔ ان کے دونوں بچے اس عمر کو پہنچ گئے تھے کہ وہ جس کی چاہیں شادی کر دیں اور ایک زرگر کو فضول سوالات سے گریز کرتے ہوئے صرف زرگری کرنا چاہیے... یہ خبر خیر دین کو پہلے ہی مل چکی تھی لیکن کسی مصروفیت کے باعث چودھری صاحب نے اسے ایک ہفتے کی تاخیر سے طلب کیا۔ خیر دین نے اس مہلت کو غنیمت جانا اور جب بیوی نے اسے داتا صاحب کے مزار پر چادر چڑھانے اور دیگ تقسیم کرنے بھیجا تھا تو وہ لاہور کے صرافوں سے کچھ نئے ڈیزائن مانگ لایا تھا۔ وہاں باہر کے جدید ترین ڈیزائن آجاتے تھے تو پرانے ہو جانے والے ڈیزائن ان کے ملازم چھوٹے شہروں کے صرافوں کو اچھی قیمت پر کاپی کر کے دے دیتے تھے۔

یہ ڈیزائن خیر دین نے چودھرائن کے سامنے پھیلا دیے۔ صبح سے دوپہر ہو گئی۔ گھر کے اندر سے ان کی دوسری بیگم کو بھی مشاورت میں شامل کر لیا گیا۔ چند ڈیزائن فائنل ہوئے... پھر کھانا آ گیا... خیر دین بہت خوش تھا اس کی محنت رائگاں نہیں گئی۔ کھانے کے بعد چودھری صاحب پھر اپنی فیملی کے ساتھ نمودار ہوئے تو ان کے ساتھ ایک بیٹی بھی تھی۔

شہاب الدین کے ہوش و حواس پر تو جیسے بجلی گر گئی۔ وہ بنی بنائی جیتی جاگتی مدھو بالا تھی جو ایک بار پھر جنم لے کر اس کے سامنے آ بیٹھی تھی مگر اس کا نام شبو تھا... وہ تو باپ نے اس کی محویت کو دیکھ لیا اور پیر سے ٹھوکر مار کے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں خبردار کر دیا ورنہ اس کا شبو کو یوں نظر جما کے گھورنا ایسی گستاخی بن جاتا جس کی پاداش میں وہ آرڈر سے محروم کر کے اور بے عزت کر کے حویلی سے نکالے جاتے۔

صرف شبو تھی جس نے شہاب الدین پر اپنے حسن کے جادو کا اثر دیکھ لیا تھا... پوری کوشش کے باوجود شہاب الدین خود کو بار بار نظر اٹھا کے شبو کو دیکھنے سے روک نہ سکا اور ہر بار اسے شبو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کے اور اس کی آنکھوں میں سوال دیکھ کر عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی۔ وہ سترہ اٹھارہ سال کی صحت مند لڑکی فتنہ حشر تھی... شہاب الدین نے مدھو بالا کی فلم محل دیکھی تھی۔ شبو بھی جیسے مدھو بالا کی روح تھی جو اس کے پیکر میں اچانک نمودار ہوئی تھی۔

خواتین کی ساری توجہ ڈیزائنوں کی طرف تھی۔ چودھری صاحب کا وہاں موجود رہنا مجبوری تھا۔ انہوں نے شہاب الدین سے پوچھ لیا۔ ''تم بھی ابا کے ساتھ ہی کام کرتے ہو... کیا نام ہے تمہارا؟''

شہاب الدین چونکا۔ ''جی... شہاب الدین جناب عالی۔''

''کچھ پڑھا لکھا بھی ہے؟''

شہاب الدین کا اعتماد لوٹ آیا۔ ''فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کیا تھا جناب... آگے پڑھنا چاہتا تھا... بی اے، ایم اے بھی کرتا۔''

''پھر کیا کیوں نہیں؟''

اب خیر دین نے مداخلت ضروری سمجھی۔ ''چودھری صاحب... یہ ہمارا خاندانی کام ہے ایک نے نہیں کیا... دوسرا تو کرے گا... اب آپ کو میں ایک خاص ڈیزائن دکھاتا ہوں... مجھے سابق مہاراجہ کشمیر گلاب سنگھ ڈوگرا کے خاندانی صراف کے بیٹے نے دیا تھا۔ ان کا لاہور میں بڑا کاروبار ہے۔''

خیر دین کو ڈر تھا کہ کہیں بیٹا اپنے دبئی جانے کی خواہش کا ذکر نہ کر بیٹھ جائے۔ اس نے جو کہانی سنائی تھی سو فیصد جھوٹ پر مبنی تھی مگر یہ ناممکن تھا کہ اس کا خواتین پر اثر نہ ہوتا۔ اپنے ڈیزائن بھی اس نے ایک ایک کر کے نکالے تھے۔ جیسے ماہر کھلاڑی تاش میں ترپ کے پتے چلتا ہے۔ اسے آخر... بڑا آرڈر بھی مل گیا۔ خوشی سے خیر دین کا وہ حال ہوا کہ اس کا گلا خشک ہو گیا۔

پانی کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے خیر دین نے چودھری

صاحب کی بڑی بیٹی شبو کو باپ کے کان میں کچھ کہتے دیکھا۔ چودھری صاحب نے جب شہاب الدین کی طرف دیکھا تو اس کے باپ کا دل ڈوبنے لگا۔ کیا اس نے باپ سے شہاب الدین کی گستاخ نگاہی کی شکایت کر دی ہے؟ ایسا ہوا تو... خیر دین کی آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا۔

مگر چودھری صاحب نے کہا۔ ''شہاب الدین... فرسٹ ڈویژن لی ہے تم نے... انگریزی کیسی ہے تمہاری؟''

شہاب الدین نے دھڑکتے دل سے کہا۔ ''میرے امتیازی نمبر تھے جناب عالی... اسی فیصد۔''

چودھری صاحب نے سر ہلایا۔ ''پھر کچھ وقت نکالو۔ ہماری بیٹی کو انگریزی مشکل لگتی ہے... اس سال نویں کا امتحان دے گی پرائیویٹ۔''

''جیسا آپ کا حکم جناب عالی۔'' شہاب الدین نے پوری کوشش سے شبو کی طرف نہیں دیکھا لیکن وہ شبو کی مسکراہٹ کے اجالے کو کسی روشنی کی طرح کمرے میں پھیلتا محسوس کر سکتا تھا۔

مگر خیر دین کے لیے یہ پریشانی اور خوف کا لمحہ تھا جس نے اس کی ساری خوشی کو نگل لیا۔ وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ جب اس کا بیٹا اس لڑکی کو پڑھائے گا تو کیا ہوگا... وہ اپنے بیٹے کی عادت اور فطرت کو سمجھتا تھا۔ اس کے خیالات کی بلند پروازی سے بھی واقف تھا۔ اور اس نے دنیا دیکھی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ شہاب الدین جیسا نوجوان کسی شبو جیسی لڑکی کو انگریزی پڑھائے یا حساب... استاد شاگرد کے رشتے کو عاشق معشوق کے رشتے میں بدلتے دیر نہیں لگتی کیونکہ حالات اور ماحول خود اس کے لیے سازگار ہوتے ہیں... یہ ہو سکتا تھا کہ شبو کے ساتھ اس کی ماں یا کوئی خادمہ بھی پہرے داری کے لیے موجود ہے لیکن محبت کے پیغامات کا تبادلہ نظروں ہی نظروں میں ہو جاتا ہے اور عہد و پیمان کے مرحلے نوٹ بکس میں طے ہوتے ہیں... چوکیدار کتنے ہی چوکس کیوں نہ ہوں۔

جو بات ناگزیر تھی، وہ اس عشق کی خوشبو پھیلنے کی تھی جسے سات پردوں میں بھی نہیں چھپایا جا سکتا تھا... اس کے بعد کیا ہو سکتا تھا یہ صرف خیر دین جانتا تھا... شہاب الدین نے تو سوچے سمجھے بغیر ہاں کر دی تھی... نہ صرف یہ کاروباری نقصان انہیں ختم کر دے گا بلکہ عین ممکن ہے شہاب الدین کو چوری، ڈکیتی جیسے جھوٹے الزام میں پولیس اتنا مارے کہ وہ معذور ہو جائے یا مارا جائے... خیر دین، کے لیے الف پور کی زمین تنگ ہو جائے... چنانچہ اس نے صورتِ حال کو خراب ہونے کی نوبت آنے سے پہلے ہی سنبھال لیا۔

اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''معاف کرنا چودھری صاحب... آپ سے تو کچھ پوشیدہ نہیں... ایک پہلے ساتھ چھوڑ چکا... یہ بھی پڑھنے پڑھانے کے چکر میں پڑا تو میں بوڑھا آدمی اکیلا رہ جاؤں گا... بڑی مشکل سے اس کو اپنے ساتھ کام پر لگایا ہے۔''

شہاب الدین کے احتجاج سے قبل ہی چودھری صاحب نے اپنا فیصلہ صادر فرما دیا۔ ''ٹھیک ہے خیر دین... ہم کوئی اور انتظام کر لیں گے... تمہارا ایک مددگار تو ہونا چاہیے ورنہ یہ کام وقت پر مکمل کیسے ہوگا۔''

حویلی سے واپس آتے ہوئے جہاں خیر دین اتنا بڑا کام ملنے پر بہت خوش تھا وہیں اس کا بیٹا اُداس اور گم صم تھا۔ اس نے بیٹے کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہا۔ ''دیکھ قسمت کتنی مہربان ہے تجھ پر... تو میرے ساتھ گیا اور اتنا بڑا کام مل گیا... اس سے ہماری حالت بدل جائے گی... ہماری شہرت بھی ہوگی اور کم سے کم پچاس ہزار کا فائدہ... انشاء اللہ سال چھ مہینے میں ہم دکان کو بڑھا لیں گے اور جیولر بن جائیں گے۔''

شہاب الدین نے بے خیالی میں کہا۔ ''چودھری صاحب کی... بیٹی بالکل مدھو بالا ہے۔''

خیر دین دم بخود رہ گیا۔ بیٹا ابھی تک شبو کے تصور میں اتنا گم تھا کہ باپ کی کوئی بات نہیں سن رہا تھا۔ عقل مندی اس نے یہ کی کہ کسی فوری ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ ''یہ مدھو بالا ہے کون آخر؟''

شہاب الدین نے جیب میں سے ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر برآمد کی۔ ''یہ ہے مدھو بالا... تو خود دیکھ لے... شبو ہے یا نہیں؟''

باپ نے تصویر لے لی مگر بیٹے کی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا... وہ خود بھی دیکھ رہا تھا کہ تصویر درحقیقت شبو کی ہے جسے وہ مدھو بالا کی بتا رہا ہے۔ ''یہ رہتی کہاں ہے؟''

شہاب الدین ہنسنے لگا۔ ''ابا... اس کی تو قبر میں ہڈیاں بھی گل گئی ہوں گی۔ ایک دوست کے گھر میں اس کی فلم ''محل'' دیکھی تھی۔ پھر ''ترانہ'' جس میں یہ دلیپ کمار کے ساتھ آئی تھی۔ آخری فلم ''مغلِ اعظم'' رنگین تھی۔ دلیپ کمار کے ساتھ... لیکن یہ تصویر فلم محل کی ہے۔''

خیر دین کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ سیالکوٹ میں اس کے بیٹے نے پڑھا تھا وہ خود کئی بار گیا تھا۔ وزیر آباد سے آگے

لاہور تھا جہاں میکلوڈ روڈ پر بہت سینما تھے اور ایبٹ روڈ پر بھی... مگر نہ تو اس نے کبھی فلم دیکھی تھی... نہ کسی پوسٹر کی طرف دھیان دیا تھا اور نہ کسی سے فلموں کی بات سنی تھی۔ اس نے تصویر بیٹے کو بلاتبصرہ واپس کردی۔

''تو نے مجھے پڑھانے سے کیوں روک دیا تھا ابا؟'' شہاب الدین نے گھر پہنچ کے سوال کیا۔

''نہیں... روکا تو نہیں تھا... اپنا مسئلہ بیان کیا تھا۔'' باپ نے کسی سیاسی مدبر کی طرح وضاحتی بیان جاری کیا۔ ''باقی چودھری صاحب کی مرضی۔''

''میں پڑھاؤں گا ان کی بیٹی کو... اور تیرے ساتھ کام بھی کروں گا... پھر تو تجھے اعتراض نہیں ہوگا نا؟''

خیر دین نے خاموشی اختیار کی... اس کے ذہن میں خطرات کے گہرے سیاہ بادل پھر امڈ آئے تھے مگر اس نے دفاعی حکمتِ عملی اختیار کی اور ایک سیاسی چال چلی کہ صورتِ حال کو خراب ہونے سے بچالیا۔ اگلے دن شہاب الدین نے چودھری صاحب کو اپنی رضامندی سے آگاہ کردیا کہ وہ ان کی بیٹی کو انگریزی پڑھائے گا لیکن اس کی امیدوں پر اوس پڑ گئی جب شام کو چودھری صاحب کا منشی یہ جواب لایا کہ شبو رانی کے لیے ایک استانی کا بندوبست کرلیا گیا ہے جو ہر روز شہر سے چودھری صاحب کی موٹر میں آئے گی اور جائے گی۔

دبئی کا بھوت ابھی تک شہاب الدین کے سر سے اترا نہیں تھا مگر مجبوریِ حالات کے باعث اس نے بہت غور کرنے کے بعد اس پروگرام کو ملتوی کردیا... اگر چودھری صاحب کے کام سے پچاس ہزار کا منافع ملتا ہے تو اس کا آدھا کام ہوجائے گا۔ پھر باقی پچاس ہزار بھی ہو ہی جائیں گے... سو تولہ سونے کی قیمت کیا ہوگی؟ خیر دین کا اعتبار قائم ہے... اگر وہ اس میں صرف دس فیصد ملاوٹ کردے یا دس تولہ کم کردے... چودھری صاحب کون ساوزن کریں گے یا کسوٹی پر سونے کو پرکھیں گے۔

بجلی کی طرح ذہن میں آنے والے اس خیال نے شہاب الدین کے جسم میں بجلی بھر دی۔ یہ ہوسکتا تھا... یہ مشکل تھا، ناممکن نہیں... شہاب الدین پرانے وقتوں کا آدمی تھا۔ نیکی، ایمانداری اور سچائی کے اصولوں پر قائم رہنے والا... خدا سے اور خدا کے بندوں سے بھی ڈرنے والا... اسے سمجھانے اور قائل کرنے میں بڑی محنت کرنا ہوگی۔ وہ آسانی سے ماننے والا نہیں ہے... اس کے لیے مشکل طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔

عادت کے مطابق اس نے غور کیا... بہت غور کیا اور غور کرنا جاری رکھا... پھر ایک حکمتِ عملی کے ساتھ وہ باپ کا اچھا بیٹا بن گیا... اس نے باپ کے ساتھ دل لگا کے کام کرنا شروع کیا اور اس کا دل خوش کرنے والی باتیں کرتا رہا تاکہ وقت آنے پر وہ اس سے اپنی بات منوا سکے۔

اس نے شیر افضل سے بھی فون پر بات کی اور کہا کہ وہ رقم کا بندوبست ہوتے ہی دبئی پہنچ جائے گا۔ اپنے خوابوں کی سلطنت کو وہ بھول کیسے سکتا تھا۔ وہ باتوں باتوں میں اپنے باپ سے زیادہ ماں کو دبئی کے قصے سناتا رہا... اس کی آنکھوں کے لیے وہ خواب بنتا رہا جو اس نے کبھی نہ دیکھے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ عورتیں کتنی خواب پرست ہوتی ہیں اور ماں کی ممتا کو کیسے ایکسپلائٹ کیا جاسکتا ہے۔

ماں بدستور اس کا گھر بسانے کی فکر میں رہتی تھی۔ اس نے مزید لڑکیاں دیکھی تھیں جو ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ ماں کو قابو کرنے کے لیے اس نے ترپ کے پتے کے طور پر اپنی مشروط رضامندی کا اظہار کردیا۔ ''تو مجھے صرف ایک سال کی مہلت دے دے۔''

''ایک سال بعد کیا ہوگا؟'' ماں نے پوچھا۔

''ایک سال میں دبئی میں لگانا چاہتا ہوں... صرف ایک سال میں ہمارے پاس پکی حویلی ہوگی... ایک کار...''

''مجھے پتا ہے ایک سال بعد کیا ہوگا... تو مجھے چکر دے رہا ہے... تو لوٹ کے آئے گا ہی نہیں۔''

اس نے ماں کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''میں تیرے سر کی قسم کھا کے کہتا ہوں... تو کہے تو قرآن بھی اٹھا سکتا ہوں... میں واپس آؤں گا اور ایک سال بعد جہاں تو کہے گی شادی کرلوں گا۔ میں تجھے ناراض کیسے کرسکتا ہوں... میری جنت تو تیرے قدموں کے نیچے ہے۔''

مائیں بہت بھولی اور اعتبار کرنے والی ہوتی ہیں۔ دنیا جھوٹی ہو یا دھوکے باز... ان کا بیٹا نہیں ہوسکتا... جذباتی ڈائیلاگ ان کی مزاحمت کو ایسے ختم کردیتے ہیں جیسے دھوپ میں برف... شہاب الدین کی ماں بے وقوف بھی تھی نہ اس کے پاس تعلیم تھی اور نہ اس نے الف پور سے آگے کی دنیا دیکھی تھی۔ وہ ایک بیٹا گنوا چکی تھی۔ دوسرے پر بھروسا کیسے نہ کرتی۔ اس نے کہا کہ وہ خیر دین سے بات کرے گی۔

خیر دین اگر ایمانداری کے قلعے کی فصیل تھا تو بیوی اس فصیل میں داخلے کا راستہ تھی... شہاب الدین نے یہ دروازہ کھول لیا تھا۔

☆☆☆

شہاب الدین نہر کے پل پر اکیلا کھڑا نیچے سے بہنے والے چائے کے رنگ کے پانی کو دیکھ رہا تھا۔ غوطے مار کر سکے نکالنے والے بچے آج زیادہ سردی کی وجہ سے موجود نہ تھے۔ پل پر سے سائیکلوں کے علاوہ اِکّا دُکّا موٹر سائیکل بھی گزر جاتی تھی... ایک بس وزیر آباد کی طرف سے آئی تو وہ جنگلے سے لگ گیا۔ پل کی چوڑائی اس بس سے کچھ ہی زیادہ تھی۔ معمولی سی تیز رفتاری کے باعث ایک بار قابو سے باہر ہو جانے والی بس نہر میں جا گرتی تھی اور اس میں سوار وہ سب بچے ڈوب گئے تھے جو اسکولوں سے واپس آرہے تھے۔

اچانک زنانہ آواز میں اپنا نام سن کر شہاب الدین چونک پڑا۔ ''ذرا ادھر بھی غور کرو غوری صاحب!'' یہ الفاظ سیاہ ریشمی برقع میں چھپی ہوئی ایک لڑکی نے کہے تھے جو اس سے چند قدم دور کھڑی تھی۔

''آپ... آپ نے... مجھ سے کچھ کہا؟'' وہ بولا

''اور کون ہے یہاں؟'' لڑکی نے اسے ڈانٹا۔

''چلو۔''

وہ چل پڑا۔ پل پر ان کے سوا کوئی نہیں تھا۔ لڑکی اس سے دس قدم آگے جارہی تھی اور شہاب الدین سحر زدہ سا اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ اس کی عقل یہ سوچ کے خبط ہو رہی تھی کہ اتنی بے تکلفی سے اس کو مخاطب کرنے والی لڑکی کون ہوسکتی ہے... وہ ڈھلوان پر احتیاط سے چلتی پل کے نیچے جارہی تھی اور اس نے ایک بار بھی مڑ کے نہیں دیکھا تھا کہ اشارے سے طلب کیے جانے والا پیچھے ہے یا نہیں۔

پل کے نیچے آتے ہی اس نے نقاب الٹ دیا اور شہاب الدین پر جیسے بجلی گر گئی۔ وہ ہکّا بکّا حواس باختہ اور مفلوج کھڑا اپنی مدھوبالا کو دیکھتا رہا۔ اس کی زبان گنگ تھی۔

''اب کیا ایسے ہی بت بنے کھڑے رہو گے؟''

''آپ... چودھری صاحب کی صاحب زادی ہیں؟''

وہ ہنس پڑی اور آسمان سے جیسے بارش کے قطرے گھنگرو بن کے برسنے لگے۔ ''یہ تم کیسے بات کرتے ہو... میں شبو ہوں۔''

شہاب الدین سنبھل گیا۔ ''یہ میں کیسے بھول سکتا ہوں... کہ تم شبو ہو۔''

وہ اسے دیکھتی رہی۔ ''پھر تم نے مجھے پڑھانے سے انکار کیوں کیا؟''

''میں نے... میں نے تو پیغام بھیجا تھا... میں آنا چاہتا تھا... تمہارے والد نے منع کردیا۔''

''انہوں نے تو خود کہا تھا تم سے... میرے سامنے اور میرے ہی کہنے پر۔''

''لیکن بعد میں اپنے منشی سے کہلوا دیا کہ تمہارے لیے کسی استانی کا بندوبست کرلیا گیا ہے... جو تمہاری کار میں ہر روز شہر سے آئے گی۔''

شبو اپنے ہونٹ کاٹتی رہی۔ ''یہ منشی نے خود تم سے کہا؟''

''میری تو بات نہیں ہوئی... ابا سے کہا تھا۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''سب سمجھ گئی میں۔ اب تم چھوڑو ساری باتیں... کل سے... بلکہ آج شام سے آجاؤ۔''

شہاب الدین کا رُواں رُواں مسرت سے سرشار ہو گیا۔ ''تم مجھ سے صرف یہ کہنے آئی تھیں... ڈر نہیں لگتا تمہیں... کہ کوئی دیکھ لے گا؟''

''کیا دیکھ لے گا... اور دیکھنے والا ہے کون؟'' وہ ہنس پڑی۔ ''مجھے پہچانے گا کیسے برقع میں؟''

''ایک سچ کہوں... تم برا تو نہیں مانو گی... تم سے زیادہ حسین لڑکی میں نے نہیں دیکھی... شاید ہو بھی نہیں سکتی۔''

اس کا چہرہ گلنار ہوا۔ ''اچھا جی... کتنی لڑکیاں دیکھ چکے ہیں آپ اور کتنی دنیا گھوم چکے ہیں؟''

وہ ہکلایا۔ ''یہ میرا خیال ہے... بلکہ یقین ہے۔''

''میں نے تو کچھ اور سنا ہے کہ تم مدھوبالا سے شادی کرنا چاہتے ہو؟'' اس نے چہرے پر نقاب ڈال لیا۔

شہاب الدین نے جیب میں سے مدھوبالا کی تصویر نکالی۔ ''ہاں... اسی لیے تمہاری تصویر لیے پھرتا ہوں۔''

شبو نے ہاتھ بڑھا کے تصویر لے لی اور نقاب اٹھا کے اسے غور سے دیکھتی رہی۔ ''میری تصویر تمہارے پاس کہاں سے آئی؟ اور آخر یہ مدھوبالا کون ہے... میں نے سنا ہے کوئی ایکٹرس تھی۔''

''بہت عرصہ ہوا وہ مر گئی... یہ تم ہو... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟'' شہاب الدین مسکرایا۔

شبو بھی مسکرائی لیکن اس مسکراہٹ نے شہاب الدین سے وہ سب کہہ دیا جو لفظوں کی زبان میں کہنا ممکن نہ تھا۔ اس نے دوبارہ نقاب ڈال لیا۔ ''میں انتظار کروں گی شام کو۔''

''میں شام کا انتظار کروں گا۔'' شہاب الدین نے بے اختیار کہا اور شبو کو قدم جما کے پُل پر جاتا دیکھتا رہا۔ پل پر سے گزرنے والے ایک سائیکل سوار نے اسے حیرانی یا شک سے دیکھا مگر سیدھا نکل گیا۔ شبو نے اطمینان سے پل عبور کیا

اور ایک طرف کھڑی کار میں بیٹھ کے لوٹ گئی۔ شہاب الدین کو معلوم نہ تھا کہ وہ اپنی کار خود ہی ڈرائیو کرتی ہے۔

اگلے دس دن میں وہ سب ہو گیا جو شہاب الدین کے لیے غیر متوقع تھا۔ ناممکن تھا۔ اسے دنیا میں ہی ایک جیتی جاگتی مدھوبالا مل گئی تھی۔ وہ مدھوبالا جس کے لیے آج بھی کہا جاتا ہے کہ اس سے زیادہ حسین عورت نہ پردۂ سیمیں پر تھی اور نہ ہو گی۔ ایک اور جنم لے کر وہ شبو کے روپ میں شہاب الدین کے سامنے آ گئی... اس کے ہوش و حواس پر چھا گئی تھی۔ سچ مچ اسے مل گئی تھی۔

ایک پرانی مکروہ صورت خادمہ سبق کے دوران موجود رہتی تھی اور اس کی نظر ایک لمحے کے لیے نہیں چوکتی تھی مگر وہ دلوں کی زبان میں ہونے والی گفتگو کیسے سن سکتی تھی... نظروں کے پیغام کو کہاں سمجھ سکتی تھی جو پیار کے خفیہ کوڈ میں ہر لمحہ دیے جا رہے تھے... ان محبت ناموں کو کیسے پڑھ سکتی تھی جو نوٹ بک کے صفحات میں لکھے جا رہے تھے۔

شہاب الدین پاگل ہو گیا... اس کا پاگل ہو جانا برحق تھا۔ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا، پاگل ہوتا... محبت کرنے والے تو ویسے بھی پاگل ہی ہوتے ہیں۔ فارسی کا ایک شعر ہے... عشق اول در دل معشوق پیدا می شود... یعنی محبت پہلے محبوب کے دل میں جاگتی ہے... شہاب الدین کے معاملے میں ایسا ثابت ہوا تھا وہ خود ایک محتاط اور بزدل آدمی تھا... وہ غور ہی کرتا رہ جاتا کہ اظہارِ عشق کرے تو کب اور کیسے اور کہاں؟

شبو نے دھڑلے سے کر دیا۔ ''میں تو دیکھتے ہی تم پر مر مٹی تھی... تم کہو گے کیسی بے شرم لڑکی ہے مگر... جب پیار کیا تو ڈرنا کیا؟''

شہاب الدین پھڑک اٹھا۔ ''یہ تو مدھوبالا نے کہا تھا... میرا مطلب ہے فلم مغل اعظم میں دلیپ کمار سے کہا تھا۔''

''اب میں تم سے کہہ رہی ہوں... بولو تم کیا کہتے ہو؟''

''میں... میں کیا کہوں... میں تو چاہتا ہوں کہ تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا لوں... ہم شادی کر لیں... لیکن کیا یہ ممکن ہے؟''

''ممکن کیوں نہیں... تم لڑکے ہو اور میں لڑکی۔''

''میرا مطلب تھا... اگر میں نے اپنے ابا کو پیغام دے کر تمہارے ابا کے پاس بھیجا... تو کیا وہ شادی پر راضی ہو جائیں گے؟''

''کبھی نہیں... وہ جوتے ماریں گے تمہارے ابا کو اور کہیں گے کہ تمہاری یہ ہمت کیسے ہوئی... شاید اس سے دگنے جوتے تمہیں پڑیں۔''

شہاب الدین سخت خفیف ہوا۔ ''پھر شادی کیسے ہو گی؟''

''بھئی شادی تو ہم کریں گے نا۔''

''تمہارے کہنے کا مطلب ہے... ہم بھاگ کے شادی کریں گے؟'' شہاب الدین نے بوکھلا کے کہا۔ ''مگر ہم بھاگ کے جائیں گے کہاں؟''

''مجھے کیا معلوم... یہ تو لڑکوں کا مسئلہ ہے کہ وہ شادی کرتے ہیں تو بیویوں کو کہاں لے جاتے ہیں... کہاں رکھتے ہیں۔''

''اور اگر ہم پکڑے گئے تو؟''

''مارے جائیں گے... چودھری صاحب قتل کر دیں گے... یا کرا دیں گے۔'' وہ اطمینان سے بولی۔

''تمہیں ڈر نہیں لگتا؟''

''لگتا ہے... یاد کرو مدھوبالا نے کیا کہا تھا... پیار کیا تو ڈرنا کیا۔ تم اتنا سوچتے کیوں ہو؟''

شہاب الدین نے تھوک نگل کے کہا۔ ''دیکھو۔ جلد بازی اچھی نہیں... تم مجھے کچھ وقت دو۔''

''کتنا وقت؟''

''کم سے کم ایک سال۔'' شہاب الدین نے کہا۔

''سال کی تو کوئی بات نہیں... میں دو سال بھی دے سکتی ہوں کیونکہ ابھی میں دوں گی نویں کا امتحان... پھر دسویں کا... لیکن یہ بتاؤ کہ تم دو سال میں کیا کرو گے؟''

''میں دبئی جا کے دولت کماؤں گا۔ صرف ایک سال بعد میں لوٹ کے آؤں گا تو اس شان سے کہ چودھری صاحب مجھے انکار نہیں کر سکیں گے... اور کرتے ہیں تو کر دیں... میں تمہیں بھی دبئی لے جاؤں گا... ہم شان سے رہیں گے... کوئی ہمیں وہاں تلاش نہیں کر سکتا اور کر لے تو ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔''

''صرف ایک سال میں کیا ہو جائے گا؟''

''میری نوکری وہاں پکی ہے... مجھے درہم ملیں گے... سعودی عرب گیا تو ریال جو پاکستانی کرنسی میں ایک لاکھ کے برابر ہوں گے... ہر مہینے... بس میرے وہاں پہنچنے کی دیر ہے۔''

''ٹھیک ہے تم... چلے جاؤ... مگر تم واپس آؤ گے... اس کی کیا گارنٹی ہے؟''

''کیسی افسوس کی بات ہے... محبت میں بھی گارنٹی... قرض میں بھی گارنٹی... کام میں بھی گارنٹی... آخر اعتبار بھی کوئی چیز ہے... تم خود سوچو کہ تمہارے بغیر میں جی سکتا ہوں... اس کی کیا گارنٹی ہے کہ تم میرا انتظار کرو گی؟ میری واپسی سے پہلے کسی سے شادی نہیں کرو گی؟''

''تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا چاہیے... دو سال تو میری شادی کی بات بھی کوئی نہیں کرے گا... تم جاؤ۔''

''چلا تو میں جاؤں۔'' شہاب الدین نے تھوڑے سے تامل کے ساتھ کہا۔ ''ایک مسئلہ ہے۔''

''پاسپورٹ ویزا کا؟''

''نہیں... وہ سب ہو جائے گا... تم فکر نہ کرو۔'' وہ بولا۔

اس کو اپنی مدھوبالا کے سامنے یہ اعتراف کرتے شرم آئی کہ اصل مسئلہ ایک لاکھ روپے کا ہے جو اس کے پاس نہیں ہے اور اسے کوئی دینے والا بھی نہیں... اس کا باپ بھی نہیں... اس سے شبو کی نظر میں اس کی اوقات کچھ نہ رہتی... اگر وہ شبو سے کہتا کہ وہ کچھ بندوبست کر دے تو یہ اس سے بھی زیادہ شرمندگی کی بات ہوتی۔

ان کے درمیان معاملات آہستہ آہستہ آگے بڑھے تھے۔ یہ ساری گفتگو خلاصہ ہے ان تمام نامہ و پیام کا جو ان کے درمیان ہوئے... وہ حد درجہ محتاط تھے... ٹیوشن پڑھتے اور پڑھاتے ہوئے ان کے لیے ادھر ادھر کی کوئی بات کرنا ممکن ہی نہیں تھا... ایک چڑیل ٹائپ بڑھیا پلک جھپکائے بغیر انہیں گھورتی رہتی... وہ یہ بات کاپی میں لکھتے تھے... شہاب الدین کہتا... اس کا انگریزی میں ترجمہ کرو... پاکستان اسلام کا قلعہ ہے... اور کاپی آگے بڑھاتا تھا تو اس پر لکھا ہوتا تھا... ''کل رات تمہاری یاد نے اتنا بے قرار کیا کہ میں سو نہیں سکا۔'' شبو ترجمہ کر کے کاپی آگے بڑھاتی تھی۔

''صبر سے کام لو... کسی کو شک بالکل نہیں ہونا چاہیے۔'' شبو بعد میں دونوں طرف کی مراسلت کو جلا کر راکھ بہا دیتی تھی۔

وہ اکثر اپنی گاڑی لے کر خاندان کے لوگوں کے گھر چلی جاتی تھی یا بازار... ایسا مہینے میں دو چار مرتبہ ہی ممکن تھا... شہاب الدین سے میل ملاقات کے بعد اس نے کوئی رسک نہیں لیا... وہ بہت محتاط تھی اور شہاب الدین کے باہر کہیں ملنے کے مطالبے کو سختی سے مسترد کر دیتی تھی... یہ جوانی کے پہلے سنسنی خیز عشق کا ایڈونچر تھا لیکن شبو نے جوش کو ہوش پر غالب نہیں آنے دیا اور شہاب الدین کے جذباتی طوفان

کے آگے بھی عقل کا اسپیڈ بریکر قائم رکھا... اس کی نظر مستقبل پر تھی۔ شہاب الدین ہر لحاظ سے اس کے لیے آئیڈیل لائف پارٹنر ثابت ہو رہا تھا... اسے معلوم تھا کہ فیصلہ خود اس نے نہ کیا تو اس کا انجام کیا ہو گا۔

☆☆☆

خیر دین کی نظر سے شہاب الدین کے رویے اور معمولات میں تبدیلی پوشیدہ کیسے رہ سکتی تھی... وہ ہر وقت گم صم رہتا تھا... اس کی غور کرنے کی عادت نے اسے غوری بنا دیا تھا... لیکن یہ معاملہ کچھ اور تھا... خیر دین نے اکثر اسے رات کو چھت پر چکر لگاتے یا صحن میں بیٹھے دیکھا۔ وہ زبانی عاشقی میں ''اختر شماری'' کرتا تھا۔ اسے کھانے پینے کا ہوش نہیں تھا... دکان پر اس کے ہونے سے نہ ہونا بہتر تھا... بات کرو تو وہ چونک پڑتا تھا یا جھنجلا جاتا... اور یہ سب مدھوبالا کی ٹیوشن کے بعد شروع ہوا تھا... شک و شبہے کی اس میں کوئی بات نہ تھی۔ خیر دین کو جس بات کا ڈر تھا وہ ہو چکی تھی۔ اس کا بیٹا چودھری صاحب کی بیٹی کے عشق میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ باری خیر دین کے ڈرنے کی تھی کہ اس کا انجام کیا ہو گا؟

بہت غور کرنے کے بعد شہاب الدین نے اپنی پوری حکمتِ عملی مرتب کر لی کہ اسے کب کیا کرنا ہو گا اور کیسے... اس نے زندگی کو داؤ پر لگانے کا پورا ڈراما تیار کر لیا تھا... پہلے کی طرح اس نے کمزور فریق کا انتخاب کیا یعنی اپنی ماں سے بات کی... شبو کا حوالہ دیے بغیر اس نے اپنا مطالبہ ایک نوٹس کی صورت میں اس کے سامنے رکھ دیا۔

''مجھے ایک لاکھ کا بندوبست کر کے دو... دبئی جانے کے لیے۔''

ماں نے بگڑ کے کہا۔ ''میں نے کیا کہیں گاڑ رکھے ہیں ایک لاکھ کہ تجھے نکال دوں؟''

''تمہیں یہ کام ابا سے کرانا ہے۔''

''پاگل ہوا ہے شہاب الدین... میں کیا جانتی نہیں کہ اس کے پاس ایسی کوئی تجوری نہیں جس میں لاکھ روپے پڑے ہوں۔ زندگی بھر وہ کیا کماتا اور خرچ کرتا رہا ہے... ہزار دو ہزار کی بات میں کر سکتی تھی۔''

''ہزار دو ہزار نہیں ماں... پورے لاکھ... اگر تم نے کچھ نہ کیا تو...''

''تو کیا؟'' ماں نے اس کے لہجے کی دھمکی کو نوٹ کر لیا۔

''بعد میں مت رونا... میں اپنی جان دے دوں

گا... یہ جو کنواں ہے نا ہمارے گھر کے پیچھے... اس میں سے میری لاش نکال لینا۔"

ماں نے گھبرا کے کہا۔ "شہاب الدین... مت کر ایسی بات ابھی تو نے کام شروع کیا ہے باپ کے ساتھ۔"

"لعنت اس کام پر... مجھے دبئی جانا ہے... ابا نے ساری عمر گنوا دی... میں دو سال میں سب کر کے دکھا دوں گا... جس کا اس نے پہلے بھی تجھ سے وعدہ کیا تھا... توبات کر ابا سے۔"

ماں نے سر پکڑ لیا۔ "اوے پاگل... کچھ سوچ... تیرا باپ کہاں سے لائے گا ایک لاکھ... چوری کرے گا... ڈاکا ڈالے گا... کچھ سوچ۔"

"میں نے بہت غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ابا کر سکتا ہے... اگر اسے بیٹے کی زندگی عزیز ہو۔"

"پھر اپنے باپ کو کیوں نہیں بتاتا۔"

"دیکھ ماں... وہ بہت شور کرے گا... چیخے گا چلائے گا... اس لیے میں تجھے بتاتا ہوں... مگر اسے مذاق نہ سمجھنا... ابا نے میری بات نہ مانی تو ساری عمر روتا رہے گا... پچھتائے گا۔"

شور شرابا ماں نے بھی بہت کیا لیکن شہاب الدین نے اپنی پوری بات کہہ دی۔ پھر وہ گھر سے غائب ہو گیا۔ اسے معلوم تھا گھر میں بہت ہنگامہ ہو گا۔ باپ جتنا چیخ چلا سکتا ہے چیخ چلا لے... وہ طوفان کی پہلی لہر گزارنے کے بعد بات کرے گا۔ اور ایسا ہی ہوا... لیکن اس کے باپ کے غیظ و غضب کی دوسری لہر بھی کم تباہ کن نہیں تھی۔

اس نے شہاب الدین کو بہت گالیاں دیں۔ "تو مجھے چوری پر مجبور کر رہا ہے۔ میری عاقبت خراب کرنا چاہتا ہے... قبر میں جانے سے پہلے میں اپنی زندگی بھر کی ایمانداری کا جنازہ اٹھا دوں۔"

شہاب الدین نے ایک گہری سانس لی۔ "ٹھیک ہے ابا... پھر تو میرا جنازہ اٹھانا۔"

ماں چلائی۔ "اوئے شاہو... کہاں جا رہا ہے تُو؟"

"خدا حافظ ماں... اگر ایک باپ اپنے بیٹے کی اتنی سی بات نہیں مان سکتا تو پھر روتا رہے بیٹے کو... اس کی قبر پر۔"

ماں نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گی۔ شہاب الدین کے لیے یہ غیر متوقع سین نہیں تھا۔ وہ ایک زندگی سے دلبرداشتہ بیٹے کی طرح مرنے کے لیے نکل گیا۔ اس نے باپ کی آواز کو بھی نظر انداز کر دیا۔ شہاب الدن کو اس ڈرامے کا دوسرا ایکٹ پیش کرنا تھا۔

ہوش میں آتے ہی ماں نے چلا کے کہا۔ "ارے خدا کے لیے اس پاگل کو روکو... کہیں وہ سچ مچ کنویں میں نہ کود جائے۔"

خیر دین سخت مشتعل تھا۔ "کودتا ہے تو کود جائے مگر میں اس کے کہنے سے اپنی عاقبت خراب نہیں کروں گا۔ غضب خدا کا... وہ مجھے چوری کی ترغیب دے رہا ہے۔ ڈکیتی پر مجبور کر رہا ہے۔"

"خیر دین آخر وہ بیٹا ہے ہمارا۔"

"بیٹا ہونے کا یہ مطلب ہے کہ میری دنیا اور آخرت میں رسوائی کرے۔ اتنا ہی دیوانہ ہو رہا ہے تو خود کہیں ڈاکا ڈالے... بوڑھے باپ کو مجبور کیوں کرتا ہے... اس کی خاطر میں جیل جاؤں... وہ دبئی جائے۔ اس نے کیا پاگل سمجھ رکھا ہے مجھے؟" خیر دین چلاتا رہا۔

شہاب الدین کی ماں خود چادر اوڑھ کے بیٹے کو تلاش کرنے نکلی۔ کنواں پیچھے کی دو گلیاں چھوڑ کے اس احاطے میں تھا جو سائیں بابا کا باغ کہلاتا تھا... یہ ملک خدا بخش کی زمین تھی جو اس نے مسجد کی تعمیر کے لیے وقف کی تھی مگر اس کی اولاد نے باپ کی وصیت کے خلاف مقدمہ کر کے اس پر زبردستی قبضہ کر رکھا تھا۔

یہ جگہ شام کے بعد غیر آباد ہوتی تھی۔ شہاب الدین کی ماں کو شکستہ چار دیواری کے اندر ہلچل نظر آئی۔ اس کا دل بیٹھ گیا... پھر ایک شخص دوڑتا ہوا اس کے پاس سے گزرا... شہاب الدین کی ماں نے اسے روک کے پوچھا۔ "کیا ہوا ہے یہاں؟"

"کوئی بندہ گر گیا ہے کنویں میں۔" اس نے گزرتے گزرتے جواب دیا۔

شہاب الدین نے پورے حفاظتی انتظامات کے بعد کنویں میں چھلانگ لگائی۔ کنویں کی چوڑائی زیادہ اور گہرائی کم تھی۔ اس کے باوجود شہاب الدین نے خطرہ مول نہیں لیا۔ اس نے راستے میں ملنے والے تین چار افراد کو بتایا کہ اپنے ظالم باپ کی زیادتی کے باعث اس نے کنویں میں کود کے اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ سب نے اسے روکنے اور سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ کسی کی سنے بغیر سائیں بابا کے باغ کی طرف دوڑتا چلا گیا۔

کنویں پر پہنچ کے بھی شہاب الدین نے توقف کیا۔ وہ مدد کے لیے پہنچنے والوں کو تھوڑی سی مہلت دینا چاہتا تھا۔ رسی لے کر دوڑنے والا بھی انہی لوگوں میں شامل تھا جن سے

شہاب الدین نے اپنے عزائم کا ذکر کیا تھا۔ صحیح وقت پر شہاب الدین نے کنویں کے وسط میں اس طرح چھلانگ لگائی کہ اس کا جسم تیزی سے نیچے جاتے ہوئے کنویں کی دیوار سے نہ ٹکرائے۔ وہ پانی میں گرا۔ کئی فٹ نیچے گیا اور پھر اُبھرا۔

جب اسے نکالا گیا تو شہاب الدین کی ماں سینہ کوبی کر رہی تھی اور چلا رہی تھی۔ "ہائے میرا شاہو... ماں صدقے... میں بھی جان دے دوں گی۔" جو لوگ شہاب الدین کو نکال رہے تھے انہوں نے اسے روکے رکھا اور یقین دلاتے رہے کہ شہاب الدین زندہ ہے۔

شہاب الدین کا سردی سے جسم اکڑ گیا تھا، وہ ہوش میں تھا مگر بے ہوش بنا رہا۔ اس کی ماں دیوانگی میں اس پر گر گئی اور نام لے لے کر اسے پکارتی رہی۔ لوگوں نے اسے ہٹا کر شہاب الدین کے کپڑے تبدیل کیے اور اس پر کمبل ڈالا۔

رات کو بے سدھ پڑے شاہو کی چارپائی کے ایک طرف ماں بیٹھی آنسو بہاتی رہی اور دوسری طرف مجرم بنا باپ سر پکڑے بیٹھا رہا۔ آخر وہ کیا کرے۔ بیٹے کا مطالبہ سو فیصد ناجائز تھا۔ وہ باپ کے منہ پر کالک ملنا چاہتا تھا۔ کیا یہ بھی شفقتِ پدری میں شامل ہے کہ وہ اسے ایسا کرنے دے؟ وہ کہے گناہ کر تو گنا کرے... جرم پر مجبور کرے تو جرم کرے... اور وہ انکار کرے تو بیٹا مرنے کی دھمکی دے۔ خیر دین بلیک میلنگ کے لفظ سے بھی نا آشنا تھا لیکن یہ ضرور سمجھتا تھا کہ بچے کا مطالبہ غیر قانونی اور غیر شرعی ہے۔

سارے سوالات کا حل ایک لمحے میں خیر دین کے سامنے آ گیا۔ یہ بالکل چت یا پٹ کا کھیل تھا۔ سکہ اچھالنے کے بعد جیت ایک فریق کی ہوتی تھی... جب وہ بچپن میں گلی ڈنڈا کھیلتے تھے تو پہلی باری کے لیے سکہ اچھالا جاتا تھا یہی سب کرکٹ میں ہوتا تھا... اب یہی زندگی کی بازی میں ہو گا... کون زندہ رہے گا... وہ یا اس کا بیٹا؟

اس نے سکہ اچھالا اور دونوں ہاتھوں کے درمیان دبوچ لیا۔ تقدیر کا فیصلہ اس کے دو بوڑھے کانپتے ہاتھوں میں موجود تھا۔ اس میں ہمت نہ تھی کہ وہ ہاتھ اٹھا کے اس فیصلے کو دیکھ سکے۔ عقل کے مقابل جذبات کا پلڑا بیٹے کے حق میں جھک رہا تھا... انکار کی صورت میں بیٹے کی زندگی نہ بچانے کا الزام اس پر آئے گا... بیٹا جوان تھا اس کی پوری زندگی اس کے سامنے تھی۔ وہ خود زندگی میں سب کچھ دیکھ چکا تھا اور انجام کی طرف بڑھ رہا تھا... مرنا اسے ہی چاہیے... اس نے آہستہ آہستہ اوپر والا ہاتھ اٹھایا اور ایک گہری سانس لی۔ تقدیر نے بھی اس کے فیصلے کی توثیق کر دی تھی لیکن اسے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ تقدیر کے اس فیصلے کا نفاذ کب اور کیسے ہو گا۔

صبح تک وہ خاصا پُرسکون ہو چکا تھا۔ بیٹے کو چائے پلانے کے بعد اس نے پُرشفقت لہجے میں کہا۔ "شہاب الدین! میں نے تیری بات مان لی... مجھے بتا یہ سب کیسے ہو گا؟"

شہاب الدین رات بھر غور کرنے کے بعد اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ باپ کے پاس ہتھیار ڈالنے کے سوا چارہ نہیں... اس نے خیر دین کا ہاتھ تھام لیا۔ "ابا... میں نے بتایا تھا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ الف پور میں تیری ساکھ ایسی ہے کہ لوگ تیری ایمانداری کی قسم کھاتے ہیں۔ چودھری صاحب کا تجھ پر اعتماد بالکل ایمان کی طرح ہے کوئی تجھ پر شک کر ہی نہیں سکتا۔"

"میرے مرنے کے بعد جب یہ بات کھلے گی؟"

"یہ بات کبھی نہیں کھلے گی۔ تیرے جیسا ماہر زرگر آس پاس کے پورے علاقے میں نہیں... خود تو نے بتایا تھا کہ ایک طرف سیالکوٹ... اور دوسری طرف وزیر آباد تک تیری مہارت تسلیم کی جاتی ہے... جو آج تک تو نے بنا کے دیا اس میں رتی بھر کھوٹ نہیں تھا اور کوئی ہوتا تو رتی ماشہ تولہ کھوٹ سے ہی بہت بڑا انجینئر بن جاتا۔ اس بار بھی تو سو تولے کا زیور بنا کے دے گا تو چودھری صاحب آنکھ بند کر کے رکھ لیں گے۔"

"اور انہوں نے پرکھنے کے لیے بلا لیا کسی کو... پھر؟"

"جو آج تک نہیں ہوا... اب کیوں ہو گا ابا؟ اپنے دل سے اس ڈر کو نکال دے۔ تیرے جیسا ماہر کاریگر اصلی سونے کی جگہ نقلی سونے کے زیور رکھے تو فرق کس کی نظر محسوس کر سکتی ہے۔ چودھری صاحب زمیندار ہیں سنار نہیں... اور کھرے کھوٹے کا پتا تو اس وقت چلتا جب زیور بیچنے کی نوبت آتی... یا وہ کسی دوسرے کو بلا کے کہتے کہ پرانے کو ڈھال کر نیا بنا دو... وہ تو پالش کے لیے بھی تجھے ہی بلاتے ہیں۔ آئندہ بھی یہی ہو گا۔ برسوں گزر جائیں گے اور کسی کو معلوم نہیں ہو گا کہ تو نے اصل نہیں نقلی سونے کے زیورات بنا کے دیے تھے۔"

خیر دین نے سر ہلایا۔ "وہ تو میں دعوے سے کہتا ہوں کہ میرے ہاتھ سے ڈھل کر نکلے ہوئے سونے کے اصلی اور

تھی زیور کو پہچان سکتا ہے تو کوئی دوسرا سنار۔۔۔ وہ بھی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد۔"

"یہی تو میں کہتا ہوں ابا۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ اور سال بھر میں میرا وعدہ ہے میں تجھے بھی دبئی بلا لوں گا اور ماں کو بھی۔ چھوڑ دینا یہ آنکھیں پھوڑنے والا کام۔ عیش کرنا دبئی میں۔۔۔ میری شاندار کوٹھی ہوگی۔۔۔ گاڑی ہوگی۔۔۔ نوکر چاکر ہوں گے۔۔۔ سارا گناہ میرے سر۔۔۔ تو اپنی مرضی سے تو کچھ نہیں کر رہا ہے۔۔۔ میں تم دونوں کو حج کے لیے بھیج دوں گا۔۔۔ وہاں سارے گناہ دھل جاتے ہیں۔ ویسے بھی اللہ تو نیت کو دیکھتا ہے۔ تیری کوئی نیت خراب نہیں تھی۔ تو نے میرے مجبور کرنے سے ایسا کیا تھا۔"

☆☆☆

شبانہ اعظم تھکن سے بے حال صوفے پر گر گئی۔ شام کی تقریب کے انتظامات کی نگرانی کوئی آسان کام نہ تھا۔ ان کی کوٹھی میں ایسی تقریبات پہلے بھی ہو چکی تھیں مگر اعظم بار بار اس دعوت خاص کی اہمیت کا ذکر کرتا تھا۔ وزیر اعلیٰ اس میں مہمان خصوصی تھے اور وہ اعظم کو صوبائی اسمبلی کی نشست کا ٹکٹ دینے آ رہے تھے۔ آج انہیں اس کا اعلان کرنا تھا۔ پارٹی کے تمام سرکردہ اراکین۔۔۔ مجلس عاملہ۔۔۔ صوبائی وزرا اور اسپیکر سمیت مہمانوں کی تعداد ایک ہزار کے قریب بنتی تھی۔

ہمیشہ کی طرح سارے انتظامات اسی فائیو اسٹار ہوٹل کے سپرد تھے جس کا مالک اعظم کے والد کے دوستوں میں شمار ہوتا تھا مگر اس کے باوجود شبانہ اندر سے باہر چکر لگاتی رہی تھی۔ فون تھا کہ مسلسل بج رہا تھا۔ اس کا ہاتھ تھک گیا تھا۔ وہ فون کبھی ایک کان پر رکھتی تھی تو کبھی دوسرے کان پر۔

کچھ دیر سکون سے رہنے کے لیے اس نے فون بند کر دیا اور صوفے پر نیم دراز ہو کے پاؤں سینٹر ٹیبل پر پھیلا دیے۔ ملازمہ نے اس سے کھانے کے لیے پوچھا تو اس نے انکار کر دیا۔ "مجھے کافی لا دو اور سینڈوچ۔" اس نے گھڑی کی طرف دیکھا اور اپنے سامنے پڑے ٹی وی کے ریموٹ کو اٹھا لیا۔

شبانہ کی ریموٹ کا بٹن دبا کے ٹی وی کی تصویر بدلتے والی انگلی اچانک رک گئی۔ اس کے سامنے مدھو بالا ناچ رہی تھی۔ شہزادہ سلیم کے لباس میں دلیپ کمار کھڑا تھا اور پرتھوی راج کی غضبناک نظر۔ بس ایک کنیز کو سرِ دربار اپنے عشق کا اعتراف کرتا دیکھ رہی تھیں۔ پیار کیا تو ڈرنا کیا جب پیار کیا۔۔۔ پیار کیا کوئی چوری نہیں کی چھپ چھپ آہیں بھرنا کیا۔۔۔ جب پیار کیا۔۔۔

شبانہ کا ذہن پھر بہت پیچھے رہ جانے والے وقت میں لوٹ گیا۔ کہاں ہے وہ جو اسے دھو بالا کہتا تھا۔ خدا کرے مر ہی گیا ہو۔ ہر وقت غور کرنے والا شہاب الدین غوری۔۔۔ زرگر کی اولاد۔۔۔ ایک پرانی بلیک اینڈ وائٹ تصویر کو سینے سے لگائے پھرتا تھا۔ فلم مغل کی مدھو بالا پر فریفتہ تھا جسے مرے ہوئے بھی زمانہ ہو گیا تھا۔ یہ شاید اس کی پیدائش سے پہلے کی بات ہوگی۔ پاگل۔

مگر اس سے زیادہ پاگل تو وہ خود تھی کہ جوانی کے جذبات کی تند سوچ میں تنکے کی طرح بہہ گئی تھی۔ لو ایٹ فرسٹ سائٹ۔ مائی فٹ۔ وہ بلاشبہ ہینڈسم تھا۔ دلیپ کمار خاک بھی نہیں تھا۔ بس اسے نظر آتا تھا فتور اس کی نظر میں بھی تھا اور عقل میں بھی کہ اس نے سوچے سمجھے بغیر اسے پسند کر لیا۔ حد یہ ہے کہ اس سے اظہارِ عشق میں بھی دیر نہیں لگائی۔ کس قدر بے شرمی کی اور گویا UN LADY LIKE بات تھی۔ شریف لڑکیاں اور معزز خواتین کیا ایسا کرتی ہیں۔ کسی میں ہمت ہو تو بہت سوچ سمجھ کے موقع محل دیکھ کے ڈرتے ڈرتے اشاروں کنایوں میں اظہارِ محبت کرتا ہے۔ اور لڑکی اپنے وقار حسن کے ساتھ ایک حوصلہ افزا مسکراہٹ سے نواز دے تو اگلا قدم اٹھاتا ہے۔

وہ تو خود پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں جا گری تھی۔ کتنا ارزاں۔۔۔ کر دیا تھا اس نے خود کو۔۔۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ ایک معزز دولت مند اور اپر کلاس۔۔۔ خاندان کی بیٹی ہے اور وہ ایک معمولی زرگر کا میٹرک پاس بیٹا۔۔۔ نکما اور آوارہ۔۔۔ بے عمل اور کاہل۔۔۔ میٹرک کر کے سمجھتا تھا، ڈاکٹریٹ حاصل کر لی۔

اس نے ایک آہ بھری اور ٹی وی بند کر دیا۔ یہ بڑی پرابلم تھی کہ ابھی تک وہ اس بے وفا۔۔۔ بے غیرت کو اپنے خیالوں سے نکال نہیں پائی تھی جو ایسا دبئی گیا کہ لوٹ کے آنا ہی بھول گیا مگر اس کی بے وفائی شبانہ کے لیے تو خدا کا انعام بن گئی۔ وہ یہاں رہتا یا سچ مچ سال بھر بعد لوٹ کے آ جاتا تو کتنی خرابی ہوتی۔ اس کے پاپا کتنے سمجھ دار تھے۔ وہ ہر بحران سے نمٹنا جانتے تھے۔ وہ زرگر کا بیٹا ان کی بیٹی کا ہاتھ مانگنے کے لیے مرسیڈیز میں بھی آتا تو اسے وہ اپنی توہین سمجھتے۔ اسے تو خیر وہ بھگا ہی دیتے مگر انہیں معلوم ہوتا کہ اس زرگر کی اولاد کو یہ ہمت خود ان کی بیٹی کی وجہ سے ہوئی جس کی محبت کا وہ دعویدار ہے تو پاپا کو کتنا دکھ ہوتا۔ یہ صلہ دیا ان کے اعتماد کا اس بیٹی نے جو ان کی لاڈلی تھی۔

سینڈوچ کھانے کے بعد کافی پی کے شبانہ نے بہت بہتر محسوس کیا۔ تھینک یو گاڈ۔ تو نے میری اور میرے خاندان کی عزت پر حرف نہیں آنے دیا۔ اس نے میٹرک کرنے تک نہ صرف یہ کہ شہاب الدین کو بھلا دیا تھا بلکہ الٹا اب اس کا خیال شبانہ کو شرمندگی اور اپنی بے وقوفی کے احساس میں مبتلا کر دیتا تھا۔ کتنا اچھا ہوا کہ اس عشق کی خوشبو کو مشک کی طرح پھیلنے کے لیے مہلت ہی نہیں ملی ورنہ ایک دن سب کو پتا تو چل ہی جاتا۔۔۔ برا وقت آنے سے پہلے ہی وہ دفع ہو گیا۔ اس نے اطمینان سے میٹرک کیا۔۔۔ پھر اپنی ضد پر لاہور چلی گئی۔ انٹر کے بعد بی اے کا امتحان دیا۔ اتنا عرصہ وہ ہوسٹل میں نہیں رہی۔۔۔ پاپا نے اس کے لیے اپنی لاہور والی کوٹھی خالی کرا لی تھی۔ وہاں وہ ایک ملازمہ۔۔۔ ڈرائیور اور چوکیدار کے ساتھ رہی تھی۔

اس دوران خاندان کے مراسم میں بڑی خوشگوار تبدیلی آئی تھی۔ اس کے تایا کو جو اسمبلی کے ممبر تھے یہ خیال آ گیا کہ سارے بھائی کسی وجہ کے بغیر آپس میں تعلقات کی کشیدگی کا شکار ہیں۔۔۔ سب اللہ کے فضل سے خوش حال اور اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں۔۔۔ کوئی زمیندار ہے۔۔۔ صنعت کار۔۔۔ یا سیاست داں تو کیا ہوا۔۔۔ ان کے درمیان وجۂ نزاع تو کبھی نہ تھی۔ وہ خود چل کے پاپا کو گلے لگانے آ گئے۔ پاپا اتنے خوش ہوئے کہ اسی وقت انہیں ساتھ لے کر تیسرے بھائی سے ملنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ پھر تیسرے کے ساتھ وہ چوتھے کے گھر پہنچے اور بہت روئے دھوئے لیکن برسوں بعد سب ایک ہو گئے۔ اس کے بعد والی عید پر سارے اکٹھے تھے تو ایک مرتبہ پھر پہل بڑے ابا بھتی تایا نے کی۔ انہوں نے اعظم کے لیے مجھے مانگا۔۔۔ بدلے میں پاپا نے اعظم کی بہن مانگ لی۔

اعظم کے آ جانے سے اس کے خیالات کی رو ماضی سے حال کی طرف لوٹ آئی۔ "بیگم صاحبہ یہاں آرام فرما رہی ہیں۔" اس نے تلخی سے کہا۔ "میں نے کہا تھا ذرا انتظامات پر نظر رکھنا۔"

شبانہ کا موڈ خراب ہو گیا۔ "اور کیا کر رہی تھی میں صبح سے۔۔۔ ابھی ذرا دیر کے لیے آ کے بیٹھی تھی۔"

"ذرا دیر۔۔۔ ڈیڑھ گھنٹا پہلے پوچھا تھا میں نے۔"

"حد کرتے ہیں آپ بھی۔ خادمہ سے پوچھ لیں۔ کھانا بھی نہیں کھایا میں نے۔ صرف چائے کے ساتھ سینڈوچ لیے ہیں۔۔۔ اور پھر ضرورت کیا ہے میرے کچھ دیکھنے کی جب آفس سے تمہاری وہ چہیتی چھمک چھلو پہنچ گئی ہے۔۔۔ تمہاری پولیٹیکل سیکریٹری۔" اس نے لہجہ بنا کے کہا۔

"پھر شروع کر دیں تم نے جاہل عورتوں والی باتیں۔"

"مجھے جاہل سمجھنے والا خود کتنا عالم فاضل ہے؟ کم سے کم میں جینوئن گریجویٹ تو ہوں۔" شبانہ چراغ پا ہو کے بولی۔

یہ جوابی وار بہت سخت تھا کیونکہ اعظم کے بارے میں اسے معلوم ہوا تھا کہ بی اے کے امتحان میں اس کی جگہ کون بیٹھا تھا۔ ڈگری اس نے پڑھ کے نہیں لی تھی۔ اس کے باپ نے کسی اور کے ذریعے اسے دلوا دی تھی۔ وہ غصے میں پلٹا اور ٹھوکر سے سائڈ ٹیبل کو گرا کے باہر نکل گیا۔

شبانہ کا موڈ خراب ہو گیا تھا مگر وہ بات کو بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے باہر نکل کے دیکھا تو سارے کام روٹین میں ہو رہے تھے۔ اعظم کی سیکریٹری جو ترقی پا کے پولیٹیکل سیکریٹری بن چکی تھی ایسی تیاری کے ساتھ مستعد کھڑی تھی جیسے پارٹی کے لیے تیار ہو کے آئی ہے۔ اس نے سلیولیس ٹی شرٹ بھی اتنی مختصر پہنی تھی کہ وہ جھکے یا ہاتھ اٹھائے تو جینز کے اوپر اس کی اجلی کمر اور کسے ہوئے پیٹ کی سفیدی نمایاں ہو جاتی تھی۔۔۔ وہ دفتر میں بھی ماڈل بنی رہتی تھی جیسے ابھی کمرے سے نکلے تو ریمپ پر کیٹ واک کرے گی۔

شبانہ کے لیے کسی سیکریٹری کے وجود کو اپنا متبادل سمجھنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ گزشتہ دس برسوں میں ایسی تین آ چکی تھیں جو اعظم کے لیے قائم مقام بیوی سے کم نہ تھیں۔ انہوں نے نکاح نہیں پڑھوایا تھا۔۔۔ اور انہیں اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔۔۔ ورنہ وہ دفتر کے بعد تقریبات میں اور باہر کے دوروں میں اعظم کے ساتھ رہتی تھیں۔ کئی بار اس نے سوچا کہ تایا سے یا پاپا سے بات کرے لیکن ہر بار وہ خود ہی رک گئی۔ یہ اس طبقے کے کلچر میں شامل تھا۔ وہ احتجاج کرتی تو فرق صرف اسے پڑتا۔۔۔ ان کے تعلقات جو کبھی مثالی نہ تھے، مزید کشیدہ ہو جاتے۔ خاندان میں ایک شادی ان کی وضعداری تھی۔ عموماً وہ دوسری سوشل وائف گھر سے باہر کی تقریبات کے لیے رکھتے تھے۔ خاندانی بیوی کا سماجی رتبہ بلند رکھا جاتا تھا اور وہ گھر کے اندر مالکن رہتی تھی۔ شبانہ کے ساتھ ایسا نہ ہو سکا تھا۔ کیونکہ وہ تعلیم یافتہ اور سوشل سرکل میں فخر کے ساتھ پیش کیے جانے کے قابل تھی۔ انتہائی خوب صورت۔۔۔ فیشن ایبل اور سوشل ایٹی کیٹس کی حامل۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ آج تک کسی نے بھی اسے مدھو بالا نہیں کہا تھا۔۔۔ شاید اس لیے کہ نئے زمانے کے لوگ اس مدھو بالا کو اتنا جانتے ہی نہیں تھے کہ دونوں کا موازنہ کر سکتے۔۔۔ اسے شبانہ اعظمی ضرور کہا جاتا تھا۔۔۔ صورت میں

شبانہ رونے لگی۔ ”یہ سچ ہے وہ حج پر گئے تھے تو لائے

اعظم نے چیخ کے کہا۔ ”پھر کیا میں نے بنوایا ہے یہ تو ہر جگہ پہن کے شان سے پھرتی رہی تھی... جو تیری ں میں رہتا تھا۔ ہم نے تو ایسا فراڈ نہیں کیا تھا... ہم یا حرکت کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے... میری بہن کا ں کے پاس ہوگا... اپنے باپ سے کہہ سنار کو بلا کے ا کرالیں۔“ وہ باہر نکل گیا۔

شبانہ کی عقل ماؤف تھی۔ اس کا ذہن کسی صورت یہ نے کو تیار نہیں تھا کہ اس کے پاپا نے یہ جانتے ہوئے افشائے راز کے نتائج کتنے سنگین ہو سکتے ہیں' اپنی ٹی کو سو تولہ سونے کے زیورات بنا کر جہیز میں دیے گے... وہ جانتی تھی کہ پاپا اور ماما جب حج کے لیے گئے واپسی پر وہاں سے کتنا خالص سونا لائے تھے۔ یہ یا پروپیگنڈا نہیں تھا۔ ان کو یہ سونا اپنے ساتھ قبر میں تو لے جانا تھا۔ شبانہ ان کی ایک ہی بیٹی تھی اور یہ اسی کے

اس میں ہمت نہ تھی کہ فون کر کے پاپا سے اس معاملے کر سکے۔ وہ سارا دن کمرے میں بند روتی رہی۔ اموش گھر کے اندر کون سا طوفان قوت پکڑ رہا ہے اس ندازہ ہی کر سکتی تھی... یہاں ذات برادری کی عزت لات اتنے حساس تھے کہ خونی رشتوں کو خون کا پیاسا تے تھے۔

شام تک اس نے اپنے حوصلے کو مجتمع کیا اور آنے الف حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔ اس کا ا کہ اب تک یہ خبر اس کے گھر بھی پہنچا دی گئی ہوگی۔ ی اسے فون کرے... پاپا سے زیادہ اسے اپنے بھائی ل کا انتظار تھا۔ جس کی شریک حیات اعظم کی بہن لیکن ایک بوجھل خاموشی تھی جو آنے والے طوفان کی ے رہی تھی۔

طوفان سرِ شام ہی آ گیا۔ اسے خادمہ نے مطلع کیا کہ حبہ آپ کے والد آئے ہیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ خوش کے بجائے اس اطلاع پر شبانہ کا دل بیٹھ گیا عام طور پر تے تھے تو پہلے بڑے بھائی کے پاس بیٹھتے تھے۔ چائے پیتے تھے تو جاتے وقت اس سے کھڑے ے مل لیتے تھے۔ اس سے پوچھتے تھے کہ خوش ہو؟ اور سنے بغیر سر پر ہاتھ رکھ کر کہتے تھے ”خدا تمہیں خوش “ اور پلٹ جاتے تھے۔ بیٹی سے کمرے میں دیر تک

بات کرنا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ ماما اس کی قائل نہیں تھیں۔ وہ بیٹی سے پرائیویسی میں گھنٹا دو گھنٹا مل کے تمام حالات کی مفصل رپورٹ لیتی تھیں۔

آج شبانہ کا دس منٹ بعد بلاوا آ گیا... جب وہ ڈرائنگ روم میں پہنچی تو عدالت لگی ہوئی تھی اور صاف نظر آتا تھا کہ مقدمے کی کارروائی شروع ہو چکی ہے... ایک طرف پاپا کے ساتھ ماما تھیں دوسری طرف شبانہ کے ساس سسر... اعظم نے خود کو عمداً غیر حاضر رکھا تھا۔ وہ تیسری طرف متحارب فریقوں کے درمیان بیٹھ گئی۔

پاپا نے کچھ دیر کی گمبھیر خاموشی کے بعد کہا۔ ”شبانہ... تمہارے تایا نے ایک بات کہی ہے... جو بہت عجیب ہے... تم کیا کہتی ہو؟“

”میں تایا کو بھی غلط نہیں کہہ سکتی۔“

”وہ زیور کہاں ہے؟“

ایک ملازمہ کو حکم دیا گیا کہ وہ بی بی کے کمرے میں رکھا ہوا گتے کا ڈبا اٹھا لائے۔ اس کے واپس آنے تک ایک بوجھل خاموشی میں وہ سب ایک دوسرے سے نظریں چراتے رہے۔

پاپا نے اور پھر ماما نے زیور کا یوں معائنہ کیا جیسے پولیس قتل کے شواہد کا معائنہ کرتی ہے۔

تایا نے مقدمہ شروع کیا۔ ”یہ ڈاکو لے گئے تھے اور وہی ہمیں واپس کر گئے... اس رقعے کے ساتھ۔“

”وہ میں نے دیکھا۔“ پاپا بولے۔

”افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ ساری دنیا نے دیکھا... یہ گھر کی بات نہیں رہی۔“ تایا بولے۔

پاپا نے کانپتی آواز میں کہا۔ ”زیور نقلی ہے... اس سے میں انکار نہیں کرتا... دکھ مجھے یہ ہے کہ قصوروار آپ نے مجھے سمجھا۔“

تائی نے پلٹ کے جواب دیا۔ ”پھر تو قصوروار ڈاکو ہی ہوئے کہ اصلی زیور لے گئے اور راتوں رات ویسا ہی نقلی بنا کے ہمارے منہ پر مار گئے۔“

”بھابی... افسوس تو یہ ہے کہ انہوں نے خیر دین کو بھی مار دیا ورنہ میں اس سے پوچھتا۔“

بڑے بھائی نے کہا۔ ”خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہارے خاندانی زرگر کے قتل کا الزام تم پر نہیں آ رہا... کم سے کم ایسا ہم نہیں کہہ سکتے... مگر کچھ لوگ کہیں گے۔“

”مجھے خیر دین پر ایسی بے ایمانی کا الزام لگاتے ہوئے سوچنا پڑتا ہے۔ وہ میرے والد کے زمانے سے ہمارے گھر کا ہر کام کرتا آیا تھا۔“

ماں نے کہا۔ ”آدمی کا دل ایک ہی بار بے ایمان ہوتا ہے اس نے ساری کسر نکال لی۔“

”وہ ہوتا تو بتاتا۔“ پاپا نے آہ بھری۔

”یہی تو برا ہوا... اب تو لوگ الزام دے رہے ہیں تمہیں اور وہی لوگ تمہیں سنار کے قتل کا ذمے دار ٹھہرا رہے ہیں کہ جب تمہارا یہ راز فاش ہونے لگا تو تم نے اس کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دی۔“ تایا نے خفگی سے کہا۔

”یہ لوگوں کی بات رہنے دیں بھائی صاحب... بتائیں میں اپنی اکلوتی بیٹی کے ساتھ ایسا کر سکتا ہوں؟ کس کے لیے لایا تھا میں وہ سونا؟ میرے حالات بھی اتنے خراب تو نہیں تھے شادی کے وقت۔“ پاپا کا لہجہ بھی تیز ہو گیا۔

تایا نے کہا۔ ”دیکھو... ہم انہی لوگوں کے درمیان رہتے ہیں... ہمیں عزت دینے والے یہی لوگ ہیں... مزارع... ملازم اور ووٹر... ہم ان کی پروا کیسے نہ کریں... میں اور تم لندن جاتے ہیں تو ہماری بہو بیٹیاں ہمارے ساتھ بے پردہ اور جینز پہن کے پھرتی ہیں... مگر کیا ہم یہاں ایسا کر سکتے ہیں؟“

”یہ تو ٹھیک ہے۔“

تایا بولتے رہے۔ ”آخر کیا ملا مجھے تعلقات بحال کر کے؟ صرف یہ بے عزتی... میں نے تو رشتہ استوار کیا تھا... خود آیا تھا تمہارے پاس... بڑا ہونے کے باوجود... میری عزت خاک میں مل گئی۔“

”بھائی صاحب... بلاوجہ آپ بات کو اتنا بڑھا رہے ہیں۔“

اب تائی نے کہا۔ ”ہم نہیں... ہمارا بیٹا بدظن ہے... وہ ہم سے کبھی خفا ہے... ہمیں الزام دیتا ہے... ابھی اسے پارٹی نے ٹکٹ دیا تھا اور آج اس کے آفس میں یہ تماشا ہوا... اس کی عزت خاک میں مل گئی۔“

”پھر کیا کریں ہم... معافی مانگیں اس سے۔“ ماما نے تیز لہجے میں کہا۔

”آپ کی معافی سے اس کی عزت بحال نہیں ہو گی... اس نے کہا ہے... ہمیں اس کا جواب دینا ضروری ہے۔“

”کیا مطلب؟“ شبانہ نے چونک کے پوچھا۔

”مطلب صاف ہے بی بی... جس رشتے میں دراڑ پڑ جائے وہ کیسے برقرار رہ سکتا ہے۔“ تائی نے تڑخ کے کہا۔ ”بے عزتی ہماری ہوئی ہے... جب تک ہم بے عزتی کرنے والے کے خلاف قدم نہیں اٹھائیں گے... یہ عزت بحال کیسے ہوگی؟“

”کیا قدم اٹھانا چاہتی ہو آپ بھابی... کھل کے کہیں۔“ ماما نے مشتعل ہو کے کہا۔

”بات لمبی کرنے یا گھما پھرا کر کہنے کی مجھے عادت نہیں... تم آئی ہو تو اپنی بیٹی کو ساتھ لے جاؤ... اس کا سامان ہم بعد میں بھیج دیں گے۔“

پاپا نے برہمی سے کہا۔ ”بھائی صاحب... یہ کیا ہو رہا ہے... اگر جرم میرا ثابت ہو جائے... تب بھی شبانہ کو سزا کیوں؟“

بڑے بھائی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”غلطی کا خمیازہ کسی نہ کسی کو تو بھگتنا ہی پڑتا ہے... غلطی ہماری نہیں تو نقصان ہمیں کیوں ہو؟“

ماما کھڑی ہو گئیں۔ ”اگر آپ نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو پھر آگے کے نتائج کے لیے بھی تیار رہیں بھابی۔“

اس ماحول میں شبانہ کے لیے عقل و ہوش سے کام لینا مشکل ہو گیا۔ ”میں جانتی ہوں یہ سب کیوں ہو رہا ہے... آپ کے بیٹے کو محض بہانہ چاہیے... میری زبان نہ کھلوائیں تو اچھا ہے... جو کچھ وہ کر رہا ہے... وہ بھی دنیا دیکھ رہی ہے۔“

اعظم کی ماں نے چیخ کے کہا۔ ”کیا الزام لگا رہی ہے تو اپنے شوہر پر شرم نہیں آتی؟“

”شرم اسے نہیں آتی تو مجھے کیوں آئے... میں نے تو کسی کو بھی پولیٹیکل سیکریٹری نہیں رکھا۔“ شبانہ تڑخ کے بولی۔

ظاہر ہے ایسی جارحیت کے بعد مفاہمت کا امکان صفر ہو چکا تھا۔ وہ ماما اور پاپا کے ساتھ گھر چلی گئی۔ اسے معلوم ہی نہیں ہوا کہ نقلی سونے کے زیورات کا ڈبا کس نے ان کی گاڑی میں رکھا تھا۔ شبانہ کو یقین تھا کہ وہ اعظم سے بات کرے گی تو معاملات کنٹرول میں آ جائیں گے۔ انہوں نے دس سال ایک ساتھ گزارے تھے۔ ان کے درمیان تین بچے ایک پل کی طرح تھے جو دو کناروں کو ملاتے تھے۔ یہ پل کیسے توڑے جا سکتے تھے۔ چند دن بعد اعظم خود محسوس کرے گا کہ اس کی دوسری بیوی آ جائے تب بھی بچوں کے لیے دوسری ماں کا مسئلہ سنگین صورت اختیار کرے گا۔

لیکن حالات ایک دم بگڑ گئے۔ اعظم کو سمجھانے والوں سے زیادہ اکسانے والے تھے... شبانہ کے نزدیک ان میں اس کی سیکریٹری پیش پیش ہوگی۔ اگلے روز شبانہ کے جہیز کا باقی ماندہ سامان آیا تو اس کے ساتھ بچے بھی آ گئے۔ شبانہ کے

شبانہ رونے لگی۔ ”یہ سچ ہے وہ حج پر گئے تھے تو لائے تھے۔“

اعظم نے چیخ کے کہا۔ ”پھر کیا میں نے بنوایا ہے یہ زیور جو تو ہر جگہ پہن کے شان سے پھرتی رہی تھی... جو تیری ہی تحویل میں رہتا تھا۔ ہم نے تو ایسا فراڈ نہیں کیا تھا... ہم ایسی گھٹیا حرکت کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے... میری بہن کا زیور اس کے پاس ہوگا... اپنے باپ سے کہہ سنار کو بلا کے تصدیق کرالیں۔“ وہ باہر نکل گیا۔

شبانہ کی عقل ماؤف تھی۔ اس کا ذہن کسی صورت یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ اس کے پاپا نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ افشائے راز کے نتائج کتنے سنگین ہو سکتے ہیں‘ اپنی لاڈلی بیٹی کو سو تولہ سونے کے زیورات بنا کر جہیز میں دیے ہوں گے... وہ جانتی تھی کہ پاپا اور ماما جب حج کے لیے گئے تھے تو واپسی پر وہاں سے کتنا خالص سونا لائے تھے۔ یہ جھوٹ یا پروپیگنڈا نہیں تھا۔ ان کو یہ سونا اپنے ساتھ قبر میں تو نہیں لے جانا تھا۔ شبانہ ان کی ایک ہی بیٹی تھی اور یہ اسی کے لیے تھا۔

اس میں ہمت نہ تھی کہ فون کر کے پاپا سے اس معاملے پر بات کر سکے۔ وہ سارا دن کمرے میں بند روتی رہی۔ بظاہر خاموش گھر کے اندر کون سا طوفان قوت پکڑ رہا ہے اس کا وہ اندازہ ہی کر سکتی تھی... یہاں ذات برادری کی عزت کے معاملات اتنے حساس تھے کہ خونی رشتوں کو خون کا پیاسا بنا دیتے تھے۔

شام تک اس نے اپنے حوصلے کو مجتمع کیا اور آنے والے مخالف حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوگئی۔ اس کا خیال تھا کہ اب تک یہ خبر اس کے گھر بھی پہنچا دی گئی ہوگی۔ شاید کوئی اسے فون کرے... پاپا سے زیادہ اسے اپنے بھائی کے ردِعمل کا انتظار تھا۔ جس کی شریکِ حیات اعظم کی بہن تھی... لیکن ایک بوجھل خاموشی تھی جو آنے والے طوفان کی خبر دے رہی تھی۔

طوفان سرِشام ہی آگیا۔ اسے خادمہ نے مطلع کیا کہ بیگم صاحبہ آپ کے والد آئے ہیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ خوش ہونے کے بجائے اس اطلاع پر شبانہ کا دل بیٹھ گیا عام طور پر پاپا آتے تھے تو پہلے بڑے بھائی کے پاس بیٹھتے تھے۔ صرف چائے پیتے تھے تو جاتے وقت اس سے کھڑے کھڑے مل لیتے تھے۔ اس سے پوچھتے تھے کہ خوش ہو؟ اور جواب سنے بغیر سر پر ہاتھ رکھ کر کہتے تھے ”خدا تمہیں خوش رکھے۔“ اور پلٹ جاتے تھے۔ بیٹی سے کمرے میں دیر تک بات کرنا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ ماما اس کی قائل نہیں تھیں۔ وہ بیٹی سے پرائیویسی میں گھنٹا دو گھنٹا مل کے تمام حالات کی مفصل رپورٹ لیتی تھیں۔

آج شبانہ کا دس منٹ بعد بلاوا آگیا... جب وہ ڈرائنگ روم میں پہنچی تو عدالت لگی ہوئی تھی اور صاف نظر آتا تھا کہ مقدمے کی کارروائی شروع ہو چکی ہے... ایک طرف پاپا کے ساتھ ماما تھیں دوسری طرف شبانہ کے ساس سسر... اعظم نے خود کو عمداً غیر حاضر رکھا تھا۔ وہ تیسری طرف متحارب فریقوں کے درمیان بیٹھ گئی۔

پاپا نے کچھ دیر کی گمبھیر خاموشی کے بعد کہا۔ ”شبانہ... تمہارے تایا نے ایک بات کہی ہے... جو بہت عجیب ہے... تم کیا کہتی ہو؟“

”میں تایا کو بھی غلط نہیں کہہ سکتی۔“

”وہ زیور کہاں ہے؟“

ایک ملازمہ کو حکم دیا گیا کہ وہ بی بی کے کمرے میں رکھا ہوا گتے کا ڈبا اٹھا لائے۔ اس کے واپس آنے تک ایک بوجھل خاموشی میں وہ سب ایک دوسرے سے نظریں چراتے رہے۔

پاپا نے اور پھر ماما نے زیور کا یوں معائنہ کیا جیسے پولیس قتل کے شواہد کا معائنہ کرتی ہے۔

تایا نے مقدمہ شروع کیا۔ ”یہ ڈاکو لے گئے تھے اور وہی ہمیں واپس کر گئے... اس رقعے کے ساتھ۔“

”وہ میں نے دیکھا۔“ پاپا بولے۔

”افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ ساری دنیا نے دیکھا... یہ گھر کی بات نہیں رہی۔“ تایا بولے۔

پاپا نے کانپتی آواز میں کہا۔ ”زیور نقلی ہے... اس سے میں انکار نہیں کرتا... دکھ مجھے یہ ہے کہ قصوروار آپ نے مجھے سمجھا۔“

تائی نے پلٹ کے جواب دیا۔ ”پھر تو قصوروار ڈاکو ہی ہوئے کہ اصلی زیور لے گئے اور راتوں رات ویسا ہی نقلی بنا کے ہمارے منہ پر مار گئے۔“

”بھابی... افسوس تو یہ ہے کہ انہوں نے خیر دین کو بھی مار دیا ورنہ میں اس سے پوچھتا۔“

بڑے بھائی نے کہا۔ ”خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہارے خاندانی زرگر کے قتل کا الزام تم پر نہیں آرہا... کم سے کم ایسا ہم نہیں کہہ سکتے... مگر کچھ لوگ کہیں گے۔“

”مجھے خیر دین پر ایسی بے ایمانی کا الزام لگاتے ہوئے سوچنا پڑتا ہے۔ وہ میرے والد کے زمانے سے ہمارے گھر کا ہر کام کرتا آیا تھا۔“

ماں نے کہا۔ ”آدمی کا دل ایک ہی بار بے ایمان ہوتا ہے اس نے ساری کسر نکال لی۔“

”وہ ہوتا تو بتاتا۔“ پاپا نے آہ بھری۔

”یہی تو برا ہوا... اب تو لوگ الزام دے رہے ہیں تمہیں اور وہی لوگ تمہیں سنار کے قتل کا ذمے دار ٹھہرا رہے ہیں کہ جب تمہارا یہ راز فاش ہونے لگا تو تم نے اس کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کردی۔“ تایا نے خفگی سے کہا۔

”یہ لوگوں کی بات رہنے دیں بھائی صاحب... بتائیں میں اپنی اکلوتی بیٹی کے ساتھ ایسا کر سکتا ہوں؟ کس کے لیے لایا تھا میں وہ سونا؟ میرے حالات بھی اتنے خراب تو نہیں تھے شادی کے وقت۔“ پاپا کا لہجہ بھی تیز ہوگیا۔

تایا نے کہا... ”دیکھو... ہم انہی لوگوں کے درمیان رہتے ہیں... ہمیں عزت دینے والے یہی لوگ ہیں... مزارع... ملازم اور ووٹر... ہم ان کی پروا کیسے نہ کریں... میں اور تم لندن جاتے ہیں تو ہماری بہو بیٹیاں ہمارے ساتھ بے پردہ اور جینز پہن کے پھرتی ہیں... مگر کیا ہم یہاں ایسا کر سکتے ہیں؟“

”یہ تو ٹھیک ہے۔“

تایا بولتے رہے۔ ”آخر کیا ملا مجھے تعلقات بحال کر کے؟ صرف یہ بے عزتی... میں نے تو رشتہ استوار کیا تھا... خود آیا تھا تمہارے پاس... بڑا ہونے کے باوجود... میری عزت خاک میں مل گئی۔“

”بھائی صاحب... بلاوجہ آپ بات کو اتنا بڑھا رہے ہیں۔“

اب تائی نے کہا۔ ”ہم نہیں... ہمارا بیٹا بدظن ہے... وہ ہم سے بھی خفا ہے... ہمیں الزام دیتا ہے... ابھی اسے پارٹی نے ٹکٹ دیا تھا اور آج اس کے آفس میں یہ تماشا ہوا... اس کی عزت خاک میں مل گئی۔“

”پھر کیا کریں ہم... معافی مانگیں اس سے۔“ ماما نے تیز لہجے میں کہا۔

”آپ کی معافی سے اس کی عزت بحال نہیں ہو گی... اس نے کہا ہے... ہمیں اس کا جواب دینا ضروری ہے۔“

”کیا مطلب؟“ شبانہ نے چونک کے پوچھا۔

”مطلب صاف ہے بی بی... جس رشتے میں دراڑ پڑ جائے وہ کیسے برقرار رہ سکتا ہے۔“ تائی نے تڑخ کے کہا۔ ”بے عزتی ہماری ہوئی ہے... جب تک ہم بے عزتی کرنے والے کے خلاف قدم نہیں اٹھائیں گے... یہ عزت بحال کیسے ہوگی؟“

”کیا قدم اٹھانا چاہتی ہو آپ بھابی... کھل کے کہیں۔“ ماما نے مشتعل ہو کے کہا۔

”بات لمبی کرنے یا گھما پھرا کر کہنے کی مجھے عادت نہیں... تم آئی ہو تو اپنی بیٹی کو ساتھ لے جاؤ... اس کا سامان ہم بعد میں بھیج دیں گے۔“

پاپا نے برہمی سے کہا۔ ”بھائی صاحب... یہ کیا ہو رہا ہے... اگر جرم میرا ثابت ہوجائے... تب بھی شبانہ کو سزا کیوں؟“

بڑے بھائی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”غلطی کا خمیازہ کسی نہ کسی کو تو بھگتنا ہی پڑتا ہے... غلطی ہماری نہیں تو نقصان ہمیں کیوں ہو؟“

ماما کھڑی ہوگئیں۔ ”اگر آپ نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو پھر آگے کے نتائج کے لیے بھی تیار رہیں بھابی۔“

اس ماحول میں شبانہ کے لیے عقل و ہوش سے کام لینا مشکل ہوگیا۔ ”میں جانتی ہوں یہ سب کیوں ہو رہا ہے... آپ کے بیٹے کو محض بہانہ چاہیے... میری زبان نہ کھلوائیں تو اچھا ہے... جو کچھ وہ کر رہا ہے... وہ بھی دنیا دیکھ رہی ہے۔“

اعظم کی ماں نے چیخ کے کہا۔ ”کیا الزام لگا رہی ہے تو اپنے شوہر پر شرم نہیں آتی؟“

”شرم اسے نہیں آتی تو مجھے کیوں آئے... میں نے تو کسی کو بھی پولیٹیکل سیکریٹری نہیں رکھا۔“ شبانہ تڑخ کے بولی۔

ظاہر ہے ایسی جارحیت کے بعد مفاہمت کا امکان صفر ہو چکا تھا۔ وہ ماما اور پاپا کے ساتھ گھر چلی گئی۔ اسے معلوم ہی نہیں ہوا کہ نقلی سونے کے زیورات کا ڈبا کس نے ان کی گاڑی میں رکھا تھا۔ شبانہ کو یقین تھا کہ وہ اعظم سے بات کرے گی تو معاملات کنٹرول میں آجائیں گے۔ انہوں نے دس سال ایک ساتھ گزارے تھے۔ ان کے درمیان تین بچے ایک پل کی طرح تھے جو دو کناروں کو ملاتے تھے۔ یہ پل کیسے توڑے جا سکتے تھے۔ چند دن بعد اعظم خود محسوس کرے گا کہ اس کی دوسری بیوی آجائے تب بھی بچوں کے لیے دوسری ماں کا مسئلہ سنگین صورت اختیار کرے گا۔

لیکن حالات ایک دم بگڑ گئے۔ اعظم کو سمجھانے والوں سے زیادہ اکسانے والے تھے... شبانہ کے نزدیک ان میں اس کی سیکریٹری پیش پیش ہوگی۔ اگلے روز شبانہ کے جہیز کا باقی ماندہ سامان آیا تو اس کے ساتھ بچے بھی آگئے۔ شبانہ کے

لیے یہ صدمہ غیر متوقع تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بالآخر بچوں کی وجہ سے ہی معاملات راہِ راست پر آجائیں گے۔ میاں بیوی الگ ہو جائیں تب بھی بچوں کا مسئلہ باقی رہتا ہے... ان کی تحویل پر مقدمات برسوں چلتے ہیں... ماں یا باپ میں سے کوئی بچوں سے دستبردار ہونے پر راضی نہیں ہوتا... پہلے وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیانہ تھا۔ اب اعظم نے وہ درخت ہی جڑ سے اکھاڑ دیا تھا۔

شبانہ پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ دن رات خون کے آنسو بہائے اس نے اپنے ساتھ بھائی کا گھر اجڑتے دیکھا۔ وٹے سٹے کے رشتوں میں ایسا کرنا خاندانی عزت اور وقار کا تقاضا بن جاتا ہے۔ بھائی اور بھابی بہت خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے بھی تین بچے تھے۔ پاپا کی مخالفت کے باوجود ماں نے بہو کو واپس بھیج دیا۔ ماں نے بیٹے کے دل کی فریاد بھی نہیں سنی... معاملہ انا اور انتقام کا تھا۔ ظاہر ہے اس کے بعد بھابی نے بھی وہی کیا جو اس کے بھائی نے کیا تھا۔ دادا، دادی کو سزا دینے کے لیے وہ اپنے بچے ساتھ لے گئی۔ مصالحت کی ہر کوشش رائگاں گئی۔ یا ناکام بنا دی گئی... دونوں طرف کے قانونی مشیروں نے طلاق نامے کے ساتھ بچوں پر اپنے حق سے دستبرداری کے کاغذات تیار کیے۔

جن کے گھر تباہ ہوئے وہ خاندان کی عزت اور وقار پر قربان ہو گئے مگر انہوں نے سماجی اخلاق کے خلاف بغاوت کی ہمت نہیں کی۔ اگر وہ چاہتے تو دستیاب وسائل کے ساتھ وہ اپنی فیملی کے ساتھ الف پور سے کہیں بھی جا سکتے تھے... جن کے پاس پیسا تھا ان کے لیے کوئی سرحد نہیں تھی۔ وہ کینیڈا، امریکا سے آسٹریلیا اور ملیشیا تک ہر جگہ آباد ہو رہے تھے۔

شبانہ نے اپنے شوہر کو دیکھا تھا... گھر کے اندر کی عورت اور باہر کی عورت کے درمیان ذاتی اخلاق کے دہرے معیار رکھتا تھا۔ خود اس کا بھائی کیا کرتا تھا... یہ شبانہ نہیں جانتی تھی مگر وہ بھی بہرحال اسی معاشرے کا مرد تھا۔

دونوں کے بچوں نے باپ کی شفقت، تربیت یا شخصیت کا کوئی روپ نہیں دیکھا۔ جو روپ ان کے سامنے آیا وہ مثبت نہیں تھا۔

شبانہ کے پاپا ایک مہینے بعد دل کے پرانے عارضے میں مبتلا ہو کے اسپتال میں داخل ہوئے۔ بلڈ پریشر جو پہلے قابو میں رہتا تھا ٹینشن سے بے قابو ہا اور وہ دنیا سے رخصت ہوئے تو ایک کامیاب اور خوش و خرم زندگی گزارنے والے کی طرح مطمئن نہیں تھے۔

خیر دین کو ڈاکو اٹھا کے لے گئے تھے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ نقلی سونے کی شناخت کرائی بلکہ اس سے اعترافِ جرم بھی حاصل کر لیا۔ دس سال بعد اسے اپنے جرم کی سزا بھی مل گئی۔ اس کی بیوی کے بارے میں کسی کو معلوم نہ ہوا کہ شوہر کے بغیر وہ کب تک جی سکی۔

☆☆☆

ریڈیو کیب کے مہذب باوردی ڈرائیور نے دبئی سے آنے والے مسافر کی معلومات میں اضافہ کیا۔ ''یہ سیالکوٹ کا ائرپورٹ خود یہاں کے صنعت کاروں نے بنایا ہے سر... یہ پاکستان کا پہلا پرائیویٹ ائرپورٹ ہے۔''

سوٹ والے مسافر نے کہا۔ ''آج کچھ گرمی ہے۔ اے سی چلاؤ۔''

''یس سر... الف پور میں آپ کہاں جائیں گے؟''

مسافر کے ساتھ بیٹھی ہوئی نسبتاً عمر رسیدہ عورت نے ناگواری سے انگریزی میں کہا۔ ''الف پور پہنچ کے بتا دیں گے تم کو اتنا تجسس کیوں ہے؟''

ڈرائیور نے انگریزی میں شائستگی سے کہا۔ ''اگر مجھے صحیح پتا معلوم ہو گا تو آپ کا وقت ضائع نہیں ہو گا میڈم۔''

مسافر ہنسا۔ ''الف پور ایک گاؤں تھا جب میں دبئی گیا تھا۔''

باتونی ڈرائیور نے کہا۔ ''یہ بہت پرانی بات ہو گی سر۔''

''ہاں... پندرہ سال سے زیادہ ہو گئے... اس وقت وزیر آباد یا سیالکوٹ کے لیے صرف پرانی بس چلتی تھی۔''

''اب آپ دیکھ لیں یہ ریڈیو کیب ٹویوٹا کا بالکل نیا ماڈل ہے... الف پور کے لوگ پیزا ہٹ اور کے ایف سی جاتے ہیں اور کھانا کھا کے واپس آجاتے ہیں۔''

عورت نے پوچھا۔ ''الف پور کتنی دور ہے شوبی؟''

''ہم پہنچ گئے میڈم۔'' ڈرائیور بولا۔

مسافر نے حیرانی سے اس صنعتی علاقے کو دیکھا جس میں کئی چھوٹے بڑے کارخانے وجود میں آچکے تھے۔ اس کے بعد نئی آبادی کی جدید کوٹھیاں نظر آرہی تھیں۔ ڈرائیور نے بتایا کہ یہ سیٹلائٹ ٹاؤن ہے... گلبرگ۔

''گلبرگ تو لاہور میں تھا۔''

''اب ہر جگہ ہے سر... جیسے موبائل فون اور کیبل ٹی وی..... آپ مجھے راستہ بتائیں گے سر؟''

''ہاں... یہاں ایک خیر دین زرگر کی دکان تھی۔''

''زرگر... وہ کیا کام کرتا تھا سر؟''

''سونے کے زیورات بناتا تھا اور کیا کرتا تھا۔ جیولر تھا۔''

ڈرائیور نے کچھ دیر سوچا۔ ''ویسے تو میں بھی الف پور کا رہنے والا ہوں سر لیکن مجھے کسی جیولر سے معلوم کرنا پڑے گا۔''

''شوبی ڈارلنگ۔'' عورت نے ناک پر رومال رکھ لیا۔ ''کس قدر دھول مٹی ہے یہاں۔''

مرد مسکرایا۔ ''تم دبئی میں نہیں ہو ڈارلنگ... بہت جلد اس کی بھی عادی ہو جاؤ گی۔ یہ لاہور میں بھی ہے اور کراچی میں بھی۔''

گاڑی کو ایک پرانے جیولر کی شاندار دکان کے سامنے روک کے ڈرائیور چلا گیا۔ دبئی سے آنے والے مسافروں کا سن کے مالک خود باہر آ گیا۔

''خیر دین زرگر تو اب نہیں ہے سر۔'' اس نے کار کی کھڑکی کے قریب آ کے کہا۔ ''اس کا قتل ہو گیا تھا گزشتہ سال۔''

شوبی یعنی شہاب الدین غوری کے لیے حیرانی کے بعد یہ دوسرا شاک افسوس کا تھا۔ ''اور اس کی بیوی... کیا وہ زندہ ہے؟''

دکاندار نے نفی میں سر ہلایا۔ ''چھ مہینے پہلے وہ بھی مر گئی... آپ کے جاننے والے تھے وہ؟''

شہاب الدین نے بے خیالی میں کہا۔ ''ہاں... یہی سمجھ لو۔''

''میں سمجھا آپ نے اس کی گڈ وِل کا ذکر سنا ہو گا کسی سے... زیورات میں اب ہماری گڈ وِل ہے سر... آپ تشریف لائیں۔''

''ہم آئیں گے... ابھی تم ڈرائیور کو اس کا پتا سمجھا دو... جہاں خیر دین زرگر رہتا تھا۔''

''آئی ایم سوری سر... میں نے بھی صرف نام سنا تھا اس کا۔''

شہاب الدین کو اچانک کچھ یاد آیا۔ ''اچھا... ایک فضل جنرل اسٹور تھا... وہ کہاں ہے... دراصل میں پندرہ بیس سال پہلے آیا تھا۔''

ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ ''وہاں تو میں آپ کو لے جا سکتا ہوں... پانچ منٹ کا راستہ ہے۔''

ایک بار پھر شہاب الدین غوری نے اپنے بھائی کی دکان میں قدم رکھا تو حالات کے ساتھ اس کے جذبات بھی بدل چکے تھے۔ اس وقت وہ ضرورت مند بن کے چھوٹے بھائی سے قرض مانگنے آیا تھا اور فقیر کی طرح دھتکار دیا گیا تھا۔ آج وہ اس پوزیشن میں تھا کہ اسٹور کو کھڑے کھڑے خرید لے۔

شہاب الدین نے فضل جنرل اسٹور کی جگہ نیا سائن بورڈ دیکھا جس پر ''فضل ڈیپارٹمنٹل اسٹور'' لکھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے پورے رہائشی گھر کو نئے سرے سے تعمیر کر کے نئے سامان سے بھر دیا تھا۔ اب وہاں کراکری... کٹلری... الیکٹرانکس اور ٹوائے شیلفس الگ الگ نظر آ رہے تھے... فضل دین خود کار شیشوں والے دروازے کے دائیں جانب ایک شیشے کے کیبن میں بیٹھا ہوا تھا۔ پورا اسٹور ائر کنڈیشنڈ تھا اور اس میں گاہک ٹرالی لیے پھر رہے تھے۔

فضل دین نے بڑے بھائی کو تھوڑا سا غور کرنے کے بعد پہچان لیا۔ وہ ایک دم اٹھا اور اس سے چمٹ گیا۔ ''بھاجی... آپ... اتنا عرصے بعد... مجھے تو یقین نہیں آ رہا ہے... آپ کو پتا ہے ابا اور اماں نہیں رہے۔''

''ہاں فضل... معلوم ہے مجھے... یہ تیری بھابی ہے۔''

فضل کی مسکراہٹ کافور ہو گئی لیکن اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال بھی لیا۔ ''اچھا اچھا... اردو سمجھتی ہے نا بھابی... کہاں کی ہیں؟''

''کینیا کی... انڈین ہیں مگر پیدا وہاں ہوئی تھیں۔ ان کے والد اپنے وزیر آباد کے ہی تھے۔ تو نے گھر کو دکان بنا لیا ہے۔ اب رہتا کہاں ہے؟''

''چلو بھاجی... میرے ساتھ چلو... تمہاری بھرجائی بہت خوش ہو گی تم سے مل کے... خیر سے ہمارے بچے اب کالج میں پڑھ رہے ہیں آپ کے بچے بھاجی؟''

''انہیں ہم ساتھ نہیں لائے۔'' بیوی کے کچھ کہنے سے پہلے شہاب الدین نے جھوٹ سے بات نبھا دی۔

''ابھی رہو گے نا ایک دو دن تو؟'' فضل دین نے اپنی ہنڈا اسوکس کا الیکٹرانک لاک کھولا۔ ''اس ٹیکسی والے کی چھٹی کر دو۔''

فضل دین کی جدید وضع کی کوٹھی بھی گلبرگ میں ہی سڑک کے کنارے تھی جہاں سے وہ کچھ دیر پہلے گزر کے گئے تھے۔ اس کی بیوی رشتے میں شہاب الدین کے ماموں کی بیٹی بھی تھی لیکن پرانے رشتوں کے حوالے اب بے معنی ہو گئے تھے۔ اصل حوالہ یہ تھا کہ اب فضل ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے مالک کا بھائی اپنی غیر ملکی بیوی کے ساتھ دبئی سے آیا تھا۔ ان کے رشتے میں دولت مندی قدرِ مشترک تھی۔ خون کا رشتہ

بھی برابری کی بنیاد پر تھا۔

رات کو کھانے کے بعد دونوں بھائی ایک بیڈروم میں جاگتے رہے اور اپنے اپنے گزرے ہوئے وقت کی باتیں کرتے رہے... فضل دین نے اپنے باپ کی اور پھر ماں کی موت کے افسوسناک واقعات کا ذکر کیا... گزر جانے والا وقت کسی قبر کے کتبے کی طرح ہو گیا تھا جس پر صرف نام اور تاریخِ وفات درج ہو۔ باقی سب یادوں کے قبرستان میں مدفون بے نشاں لمحے ہوتے ہیں۔

''بھاجی... یہ تم نے کس سے شادی کر لی؟'' فضل دین بولا۔

شہاب الدین چونکا۔ ''کس سے کیا مطلب... ایک عورت ہے یہ بھی۔''

''عورت تو ہے مگر عمر میں تمہاری... کافی بڑی لگتی ہے... انڈیا کی ہے تو کیا مسلمان ہے؟''

''نہیں فضل دین... اس کا باپ بھی سکھ تھا۔ وہ تقسیم سے پہلے ہی کینیا چلے گئے تھے۔ وہاں اس نے ایک ہندو فیملی میں شادی کی... بیٹی کا نام تو امرت کور ہے۔ مگر مذہب اس کا کچھ بھی نہیں... نہ سکھ نہ ہندو... باہر سب چلتا ہے فضل دین... اسے میرے مسلمان ہونے سے فرق نہیں پڑتا... دراصل جب میں دبئی پہنچا تو بڑے مشکل حالات تھے جس شخص کے آسرے پر گیا تھا وہ مجھے ملا نہیں... اس کا نام تھا شیر افضل... خیر میں نے ادھر ادھر کے بہت سے چھوٹے موٹے کام کیے۔ سب ہی کو کرنے پڑتے ہیں۔ مجھے تو کوئی خاص کام آتا نہیں تھا۔ میں نے مزدوری کی... پھر ڈرائیونگ کا لائسنس لے لیا... ایک کمپنی میں اچھی ملازمت بھی مل گئی... ایک سکھ فیملی کرائے کی گاڑیاں چلاتی ہے... اس نے ٹیکسی دے دی۔ وہ بعد میں اپنی ہو گئی اور آمدنی بھی بہت بڑھ گئی۔ لیکن اس کے بعد میں ایک بڑی مشکل میں پھنس گیا۔ سڑک پر ایک بندہ میری گاڑی کے نیچے آ کے مر گیا۔ مجھے تو ہو جاتی سزائے موت۔ ادھر کوئی دیر نہیں لگتی۔ جان ایک صورت میں بچ سکتی تھی کہ مرنے والے کی فیملی دیت قبول کرے۔ وہ لاکھوں میں بنتی تھی۔ میں کہاں سے لاتا۔ اس وقت یہ عورت امرت کور میرے کام آئی۔ اس نے وارثوں کو دیت کی رقم ادا کی... میری ٹیکسی چھڑائی... اور اس کے لیے مجھے اس سے شادی کرنی پڑی۔ اس نے کہا کہ میں مسلمان ہو جاتی ہوں... تم مجھ سے نکاح کر لو... اس کا اسلامی نام بھی رکھا گیا امیر بیگم... لیکن یار وہ سب مجھے پھانسنے کے لیے تھا... وہ دل سے سکھ ہی رہی۔ نکاح رجسٹرڈ ہو گیا اور اس نے حق مہر لکھوا لیا پانچ لاکھ درہم۔

''اور تو نے لکھ دیا؟ اس بڑھیا کے لیے۔''

''میں کیا کرتا فضل... آنے والے جمعے یا اس سے اگلے جمعے کی نماز کے بعد میرا سر قلم کر دیا جاتا۔ جان بچانے کے لیے سب کرنا پڑا مجھے... اب اس کا وہ قرضہ الگ ہے جو اس نے دیت کی ادائیگی کے لیے دیا تھا۔ طلاق دوں تو پانچ لاکھ درہم اس کے علاوہ... میں کچھ نہیں کر سکتا... شادی کے وقت میری عمر تھی بائیس سال... یہ چالیس کی بتاتی تھی خود کو۔''

''تجھ سے دگنی عمر کی ہو گئی نا... بچے اسی لیے نہیں ہوئے؟''

شہاب الدین نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''میں نے سوچا تھا دوسری کر لوں گا۔ اس پر بھی راضی نہیں۔ ایسے ہی گزارا چل رہا ہے۔ خیر یہاں کی سنا۔ الف پور تو اچھا بھلا شہر ہو گیا ہے۔ مجھ سے تو راستے ہی نہیں پہچانے جا رہے تھے۔ یہاں ایک زمیندار تھے۔ چودھری فیملی... نام ان کا مجھے بھول گیا... ابا انہی کے لیے زیورات بناتا تھا۔''

فضل نے سر ہلایا۔ ''چودھری تو مر گیا۔ اس کا بیٹا ہے۔''

''ایک بیٹی بھی تھی اس کی۔'' شہاب الدین نے کہا۔

''ہاں... بھائی کے گھر میں شادی کی تھی۔ طلاق ہو گئی... ابھی بھی گھر وہی ہے... جہاں زمین تھی۔''

اس کا بھائی نہ جانے کیا کچھ بتا رہا تھا لیکن شہاب الدین کا ذہن پرانے وقتوں میں بھٹک رہا تھا۔ یادوں کی سنسان گلیوں میں گھوم رہا تھا۔ اسے مدھوبالا یاد آ رہی تھی۔ نہر کا پل یاد آ رہا تھا۔ کیا عمر تھی اس وقت شبو کی... سترہ اٹھارہ... آج پندرہ سال بعد وہ ہو گی بتیس تینتیس کی... اس کی ہم عمر... امرت کور تو ہو گئی پچپن کی... کہنے والے اسے بیوی کی جگہ اماں بھی کہہ دیتے ہیں... شبو کیسی ہو گی؟ اگر طلاق ہو چکی ہے اسے تو یہ ہو سکتا ہے کہ وہ مجھ سے شادی پر راضی ہو جائے۔ میں لوٹ کے دبئی ہی نہ جاؤں... امرت کور جائے جہنم میں۔ یہاں وہ میرا کیا بگاڑ سکتی ہے... اور میری مالی حیثیت اب پہلے جیسی نہیں... اگر میں اپنا سرمایہ دبئی سے یہاں منتقل کرا لوں تو یہاں بھی رہ سکتا ہوں۔

وہ رات کے آخری پہر میں سویا تو اس کے خواب میں نصف صدی پرانی بلیک اینڈ وائٹ فلم ''محل'' چلتی رہی۔

مدھو بالا جھولے میں بیٹھی گا رہی تھی۔ لالٹین ہاتھ میں لیے ویران حویلی میں گھوم رہی تھی۔ چاند جیسے روشن چہرے پر کالے بادلوں جیسے بال بکھرائے... تنا کی رس بھری آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ آئے گا... آئے گا... آنے والا آئے گا... آئے گا۔

☆☆☆

شہاب الدین غوری کے لیے وقت پھر پندرہ سال پیچھے چلا گیا تھا۔ اس وقت جب وہ اٹھارہ برس کا نوجوان تھا۔ جس کا دل پہلی بار شبو کو دیکھ کر ایسے دھڑکا تھا جیسے بچہ مچل جاتا ہے... ایک دم اس کے سامنے مدھو بالا آ کھڑی ہوئی تھی جس کی ایک رسالے سے نکالی ہوئی تصویر وہ سینے سے لگائے پھرتا تھا۔ لڑکے اس پر ہنستے تھے اسے دیکھو... کس پر مرتا ہے جو خود مر چکی ہے... لیکن وہ مجبور تھا... مدھو بالا کا حسن اس کی نگاہوں کو خیرہ کرتا تھا... اسے مدہوش اور مسحور کر دیتا تھا۔

شبو کے روپ میں ایک دن اچانک وہ نظر آ گئی تھی۔

شہاب الدین نے وہ فاصلہ پیدل ہی طے کیا تھا۔ کسی دشواری کے بغیر وہ نہر تک پہنچ گیا تھا۔ نہر بالکل وہیں تھی اور ویسی ہی تھی۔ اس میں بہنے والا گدلا پانی بھی وہی تھا۔ حد یہ کہ اس کا وہ پل بھی ویسا ہی تھا۔ الف پور نے بڑی ترقی کی تھی نئی سڑکیں اور جدید عمارات بن گئی تھیں۔ اس نے سنا تھا کہ آگے کہیں نہر پر ایک نیا اور بہت چوڑا پل بھی بنا ہے جس پر سے دن رات کاریں اور بسیں گزرتی ہیں... یہ پرانا پل متروک ہو گیا تھا... اس پر سے لوگ پیدل نہر کو عبور کرتے تھے یا کوئی سائیکل پر گزر جاتا تھا۔

یہاں وقت جیسے رک سا گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ زندگی کے گزر جانے والے پندرہ برس اپنا کوئی وجود نہیں رکھتے۔ جذبات کی شدت اسے آج پھر ویسی ہی محسوس ہو رہی تھی۔ جوانی جو شاید گزر گئی تھی پھر نوجوانی سے ہم آہنگ ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی لواسٹوری میں کوئی وقفہ ہی نہیں آیا... اس کے لیے وہی پہلی لواسٹوری تھی جو آخری بھی بن گئی تھی اور آج وہ پھر وہیں تھا جہاں سے یہ لواسٹوری شروع ہوئی تھی۔

وہ نہر کے پرانے پل کے جنگلے پر جھک کر نیچے سے گزرنے والے گدلے پانی کو دیکھنے لگا... ایک مشہور انگریزی محاورہ تھا جو وقت کے گزرنے کی صحیح عکاسی کرتا تھا کہ پلوں کے نیچے سے کتنا پانی گزر چکا ہے... یہاں یوں لگتا تھا کہ وہی پانی آج بھی بہہ رہا ہے۔ انجام سے آغاز کی طرف لوٹ جانے کا یہ تجربہ اپنے اندر ایک انوکھی سنسنی رکھتا تھا۔

اس کا یہ احساس مزید شدت اختیار کر گیا جب اس نے ایک گاڑی کو پل کے آغاز میں لائٹس بجھا کے نشیب کی طرف رکتا دیکھا... یہ گاڑی وہی تھی... شہاب الدین کو یقین نہ آیا... شبو آج پندرہ سال بعد بھی وہی گاڑی چلا رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اب اس کے پاس جدید ترین ماڈل کی کار ہو گی۔ کچھ لوگ پرانی چیزوں اور یادوں کو عزیز رکھتے ہیں... کیا شبو کے لیے بھی اس کے ماضی کا ہر نقش ایک قیمتی سرمایہ تھا۔

وہ کیسے اندازہ کر سکتا تھا کہ شبو نے آج بطور خاص یہ گاڑی نکالی تھی جو اس کے پاپا کی نشانی تھی۔ ذاتی استعمال کے لیے اس کے پاس ایک نہیں دو نئی کاریں تھیں گزشتہ روز جب اس کی شہاب الدین سے بات ہوئی تھی اس نے تب ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ایک بار پھر اس کی لواسٹوری کا پہلا سین اسے یاد دلائے گی۔ یوں جیسے کوئی پرانی تصویر میں قید لمحہ وقت کی کسی تبدیلی سے متاثر نہیں ہوتا۔

برقع کا استعمال وہ شادی کے بعد ترک کر چکی تھی لیکن یہ پرانا برقع اس کی پرانی چیزوں کے ساتھ آج بھی محفوظ تھا۔ اس کے پاپا نے اسے رخصت کر دیا تھا مگر اس کی یادوں کو دل میں بسائے رکھا تھا۔ اس کے استعمال کی ہر چیز اس کے کمرے میں موجود تھی۔ پرانے کپڑے... جوتے... کتابیں... یہاں تک کہ پرانی گڑیاں اور کھلونے۔

وہ ایک بار پھر برقع میں پل کے اوپر سے گزری جہاں وہی شہاب الدین نیچے سے گزرتے پانی پر غور کر رہا تھا۔ پہلے بھی شبو کا مقصد اپنی شناخت کو ظاہر نہ ہونے دینا تھا اور آج بھی وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اسے دیکھے تو پہچان لے۔ شہاب الدین ایک اشارے پر اس کے پیچھے ہو لیا... وہ ڈھلوان پر قدم جماتی نیچے کی طرف چلتی گئی جہاں پل کے نیچے نہر کے کنارے بڑی محفوظ پناہ فراہم کرتے تھے۔

شہاب الدین نے چاندنی میں ایک اور ہاتھ کو طلوع ہوتے دیکھا۔ آسمان تک پھیلی ہوئی تاریکی میں ایک چاند اپنی روشنی پھیلا رہا تھا۔ دوسرا برقع کی سیاہی میں سے شبو کا چہرہ بن کے ابھرا اور اس کے دل کو منور کر گیا۔

''شبو۔'' اس نے بے اختیار کہا۔ ''مجھے معلوم تھا تم آؤ گی۔''

''مجھے بھی یقین تھا کہ تم آؤ گے۔'' شبو نے کہا۔

''شہاب الدین نے اس کے طنز کو محسوس کیا۔ وہ پندرہ سال پہلے کے عہد و پیمان کا حوالہ دے رہی تھی۔

''مجھے افسوس ہے میں وعدے کے مطابق نہ آ سکا۔''

''مگر مجھے کوئی افسوس نہیں۔'' شبو نے کہا۔

شہاب الدین نے بات بدل دی۔ ''تم آج بھی ویسی ہی لگتی ہو۔''

''جیسی دھو بالا فلم محل میں لگتی تھی؟''

''تم نے خود کو بہت اچھا MAIN TAIN کیا تمہیں دیکھ کے اندازہ کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ اتنا وقت گزر گیا۔''

''یہ تو تم نے جان ہی لیا ہو گا کہ کیسا گزرا؟''

''ہاں کچھ لوگوں سے معلوم ہوا... کل تم سے فون پر بات ہوئی تو پتا چلا... تمہارا نمبر بڑی مشکل سے ملا تھا مگر تلاش سچی ہو تو خدا بھی مل جاتا ہے۔''

''تمہیں بھی وہ سب مل گیا جس کی تمہیں آرزو تھی؟''

''سوائے تمہارے...'' شہاب الدین بولا۔ ''آج میرے پاس سب کچھ ہے... مال و دولت... کوٹھی کار۔''

''اور بیوی... میں نے اسے کل دیکھا تھا تمہارے ساتھ۔''

شہاب الدین چونکا۔ ''ہاں... وہ بس... ایک مجبوری تھی وہ تمہارا نعم البدل بہرحال نہیں۔''

''نعم البدل کسے کہتے ہیں شہاب الدین غوری... اس پر کبھی غور کیا تم نے... کیا اس وقت کا نعم البدل ہو سکتا ہے جو خواب دیکھتے یا تعبیر کی جستجو میں گزر جاتا ہے... زندگی میں سب پانے کی لگن میں گزر جاتا ہے... میرے پاس آج کچھ بھی نہیں ہے۔''

''میں کل دبئی جا رہا ہوں... لیکن تم میرے ساتھ چلو میں اپنی روانگی ملتوی کر سکتا ہوں۔'' شہاب الدین نے کہا۔

شبو نے ایک دم برقع کے اندر سے ریوالور نکال لیا۔ ''اب کچھ ملتوی نہیں ہو سکتا۔''

شہاب الدین کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ ''یہ... یہ کیا ہے؟''

''اس لواسٹوری کا انجام۔'' شبو ہنسی۔ ''ہر لواسٹوری میں یہی ہوتا ہے۔ فرہاد نے خود کو تیشہ مار کے ہلاک کر لیا تھا۔ سوہنی کچے گھڑے پر دریا میں ڈوب گئی تھی۔ رومیو جیولیٹ نے زہر کھا لیا تھا۔''

''خدا کے لیے ہوش میں آؤ شبو۔'' وہ چلایا۔ ''یہ سب کیا ہے؟''

''یہ تمہارے لیے یوم حساب ہے۔ کچھ اندازہ ہے تمہیں کہ تم کو کس کس کے خون کا حساب دینا ہے... صرف میں تھی جو تمہیں مارنے کے لیے زندہ تھی۔ اور کتنے تم نے مار دیے، ان کا کوئی حساب ہے... تم نے اپنے باپ کو مارا... اپنی ماں کو مارا... میرے پاپا کو مارا... میرے بچوں کے باپ کو جیتے جی مارا... یہی میرے بھائی کے بچوں کے ساتھ ہوا۔''

''میں نے کچھ نہیں کیا...'' وہ وحشت سے چلایا۔

''ہاں... نہ گولی کچھ کرتی ہے نہ ریوالور کا قصور ہوتا ہے... خنجر خود کچھ بھی نہیں کرتا... قصوروار تو قاتل کا ہاتھ ہوتا ہے... اتنے لوگ تم نے نہیں مارے مگر تمہاری وجہ سے مارے گئے...'' وہ ہذیانی انداز میں ہنسی۔ ''تم تو سمجھ رہے ہو گے کہ میں اپنی لواسٹوری کا پھر سے آغاز کروں گی۔ انٹرول کے بعد... وہیں سے جہاں تم نے اسے چھوڑا تھا۔'' اس نے ایک فائر کیا۔

شہاب الدین منہ کے بل گر گیا۔ خون اس کے دل سے ابل رہا تھا اور بہہ کر نہر کے گدلے پانی میں شامل ہو رہا تھا۔

شبو نے اس کے دل میں ایک اور سوراخ کر دیا۔

''میں تمہاری لواسٹوری کو وہیں ختم کرنے آئی تھی جہاں سے یہ شروع ہوئی تھی۔''

اس نے اطمینان سے ریوالور کو اپنے بیگ میں ڈالا اور چڑھائی پر قدم جماتی اپنی کار تک آ گئی۔ گاڑی پرانے راستے پر ہیڈ لائٹس کے بغیر ہی دوڑنے لگی۔ یہ راستہ اس کا دیکھا بھالا تھا۔ اور اسے راستہ دکھانے کے لیے چاندنی بھی تھی۔

پل کے نیچے پڑی لاش کی جیب میں ایک موبائل فون کی گھنٹی صبح تک چلاتی رہی... امرت کور کے لیے شہاب الدین کا یوں بغیر بتائے اچانک کہیں چلے جانا اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ انہیں دبئی جانے کے لیے لاہور سے کراچی کی فلائٹ پکڑنی تھی۔

بالآخر اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس نے گھڑی دیکھ کے کہا۔ ''اچھا بھائی فضل... میں تو اب مزید انتظار نہیں کر سکتی۔ میں چلتی ہوں... ورنہ میری فلائٹ بھی نکل جائے گی... شہاب الدین آ جائے بعد میں... اور نہیں آتا تو میری طرف سے جہنم میں جائے۔''

فضل دین نے سر ہلایا اور ٹیکسی کو دیکھتا رہا جو دھول اڑاتی الف پور سے دبئی کے سفر پر روانہ ہو چکی تھی۔

جاسوسی کی سالگرہ کا تیسرا تحفۂ خاص

طرفہ تماشا

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

حُسنِ بلا خیز ہو تو دل میں گھر کر جاتا ہے ۔ حُسن اور عشق کا ملاپ ہو چکا تھا مگر پھر کسی اور کی آنکھیں بھی اُس جلوۂ حُسن کی تاب سے خیرہ ہو گئیں۔ دو دلوں کے درمیان اچانک ہی کوئی در آیا ... بے قابو ہو جانے والے جذبات کی یورش، جنوں خیز عشق اور زندگی کی جُستجو میں دوڑتی بھاگتی ایک پُرلطف کہانی...

اُس جوڑے کا قصہ جس کی زندگی اور محبت کے گرد دشمنوں کا گھیرا تنگ ہو رہا تھا

وہ خاصی عجلت میں تھا۔ اس کا رخ کینٹ اسٹیشن پر ...قع ایک اقامتی ہوٹل کی طرف تھا۔ اچانک اس کی نظر ایک ...سی اخبار فروش کے کھوکھے پر جھولتے مقامی اخبار پر پڑی ...س میں جلی حروف میں سرخی لگی تھی۔

''جامشورو کے ایک گوٹھ سے، نوجوان بیٹا اپنے باپ ... بیوی لے بھاگا۔''

خبر بلاشبہ اپنے اندر مضحکہ خیز قسم کی سنسنی خیزی لیے ...ے تھی۔ ساتھ میں مرد عورت کی تصاویر بھی تھیں۔ وہ ...ٹرے کھڑے چکرا گیا... بلخ شیر کا جی چاہا کہ اخبار کے ...ں کھوکھے کو آگ لگا دے مگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا چنانچہ اس ... جی کڑا کر کے پانچ روپے جیب سے نکالے اور فوراً وہ ...بار خرید لیا... چوروں کے سے انداز میں پہلے دائیں ...یں نگاہ ڈالی پھر ایک طرف کھڑے ہو کے خبر کی سرخی کو ...بارہ دیکھنے لگا۔ قریب سے دیکھنے پر خبر کی سنسنی خیزی ...ے کم ہوئی۔ اب خبر اس طرح پڑھنے میں آ رہی تھی۔

''جامشورو کے ایک گوٹھ مستی شاہ سے، جوان بیٹا اپنے ...ر رسیدہ باپ کی جواں سال ہونے والی بیوی لے بھاگا۔''

بات سمجھ میں آ گئی۔ خبر کو سنسنی خیز یا دانستہ مضحکہ خیز ...نے کی خاطر اخبار والوں نے سرخی کے چند ''مخصوص'' درمیانی الفاظ کو تو جلی حروف میں لکھا تھا جبکہ ''عمر رسیدہ'' اور ''جواں سال ہونے والی'' بہت چھوٹے اور باریک لفظوں میں لکھا تھا جس کے باعث سرخی کو دور سے پڑھنے والے... یا بہ الفاظِ دیگر... ''مفت خورے'' جو اخبار کے کھوکھوں اور اسٹالوں پر کھڑے... بغیر اخبار خریدے صرف سرخیاں پڑھ کر کام چلاتے ہیں، وہ کشش محسوس کریں اور بالآخر چارو ناچار، چار پیسے جیب سے نکال کر اخبار خریدنے پر مجبور ہو جائیں۔ اور جو زیادہ ہی ڈھیٹ قسم کے کنجوس اور ''میں نہ خریدوں'' پر عمل پیرا رہتے ہیں، وہ ایسی سرخیوں کو دور سے پڑھ کر الٹی سیدھی افواہیں پھیلانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ پس...! ثابت ہوا کہ افواہیں پھیلانے والے بھی ڈھیٹ قسم کے کنجوس لوگ ہوتے ہیں جن سے معاشرے میں انارکی پھیلتی ہے کیونکہ ادھوری خبر... تباہی کی خبر کے مصداق ہوتی ہے۔

بہر طور... جواں سال بلخ شیر نے اخبار کا رول بنایا اور اپنے مطلوبہ ہوٹل کی طرف بڑھ گیا جو چند قدموں کے فاصلے پر تھا۔

استقبالیہ کے سامنے سے وہ بظاہر دنیا جہاں کا اطمینان اور سکون اپنے اندر سموئے ہوئے گزرا کیونکہ وہاں ایک ہیڈ

ویٹر کسی وردی پوش پولیس والے سے محوِ گفتگو تھا۔ وہ اس کی عجلت آمیزی پر شبہ کر سکتے تھے۔ اس نے مکمل تسلی کرانے والے انداز میں مسکرا کے ان کی طرف دیکھا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ یہاں کسی ذی نفس کو غیر موجود... پا کر وہ کسی راکٹ کی سی تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر چوتھی منزل پر پہنچا... کہ لفٹ بھی کیا اتنی جلدی پہنچاتی ہوگی۔

اخبار میں اپنی اور زرینہ کی تصاویر چھپنے کے بعد اس کا خوف اور اضطراب کچھ اور بڑھ گیا تھا، چنانچہ ذرا دیر بعد وہ اپنے کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑا بری طرح ہانپ رہا تھا۔ ہوٹل کی پہلی منزل کا کوئی کمرا خالی نہ تھا البتہ دوسری منزل میں نصف سے زیادہ کمرے خالی پڑے تھے۔

تیسری منزل پر تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ کسی کمرے میں بلی چوہوں کے علاوہ کوئی اور ذی نفس ہوتا، سب پر تالے تھے۔ یہی صورتِ حال چوتھی منزل کی تھی اور یوں اس نے رہائش کے لیے چوتھی منزل میں کمرا لینے کی ہی استقبالیہ پر عاجزانہ درخواست کی تھی۔ اس پر استقبالیہ پر موجود شخص نے شدید حیرت سے ان کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی بجا طور پر طاری ہوتی حیرت کو دور کرنے کے لیے بلخ شیر نے یہ جواز دیا تھا کہ...

''دراصل ہم دونوں میاں بیوی کچھ موٹے ہیں۔ ویسے تو ہمیں وزن گھٹانے کے لیے ورزش کرنے کا وقت نہیں ملتا اسی لیے یہ فیصلہ کر کے ہنی مون پر نکلے تھے کہ اوّل تو کسی اونچے درجے... میرا مطلب ہے، اونچی منزلوں والے ہوٹل میں سب سے اوپری منزل میں کمرا لیں گے تاکہ سیڑھیاں اترنے چڑھنے کے باعث...''

''ٹانگیں ٹوٹ جائیں...؟'' اس شخص نے ''بوجھو تو جانیں'' والے انداز میں فوراً ہونق سی شکل نکال کے مسکرا کر کہا۔

''نہیں، وزن ٹوٹ جائے... میرا مطلب ہے، وزن گھٹ جائے۔'' بلخ شیر نے بُرا سا منہ بنا کے تصحیح کی۔

اس پر ریسپشنسٹ نے بڑے غور سے اپنی پہلے سے پھیلی ہوئی آنکھوں کو مزید پھیلانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے سرتاپا بلخ شیر اور زرینہ کا جائزہ لیا تھا اور چند ثانیے کے لیے اس سوچ میں پڑا رہا تھا کہ انہیں اوپر والی منزل پر کمرا کیوں درکار ہے؟ لگ تو دبلے رہے ہیں... کہیں ان دونوں کی اپنی اوپر والی منزل تو نہیں کھسکی ہوئی؟

بہر طور... یوں انہیں اوپر والی منزل میں ایک کمرا مل گیا۔ میاں بیوی تو ابھی یہ نہیں بنے تھے البتہ ''شو'' انہوں نے یہی کیا تھا۔

اب وہ اپنے کمرے کے دروازے کے باہر کھڑا زور زور سے دستک دے رہا تھا۔ دروازہ ظاہر ہے زرینہ نے ہی کھولا اور بلخ شیر کے بجائے ایک خوبرو اجنبی کو دیکھ کر ہکلاتے ہوئے بولی۔

''کک... کون ہو تم...؟'' یہ کہتے ہوئے زرینہ نے حلق سے بے اختیار امڈتی چیخ برآمد کرنے کے انداز میں اپنا دہانہ کھولا ہی تھا کہ خوبرو اجنبی نے... جو بلاشبہ بلخ شیر ہی تھا، بوکھلا کے یک دم اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور زرینہ سے تقریباً لپٹنے کے انداز میں اسے اندر دھکیلتا ہوا لے آیا اور عقب میں دروازہ بند کر دیا...... زوردار ...آواز سے کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔

''پاگل ہو گئی ہو، زری...! یہ میں ہوں، پہچانو مجھے... بلخ شیر...''

زرینہ کی دلنشین آنکھوں میں حیرت ابھری۔

''پہچان گئی ہو مجھے؟ میں سسپنس افورڈ کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ جلدی بتاؤ تو اپنا ہاتھ ہٹاؤں تمہارے منہ سے۔'' بلخ شیر نے اس کی تسلی چاہی اور زرینہ نے اثبات میں سر ہلانے کی کوشش کی۔ بلخ شیر نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا دیا۔

''یا اللہ سائیں! یہ تم ہو؟'' وہ ہنوز بحرِ حیرت میں غوطہ زن تھی۔

''ہاں، یہ میں ہی ہوں۔ کیا مسجد چلیں پھر یقین کرو گی میرا...؟'' وہ چڑ کر بولا۔

"ہائے... شیرل! تمہارے کتنے بڑے بال تھے۔ تم نے اتنے چھوٹے کروا لیے اور... اور... تمہاری گھنی مونچھیں، لمبی قلمیں، تم نے سب چٹ کرالیں... مجھے کس قدر پسند تھیں۔" زرینہ جیسے رونے کے قریب ہوگئی۔

"تم صرف مجھے پسند کرو۔ میرے بالوں، مونچھوں اور لمبی قلموں کو چھوڑو..." وہ بولا۔ "ہاں... قلموں سے یاد آیا... میں جب حجام کی دکان سے اپنا حلیہ بدل کے ایک عدد قلمی آم چوستا ہوا آرہا تھا تو سرخی پر اخبار کی نظر... اوہو... اخبار کی سرخی پر نظر پڑی... بابا سائیں نے ہماری تصویریں چھپوا دی ہیں... یہ دیکھو۔" بلخ شیر نے رول کیا ہوا اخبار اس کی طرف بڑھا دیا۔

زرینہ نے اپنی اور بلخ شیر کی تصاویر دیکھیں تو بلخ شیر کی توقع کے برخلاف پریشان ہونے کے بجائے خوش ہو کے بولی۔

"کتنی اچھی فوٹو چھپی ہے ہماری۔ تم بھی کتنے اچھے لگ رہے ہو نا... مگر تم نے اپنے گھنے بال کٹوا لیے، مونچھیں اور قلمیں صاف کروالیں۔"

"زری بیگم! اب یہ وقت تاسف کا نہیں ہے، یہ سب وقت کا تقاضا تھا... اور تم بھی تیار ہو جاؤ۔" بلخ شیر نے اس کی دلنشین سرگیں آنکھوں اور خوش ادا حسین چہرے کی طرف محبت پاش نظروں سے دیکھ کر کہا تاکہ وہ مان جائے، جو وہ چاہ رہا تھا... مگر زرینہ نے فوراً اسے گھور کے کہا۔

"کیا مطلب؟ میں ہرگز اپنی اتنی پیاری اور خوب صورت چوٹیوں کو نہیں کٹواؤں گی۔" یہ کہہ کر اس نے ایک "زوردار" ادا کے ساتھ اپنا سر جھٹکا۔ دونوں موٹی چوٹیاں ہنٹر کی طرح فضا میں لہرائیں، بلخ شیر فوراً نیچے ہو گیا۔ دونوں چوٹیاں اس کے سر کے اوپر سے گزر کر زرینہ کے ہاتھوں میں آگئیں اور وہ بڑی محبت سے انہیں سہلا سہلا کے دیکھنے لگی۔

"بچوں والی باتیں مت کرو۔" بلخ شیر گھور کے بولا۔

"میں نے تو کوئی بچوں والی بات نہیں کی۔" وہ یک دم شرما کے بولی۔ "ابھی تو ہماری شادی بھی نہیں ہوئی۔" اس کی بات پر بلخ شیر نے اپنا سر پیٹ لیا۔

اچانک انہیں دروازے پر کسی کے زور زور سے ہانپنے کی آواز سنائی دی۔ دونوں بُری طرح ٹھٹک گئے۔

"شش..." بلخ شیر نے فوراً زرینہ کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور خود بدحواسی میں چیخ کر بولا۔ "تم غسل خانے میں گھس جاؤ۔ میں نے نیچے استقبالیہ پر ایک مشکوک پولیس والا دیکھا تھا، شاید اس نے بھی پانچ روپے کا وہ شرپسند اخبار خرید کے ہماری فوٹو دیکھ لی ہے۔" زرینہ فوراً غسل خانے کی طرف دوڑی۔ بلخ شیر نے دروازہ کھولا۔ سامنے ویٹر کھڑا تھا۔ ہانپتے ہوئے بولا۔

"صاحب جی! ویسے تو میں آپ سے چائے لانے کا پوچھنے اوپر آیا تھا مگر اب سوچ رہا ہوں کہ چائے لے کر بھی مجھے ہی تو دوبارہ اوپر آنا پڑے گا۔ سمجھ میں نہیں آتا، آپ نے اتنی اوپر کیوں کمرا لیا ہے جبکہ دوسری منزل میں بہت سے کمرے خالی پڑے ہیں۔"

"ابے بھاگ یہاں سے۔" بلخ شیر گھور کے بولا۔ "تم کون ہوتے ہو، ہمارے ذاتی معاملات میں دخل انداز ہونے والے؟ ہماری مرضی، چاہے ہم چھت پر کرالیں۔ جاؤ تم... ہمیں ضرورت نہیں ہے چائے پینے کی۔"

ویٹر الٹے پاؤں لوٹ گیا۔ بلخ شیر نے جھنجلا کے دروازہ بند کیا اور غسل خانے کی طرف منہ کر کے ہانک لگائی۔

"باہر آجاؤ... جو آیا تھا، وہ ہمیں بددعائیں دیتا ہوا چلا گیا ہے۔"

غسل خانے میں پانی گرنے کی متواتر آواز آرہی تھی اور ساتھ ہی زرینہ کے مترنم انداز میں گنگنانے کی آواز بھی آرہی تھی۔

"تم سچ مچ غسل میں مصروف ہوگئی ہو، پیاری... یا یونہی پانی کے ساتھ مدھر بانی کر رہی ہو؟ ایک مہربانی کرو، جلدی باہر آجاؤ... ہم یہ ہوٹل چھوڑ رہے ہیں۔"

دونوں نے وہ ہوٹل چھوڑ دیا۔ اب ان دونوں کا گیٹ اپ یوں نظر آتا تھا جیسے ایک شہری بابو، دیہات کی کوئی الھڑ دوشیزہ کو بھگائے لے جا رہا ہو۔

بہرطور، بلخ شیر نے ایک سستے بیوٹی پارلر کو تلاش کیا اور اندر داخل ہو گیا۔ بیوٹیشن ایکسپرٹ کو دیکھ کر بلخ شیر کے ذہن میں اسے دینے کے لیے پہلا مشورہ یہی ابھرا تھا کہ بیوٹیشن ایکسپرٹ کو خود "بیوٹی" کی ضرورت تھی مگر اسے اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس کی زرینہ بنی بنائی اور فطری "بیوٹی" رکھتی تھی۔ وہ تو اس کا حلیہ بدلوانے کے لیے یہاں لایا تھا۔

زرینہ کو کس طرح تختۂ مشق بنانا تھا، یہ سب بلخ شیر نے اسے سمجھا دیا اور زرینہ کو اس کے حوالے کر کے خود باہر کھڑا ہو گیا کیونکہ یہ لیڈیز بیوٹی پارلر تھا اور مردوں کو اندر بیٹھنے کی سختی سے ممانعت تھی۔ بلخ شیر باہر کھڑا انتظار کرتا رہا۔ خاصی دیر گزر گئی تو وہ بے چین سا ہونے لگا، تب اچانک اندر چیخنے کی آواز ابھری۔ اندر ویٹنگ روم میں موجود "بیوٹی" کے انتظار میں فقط دو عورتیں بیٹھی تھیں اور انہیں بلخ شیر نے دہری تہری چیخیں

مارتے ہوئے باہر بھاگتے دیکھا تو وہ پریشان اور متوحش سا ہو گیا۔ وہ غڑاپ سے اندر گھسا اور ایک طرف بوائے کٹ بالوں والی اور تراشی ہوئی بھنوؤں والی اجنبی لڑکی کو کھڑے روتے دیکھا۔ اس کے بوائے کٹ بالوں میں ہائیڈروجن رنگ ہوا تھا جس کے باعث اس کے بال سنہری مائل براؤن ہو رہے تھے۔ چہرے پر افسردگی تھی۔ وہ ایک دودھیا سیور بلب کے قریب کھڑی تھی۔

بلخ شیر چیمبر میں جا گھسا۔ وہاں سامنے بیوٹی پارلر کی مالکن کو میک اپ میں استعمال ہونے والے رنگ و روغن سمیت زمین پر اٹا غفیل پایا۔ بلخ شیر کی چکراتی نظریں زرینہ کو تلاش کر رہی تھیں مگر وہ اسے کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔

'ضرور یہاں کوئی ناخوش گوار واقعہ ظہور پذیر ہوا ہے۔' بلخ شیر نے خالص سراغ رسانوں والے انداز میں سوچا پھر بیوٹی چیمبر سے باہر آکے اس بوائے کٹ اور خوش جمال لڑکی سے مخاطب ہو کے بولا۔

"محترمہ! کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ اندر کیا واقعہ پیش آچکا ہے؟"

"میری دونوں چوٹیاں کٹوا کے اب میرا مذاق اڑا رہے ہو تم، شیرل..." وہ "محترمہ" شناسا مگر روہانسی آواز میں بولی۔ بلخ شیر کے چہرے پر حیرت آمیز مسرت کے تاثرات ابھرے۔

"ارے، زری! تم... کتنی بدل گئی ہو تم۔"

"میں نہیں بدلی ہوں... اب بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

بلخ شیر بولا۔ "یہ بتاؤ کہ تم نے اندر اس عورت کے ساتھ کیا کیا ہے؟ وہ زمین پر لمبی پڑی ہوئی ہے۔"

"میں چیخ مار کے بے ہوش ہونا چاہتی تھی مگر چیخ میں نے ماری، بے ہوش وہ ہو گئی۔ اچھا ہوا کم بخت میری آنکھیں بند کرا کے پتا نہیں گھنٹوں میرے ساتھ کیا کیا کرتی رہی۔ جب اس نے مجھے آنکھیں کھولنے کا کہا تو آئینے کے سامنے خود کو دیکھ کر میری چیخ نکل گئی۔" وہ بتانے لگی۔

بلخ شیر یہ عجلت بولا۔ "آؤ، اب بھاگ چلیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ بابا سائیں کے ہمارے پیچھے چھوڑے ہوئے حواری اب ہمیں کبھی نہیں پہچان پائیں گے۔"

وہ زرینہ کا ہاتھ پکڑ کے باہر آگیا۔ زرینہ اب ایک الٹرا ماڈرن شہری لڑکی دکھائی دینے لگی تھی اور بلخ شیر شہری بابو... اب کوئی انہیں دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ دونوں کسی دور دراز گوٹھ کے رہنے والے باسی ہیں۔ نہ ہی کوئی انہیں ان کی سابقہ صورتوں کی وجہ سے پہچان سکتا تھا۔ ورنہ جب وہ اپنے گوٹھ سے فرار ہو کر یہاں کراچی پہنچے تھے تو دونوں ہی ٹھیٹ پینڈو "پل" دکھائی دیتے تھے۔

ان دونوں کی کہانی بڑی عبرت ناک تھی۔

بلخ شیر ایک چوبیس پچیس سالہ خوبرو لڑکا تھا۔ اس کے باپ کا نام محمد پچل تھا جو ایک چھوٹی سطح کا مگر خوش حال زمیندار تھا جس نے دو شادیاں کر رکھی تھیں۔ بلخ شیر پہلی بیوی سے تھا، دوسری بیوی سے ایک بیٹا اور تھا... اس کا نام مٹھل تھا۔ وہ اپنے سوتیلے بھائی بلخ شیر سے صرف دو برس چھوٹا تھا۔ مضبوط توانا جسم والا مٹھل، غصیلی طبیعت اور کرخت مزاج کا حامل تھا۔ بلخ شیر سے اس کی نہیں بنتی تھی۔ وہ باپ کے زیادہ قریب تھا اور باپ اس کو اپنا بازو کہتا تھا۔ اس کی وجہ تھی۔ وہ یہ کہ مٹھل، باپ کے ساتھ زمینوں وغیرہ کے سلسلے میں اس کا ہاتھ بٹاتا تھا جبکہ بلخ شیر کو ان معاملات سے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ اسے پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ وہ سندھ یونیورسٹی جامشورو میں بی ایس کے آخری سال میں تھا اور وہیں ہوسٹل میں رہتا تھا۔ باپ اس کو خرچہ بھیج دیا کرتا تھا۔

بلخ شیر کو اپنے گوٹھ کی ایک لڑکی زرینہ سے عشق ہو گیا تھا۔ وہ ایک سیندر جل سی خوب صورت لڑکی تھی۔ عمر انیس، بیس کے لگ بھگ تھی۔ غریب تھی اور یتیم بھی۔ وہ اپنے بوڑھے چاچا دسایا کے ساتھ رہتی تھی جو بے اولاد تھا مگر ایک نمبر کا حریص اور لالچی تھا۔ وہ گوٹھ ہی کے ایک ادھیڑ عمر شخص کوڑا خان سے اپنی خوب صورت، معصوم اور یتیم بھتیجی کی شادی کرنا چاہتا تھا۔ کوڑا خان نے زرینہ کے بوڑھے لالچی چاچا کو عوضانہ کے طور پر ڈیڑھ لاکھ روپے دینے کا وعدہ کیا تھا۔

زرینہ نے جب رو رو کے بلخ شیر کو اس ساری صورت حال کے بارے میں بتایا تو اسے پہلے زرینہ پر غصہ آیا کہ وہ ایک لالچی شخص کی بھتیجی کیوں ہے پھر اس کے چاچا دسایا پر طیش آیا کہ اسے صرف ڈیڑھ لاکھ سے غرض تھی۔ اس بات کی پروا نہ تھی کہ اگر اس کی بھتیجی کی شادی، وہ اس سے کرنے پر "بلاعوضانہ" راضی ہو جاتا۔ بلاعوضانہ اس لیے کہ بلخ شیر کا کنجوس باپ محمد پچل ایک روپیا تک نہ نکالتا، لیکن یہ مسئلہ بعد کا تھا۔

سب سے آخر میں بلخ شیر کو ادھیڑ عمر کوڑا خان پر تاؤ آیا جو اپنی بیٹی کی عمر کی لڑکی، یعنی زرینہ سے بیاہ کرنا چاہتا تھا۔

"اس کم بخت کوڑا خان کو سو کوڑے مارنا چاہئیں اور ننانوے پر آکر گنتی بھول کے پھر ایک سے شروع کی جائے۔"

"مگر کوڑا خان کو سو کوڑے مارے گا کون؟" زرینہ نے

اپنے ململ کے دوپٹے کو اشک بار آنکھوں سے بھگوتے ہوئے کہا۔ ”میں تو کہتی ہوں، ایک ہی کوڑے سے جان نکل جائے اس بڈھے کی۔“ اس پر بلخ شیر جل کے بولا۔

”وہ کوڑے سے کہاں مرے گا... مگر مچھ کی کھال والا ہے وہ۔ ڈنڈا بھی اثر نہیں کرے گا، گولی بھی شاید ہی اثر کرے مردود کو۔“

زرینہ نے مشورہ دیا۔ ”میرا خیال ہے شیرل! تم اس کے گلے میں رسّی ڈال کے کسی کنوئیں میں دھکیل دینا۔“

”اچھا... اور پھر بعد میں پولیس میرے گلے میں رسّی کا پھندا ڈال کے موت کے کنوئیں میں دھکیل دے۔“

”اللہ سائیں نہ کرے... ایسا کیوں بولتے ہو؟“ زرینہ نے متوحش ہو کے ایک ہاتھ بے اختیار بلخ شیر کے منہ پر رکھ دیا۔ زرینہ کے نرم و نازک ہاتھ کا لمس اور خوشبو سے نیند آنے لگی مگر اس نے فوراً خود کو سنبھالا۔

”میں مذاق کر رہا تھا۔ اچھا سنو زری! میں آج ہی اپنے بابا سائیں سے بات کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اماں جی کے ساتھ ضرور تمہارا رشتہ لینے میرے گھر آئیں گے... میرا مطلب تمہارے گھر آئیں گے۔ تم بے غم ہو جاؤ، میں آ گیا ہوں نا۔“ اس نے اصیل مرغ کی طرح اپنا سینہ پھلایا۔ زرینہ کو تسلی ہو گئی۔

بلخ شیر کھٹ سے گھر پہنچا اور ٹھک سے ماں کے گھٹنوں سے جا لگا۔ ماں نے گھبرا کے لات چلا دی۔ خالص دیہاتی موٹی تازی عورت تھی، بلخ شیر بے چارہ دبلا پتلا سا... ایک جھٹکے سے بال کی طرح دیوار سے جا لگا۔ حلق سے آہِ بے داد برآمد ہو گئی۔

”ہائے اماں...“

سدھوری مائی نے بیٹے کی آواز پہچان کر اپنے حلق سے دخانی انجن جیسی آواز برآمد کی اور بلخ شیر کو سنبھالا۔

”معاف کرنا بیٹے... میں سمجھی تھی کم بخت بھولے قصائی کا ناپاک پلّا ادھر آن نکلا ہے، چوٹ تو نہیں لگی۔“

”سر بچ گیا، باقی خیر ہے اماں۔“ بلخ شیر کھڑا ہو کے بولا اور فوراً مطلب کی بات کہہ ڈالی۔

”تُو فکر نہ کر، میں آج ہی تیرے پیو (باپ) کو ساتھ لے کر چاچے وسائے کے پاس جاؤں گی۔“

”اماں! تو کتنی اچھی ہے۔“ بلخ شیر نے خوشی سے پاگل ہو کے نعرہ مارا۔ دوسرا جوابی نعرہ اس کے باپ محمد بچل نے مارا۔

”میرے جوان کی خیر... کیا بات ہے، آج دونوں ماں بیٹے خوش نظر آ رہے ہیں۔“ پچپن سالہ محمد بچل نے جوانوں کی طرح چہک کر کہا پھر اس کی بیوی سدھوری مائی نے اسے ساری بات بتا دی۔

محمد بچل نے سوچا کہ چاچا وسایا غریب ہاری ہے، پانچ دس ہزار عوضانہ لے گا۔ بھتیجی بھی یتیم ہے، بیٹا پسند کرتا ہے۔ سستے میں جان چھوٹ رہی تھی۔ فوراً تیار ہو گیا۔

پچپن سالہ محمد بچل نے دو شادیاں کی تھیں مگر لوگوں کا خیال تھا، اس نے اتنی کم شادیاں کر کے اپنے خاندان میں برسوں سے چلتی روایت کو توڑا ہے کیونکہ اس کے باپ داداؤں نے تین تین چار چار شادیاں کی تھیں۔ محمد بچل چھوٹی سطح کا زمیندار تھا مگر بلا کا کنجوس تھا۔

بہر طور... سدھوری مائی اور محمد بچل، چاچا وسایا کے گھر روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر اس کی یتیم بھتیجی زرینہ کا رشتہ اپنے بیٹے کے لیے مانگا۔ موقع پرست اور حریص وسایا نے جب دیکھا کہ ایک زمیندار اپنے بیٹے کے لیے اس کی بھتیجی کا رشتہ مانگنے آیا ہے تو یک دم اس کی چندی چندی آنکھوں میں لالچ کی چمک ابھری۔ اس نے کوڑا خان کو تصور ہی تصور میں ایک عدد خیالی کوڑا رسید کیا اور زرینہ کا عوضانہ مبلغ تین لاکھ بتا دیا۔

”وسایا! تیرے کو غلطی ہوئی ہے بابا...“ زمیندار محمد بچل سرد ہنسی کے ساتھ بولا۔ ”ہم کوئی زمین کا ٹکڑا تیرے سے خریدنے نہیں آئے ہیں۔ تیری بھتیجی کا رشتہ لینے آئے ہیں۔“

اس پر چاچا وسایا کی آنکھیں برساتی مینڈک کی طرح ابل آئیں اور وہ زور سے ٹرانے کے انداز میں بولا۔ ”بچل سائیں! مجھ گریب کے پاس زمین کہاں، زمینوں کے مالک تو آپ ہو، میں نے سنگ عوضانہ ہی بتایا ہے۔“

کسی دور افتادہ دیہات میں آپ نے آٹے کی چکی کے چلنے کی مخصوص پک... پک... پک... کرتی افسانوی سی آواز کبھی نہ کبھی ضرور سنی ہو گی، کچھ ایسی ہی آواز زمیندار بچل کے حلق سے برآمد ہوئی۔

”ایں... تین لاکھ... طبیعت ٹھیک ہے چاچا وسایا تیری؟ میں اپنے بیٹے کو بیوی کی جگہ ٹریکٹر نہ لے دوں... وہ بھی قسطوں میں۔“ اس کے لہجے میں بلا کی طنزیہ کاٹ تھی۔ وسایا نے بھی منہ بنا لیا پھر بولا۔

”تم نے ابھی زرینہ کو دیکھا نہیں ہے اس لیے ایسا کہہ رہے ہو، ورنہ سو ٹریکٹر قربان کر دیتے۔ بالکل حور پری ہے، آسمان سے اتری اپسرا ہے... شہزادی ہے شہزادی... تیرے گھر کی بہو بنے گی تو شان ہی اور ہو جائے گی۔ بیٹا بھی تمہارا تمہیں یاد رکھے گا کہ اس کے ماں باپ نے اس کے لیے

کیسی چاند سی دلہن ڈھونڈی ہے۔“

اثنائے راہ... چاچا وسایا نے بھتیجی کو آواز دی۔ وہ سر پہ ہوڑائے لسّی کے دو گلاس تھالی میں رکھے ایک کوٹھری نما کمرے سے برآمد ہوئی۔ زمیندار بچل نے جو زرینہ کو دیکھا تو اسے ایک سے دو نظر آنے لگے۔ اس نے سر کو دو تین بار جھٹکا دیا تو دو کے چار ہو گئے۔ زمیندار بچل کی آنکھیں زرینہ کا حسن دیکھ کر خیرہ ہو گئیں... اس کی خاندانی رگ پھڑکی۔ وہ گم صم سا ہو گیا۔ سوچنے کا ٹائم مانگ کر دونوں میاں بیوی چاچا وسایا کے گھر سے رخصت ہو گئے۔

”لاکھوں میں ایک تھی میری ہونے والی بہو۔ مار دے چاچا وسایا کے منہ پر تین لاکھ... اور زرینہ کو بہو بنا کے لے آتے ہیں۔“ مائی سدھوری نے شوہر سے کہا۔

”تین لاکھ کی رقم کم نہیں ہے جو صبح وسایا کے منہ پر مار دوں۔ میرے پاس نہیں ہے اتنی رقم۔“

”کیا بات کرتے ہو شیرل کے پیو (باپ)... بیٹے سے بڑھ کر پیسے ہوتے ہیں؟“ بیوی روہانسی ہو گئی۔

”تو پھر بول دے شیرل کو کہ لے آئے تین لاکھ روپے... میرے پاس تو اپنی شادی کرنے کے لیے اتنے پیسے نہیں ہیں۔“

”تیرے پاس ہوتے ہی کب ہیں پیسے۔“ مائی سدھوری روتے ہوئے بولی۔ ”ہم ماں بیٹے کی خوشی کے لیے تیری جیب سے پیسے نہیں نکلتے اور اپنے شوق کے لیے لاکھ لاکھ کا مرغ اور دوڑنے والے کتے خریدتا رہتا ہے۔ میری سوتن کو تو دو لاکھ میں خرید کر لایا۔ لاکھ روپیا شادی کے انتظامات میں خرچ کیے اور...“

”اڑی چپ کر... بکواس کیے جا رہی ہے۔“ محمد بچل نے اسے جھڑکا۔

بلخ شیر کو معلوم ہوا کہ اس کا باپ تین لاکھ روپے نہیں نکال رہا تو گردن اکڑا کے اس کے سامنے آ گیا۔

”یہ میں کیا سن رہا ہوں پیو؟“ بیٹے کو اس طرح اکڑ کے سامنے آتا دیکھ کر محمد بچل نے اپنی جوتی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو بلخ شیر فوراً بدک کے باپ سے ذرا فاصلے پر جا کھڑا ہوا۔

”ہاں، اب بول... کیا سنا تُو نے؟ مجھے اتنی دور سے آواز آ جائے گی تیری۔“

”پیو! تیرے پاس اپنے بیٹے کی خوشی کے لیے تین لاکھ بھی نہیں ہیں۔ پھر کس کام کی یہ اتنی بڑی حویلی... کس کام کی یہ ہزاروں ایکڑ میں پھیلی ہوئی زمینیں... آگ لگا دوں ان سب کو۔“

”اڑے تجھے کتنی بار کہا ہے، پنجابی فلمیں نہ دیکھا کر۔“ باپ نے جھڑکا۔

”نہیں پیو! آج فیصلہ ہو کے رہے گا۔ تجھے آج بتانا ہو گا کہ تجھے تین لاکھ پیارے ہیں یا اپنا بیٹا۔“ بلخ شیر نے باپ کو جذباتی بلیک میل کرنے کی کوشش کی۔

”اس میں بتانا میرے لیے کون سا مشکل ہے۔ مجھے تین لاکھ پیارے ہیں۔ لے اب بول، کیا کر لے گا تُو...؟“

”میں تیرا بھرا ہوا پستول نکال کے خود کو گولی مار لوں گا۔“

”خبردار... جو میرے پستول کی گولی تُو نے ضائع کی تو۔ پورے ایک سو دس روپے میں ایک گولی آتی ہے۔“ باپ نے جھڑکا۔ ”خودکشی کے لیے کوئی اور سستا طریقہ ڈھونڈ... سمجھا تو۔“

بلخ شیر مایوس ہو گیا۔ سمجھ گیا کہ سور کی کھال اتر سکتی ہے مگر ایک کنجوس اور بخیل باپ سے روپیا نہیں نکل سکتا۔ چنانچہ وہ سوچنے لگا کہ اسے اب خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔

مگر بلخ شیر کے کچھ ”کرنے“ سے پہلے اس کے باپ نے ”کر ڈالا“... اور ایسا کر ڈالا کہ سب کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

اپنی خوشی کی خاطر محمد بچل نے چاچا وسایا سے دوبارہ تنہائی میں خفیہ ملاقات کی اور اسے تین لاکھ کے بجائے ڈھائی لاکھ پر اس کی خوب صورت بھتیجی زرینہ کا سنگ (رشتہ) اپنے بیٹے کے بجائے اپنے لیے دینے پر رضامند کر لیا۔ گویا بیٹے نے اپنے لیے جو لڑکی پسند کی تھی اور جس سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا، وہ باپ کو اپنے لیے پسند آ گئی اور بیٹے کی خاطر سنگ عوضانہ کے لیے ایک روپیا نہ نکالا مگر بیٹے کی خوشیوں پر شب خون مارتے ہوئے اپنی خوشی کی خاطر ڈھائی لاکھ نکالنے پر رضامند ہو گیا۔ یوں زمیندار محمد بچل زرینہ سے تیسری شادی کرنے کے لیے پر تولنے لگا۔

بے حس اور خودغرضی ایسے شرمناک گل بھی کھلاتی ہے۔

بلخ شیر کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ غم و غصے سے کپکپاتا ہوا باپ پر چڑھ دوڑا۔ باپ جانتا تھا کہ اس کے بیٹے کو بجا طور پر غصہ آ سکتا ہے اس لیے اس نے اپنے دوسرے بیٹے مٹھل کو اس کے مقابلے پر لا کھڑا کیا جو ڈیل ڈول میں بلخ شیر سے دگنا تھا اور کسی ملاکھڑا پہلوان ہی کی طرح نظر آتا تھا۔ یہی نہیں، وہ اپنے سوتیلے بھائی بلخ شیر پر ہر وقت ادھار کھائے بھی بیٹھا رہتا تھا۔

بلخ شیر نے پھر دوسرا طریقہ آزمایا۔

جس وقت نکاح خواں اس کے باپ کا نکاح زرینہ کے ساتھ پڑھانے والا تھا، اس سے ذرا دیر پہلے ہی بلخ شیر زرینہ کو اپنے ساتھ بھگا لے گیا۔

☆☆☆

شہر آتے ہی دونوں نے سب سے پہلے اپنا ٹھیٹ دیہاتیوں والا گیٹ اپ تبدیل کر لیا تھا۔ بلخ شیر کے بڑے لمبے اور گھنے بال تھے۔ لمبی قلمیں تھیں۔ مونچھیں بھی گھنی تھیں۔ یہاں آکر وہ کلین شیو ہو گیا۔ سر کے بال بھی بہت چھوٹے کروا لیے۔ گھنی اور ناک کی جڑ کے قریب آپس میں گلے ملتی بھوؤں کو بھی سیٹ کروا لیا تھا۔ یہی "حشر" اس نے زرینہ کے ساتھ بھی کیا۔ وہ اسے بیوٹی پارلر سے الٹرا ماڈرن شہری لڑکی بنا کر نکلا۔

اب بلخ شیر کی کوشش یہ تھی کہ وہ کسی طرح کرائے کا چھوٹا موٹا سستا سا فلیٹ حاصل کر لے۔ زیادہ دن ایک ہی ہوٹل میں قیام بھی مناسب نہ تھا۔ لہٰذا وہ دو تین روز بعد ہوٹل بدل لیتے تھے۔

ایک بار انہیں کسی ہوٹل میں کوئی کمرا خالی نہ ملا، رات ہو گئی۔ وہ ایک منی بس میں سوار تھے۔ زرینہ بس کے اگلے لیڈیز پورشن میں بیٹھی تھی اور بلخ شیر پچھلے مردانہ پورشن میں ایک سیٹ پر بیٹھا تھا اور پریشان بھی تھا۔ سرِدست اسے پیسوں کی کوئی پریشانی نہ تھی، ماں نے اسے اچھی خاصی رقم دے رکھی تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا تھا کہ رقم ختم ہو جائے تو کسی وقت بھی گوٹھ آکر مزید لے سکتا ہے۔ وہ رقم لینے کے لیے دوبارہ گوٹھ کا رخ نہیں کر سکتا تھا۔ ماں نے محبت اور سادگی میں یہ کہہ دیا تھا مگر بلخ شیر کو اپنے زورِ بازو پر بھروسا تھا۔ وہ پہلے سر چھپانے کا مستقل ٹھکانا تلاش کر لینا چاہتا تھا پھر کوئی اچھی سی نوکری ڈھونڈنا چاہتا تھا۔ کمپیوٹر کے ویسے بھی اس نے دو تین ڈپلوما کورسز کر رکھے تھے۔

بہرطور... بس میں بیٹھے بیٹھے اچانک اس کی نظر اپنی بالکل بازو والی سیٹ پر پڑی اور اگلے ہی لمحے وہ منجمد ہو گیا۔ وہاں اس کا بھائی مٹھل اپنی خوں خوار صورت لیے بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ اس جیسا ہی ایک اور شخص بھی تھا۔ بلخ شیر اسے بھی پہچان گیا۔ وہ خیرل تھا، اس کے باپ زمیندار محمد بچل کا خاص آدمی۔

گویا دونوں گوٹھ سے شہر انہی دونوں کی تلاش میں آئے تھے، بہ الفاظِ دیگر بھیجے گئے تھے۔

بلخ شیر ان دونوں کے چہروں کے چڑھے ہوئے تاثرات سے ان کے اندر چھپے ہوئے جارحانہ عزائم کا سیاق و سباق کے ساتھ مطالعہ بہ آسانی کر سکتا تھا جس کے پہلے "اقتباس" سے اس نے یہی قیاس لگایا تھا کہ یہ دونوں گوٹھ سے یہاں شہران کی قبر کھودنے آئے ہیں۔

بلخ شیر نے دوسرے ہی لمحے اطمینان کا گہرا سانس لیا کیونکہ وہ مطمئن تھا کہ جو گیٹ اپ اس نے اور زرینہ نے اپنا رکھا ہے، قیامت تک اس میں یہ دونوں غصہ ور حضرات انہیں نہیں پہچان سکتے تھے... مگر بہرحال خطرے کا بم سر پر موجود تھا اور کسی بھی وقت پھٹ بھی سکتا تھا۔

کنڈیکٹر کرایہ لینے ان کی سیٹوں کی طرف آیا۔ بلخ شیر "اوور کانفیڈنس" کا شکار ہو کے مطمئن تھا لیکن جب کنڈیکٹر نے اس سے کرایہ مانگا تو بلخ شیر نے اسے نہ صرف اپنے اگلے اسٹاپ کے بارے میں بتایا بلکہ اس سے احتیاطاً یہ درخواست بھی کر دی کہ جب ان کا مطلوبہ اسٹاپ آجائے تو اسے بتا بھی دے۔ کنڈیکٹر سر دھن کے آگے بڑھ گیا مگر مطمئن بیٹھے بلخ شیر کے بازو والی سیٹ پر براجمان مٹھل اور خیرل نے اپنی گردنوں کو فوراً میکانکی انداز میں بیک وقت بلخ شیر کی طرف موڑا۔ انہوں نے اس کی آواز صاف پہچان لی تھی۔ دونوں کو اپنی طرف خوفناک نظروں سے گھورتے دیکھ کر بلخ شیر ان کی نظروں کو "سرسری" حرکت سمجھ کر پوری تسلی کے ساتھ مسکرایا مگر پھر اسے اپنی بھیانک غلطی کا احساس ہوا اور پل کے پل اس نے حسرت سے سوچا کہ کاش حجام کی دکان اور بیوٹی پارلر کے ساتھ آواز بدلنے کا بھی کوئی ذریعہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔

بلخ شیر کی مسکراہٹ اب قابلِ ترحم ہو گئی۔ وہ دونوں ابھی کچھ شش و پنج میں تھے۔ پس اس لحاتی موقع سے فائدہ اٹھا کر بلخ شیر نے نہایت پھرتی کے ساتھ اپنی سیٹ سے زقند بھری اور حلق کے بل چیخ کر اس نے "روکیے" کہا اور لیڈیز پورشن میں آگیا۔ لیڈیز پورشن میں بھانت بھانت کی عورتوں کا رش تھا۔ سیٹ خالی نہ ہونے کے باعث کھڑی ہو کے سفر کرنے والی عورتیں زیادہ تھیں۔

بلخ شیر کی اس دخل در نامعقولات پر عورتوں میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ اسے راستہ دینے کے لیے... شریف النفس قسم کی لڑکیوں اور برقع پوش خواتین نے اِدھر اُدھر سرکنے کی ناکام کوشش بھی کی مگر پھر بھی انہیں اپنے جسم پر غیر کا لمس سہنا پڑا تو گالیوں کا طوفان امڈ پڑا۔ "مردود، ذلیل، تیری ماں، بیٹی، بہن نہیں ہے جو عورتوں میں گھستا چلا آیا۔" اس قسم کی آوازوں کے دوران اس نے زرینہ کو پکارا۔ ڈرائیور نے بھی غصے میں آکر بس روک دی تھی۔ زرینہ بلخ شیر کی آواز پر اس کی جانب لپکی تو بلخ شیر نے اس کا ہاتھ پکڑ کے چھلانگ ماری اور نیچے

اترا۔ بس حرکت میں آئی مگر ذرا ہی آگے جا کے پھر رکی۔ بلخ شیر نے ٹھٹکی ہوئی نظروں سے اس طرف دیکھا۔ مٹھل اور خیرل انہی کی طرف دوڑتے غراتے آرہے تھے۔

"بھاگو زرینہ!" بلخ شیر چیخا۔ زرینہ کو بھی اب تک شاید صورتِ حال کی نزاکت کا احساس ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ بھی دوڑنے میں اس کا پورا پورا ساتھ دینے لگی۔

وہ دونوں بھاگتے بھاگتے ایک پوش علاقے میں داخل ہوئے۔ ان کے عقب میں ملک الموت کی طرح مٹھل اور خیرل بھی دوڑتے آرہے تھے۔ یہاں دائیں بائیں بڑی بڑی کوٹھیاں اور بنگلے بنے ہوئے تھے جن کے گیٹ روشنی سے تو مقدور بھر منور تھے لیکن سڑک کے کنارے لیمپ پوسٹ نہ ہونے کے باعث کافی تاریکی پھیلی ہوئی نظر آتی تھی۔ بلخ شیر اور زرینہ اس تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چھپتے چھپاتے دوڑ رہے تھے۔

بالآخر جلد ہی بلخ شیر کو اندازہ ہو گیا کہ اس طرح دوڑنے سے وہ تعاقب میں آنے والوں سے نہیں بچ سکتے اور کسی وقت بھی دھر لیے جائیں گے، چنانچہ ایک موڑ مڑتے ہی بلخ شیر کو کارنر والی ایک کوٹھی کی دیوار مناسب لگی۔ اس دیوار کے قریب ایک گاڑی کھڑی تھی۔ بلخ شیر نے ایک نظر عقب میں ڈالی۔ مٹھل اور خیرل زیادہ دور نہیں تھے۔ ان کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

بلخ شیر نے گاڑی کے بونٹ پر چھلانگ لگائی، زرینہ کا ہاتھ پکڑ کے اسے اوپر کھینچا پھر گاڑی کی چھت سے وہ منڈیر پر ٹک گئے۔ پھر جیسے ہی مٹھل اور خیرل موڑ کاٹتے، بلخ شیر اور زرینہ کوٹھی کی دوسری طرف چھلانگیں لگا چکے تھے۔

دونوں اندر دوسری طرف پھولوں اور کیاریوں کے جھنڈ میں گرے تھے اور گرتے ہی دم سادھ لیے تھے۔

"اتنی جلدی دونوں کہاں غائب ہو گئے؟" معاً ان کی سماعتوں سے غصیلی اور جھنجلائی ہوئی آواز ٹکرائی۔ یہ مٹھل کی آواز تھی۔

"میرا خیال ہے کہ وہ دونوں کسی قریب کے بنگلے یا کوٹھی کی دیوار پھلانگ کے چھپ گئے ہیں۔" بلخ شیر نے یہ آواز بھی پہچان لی۔ یہ خیرل تھا۔ اس نے دل ہی دل میں ان دونوں کی عقلوں کو کوسا جو بالکل ٹھیک خطوط پر کام کر رہی تھیں۔

"اب ہم ایک ایک کوٹھی اور بنگلے کو تو کھنگالنے سے رہے۔" مٹھل نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں ادھر ہی آس پاس موجود رہنا چاہیے... وہ دونوں چوروں کی طرح کسی بنگلے میں کودے ہیں تو جلد پکڑے بھی جائیں گے۔"

بلخ شیر کو ان دونوں کی باتیں ہراساں کر رہی تھیں۔ اس نے بہتر یہی سمجھا کہ زرینہ کو لے کر تھوڑا آگے کی طرف یعنی اندر کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیے۔ چنانچہ اس نے ان دونوں کی ہراس میں مبتلا کرنے والی باتوں سے اپنا دھیان ہٹایا اور اپنے دبلے پتلے جسم کی گولائی توڑ کے، سیدھے ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کیاریوں اور بیلوں کی چلمن کو اپنی آنکھوں کے سامنے سے ہٹا کے سامنے کا جائزہ لیا۔

وہ وسیع و عریض لان میں ہی کودے تھے جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھوٹے چھوٹے الیکٹرک پول پر دودھیا روشنی والے گلوب نصب تھے۔ ان کی روشنی میں بلخ شیر نے کوٹھی کی وسطی عمارت اور دروازے کا جائزہ لیا۔ وہاں ویرانی اور سناٹے کے سوا کچھ نہ تھا۔ پورچ میں ایک کار کھڑی ہوئی ضرور نظر آرہی تھی۔ داخلی گیٹ یہاں سے خاصے فاصلے پر تھا۔ ممکن ہے وہاں چوکیدار ٹائپ کی شے بھی موجود ہوتی۔

"اب کیا کریں؟" سانسیں بحال کرنے کے بعد زرینہ نے سرگوشی کی۔

"گوڈی کرنا پڑے گی۔" بلخ شیر نے جل کے کہا۔ "تم چپ رہو اور جو میں کر رہا ہوں وہی کرتی رہو۔"

"وہی تو کر رہی ہوں اب تک۔" وہ منہ بسور کر بولی۔

بلخ شیر نے پیار سے اس کا نرم و نازک ہاتھ دبایا۔ "میری جان! ہم بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں اور تمہارا ساتھ میرا حوصلہ بڑھا رہا ہے۔ ہمیں پناہ کی ضرورت ہے، وہ دونوں باہر موجود بوگیر کتوں کی طرح ہمارے خون کی بو سونگھ رہے ہیں۔ یقیناً ان کو بابا سائیں نے ہی ہماری تلاش میں بھیجا ہوگا۔" بلخ شیر کا اشارہ مٹھل اور خیرل کی طرف تھا۔

"کتنا خوب صورت گھر ہے... کیا ہم اس کے اندر داخل ہوں گے؟" زرینہ نے بھولپن سے پوچھا۔

"بالکل۔" بلخ شیر بولا۔ "ہم دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہوں گے، ایک پرتعیش بیڈ روم ہمارا منتظر ہوگا۔ اندر اے سی کی مخصوص گھرر... گھرر کی آواز آرہی ہوگی۔ میں وارڈ روب سے بیش قیمت سلیپنگ گاؤن نکالوں گا اپنے لیے، تمہارے لیے پنک کلر کی نائٹی نکالوں گا، پھر میں آرام دہ بیڈ پر لیٹ کر تمہیں کہوں گا، کچن میں جا کر میرے لیے چائے پراٹھا بنا کے لاؤ۔"

"اچھا! خود بڑے مزے سے ہلکے پھلکے ہو کے نرم بیڈ پر آرام کرو گے اور مجھے کچن میں بھیج دو گے، ہرگز نہیں... میں بھی آرام کروں گی تمہارے ساتھ..." زرینہ وارفتہ ہونے

لگی۔ اسے خیالوں ہی خیالوں میں خطرناک ہوتا پا کر بلخ شیر سرگوشی میں بولا۔

”بے وقوف لڑکی! ہوائی قلعے مت تعمیر کرو۔ میں نے مذاق میں بات بولی تھی۔ ہمیں بڑی رازداری سے اور چھپ کے اندر داخل ہونا پڑے گا۔ یہ کوٹھی ہمارے باپ کی نہیں ہے، کسی اور کے باپ کی ہے۔ آؤ... آگے بڑھیں۔“

بلخ شیر نے زرینہ کا ہاتھ اب چھوڑ دیا تھا۔ دونوں مدھم روشنی میں جھکے جھکے وسطی دیوار سے جا لگے، یہ لاؤنج کی دیوار تھی۔ بلخ شیر نے شیشے کی کھڑکی سے اندر جھانکا، کوئی اندر نہ تھا۔ ہر سو عجیب سی خاموشی اور ویرانی طاری تھی۔ بلخ شیر دیوار کے ساتھ ساتھ آگے سرکتا چلا گیا۔ مختلف کمروں کی کھڑکیوں کے اندر بھی نظر ڈالتا رہا۔ شاید وہ اندر موجود کوٹھی کے مکینوں کی تعداد کا اندازہ لگانا چاہتا تھا مگر ابھی تک اسے کوئی ذی نفس نظر نہیں آیا تھا۔ ایک خوش گوار خیال اس کے ذہن میں ابھرا۔

”کہیں یہ کوٹھی واقعی اندر سے خالی تو نہیں...؟“

معاً اسے آواز آئی۔ وہ ٹھٹک کے رکا۔ ایک کھڑکی سے روشنی پھوٹ رہی تھی، آواز اندر سے آئی تھی۔ یہ کسی کے کھنکھارنے یا زور سے کھانسنے کی آواز تھی۔ بلخ شیر نے زرینہ کو چپ رہنے کا اشارہ کیا پھر خود ذرا آگے سرک کے کھڑکی کے شیشے کے پار اندر جھانکا۔

وہ نشست گاہ ٹائپ کا کمرا نظر آتا تھا۔ اندر بڑا خوب صورت اور بیش قیمت فرنیچر اور سرخ رنگ کا پھول دار قالین بچھا ہوا تھا۔ اندر تین افراد موجود تھے اور تینوں کی وضع قطع ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھی۔ عجیب سا پراسرار ماحول تھا اندر۔ ان تین مختلف وضع قطع کے افراد میں سے ایک نے سبز رنگ کی پتلون اور شرٹ پہن رکھی تھی اور شال نما چادر سی اس کے کاندھے سے نیچے جھول رہی تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ میں ایک بریف کیس تھا۔ وہ شخص عجلت میں نظر آتا تھا اور کھڑا تھا۔ اس کے دائیں جانب سامنے کی طرف ایک عمر رسیدہ شخص بھی کھڑا تھا، جو نوکر ہی نظر آتا تھا۔ اس کے ساتھ تیسرا شخص اس پوزیشن میں کھڑا تھا کہ اس کا بقیہ جسم نسبتاً تاریک گوشے میں کھڑے ہونے کے باعث صرف چہرہ ہی نظر آتا تھا مگر یہ چہرہ بڑا عجیب تھا، چہرے کے تاثرات سے بیک وقت پاگل پن اور وحشیانہ سی مسکراہٹ جھلکتی نظر آتی تھی۔ ان تینوں کے پس منظر میں ایک خوش جمال لڑکی کا پورٹریٹ نظر آ رہا تھا جس کی ٹھوڑی اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ کمرے میں روشنی تھی، پینٹ شرٹ والا شخص اپنے سامنے کھڑے ملازم ٹائپ شخص سے کہہ رہا تھا۔

”تمہارا یہ آدمی... بہ خوبی کام کر دے گا نا...؟“

”آپ بالکل بے فکر رہیں صاحب جی! یہ پہلے بھی اس طرح ایک بندے کو راستے سے ہٹا چکا ہے۔“ بلخ شیر نے ملازم ٹائپ شخص کو کہتے سنا۔ ”پولیس نے بھی اسے قتل کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا مگر اس نے پاگل پن کی ایسی جان دار اداکاری کی کہ تھوڑی سزا کاٹ کے رہا ہو گیا۔“

”لیکن ضروری تو نہیں کہ ہر بار پولیس اسے پاگل سمجھ کر چھوڑ دے۔“ اس نے... نوکر سے کہا۔

نوکر بولا۔ ”اس قتل کو کافی مہینے بیت گئے ہیں اور وہ کسی اور شہر میں ہوا تھا۔ یہ ہم دونوں بھائیوں کا سر درد ہے۔ آپ ہمارا کام کر دیں، ہم آپ کا کام خوش اسلوبی سے نمٹا دیں گے۔“

عمر رسیدہ نوکر نے ازراہِ تشفی کہا۔ اس کی حریصانہ نظریں ”صاحب جی“ کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بریف کیس پر جمی ہوئی تھیں۔ ادھر بلخ شیر کا ان کی باتوں کی وجہ سے حوصلہ خطا ہو رہا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ اندر اس کمرے میں کسی کے قتل کی منصوبہ بندی ہو رہی ہے۔ تب اچانک بریف کیس والے شخص کی نہ جانے کس طرح نظریں کھڑکی کی طرف اٹھ گئیں۔ بلخ شیر اسے اپنی طرف متوجہ پا کر خوف زدہ سا ہو گیا۔ وہ شخص کھڑکی کی طرف ہاتھ اٹھا کے انگلی کا اشارہ کر کے چلّایا۔

”وہاں کوئی ہے، ہماری باتیں سن رہا تھا۔ پکڑو... جانے نہ پائے۔“

بھانڈا پھوٹتے ہی بلخ شیر نے زرینہ کا ہاتھ پکڑا اور اندھا دھند گیٹ کی طرف دوڑا۔ عقب سے دوڑتے قدموں کے ساتھ وحشیانہ غراہٹ سن کر بلخ شیر کی ٹانگوں میں کپکپاہٹ آنے لگی۔ یہ وہی پاگل وحشی شخص تھا جو ایک خون پہلے بھی کر چکا تھا۔ دونوں دوڑتے ہانپتے ہوئے گیٹ کے قریب پہنچے۔ بلخ شیر نے پھرتی سے کام لیا اور گیٹ اندر سے کھول کے باہر بھاگا۔ سڑک ویران تھی۔ دونوں دوڑنے لگے، دفعتاً سامنے سے کوئی نمودار ہوا اور اپنے دونوں بازو پھیلا دیے تاکہ انہیں چھاپ سکے۔ یہ خیرل تھا۔ زرینہ نے دوڑتے دوڑتے خوف زدہ ہو کے چیخ ماری۔ بلخ شیر نے اس کے قریب پہنچتے ہی جھکائی دی اور زرینہ سمیت گر گیا اور وہاں موجود ایک لمبی سی کار کے عقب میں رینگ گیا، تب اس کی سماعتوں سے وحشیانہ غراہٹیں سنائی دیں۔ اس نے پھولی ہوئی سانسوں پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے کار کے عقبی بمپر سے تھوڑا باہر ہو کے دیکھا تو لرز گیا۔ وہی وحشی نما پاگل انسان خیرل سے بری طرح لپٹا ہوا تھا اور اسے بھینچے جا رہا تھا۔ اس کے عقب میں نوکر اور بریف کیس والا شخص دوڑے چلے آ رہے تھے پھر بلخ شیر نے دیکھا

کہ خیرل نے خود کو اس نیم پاگل وحشی کے آہنی شکنجے سے بچنے کے لیے جان توڑ کوشش کر ڈالی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ بالآخر بلخ شیر نے خیرل کا سر وحشی انسان کے ایک کاندھے میں ڈھلکتے دیکھا۔ اس کے منہ سے خون بھی جاری ہو گیا تھا۔ اس وحشی انسان کے ہاتھوں خیرل کا یہ بھیانک انجام دیکھ کر بلخ شیر کے تو اوسان خطا ہی ہونے لگے تھے کہ زرینہ نے بھی مارے دہشت کے چیخ بلند کر ڈالی۔ اس وحشی انسان نے خیرل کے مُردہ وجود کو چھوڑا تو وہ زمین پر ڈھے گیا۔ زرینہ کی ہذیانی چیخ سن کر وہی نیم پاگل وحشی ان کی طرف لپکا۔ تب تک بریف کیس والا شخص اور وہ نوکر بھی اس کے سر پر پہنچ چکے تھے۔ نوکر نے نیم وحشی انسان سے غصیلے اور تحکمانہ لہجے میں کچھ کہا پھر بلخ شیر اور زرینہ کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ وہاں سے نکل کر بھاگنے کے لیے پر تول رہے تھے کہ بریف کیس والے شخص نے نہایت پھرتی کے ساتھ اپنی جیب سے پستول نکال کے ان دونوں پر تان لیا اور کرخت لہجے میں بولا۔

”خبردار! اگر اب بھاگنے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا۔“

بلخ شیر اور زرینہ خاموش مگر ہراساں سے کھڑے رہ گئے۔ بریف کیس والے شخص نے اپنے نوکر سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

”غفورا! تم اپنے بھائی جمالے کو لے جاؤ، میں ان دونوں کو اندر لے جاتا ہوں۔ جلدی کرو، کم بخت جمالے نے غلط آدمی کا مرڈر کر کے سارا منصوبہ چوپٹ کر دیا ہے۔“ وہ بری طرح جھنجلا رہا تھا اور طیش میں بھی تھا۔ اس پر سوا بلخ شیر اور زرینہ اس کے لیے ایک نئی مصیبت بن کر سوار ہو گئے تھے جنہوں نے یہ سب نہ صرف اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا بلکہ ان تینوں سفاک انسانوں کے خونی منصوبے سے بھی آگاہ ہو چکے تھے۔ بہرطور... بریف کیس والا شخص بلخ شیر اور زرینہ کو گن پوائنٹ پر اپنے ساتھ کوٹھی میں لے آیا اور دونوں کو ایک کمرے میں بند کرنے سے پہلے بلخ شیر کی تلاشی لے کر اس کا موبائل فون نکال کر لے گیا جبکہ ادھر غفورے نے خیرل کی لاش کو بھی ٹھکانے لگا دیا تھا اور جمالے کو اپنے کوارٹر میں پہنچا دیا تھا۔

اب وہ اس کمرے میں موجود تھا جہاں تھوڑی دیر پہلے وہ اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ موجود کسی کے قتل کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ بلخ شیر اور زرینہ کو جس کمرے میں بند کیا گیا تھا، وہ کمرا اس کمرے سے متصل تھا۔

بلخ شیر نے اس کمرے میں قید ہونے کے بعد کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرا آٹھ بائی دس کا تھا۔ کمرے میں صرف ایک اسٹول رکھا تھا جس کی ایک ٹانگ غائب تھی۔ اس پر بے خیالی میں بیٹھنے والا زمین بوس ہو سکتا تھا۔ دیوار پر ایک گول روشن دان تھا، اٹیچ باتھ تھا، ایک کھڑکی تھی جس پر اندرونی طرف سلائیڈنگ پٹ شیشے کے تھے اور بیرونی طرف آہنی گرل تھی۔

زرینہ بہت دہشت زدہ نظر آ رہی تھی، اس کی آنکھوں کے سامنے ابھی تک اس نیم پاگل اور وحشی انسان کے ہاتھوں خیرل کے دردناک انجام کا منظر کسی ہارر موی کی طرح گھوم رہا تھا۔

”شیرل! مجھے یہاں بہت ڈر لگ رہا ہے۔ خدا کے لیے نکل چلو یہاں سے۔“ وہ سراسیمہ ہو کے بولی۔

”دل تو میرا بھی چاہ رہا ہے یہاں سے نکلنے کو مگر مجبوری ہے... دروازہ باہر سے بند ہے۔“ بلخ شیر مسکین صورت بنا کے بولا۔

”تم کچھ کرو نا... یہ بہت خطرناک لوگ ہیں، پتا نہیں ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں۔“

”میں اب دروازے سے ٹکریں تو مارنے سے رہا۔“ وہ بولا پھر دفعتاً... چونکا۔ کمرے کی دوسری طرف کسی کے باتیں کرنے کی گونج بھی سنائی دے رہی تھی مگر مفہوم سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بلخ شیر فوراً دروازے کی طرف بڑھا پھر کی ہول سے دوسری طرف جھانکا۔

اب اس کمرے میں بریف کیس والا شخص اور غفورا نامی نوکر موجود تھے۔

”اس کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ اب کون انہیں ٹھکانے لگائے گا۔ جمالا تو گیا کام سے، ہم اب اس سے یہ کام نہیں لے سکتے۔“ بریف کیس والا غفورے سے کہہ رہا تھا۔

جواباً غفورا بولا۔ ”آپ کیوں فکر کرتے ہو صاحب جی! میں یہ کام کر دوں گا۔“ اس کی نظریں اب بھی بریف کیس پر جمی تھیں۔ جمالے کی غلط حرکت کے بعد غفورے کو یہ بریف کیس جاتا ہوا نظر آ رہا تھا اس لیے اب اس نے یہ کام خود اپنے ذمے لینے کا سوچا۔ دولت کی چمک یہی گل کھلاتی ہے، پہلے عقل کھاتی ہے پھر بے حس بنا دیتی ہے... اس کے بعد جنونی۔ غفورا بھی جنونی بن چکا تھا اور ڈھیر سارے روپوں کے بدلے میں جو معاملہ کھٹائی میں پڑتا نظر آ رہا تھا، اسے اپنے ذمے لے کر سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”لیکن تم یہ کام کیسے کرو گے؟ میں اس کام میں کسی آتشیں ہتھیار کا دخل بالکل نہیں چاہتا۔ صرف ہاتھ کی صفائی

دیکھنا چاہتا ہوں اور اس کام کے لیے جمالا ہی بہتر تھا... مگر اس گدھے کے بچے نے کسی اور فضول آدمی پر اپنے ہاتھ کی صفائی دکھادی۔'' بریف کیس والا ابھی تک جھلّایا ہوا تھا۔

''صاحب جی! میں کہہ رہا ہوں نا کہ میں یہ کام بہت خوش اسلوبی سے نمٹا دوں گا، بغیر کسی آتشیں ہتھیار کے... آپ میرا کام تو دیکھیں۔''

''کیا یہاں کسی کو جان سے مارنے کی ریہرسل کرو گے؟'' بریف کیس والا اجل کے بولا۔

''نہیں صاحب جی... میرا یہ مطلب نہیں ہے۔'' غفورا گھبرا کے بولا۔

''وہ ہوگی کہاں اس وقت؟'' بریف کیس والے نے خود کلامیہ بڑبڑا کے رسٹ واچ میں وقت دیکھا پھر بولا۔ ''تمہیں ثوبیہ کیا بتا کر گئی تھی کہ وہ کہاں جارہی ہے اور کب تک لوٹے گی؟''

''صاحب! مجھے تو یہی بتایا تھا بیگم صاحبہ نے کہ وہ اپنی کسی سہیلی سے ملنے جارہی ہیں... عورتوں کا کوئی اجلاس ہے۔''

''ہوں... ٹھیک ہے، جب تک ہمیں بھی کچھ کرنے کا موقع مل جائے گا۔ اب یہ بتاؤ کہ تم ثوبیہ کو ٹھکانے کس طرح لگاؤ گے؟'' اس شخص نے پوچھا۔

غفورا بولا۔ ''بیگم صاحبہ جیسے ہی اندر داخل ہوں گی، میں پیچھے سے نکل کے ان کا گلا دبادوں گا۔''

''ابے پیچھے سے کیا انڈے سے نکلو گے؟'' وہ جھلّا کے بولا۔ ''آگے سے کیوں نہیں نکلو گے؟ سامنے آکے گلا دبانا زیادہ آسان ہوتا ہے۔''

''ٹھیک ہے صاحب! سامنے سے آکر بیگم صاحبہ کا گلا دبادوں گا۔''

''سنو! جب اس کا کام تمام ہو جائے تو مجھے آکر فوراً بتانا۔ میں دوسرے کمرے میں ہوں گا۔ میں ذرا کمزور دل کا ہوں، اپنی بیوی کو آنکھوں کے سامنے مرتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتا... سمجھے تم۔''

''سمجھ گیا صاحب جی۔'' غفورا سر ہلا کے بولا۔ پھر وہ بریف کیس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''اب یہ میرا ہوگا؟''

''کام کے بعد یہ تمہارا ہوگا... اس کے اندر پورے پانچ لاکھ ہیں۔'' بریف کیس والا شخص بولا۔ پھر اس نے موضوع بدلا۔

''تم ایک کام کرو، بیگم صاحبہ کو فون کر کے ذرا پوچھ لو... وہ کہاں ہیں اور کب تک لوٹیں گی... تاکہ ان دونوں قیدیوں کا بھی کچھ بندوبست کرنے کا وقت مل سکے۔'' اس کا اشارہ بلّے شیر اور زرینہ کی طرف تھا۔

''صاحب جی! آپ اپنے موبائل سے کیوں نہیں رابطہ کر لیتے؟ مجھے ان کے موبائل کا لمبا چوڑا نمبر یاد نہیں رہتا۔''

''میں اسے فون نہیں کرنا چاہ رہا۔ تم فون اٹھاؤ، میں تمہیں بیگم صاحبہ کا نمبر بتاتا ہوں۔''

غفورا فوراً قریب رکھے ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھا اور ریسیور اٹھا کے کان سے لگایا پھر صاحب جی کی طرف دیکھا۔ صاحب جی اسے ''بیگم صاحبہ'' کا موبائل نمبر بتاتا گیا اور وہ نمبر ملاتا رہا۔

دروازے کے کی ہول سے بلّے شیر اپنی آنکھ چپکائے نہ صرف ان دونوں کو دیکھ رہا تھا بلکہ ان کی باتیں بھی سن رہا تھا۔ بلّے شیر کا ایسے موقع پر دماغ خوب چلتا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہاں کسی ثوبیہ نامی عورت جو اس کوٹھی کی ''بیگم صاحبہ'' ہے، یعنی بریف کیس والے شخص کی بیوی بھی ہوسکتی ہے... اسے قتل کرنے کی سازش تیار کی جارہی تھی۔ بلّے شیر کی انسانی ہمدردی والی رگ پھڑک اٹھی حالانکہ اس وقت خود اس کو کسی کی ہمدردی کی ضرورت تھی۔ بہرطور... بیگم صاحبہ یعنی ثوبیہ کا موبائل نمبر اس نے بھی صاحب جی کی ''زبانی'' نوٹ کرلیا بلکہ ذہن نشین کرلیا۔

''تم دروازے سے آنکھ چپکائے اتنی دیر سے کیا دیکھے جارہے ہو؟'' عقب میں سراسیمہ اور پریشان کھڑی زرینہ نے پوچھا۔

''فلم دیکھ رہا ہوں۔ بڑی تھرل مووی ہے۔'' بلّے شیر سیدھا ہوتے ہوئے جل کے بولا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ کاش اگر بریف کیس والا شخص اس کا موبائل نہیں چھینتا تو وہ اس وقت ثوبیہ کو فون کر کے اسے خطرے سے آگاہ کرسکتا تھا اور وہی ان کی مدد بھی کرسکتی تھی۔ تب پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ زرینہ کے ساتھ گوٹھ سے بھاگ کر شہر آیا تھا تو اس نے ممکنہ جدائی یا شہر کی بھیڑ بھاڑ میں گم ہونے کے خدشے کے امکان کے پیشِ نظر زرینہ کو بھی ایک سستا سا موبائل سیٹ خرید کر دیا تھا اور اپنے پاس موجود بہت سی فالتو سموں میں سے ایک سم زرینہ کے سیٹ میں ڈال دی تھی۔ وہ سیٹ زرینہ نے اپنے گریبان میں اڑس کے رکھ لیا تھا اور بریف کیس والے کا اتفاق سے اس طرف خیال ہی نہیں گیا تھا کہ زرینہ کے پاس بھی ایک عدد موبائل سیٹ ہوسکتا ہے۔ یہ خیال آتے... بلّے شیر دبے دبے جوش سے زرینہ کے گریبان

کی طرف دیکھ کر بولا۔

''موبائل سیٹ نکالو جو میں نے تمہیں خرید کر دیا تھا۔''

زرینہ اس کی بات سمجھ گئی اور فوراً سیٹ نکال کر بلّے شیر کو تھما دیا۔ بلّے شیر کپکپاتے ہاتھوں سے ثوبیہ کے موبائل نمبر پنچ کرنے لگا۔ جوش و مسرت سے اس کا پورا وجود مرتعش ہو رہا تھا۔

☆☆☆

آنسوؤں کے موتی اس کی دلکش آنکھوں سے بہہ کر گورے گالوں پر لڑھک رہے تھے۔ وہ نئے ماڈل کی کرولا ڈرائیو کر رہی تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کی بیش قیمت ساڑی پہن رکھی تھی جو اس کے گورے اور بھرے بھرے بدن پر بڑی دیدہ زیب نظر آرہی تھی۔ اس کی عمر پینتیس کے قریب تھی۔ چہرے سے تو وہ بہت پہلے ہی دکھی معلوم ہوتی تھی۔ تازہ بہنے والے آنسو اس کے کسی نئے دکھ کی غمازی کر رہے تھے۔ بھرے بھرے رسیلے ہونٹوں پر سرخ لپ اسٹک تھی جنہیں شاید احساسِ غم کی شدت سے اس نے اپنے دانتوں تلے دبا رکھا تھا۔

اس کا نام ثوبیہ تھا۔ ماں بچپن میں ہی فوت ہوگئی تھی۔ باپ نے ہی اسے پالا تھا۔ باپ کو اس سے بہت محبت تھی۔ اسی محبت کے باعث اس نے دوسری شادی کرنا گوارا نہ کیا تھا۔ وہ ثوبیہ کی ہر آرزو، ہر خواہش پوری کرتا تھا۔ یہاں تک کہ جب ثوبیہ نے ارسلان کو اپنا لائف پارٹنر بنانے کا فیصلہ کیا تو باپ نے بیٹی کی خوشی کی خاطر اس کا اتنا بڑا فیصلہ بھی قبول کرلیا۔ ارسلان خوب صورت تھا مگر مردانہ وجاہت کے سوا اس میں کوئی اور خوبی نہ تھی۔ پڑھا لکھا بھی زیادہ نہ تھا۔ خاندانی بیک گراؤنڈ بھی اس کا تیسرے درجے کا تھا۔ اسے کوئی ڈھنگ کا کام بھی نہیں آتا تھا، نہ ہی کچھ کرتا تھا۔ ہاں البتہ ثوبیہ کو اس میں ایک خوبی نظر آئی تھی جس نے اس کی ساری خامیوں پر پردہ ڈال دیا تھا اور وہ تھا ارسلان احمد کا یہ دعویٰ کہ ثوبیہ اس کا پہلا اور آخری پیار ہے۔

شادی ہوگئی... تھوڑے دنوں میں سیٹھ اقبال کا بھی انتقال ہوگیا۔ کاروبار کی باگ ڈور ثوبیہ نے سنبھال لی۔ ارسلان اس کا دم چھلّا بنا رہا۔ ثوبیہ چاہتی تھی کہ وہ بھی کاروبار میں دلچسپی لے، اس کا ہاتھ بٹائے، مگر ارسلان جو چاہتا تھا وہ پورا ہوگیا تھا۔ ثوبیہ کاروبار میں مصروف رہتی اور ارسلان لمبی چمچماتی کاروں میں نوٹوں سے جیبیں بھر کے اور نت نئے بیش قیمت سوٹ پہن کر حسین و جمیل لڑکیوں اور عورتوں سے دوستیاں گانٹھتا رہا۔ وہ شراب کا بھی رسیا تھا پہلے سستی اور دیسی پیتا تھا، ایک ایئر کموڈور آدمی کی بیٹی سے شادی کے بعد وہ ولایتی

میں نے بہ عجلت لباس تبدیل کیا اور دوڑی ہوئی آپ کے پاس چلی آئی

شراب پینے لگا۔ تیس لاکھ روپے کی ممبر شپ بھی لی اس نے کسی کلب میں۔

اگرچہ ارسلان کے اس سے محبت کے دعوے کے بعد ثوبیہ سچ مان کے اسے اپنا جیون ساتھی بنا تو چکی تھی مگر بعد میں اس نے پرکھنے کی بھی کوشش کی۔ بعض عورتیں مردوں کے ہاتھوں صرف ایک بار بے وقوف بنتی ہیں، بار بار نہیں۔ ثوبیہ کو بھی ارسلان سے شادی کے تھوڑے دنوں بعد ہی معلوم ہوگیا تھا کہ یہ کس قسم کے ''پھن'' رکھتا تھا، وہ پوری طرح آگاہ تھی۔ ہمارے مشرقی ماحول میں عموماً میاں بیوی کی گھریلو زندگی سمجھوتوں پر چلتی ہے۔ ثوبیہ نے بھی اپنی شادی شدہ زندگی سے سمجھوتا کرلیا تھا اور ارسلان کی ایک حد مقرر کر دی تھی۔ اسے اب وہ لگا بندھا خرچ دینے لگی تھی۔ ارسلان بھی بے وقوف اور جلد باز نکلا تھا... جب ثوبیہ نے اس پھنچیر سے شادی کے لیے ہاں کر دی تھی تو ارسلان نے اپنے تئیں سمجھ لیا تھا کہ ثوبیہ اس صدی کی سب سے بڑی بے وقوف عورت ہے، اب وہ اس کی بے وقوفی پر ساری زندگی عیش کرتا رہے گا مگر مسئلہ یہ تھا کہ ثوبیہ نے بھی اپنی اس پہلی بے وقوفی کو سمجھ لیا تھا۔

چنانچہ پھر حالات زیادہ ارسلان کے حق میں نہیں ہو سکے۔ اور اس بات پر ارسلان کے سر پر ہر وقت جھلّاہٹ

طاری رہنے لگی کہ ثوبیہ نے اسے آوارہ اور نکھٹو شوہر کا خطاب دے کر نہ صرف محدود کر دیا تھا بلکہ اس کا خرچہ پانی بھی ایک حد تک مقرر کر دیا تھا۔

ثوبیہ کو سونے کا انڈا دینے والی مرغی سمجھنے والے ارسلان نے جب دیکھا کہ اس کی بیوی نے اس پر اپنی دولت لٹانے کے بجائے اس کی حیثیت تنخواہ دار معمولی ملازم کی سی کر دی ہے تو اس کے اندر ثوبیہ کے خلاف مجرمانہ خیالات پرورش پانے لگے۔ ان پر عمل درآمد کرنے کا اس نے تب بڑی سنجیدگی سے سوچا جب اس کی دوستی ایک طرح دار، حسین و جمیل، خوش ادا اور اپنے اندر مقناطیسی کشش رکھنے والی عورت سے ہوگئی۔ وہ بھی دولت مند عورت تھی۔ رقیہ خانم نام تھا اس کا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ رقیہ خانم کی دولت بھی اس حد تک تھی کہ ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور کھانے کے اور... بنی نظر آتی رہے۔ ارسلان جیسے وہ لوگ اس کا شکار ہوتے تھے جن کی امیر کبیر بیویاں، بہ الفاظ دیگر عقل مند بیویاں... اپنے آوارہ اور نکھٹو شوہروں کو محدود کر دیتی ہیں اور جن کی حیثیت گھر کے ملازموں سے بس تھوڑی زیادہ ہوتی ہوگی۔ وہ ان سے دوستی کرتی اُن کے اندر پروان چڑھنے والے مجرمانہ خیالات کو پڑھتی بلکہ بھانپتی... اور پھر مادہ مکڑی کی طرح نر کو قریب بھی بلاتی اور موت کے اندھیروں میں بھی دھکیلتی۔

چنانچہ رقیہ خانم نے بھی اپنی قاتل اداؤں اور بھڑکیلے جذبات سے ارسلان کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اور اپنی اس کے ساتھ دلداری اور وارفتگی کو مزید بھڑکانے تک محدود رکھتے ہوئے اسے اپنا دیوانہ بنا لیا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ لوہا پگھلنے لگا ہے اور اب جیسے چاہو اسے ڈھالنے والے مقام پر آچکا ہے تو سارا منصوبہ اسے بتا دیا۔

لہٰذا اب ارسلان اپنی امیر کبیر بیوی ثوبیہ کو ...... ہمیشہ کے لیے راستے سے ہٹا کے خود اس کی دولت و کاروبار پر قبضہ جمانے کے جس ناپاک منصوبے پر عمل کر رہا تھا، وہ رقیہ خانم کا ہی بنایا ہوا تھا۔

ارسلان نے سب سے پہلے گھر کے پرانے وفادار ملازموں کی چھٹی کر دی تھی اور غفورے کو ملازم رکھ لیا تھا اور لالچ وغیرہ دے کر اپنے منصوبے میں شریک بھی کر لیا تھا۔

ثوبیہ اس وقت اپنی کار میں بیٹھی اپنی تقدیر کے بارے میں سوچ رہی تھی اور پریشان ہو رہی تھی۔ فطری طور پر ثوبیہ ایک شوہر پرست اور محبت کرنے والی عورت تھی۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ اسے اچھا اور محبت کرنے والا پرخلوص شوہر ملے مگر ایسا ہو نہ سکا۔ ارسلان سے جب اس نے شادی کی تھی تو اسے اپنی یہ ازلی خواہش پوری ہوتی محسوس ہوئی تھی مگر جب دھیرے دھیرے اس کے کرتوت واضح ہونے لگے... حتیٰ کہ جب ارسلان نے اس پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ اگر وہ سارا کاروبار اس کے نام کر دے تو وہ بہ حسن و خوبی اسے سنبھال لے گا اور وہ... یعنی ثوبیہ صرف گھر سنبھالے تو ثوبیہ کو حیرت ہوئی تھی اور دکھ بھی۔ یہی نہیں بلکہ ارسلان نے کچے کھلاڑی کی طرح جلد بازی میں آکر ثوبیہ کا روپیا پیسا اور بینک بیلنس تک اپنے نام ایک ''کچی'' چالاکی سے ... کروانے کی کوشش بھی کی تھی۔ اسی دن سے ثوبیہ کو اس کی ذہنیت اور عزائم کا اندازہ ہو گیا تھا پھر وہ بھی نہ صرف محتاط ہوگئی تھی بلکہ اپنا رویہ بھی بدل لیا تھا۔

ثوبیہ اس وقت اپنی ایک عزیز سہیلی نادرہ سے ملنے جا رہی تھی۔ وہ ایک انسانی حقوق کی کوئی بڑی این جی او کی سربراہ تھی اور اس کی بہت اچھی اور مخلص دوست بھی تھی۔

جب ثوبیہ پر قنوطیت طاری ہوتی اور تنہائی کا احساس بڑھنے لگتا تو وہ اپنی اسی سہیلی سے ملنے چلی جاتی ورنہ تو وہ خود کو ہر وقت کاروبار میں ہی مصروف رکھتی۔

''میرے مشورے پر عمل کرو۔ ارسلان کو لات مارو اور کسی دوسرے... اچھے، نیک نفس اور شریف انسان کے بارے میں سوچو۔''

اس کی عزیز سہیلی نادرہ نے مشورہ دیا۔ ثوبیہ جب اس کی کلفٹن میں واقع کوٹھی میں پہنچی تو وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ نادرہ ایک چالیس سالہ خوبرو ماڈرن عورت تھی۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ دونوں ملک سے باہر زیرِ تعلیم تھے۔ نادرہ کے شوہر کا چند سال قبل ہی انتقال ہوا تھا۔

دونوں سہیلیاں اس وقت کمرے ...... میں بیٹھی تھیں اور تھوڑا بہت پینا پلانا بھی کر لیتی تھیں۔ بالخصوص اس وقت جب دونوں اکٹھی ہوتیں اور تنہائی کا زہر ان کے درماندہ وجود اور تفتہ دل کو چھلنی کرنے لگتا تھا۔

''میں ایسا نہیں کر سکتی، وہ دربدر ہو جائے گا۔'' ثوبیہ نے بلوریں پیگ کو ہونٹوں سے لگا کے کہا۔ ''کیونکہ ابھی ارسلان نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی ہے کہ میرے دل میں اس کے لیے جو تھوڑی بہت محبت ہے، وہ بھی ختم ہو کے نفرت میں بدل جائے اور اس کا وجود میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو جائے۔''

''مجھے ڈر ہے، تمہاری یہ رحم دلی تمہیں کہیں لے نہ ڈوبے... اللہ نہ کرے۔'' نادرہ نے زیرِ لب کہہ بھی دیا۔ وہ اس وقت عام گھریلو لباس میں ملبوس تھی مگر یہ عام لباس بھی

خاصا قیمتی تھا۔

''جب میں محسوس کروں گی کہ کوئی مجھے ڈبونے کی کوشش کر رہا ہے تو میں ناتا ہی توڑ لوں گی۔'' ثوبیہ کے لہجے میں زہریلا پن تھا۔

''تم میری بات کا مطلب نہیں سمجھیں۔ تم میری اچھی دوست ہو، یقیناً میری بات کا برا نہیں مناؤ گی پھر تم نے اپنے اور ارسلان کے سلسلے میں مجھ سے اب تک کچھ بھی تو نہیں چھپایا۔ اس کی روشنی میں اب واضح لفظوں میں تمہیں ہوشیار کرتے ہوئے بتا رہی ہوں کہ ارسلان اب تمہاری جان کا دشمن بھی بن سکتا ہے۔ خدانخواستہ وہ تمہاری جان بھی لے سکتا ہے۔'' نادرہ کی بات پر ثوبیہ نے خلافِ توقع ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ نادرہ کو اس کی آنکھوں میں اترتی شراب کی غنودگی محسوس ہوئی جس کی تہ میں ناکام گھریلو زندگی کے دکھ کی تلچھٹ بھی تھی۔

''تمہیں ارسلان کو جاننے میں ابھی تھوڑی کسر رہ گئی ہے۔ وہ اتنی بڑی بہادری یا ہمت کا مظاہرہ کبھی نہیں کر سکتا، میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔'' ثوبیہ کے لڑکھڑاتے لہجے میں استہزا تھا۔

''بھوک گیدڑ کو بھی شیر بنا دیتی ہے۔'' نادرہ نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔

''وہ گیدڑ سے بھی گیا گزرا ہے۔''

''تم اوور کانفیڈنس ہو رہی ہو۔'' نادرہ کے لہجے میں تنبیہ تھی۔

''یار! چھوڑو ان باتوں کو... جام بناؤ۔'' ثوبیہ نے خالی پیگ تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

''صاحب جی! بیگم صاحبہ کا سیل آف جا رہا ہے۔'' غفورے نے دو تین بار ثوبیہ کا نمبر ملانے کے بعد کہا۔ ارسلان جھلایا ہوا سا نظر آنے لگا۔ غفورے نے ریسیور رکھ دیا تھا۔

''اب ان دونوں کا کیا کریں؟'' ارسلان نے غفورے کی طرف دیکھ کر مضطربانہ انداز میں کہا۔

غفورا تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ''صاحب جی! آپ ان دونوں کی فکر نہ کریں۔ پہلے اہم کام نمٹا لیں، اس کے بعد ان کا بھی حل آرام سے ڈھونڈ نکالیں گے۔ آپ یہ اب مجھے دے دیں، میں اسے اپنے کوارٹر میں رکھ آؤں۔'' اس نے ارسلان کے ہاتھ میں پکڑے بریف کیس کی طرف دیکھ کر للچائے ہوئے لہجے میں کہا۔ غفورے کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر کیا وجہ تھی کہ صاحب نے اتنی دیر سے اپنے ہاتھ میں بریف کیس پکڑ رکھا تھا۔ بے شک اس میں پانچ لاکھ کی رقم تھی اور بہ قول ان کے، جو انہوں نے ''کام'' کے بعد اس کے ہی حوالے کرنا تھی۔

''ابھی نہیں، پہلے اپنا کام نمٹاؤ۔'' ارسلان اس سے درشتی سے بولا۔

''صاحب جی! میرا مطلب آپ سمجھے نہیں۔'' غفورے نے مکاری سے بات بدلی۔

''اس طرح آپ یہ بھاری بریف کیس پکڑے پکڑے تھک جائیں گے اور پھر بیگم صاحبہ جب لوٹیں گی تو... یہ بریف کیس آپ کے ہاتھ میں دیکھ کر...''

''تم صرف اپنے کام سے کام رکھو... سمجھے تم؟'' ارسلان نے اس کی بات کاٹ کر اسے جھڑکا۔

بریف کیس کی اصل حقیقت فقط ارسلان ہی جانتا تھا جس کے اندر محض پانچ لاکھ ہی کی رقم نہیں تھی بلکہ لاکھوں مالیت کے پرائز بانڈز، شیئرز اور جیولری بھی تھی۔ یہ قدم ارسلان نے کسی انتہائی خطرے کے پیش نظر اٹھایا تھا جسے بہ الفاظِ دیگر بھانڈا پھوٹنا بھی کہا جا سکتا ہے۔ اپنی عقلِ سلیم کے مطابق ارسلان نے ایسا محض حفظِ ماتقدم کے لیے کیا تھا کہ اگر عین وقت پر اس کا منصوبہ فیل ہو جاتا ہے اور ثوبیہ بچ جاتی ہے تو پھر وہ اس سے کوئی رعایت نہیں برتے گی... اور کچھ نہیں تو اسے بھوکا ننگا کر کے لات ضرور مار دے گی۔ کم از کم وہ خالی ہاتھ کیوں اس گھر سے نکلے۔ کچھ تو ہو اس کے پاس...

اب ارسلان اور غفورے کو ثوبیہ کا بے چینی سے انتظار تھا۔

☆☆☆

بالآخر کوئی انتیسویں بار کی کوشش کے بعد بلخ شیر کا رابطہ ثوبیہ کے موبائل فون پر ہو گیا۔

''ہیلو!'' دوسری طرف سے بلخ شیر کو ایک مترنم سی نسوانی آواز سنائی دی تو بلخ شیر جوشِ مسرت سے کپکپانے لگا۔

''ہیلو... ہیلو... آ... آ... آپ... بیگم صاحبہ ہیں؟ میرا مطلب... آپ کا نام ثوبیہ ہے؟'' بلخ شیر نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

دوسری طرف چند ثانیے کی خاموشی رہی پھر کوئی بڑبڑایا۔ ''پتا نہیں کون پاگل ہے۔'' پھر وہی دلکش سی نسوانی آواز ابھری۔ ''ہاں، میں ہی ثوبیہ ہوں... مگر تم کون ہو؟ مجھے کیسے جانتے ہو؟ اور میرے سیل فون کا نمبر تمہارے پاس کیسے آیا؟''

ایک ساتھ کئی سوالات نے بلخ شیر کو بوکھلا کے رکھ دیا۔ زرینہ کے چہرے پر بھی مسرت تھی، وہ قریب ہی کھڑی تھی۔

''نہ میں آپ کو جانتا ہوں، نہ آپ مجھے جانتی ہیں لیکن ہم

پھر بھی ایک دوسرے کو جان جائیں گے، بہت جلد... آپ پریشان نہ ہوں... آپ کی جان کو سخت خطرہ ہے۔ آپ اس وقت اپنے گھر لوٹ رہی ہیں تو پولیس کو ساتھ لے کر آئیں۔ ہمیں آپ کی کوٹھی کے ایک کمرے میں قید کر کے رکھا گیا ہے... آپ کے شوہر اور ملازم...''

اچانک بلخ شیر کے موبائل سیٹ پر بیٹری لو ہونے کی مخصوص بیپ ابھری اور وہ آف ہو گیا۔

''دھت تیرے کی۔'' بلخ شیر جھلا کے بولا۔ ''اس کم بخت بیٹری کو بھی ابھی ڈسچارج ہونا تھا۔''

''کیا ہوا؟ تم بات کرتے کرتے... یہ کیا الٹا سیدھا بولنے لگے ہو؟'' قریب کھڑی زرینہ نے پریشان ہو کے پوچھا تو بلخ شیر نے اسے بتایا کہ کیا ہوا ہے۔

''تم نے اتنا سارا وقت صرف بیگم صاحبہ کی ہمدردی میں ان کا نمبر ملانے میں ضائع کر دیا۔'' زرینہ اسے کوستے ہوئے بولی۔ ''اگر تم کسی پولیس تھانے... سے رابطہ کرتے تو...'' زرینہ نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔

''پریشان نہ ہو میری جان۔'' بلخ شیر نے ملائمت سے کہا۔ ''میں ڈیڑھ سیانا بننے کی کوشش کر رہا تھا۔'' اس کے لہجے میں اب اعتراف در آیا تھا۔ ''اوّل تو میرے پاس کسی تھانے کا نمبر نہیں تھا، نہ ہی کسی اور کا۔ پھر میری بھی ساری توجہ بیگم صاحبہ پر تھی کہ انہیں ساری حقیقت بتا دوں تو وہ خود آگے سب سنبھال لیں گی اور ساتھ میں ہمیں بھی... ویسے زری ڈیئر! تم فکر نہ کرو، میں کافی حد تک بیگم صاحبہ کو ساری بات بتا چکا ہوں۔''

زرینہ کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بلخ شیر کی باتوں سے زیادہ مطمئن نہیں ہے۔

☆☆☆

ثوبیہ کو اپنے سیل فون پر وہ اجنبی کال اس وقت موصول ہوئی تھی جب رات بارہ بجے کے وقت وہ نادرہ سے رخصت ہو کے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئی تھی۔

ابھی اس کی کار نے نادرہ کے گھر سے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا ہو گا کہ موبائل فون آن کرتے ہی یہ اجنبی کال اسے موصول ہوئی تھی اور کوئی اسے اس کی جان کے خطرے میں ہونے سے آگاہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اچانک دوسری جانب سے رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ ثوبیہ نے اس نمبر پر دوبارہ رابطہ کرنا چاہا مگر دوسری جانب سے یاور آف ہو چکا تھا۔

پہلے تو وہ یہی سمجھی تھی کہ یہ یونہی کسی کی شرارت ہو گی کیونکہ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ لوگ بلاوجہ گمنام کالیں کر کے تنگ کرتے ہی تھے۔ چنانچہ ثوبیہ نے بھی پہلے پہل اس گمنام نمبر کی کال کو کسی فضول انسان کی شرارت سمجھا لیکن پھر اچانک اسے اپنی سہیلی نادرہ کی آج والی گفتگو یاد آ گئی، جس میں اس نے اسے پہلے اشاروں کنایوں میں اور پھر بعد میں واضح لفظوں میں اپنے شوہر ارسلان سے محتاط رہنے کی تاکید کی تھی۔

'کیا ارسلان نے میرے قتل کا کوئی منصوبہ بنایا ہے؟' اس نے سوچا۔ 'مگر وہ اتنا دلیر کب سے ہو گیا؟' پھر وہ آنے والی اجنبی کال کے بارے میں سوچنے لگی۔

'آخر وہ گمنام کال کرنے والا کون تھا؟ اور اسے اس کی کوٹھی میں کیوں قید کیا گیا تھا؟ پھر اس نے نوکر کا بھی تذکرہ کیا تھا۔ نوکر تو غفور انام کا واقعی تھا مگر وہ نام نہیں بتا سکا تھا۔'

'اس نے رابطہ کیوں منقطع کر دیا؟' وہ الجھ گئی۔ دماغ پر زور دینے کے بعد اس نے قیاس کیا۔

'ممکن ہے... اسے کسی وجہ سے مزید بات کرنے کا موقع نہ ملا ہو... یا پھر اس کی بیٹری ڈاؤن ہو گئی ہو۔'

جب ثوبیہ کی چھٹی حس نے ان ساری باتوں کے بعد خطرے کا الارم بجانا شروع کیا تو اس نے سوچا عقل مندی کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اسے کسی کا مذاق نہ سمجھے اور پولیس کو اپنے ساتھ اپنی رہائش گاہ تک لے جائے، چنانچہ پھر اس نے یہی کیا۔

پیٹرولنگ کرتی ایک پولیس موبائل کو وہ ذاتی خرچ پر اپنے ہمراہ اپنی رہائش گاہ پر لے آئی۔

اس کی کوٹھی پر گہرا سکوت طاری تھا۔ موبائل دور سے ہی سائرن بجاتی ہوئی ثوبیہ کی کار کے پیچھے پیچھے دوڑتی ہوئی اس کی رہائش گاہ پر پہنچی تھی۔

ثوبیہ پولیس کو لے کر اندر آئی تو اسے ارسلان سلیپنگ سوٹ میں اپنے بیڈ روم میں بے سدھ سویا ہوا ملا۔ پھر اس نے پولیس کے ساتھ اپنی کوٹھی کے سارے کمرے بھی کھنگال ڈالے کہ بہ قول اس گمنام کالر (بلخ شیر) کے انہیں اس کی کوٹھی کے کسی کمرے میں قید کیا گیا ہے... مگر کوئی ''قیدی'' نہ ملا۔ اب ثوبیہ کو یقین ہو گیا کہ واقعی اس کے ساتھ کسی نے بڑا سنگین مذاق کیا تھا۔ چنانچہ پولیس والوں کا ''شکریہ'' تو وہ پہلے ہی ''ادا'' کر چکی تھی، اب اسے ان کا زبانی کلامی بھی شکریہ ادا کرنا پڑا۔ ثوبیہ گیٹ تک پولیس والوں کو رخصت کر کے پلٹی اور پختہ روش پر چلتی ہوئی وسطی دروازے کی طرف بڑھی۔

رات گہری ہونے لگی تھی۔ لان میں خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ثوبیہ ابھی وسطی دروازے کے قریب پہنچی ہی تھی کہ

اچانک تاریکی سے ایک بھاری بھرکم سایہ نمودار ہوا اور اس پر جھپٹا۔ ثوبیہ نے چیخنے کے لیے منہ کھولنا چاہا مگر اس بھاری بھرکم سائے نے اس کے چہرے پر مضبوطی سے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ساتھ ہی اس کی کنپٹی پر پستول کی خوفناک نال بھی لگا دی۔

☆☆☆

جیسے ہی ثوبیہ پولیس والوں کو چھوڑنے کے لیے باہر نکلی، بیڈ پر بظاہر گہری نیند سویا ہوا ارسلان چھلانگ مار کے اترا اور بیڈ کے نیچے جھک کے اس نے غفورے کو آواز دی۔

''نکل آؤ... پولیس جا چکی ہے۔'' اس آواز پر غفورا فوراً ہانپتا ہوا بیڈ سے نکل آیا۔ پھر ارسلان نے اس سے توصیفی لہجے میں کہا۔

''شاباش! تم نے اپنا کام بڑی پھرتی اور تیزی سے انجام دیا۔ ورنہ اس وقت ہم دونوں بھی خالی ہاتھ رخصت ہوتی ہوئی پولیس کے ساتھ ہوتے اور ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ہوتیں۔''

غفورا فخر سے گردن اکڑا کے بولا۔ ''صاحب جی! میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ یہ تو شکر ہوا کہ مجھے دور سے ہی پولیس موبائل کے سائرن کی آواز آ گئی پھر جب وہ گیٹ کے سامنے رکی تو میں سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے اور میں نے پہلا کام یہ کیا کہ... ان دونوں یرغمالیوں کو فوراً گن پوائنٹ پر رکھ کر اپنے کوارٹر میں لے جا کر بند کر دیا۔ لڑکی سے میں نے اس کا موبائل سیٹ بھی برآمد کر لیا تھا۔''

''اور... میں بھی فوراً کپڑے بدل کے یہاں سوتا بن گیا۔'' ارسلان نے کہا۔ ''چلو اب جلدی کرو... تم نے بڑی ہوشیاری سے اپنا آخری اور اہم کام نمٹانا ہے۔''

دونوں فوراً بیڈ روم سے نکلے اور نکلتے ہی بری طرح ٹھٹکے۔ ان کے سامنے ثوبیہ کھڑی تھی مگر اس طرح کہ اسے ایک بھاری بھرکم ڈیل ڈول والے اجنبی نے گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا۔ وہ خوں خوار نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے غرا کے بولا۔

''خبردار! کوئی غلط حرکت مت کرنا، ورنہ اس عورت کو گولی مار دوں گا۔''

یہ مٹھل تھا، بلخ شیر کا سوتیلا بھائی جو اپنے ساتھی خیرل کے ساتھ، بلخ شیر اور زرینہ کا تعاقب کرتے ہوئے اس پوش علاقے میں آن پہنچا تھا لیکن پھر اپنے ساتھی خیرل کا اس پاگل وحشی کے ہاتھوں عبرت ناک انجام دیکھ کر مٹھل کے اوسان خطا ہو گئے تھے اور وہ خوف زدہ سا ہو کر وہیں تاریک گوشے میں دبک گیا تھا۔ پھر اس نے اپنے دونوں شکار یعنی بلخ شیر اور زرینہ کو بھی ارسلان اور غفورے کے قبضے میں گن پوائنٹ کے ذریعے جاتے دیکھا تو بھی اس میں ان سے اپنا شکار چھیننے کی جرأت نہ ہو پائی۔ بالآخر کافی دیر گزرنے اور کسی مناسب موقع کے انتظار میں بیٹھے رہنے کے بعد اس نے اچھی طرح سے اس بات کی تسلی بھی کر لی کہ اب درندہ صفت وحشی پاگل کو اس کے دونوں ساتھیوں نے کسی خطرے کے پیشِ نظر کہیں گم کر دیا ہے تو وہ کوٹھی میں داخل ہوا اور خوش قسمتی سے ثوبیہ اس کے ہتھے چڑھ گئی۔

''تت... تم... کون ہو...؟ کیا چاہتے ہو...؟''

ارسلان ہکلا کے بولا۔ ثوبیہ کا چہرہ دہشت سے پیلا پڑ رہا تھا۔

''مجھے میرے دونوں شکار چاہئیں جو تمہارے قبضے میں ہیں۔'' مٹھل نے غرا کے کہا۔ ارسلان سمجھ گیا کہ یہ انہی دونوں لڑکی، لڑکے کے بارے میں پوچھ رہا تھا جنہیں غفورا اپنے کوارٹر میں بند کر آیا تھا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ اب وہ دونوں... ارسلان کے شکار تھے۔ وہ ہرگز ہرگز اپنے شکار کو مٹھل کے حوالے نہیں کرنا چاہتا تھا، تب پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک زبردست جھماکا ہوا۔ اس کے اندر سے آواز آئی۔

''میاں ارسلان! تم ایک نمبر کے گدھے ہو۔ تمہارا کام تو خود بہ خود آسان ہو رہا ہے۔ اس خوں خوار آدمی کو مزید طیش دلاؤ، یہ تو تمہارا کام آسان کر رہا ہے۔ یعنی ثوبیہ کو اس کے راستے سے ہٹانے کا مفت کا ٹھیکا۔''

اس نے تیزی سے سوچا اگر وہ کسی طرح اس قاتل خونی نظر آنے والے انسان کو یکدم بھڑکا کے مشتعل کر دے تو یقیناً یہ غصے میں آ کر ثوبیہ کو گولی مار دے گا اور یوں اس کا کام خود ہی آسان ہو جائے گا۔

اور اس نے ایسا ہی کیا۔

''میرے پاس تمہارے وہ دونوں شکار نہیں ہیں۔'' اس نے مٹھل سے بالآخر جھوٹ بول دیا اور ساتھ ہی اپنی جانچتی نظروں سے اس کے چہرے کا بھی جائزہ لیتا رہا۔

اس کی توقع کے عین مطابق... مٹھل مشتعل ہو رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ قسمت نے اسے اپنی بیوی ثوبیہ سے ہمیشہ کے لیے جان چھڑانے کا کیسا سنہری موقع دیا ہے مگر ڈراما کرنا ضروری تھا۔ ورنہ کھیل بگڑ سکتا تھا، لہٰذا اس کی منت کرتے ہوئے بولا۔

''دیکھو... خدا کے لیے میری بیوی کو چھوڑ دو، میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں... میں تمہارے ان دونوں

شکار کے بارے میں نہیں جانتا۔''

''بکواس بند کرو۔'' مٹھل غرایا۔ ''میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ تم اور تمہارا یہ نوکر ان دونوں کو پستول دکھا کر... اپنی کوٹھی میں لے گئے تھے۔ تم نے اب بھی کسی مقصد کے لیے ان دونوں کو اپنی قید میں رکھا ہوا ہے۔''

''کم بخت! جلدی یقین کر لے کہ اس کے دونوں شکار میرے قبضے میں ہی ہیں تاکہ ثوبیہ کی موت اس کے ہاتھوں یقینی ہو جائے۔'' ارسلان نے دل ہی دل میں کہا پھر بولا۔ ''نہیں، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس کے ساتھ کھڑے غفورے نے اپنے تئیں چالاکی دکھائی اور مٹھل سے بولا۔

''ہم ان دونوں کو پستول دکھا کر اندر ضرور لے گئے تھے مگر پھر وہ دونوں نہ جانے کس طرح ہمارے قبضے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔''

''اچھا۔'' مٹھل متذبذب ہو گیا۔ ارسلان کا منصوبہ پانی ہونے لگا۔ اس نے جب مٹھل کو متذبذب ہوتے دیکھا تو کھا جانے والی نظروں سے غفورے کو گھورا۔ وہ اب تک ارسلان کی چالاکی نہیں سمجھ پا رہا تھا اور مٹھل کو یقین دلانے پر تلا ہوا تھا کہ اس کے شکار ان کے قبضے میں نہیں ہیں اور ظاہر ہے یہ بات ارسلان کے ''منصوبے'' کے خلاف جاتی تھی۔ مٹھل کا طیش کم ہو جاتا، وہ ثوبیہ کو کسی قسم کا جانی نقصان پہنچانے کا ارادہ ترک کر کے کوئی اور قدم اٹھا سکتا تھا۔ اب مصیبت یہ تھی کہ ارسلان واضح لفظوں میں کیسے مٹھل سے کہتا کہ دونوں شکار اس کے قبضے میں ہیں۔ اس طرح مٹھل کو بھی شبہ ہو جاتا کہ ارسلان درحقیقت اسے اس طرح طیش دلا کے ثوبیہ کو اس کے ہاتھوں مروانا چاہتا ہے۔ ارسلان کے لیے یہ بڑی عجیب صورتِ حال تھی جبکہ ادھر ثوبیہ کو حیرت تھی کہ اس کا آوارہ اور نکھٹو شوہر اسے ایک متوقع خونی شخص کے چنگل سے چھڑانے کے لیے کس طرح منت سماجت کر رہا ہے اور وہ بھی ہاتھ جوڑ کر۔

''یہ ذلیل... غفورا جھوٹ بول رہا ہے۔''

''کیا؟'' مٹھل الجھ کر بولا۔ خود غفورا بھی ششدر رہ گیا۔

''صاحب جی! مجھے گالی کیوں دیتے ہو... میرا کیا قصور ہے؟''

''ابے چپ! مردود کہیں کا۔ قسمت کا بنا بنایا کھیل بگاڑ رہا ہے۔''

پھر وہ مٹھل کی طرف متوجہ ہو کے بولا۔ ''دیکھو... تم میری بیوی کو چھوڑ دو۔ مجھے اس سے شدید محبت ہے، میں اس کے بغیر مر جاؤں گا اگر تم اسے گولی مار دو گے تو مجھے رنج ہو گا مگر میں تمہارے دونوں شکار تمہارے حوالے نہیں کروں گا۔''

''کیا؟'' مٹھل کی خوں خواری اور غضب ناکی دوبارہ لوٹ آئی۔

''میرا مطلب ہے، تمہارے دونوں شکار۔'' وہ کہتے کہتے رکا۔ پھر اچانک اس کے ذہن میں خیال ابھرا... ایک خطرناک خیال... اس نے فوراً ایک دوسری چال چلنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سوچا اگر وہ ثوبیہ کو ''بظاہر'' بچانے کی خاطر مٹھل کی طرف اچانک پیش قدمی کرے تو یقیناً مٹھل طیش میں آ کر ثوبیہ کو گولی مار دے گا اور یوں اس کا منصوبہ ازخود کامیاب ہو جائے گا۔

''میں کہتا ہوں میرے دونوں شکار میرے حوالے کر دو... ورنہ... میں تمہاری بیوی کی کھوپڑی میں گولی اتار دوں گا۔''

''ابے گھامڑ... یہی تو میں چاہتا ہوں۔ دیر کیوں کر رہا ہے... پھر؟'' ارسلان نے اس کی دھمکی پر دل ہی دل میں اسے کوسا پھر اوپری دل سے روہانسا ہو کے خوف زدہ لہجے میں مٹھل سے بولا۔ ''نہیں... نہیں... خدا کے لیے ایسا مت کرنا... میری بیوی کو مت مارنا۔''

ارسلان نے اپنے تئیں اس موقع کو سنہری موقع جان کر مٹھل کی طرف جارحانہ پیش قدمی کی۔ ثوبیہ کو خوش گوار حیرت ہوئی کہ اس کا شوہر... اسے بچانے کی خاطر اپنی جان کی بھی پروا نہیں کر رہا ہے۔

''میں کہتا ہوں رک جاؤ... ورنہ تمہاری بیوی کو گولی مار دوں گا۔'' مٹھل، ارسلان کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر دہاڑا مگر ارسلان یہی تو چاہتا تھا اس لیے نہیں رکا اور بظاہر ثوبیہ کو اس کے خونی پنجوں سے نجات دلانے کی خاطر اس کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھتا رہا پھر وہی ہوا۔ اچانک گولی چلنے کا دھماکا ہوا۔

گولی چلنے کی حد تک تو وہی ہوا تھا مگر مٹھل نے گولی ثوبیہ پر نہیں بلکہ طیش میں آ کر اپنی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے ارسلان پر چلائی تھی جو اس کے پیٹ میں لگی۔

مٹھل سے بھی شاید یہ فائر غیر ارادی طور پر ہوا تھا، اس لیے ارسلان کو گولی لگنے اور پھر گرتے دیکھ کے وہ بدحواس ہو گیا اور ثوبیہ کو چھوڑ کر بھاگ اٹھا۔

ثوبیہ چیخ مار کے ارسلان کی طرف دوڑی۔ ارسلان اپنا

زخمی اور خون آلود پیٹ پکڑے زمین پر گرا پڑا تھا اور تقدیر کی اس ستم ظریفانہ طرفہ کاری اور الٹ پھیر پر حیران بھی تھا۔

''ارسلان! تت... تم نے... میری خاطر..... اپنی جان خطرے میں ڈال دی... مجھے معاف کر دینا... میں تمہیں غلط سمجھی تھی۔'' ثوبیہ غم سے نڈھال ہوگئی۔ پھر غفورے کی طرف دیکھ کر چیخ کے بولی۔

''تم منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ جلدی کرو... اسے اٹھا کے گاڑی میں ڈالو۔''

''نن... نن... نہیں... پلیز... ثوبیہ! اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔'' ارسلان کراہ کے بولا۔ وہ اب اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر لمحہ بہ لمحہ موت کی زردی پھیلتی جارہی تھی۔ ثوبیہ زمین پر بیٹھی زخمی ارسلان کا سر اپنی گود میں لیے بڑی محبت سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرے جارہی تھی اور ہچکیاں لے کر رو رہی تھی۔

''مم... میں... میری... بات سن لو ثوبیہ! میں اب نہیں بچوں گا۔ مرنے سے پہلے میں ایک اعتراف کر لینا چاہتا ہوں۔ میں نے تمہارے لیے گڑھا کھودا تھا، میں خود اس میں جا گرا... حقیقت یہ تھی کہ میں تمہیں قتل کروانا چاہتا تھا۔ آخری وقت تک میری یہی کوشش رہی کہ تم مٹھل کے ہاتھوں... مگر مٹھل نے اشتعال میں آکر تمہیں گولی مارنے کے بجائے مجھے ماردی... میں آج تک تم سے جھوٹ ہی بولتا آیا... کبھی سچ نہیں بولا... لل... لیکن... اب جبکہ میں اس دنیا سے رخصت ہورہا ہوں... تو جانے کیوں اچانک ایک احساس جاگا ہے... کہ تم سے معافی مانگ لوں... شاید اللہ بھی مجھے معاف کر دے... میں تمہارا مجرم ہوں، مجرم تھا... مگر خدا کے لیے اس آخری وقت میں مجھے معاف کر دو... آج... جب میں تم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ رہا ہوں تو مجھے شدت سے احساس ہورہا ہے... کہ... کہ... محبت... کیا ہوتی ہے... آ... آئی... لو... یو... ثوبیہ...''

اس کے ساتھ ہی ارسلان کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ ثوبیہ کی پھٹی پھٹی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ارسلان کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں جو ثوبیہ کے چہرے پر جمی ہوئی محسوس ہوتی تھیں، جیسے وہ مرنے کے بعد بھی اس سے معافی کا منتظر ہو... اور ثوبیہ نے دھیرے سے اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ ارسلان کے چہرے پر پھیر کے اس کی کھلی آنکھیں بند کر دیں اور زیر لب بڑبڑائی۔ ''میں نے تمہیں معاف کیا ارسلان! اللہ بھی تمہیں معاف کرے۔''

بعد میں غفورا بھی ثوبیہ کے قدموں میں جا گرا اور اس سے معافی مانگنے لگا۔ ثوبیہ نے اسے بھی معاف کر دیا پھر ان دونوں قیدیوں کے بارے میں دریافت کیا۔ غفورا فوراً بھاگا بھاگا گیا اور بلخ شیر اور زرینہ کو اپنے کوارٹر سے لے آیا۔

بلخ شیر نے ثوبیہ کو بتادیا کہ اس نے ہی اسے فون کر کے محتاط ہونے کا مشورہ دیا تھا اور ساتھ ہی اپنی رام کتھا بھی سنا ڈالی اور وحشی پاگل کے بارے میں بھی بتا دیا جو غفورے کا بھائی تھا۔

ثوبیہ نے پولیس کو فون کر دیا تھا۔

☆☆☆

پولیس آئی اور ضروری کارروائی نمٹانے کے بعد چلی گئی۔ پاگل وحشی شخص کو گرفتار کر لیا گیا۔ غفورے کو اس کے خلاف سلطانی گواہ بنالیا گیا پھر بلخ شیر نے مٹھل کے بارے میں بھی پولیس کو بتا ڈالا..... اسے یقین تھا کہ مٹھل بھی بہت جلد قانون کی گرفت میں آجائے گا۔

''ثوبیہ بی بی! ہمیں اس سارے واقعے پر بہت افسوس ہوا، اب ہمیں اجازت دیں۔''

ثوبیہ نے ایک غمگین سی مسکراہٹ سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی حسرت تھی۔ وہ بڑے غمگسار لہجے میں ان کی طرف دیکھ کر بولی۔

''تم نے اپنا انسانی فرض نبھانے کی پوری کوشش کی۔ میں تم دونوں کا دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ خدا تم دونوں کو خوش رکھے۔ میں تو بدنصیب ہی رہی، ارسلان سے محبت کی تو وہ میری جان کا دشمن نکلا۔ جب مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے لگا تب اس کا ضمیر جاگا... ہر ایک کا نصیب ہے... ایک تم دونوں ہو... محبت کی خاطر... ایک دوسرے کو پانے کی خاطر آخری وقت تک جدوجہد کرتے رہے اور محبت کو فتح کر لیا۔''

زرینہ آگے بڑھ کر ثوبیہ کے گلے لگ گئی اور خلوص سے بولی۔ ''آمین ثوبیہ! ہماری دعا ہے، اللہ آپ کو خوش رکھے اور آپ کو اچھا، پیار کرنے والا جیون ساتھی ملے۔''

ثوبیہ اس کی سادگی اور محبت پر مسکرائی اور کہا۔ ''ہاں، محبت کرنے والوں کی دعائیں ضرور اثر کرتی ہیں۔'' پھر وہ بولی ''لیکن مجھے خوشی ہوگی کہ اگر تم کچھ دن میرے ساتھ رہو... تم نے مجھے بہن کہا ہے تو اس بہن کی بھی بات تمہیں ماننا ہوگی۔'' ثوبیہ نے بڑی محبت سے کہا اور زرینہ نے بلخ شیر کی طرف دیکھا تو اس نے سر جھکا دیا۔